

فی ظلال القرآن

(قرآن کے سائے میں)

سورۃ آل عمران کی مکمل تفسیر

شہید اسلام سید قطب رحمہ اللہ

ترجمہ: سید معروف شاہ شیرازی

ناشر: ادارہ منشورات اسلامی

بالمقابل منصورہ ملتان روڈ لاہور

انٹرنیٹ ایڈیشن



اسلامی لائبریری

فی ظلال القرآن

(قرآن کے سائے میں)

سورۃ آل عمران کی مکمل تفسیر

شہید اسلام سید قطب رحمہ اللہ

ترجمہ: سید معروف شاہ شیرازی

اخوانکم فی الاسلام:



الاسلامی لائبریری

مسلم ورلڈ ویڈیو پروسیسنگ پاکستان

شہید اسلام سید قطب رحمہ اللہ اور تفسیر فی ظلال القرآن

شہید اسلام سید قطب کا شمار امت مسلمہ کی ان چند برگزیدہ ہستیوں میں ہوتا ہے جنہوں نے تاریک ادوار میں روشنی کے چراغ جلائے اور اسلامی نظام زندگی کو اپنے خون سے سینچا۔

سید قطب رحمہ اللہ ۱۹۰۲ء میں مصر کے ایک صوبہ ”اسیوط“ کے ایک گاؤں ”موشاء“ میں پیدا ہوئے۔ والد کا نام حاجی قطب ابراہیم اور والدہ کا نام فاطمہ حسین عثمان تھا۔ دونوں عربی النسل تھے۔ سید قطب اپنے والدین کے سب سے بڑے لڑکے تھے۔

آپ نے ثانوی تعلیم ”تہجیزیہ دارالعلوم“ نامی ایک اسکول میں حاصل کی۔ اس اسکول میں طلباء کو دارالعلوم میں داخلہ کے لئے تیار کیا جاتا تھا۔ وہاں سے فارغ ہو کر آپ ۱۹۲۹ء میں قاہرہ کے دارالعلوم میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۲ء میں آپ نے بی۔ اے کی ڈگری اور ڈپلومہ ان ایجوکیشن حاصل کیا۔ تعلیم سے فراغت کے بعد آپ نے محکمہ تعلیم میں بحیثیت انسپکٹر تعلیم ملازمت اختیار کر لی اور ۱۹۵۲ء تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اسی دوران ۱۹۵۴ء میں آپ اخوان المسلمون سے متعارف ہوئے۔ اور ۲ جولائی ۱۹۵۴ء میں آپ کو اخوان کے شعبہ نشر و اشاعت نے اخبار ”الاخوان المسلمون“ کا ایڈیٹر مقرر کیا۔

شہید اسلام سید قطب رحمہ اللہ ۱۹۵۴ء سے لے کر ۱۹۶۴ء تک جیل میں رہے اور اگست میں عبدالسلام عارف صدر عراق کی کوشش سے رہا ہوئے۔ رہا ہوتے ہی پوری دنیا کے نوجوانوں نے آپ کی طرف رجوع کیا، اور آپ کا لٹریچر جنگل کی آگ کی طرح پوری دنیا میں پھیلنے لگا۔ چنانچہ لادین مغرب پرست کمیونسٹ اور سوشلسٹ عناصر چیخ اٹھے اور بیک وقت ماسکو اور واشنگٹن سے ان کے خلاف سازشیں ہونے لگیں۔ چنانچہ آپ کو ایک سال بعد اگست ۱۹۶۵ء میں دوبارہ گرفتار کر لیا گیا اور ایک سال بعد ۲۹ اگست ۱۹۶۶ء میں آپ کو شہید کر دیا گیا۔

سید قطب اخوان المسلمون میں آنے سے پہلے خالص ادبی کام کرتے رہے۔ لیکن تحریک اخوان المسلمون میں شامل ہونے کے بعد اسلامی انقلاب، اور تحریک اسلامی، ان کا خاص موضوع رہا۔

مصنف نے فی ظلال القرآن میں قرآن پاک کی اثر انگیزی، جس نے عرب کی کاپلٹ دی تھی، کی راہ میں حائل پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن پاک کا مطالعہ کرنے والا اس تحریک کے ساتھ جاکھڑا ہوتا ہے جو ہبوط آدم علیہ السلام کے وقت سے روئے زمین پر برپا ہوئی اور انبیاء علیہم السلام کی قیادت میں چلتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دور تک آپہنچی۔ آپ صلی اللہ علیہ کے بعد بھی یہ تحریک زندہ اور قیامت تک جاری رہے¹۔ قاری توحید و رسالت اور آخرت کے عقیدے کو قافلے کے ایک رفیق اور تحریک کے ایک کارکن کی حیثیت سے سنتا اور سمجھتا ہے اور قوموں کے عروج و زوال کی داستان کو امت کے ایک فرد کی حیثیت سے پڑھ کر اس سے سبق لیتا ہے۔

فی ظلال القرآن میں علمی مویشگافیوں اور فقہی باریکیوں سے ہٹ کر قرآن پاک کے اصل مقصد اور دعوتی رنگ کو اختیار کیا گیا ہے۔ اس کے لئے جو زبان استعمال کی گئی ہے۔ وہ سید کا ہی حصہ ہے اور اسے بلاشبہ الہامی زبان ہی کہا جاسکتا ہے۔ اپنے اس رنگ میں یقیناً یہ ممتاز ترین تفسیر ہے۔ تفسیر کیا ہے ایک دعوت عمل اور دعوت انقلاب ہے، الفاظ اور معنی کا دریا ہے، جس میں تحقیقی، علمی، وجدانی، اور ادبی نکات جابجا موجود ہیں۔ پورے ذخیرہ تفاسیر میں یہ پہلی تفسیر ہے۔ جو خود قرآن کے اسلوب بیان میں لکھی گئی ہے۔ دوسری تفاسیر بالعموم منطقی انداز بیان میں لکھی گئی ہیں اور فی ظلال القرآن قرآنی اور انقلابی انداز بیان میں ہے۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہیں کہ یہ اختلافی مسائل اور اسرائیلیات سے خالی ہے۔ اسلام کا جامع تصور لئے ہوئے، اس کے احیاء کا طریقہ کار نمایاں کرتی ہے۔ غرض اخلاص، روح

¹ اس بات میں نہ تو کوئی مبالغہ ہے اور نہ ہی کسی قسم کی کوئی قیاس آرائی ہے کہ آج اس تحریک کے علمبردار اور داعی مجاہدین القاعدہ ہیں۔ جنہوں نے اپنے خون سے اس تحریک کی آبیاری کی ہے۔ اور اس تحریک کے پودے کو اپنے خون سے سیرجہ ہے۔ آج دنیا کے جس خطے میں بھی کفار مرتدین اور صلیبیوں کے خلاف جہاد جاری ہے وہ اسی تحریک کی سربراہی میں اسلام کے جھنڈے تلے جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کے نوجوانوں کو ان ابطال امت کی پیروی کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

ایمان، عمل صالح اور دعوت انقلاب اس کی نمایاں خصوصیات ہیں۔ پندہ پارے جیل سے باہر اور بقیہ جیل میں لکھے گئے ہیں۔ عربی میں اب تک کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

سید عارف شیرازی

منصورہ ۲۹ دسمبر ۱۹۸۷ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست

سورۃ آل عمران - ۳

6	ایک نظر میں	سورۃ آل عمران
38	ایک نظر میں	درس نمبر ۲۳
44	تشریح آیات ۱..... تا..... ۳۲	درس نمبر ۲۳
111	ایک نظر میں	درس نمبر ۲۴
116	تشریح آیات ۳۳..... تا..... ۶۴	درس نمبر ۲۴
165	ایک نظر میں	درس نمبر ۲۵
173	تشریح آیات ۶۵..... تا..... ۹۱	درس نمبر ۲۵
215	ایک نظر میں	پارہ - نمبر ۴
218	ایک نظر میں	درس نمبر ۲۶
223	تشریح آیات ۹۲..... تا..... ۱۲۰	درس نمبر ۲۶
286	ایک نظر میں	درس نمبر ۲۷
314	تشریح آیات ۱۲۱..... تا..... ۱۷۹	درس نمبر ۲۷
505	ایک نظر میں	درس نمبر ۲۸
510	تشریح آیات ۱۸۰..... تا..... ۱۸۹	درس نمبر ۲۸
530	ایک نظر میں	درس نمبر ۲۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

نوٹ

فی ظلال القرآن کے تفسیری ادب، میں اپنے اسلوب تفسیر، انداز بیان اور اپنی صورت فکر کے لحاظ سے ایک منفرد مقام رکھتی ہے۔ اس کا اسلوب بھی نیا ہے۔ عربی زبان میں سید قطب صاحب طرز ادیب ہیں۔ انہوں نے جدید عربی کو بالکل ایک نیا اسلوب دیا ہے۔ میں اسے ”ایمانی اسلوب“ سے تعبیر کرتا ہوں۔ نئی نئی تعبیرات کو استعمال میں لا کر اپنے مافی الضمیر کا اظہار کیا ہے۔ اس کا ترجمہ اس معیار کا تو ممکن ہی نہیں، میں نے اپنے اس ترجمہ میں نہایت ہی سہل اور سادہ پیرایہ اظہار میں ان کے مفہوم اور مراد کو منتقل کرنے کی سعی کی ہے۔

کتاب کے معنوی حسن کے ساتھ ساتھ ہم نے یہ کوشش کی ہے کہ اس کی کتابت اور طباعت کا معیار بھی بہتر ہو، جس کی وجہ سے بہت ہی زیادہ اخراجات اٹھے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ زیادہ اخراجات کے باوجود قیمت کم سے کم رکھی جائے تاکہ زیادہ سے زیادہ قارئین اسے خرید سکیں۔ اس لیے عام کتابوں کی طرح اس میں زیادہ تاخرانہ کمیشن ملنا مشکل ہو گا۔

اس کتاب کی طباعت اور ترتیب میں برخوردار سید عارف شیرازی نے، اپنی تعلیمی و تنظیمی مصروفیات کے باوجود میری امداد کی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ انہیں توفیق دے کہ وہ اس سلسلے کے اختتام تک یہ خدمت کرتے رہیں۔ اس سلسلے کی مزید دو جلدیں تیار ہیں۔ باقی تین جلدیں ان شاء اللہ جلد ہی منظر عام پر آجائیں گی۔ اللہ تعالیٰ اس پیشکش کو قبول فرمائے آمین!

تولیعہ قارئین! میں، آپ اور سید قطب شہید رحمہ اللہ کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں رہنا چاہتا۔ (سید معروف شاہ شیرازی۔ منصورہ 29 دسمبر 1987)

سورۃ آل عمران، ایک نظر میں

قرآن حکیم ہی دعوت اسلامی کی کتاب ہے، وہی اس کا باعث اور روح رواں ہے۔ دعوت اسلامی کی شخصیت اور اس کا وجود یہی کتاب ہے۔ اور یہی کتاب اس کی پاسبان اور ساربان ہے۔ یہی اس کا بیان اور ترجمان ہے۔ یہی اس کا نظام اور دستور ہے، اس کی دعوت کا مرجع اور ماخذ یہی کتاب، اس کے داعیوں کے لئے یہی گائیڈ ہے۔ اسی سے دعوت اسلامی منہج حرکت و عمل اخذ کرتی ہے اور اسی سے وہ زاد راہ اور نشان منزل پاتی ہے۔

لیکن جب تک ہم اس بات کو اچھی طرح نہ سمجھ لیں گے اس کتاب کا پہلا خطاب ایک زندہ اور متحرک امت سے تھا۔ اس وقت تک ہمارے اور اس کتاب کے درمیان ایک وسیع خلیج حائل رہے گی۔ ہمارے ذہن میں یہ حقیقت اچھی طرح جاگزیں ہونی چاہئے کہ قرآن کی مخاطب امت کا ایک حقیقی وجود تھا۔ پھر اس خطاب کی وجہ سے اس امت نے عالم واقعہ میں بعض عملی اقدامات کئے اور ان واقعات اور اقدامات کے ذریعہ اس امت نے اس کرۃ ارض پر اس وقت کی پوری انسانی زندگی کا رخ ہی بدل کر رکھ دیا۔ اس خطاب کی وجہ سے اس وقت پوری انسانیت کی نفسیاتی دنیا میں زبردست معرکہ برپا ہوا۔ اس نظریاتی جنگ کے علاوہ اس کرۃ ارض کے بعض حصوں میں عملاً معرکے بھی ہوئے۔ یہ ایسے معرکے تھے کہ جن کے عمل اور رد عمل کی وجہ سے دنیا متاثر ہوئی۔ اثرات ڈالے اور ایک طوفان برپا ہوا۔

جب تک اس کتاب کے ساتھ ہمارا رویہ یہ ہو گا کہ ہم صرف خوش الحانی کے ساتھ اس کی تلاوت کریں۔ اسے سنیں، اس پر جھو میں اور اسے صرف برائے حصول ثواب اس کے ختم کرائیں۔ لیکن اس کے علاوہ انسان کی عملی زندگی کے ساتھ اس کا کوئی عمل دخل نہ ہو، تو حقیقت یہی رہے گی کہ ہمارے اور اس قرآن کے درمیان ایک دبیز پردہ حائل رہے گا۔ اور اس وقت صورت حالات یہی ہے کہ اس مخلوق یعنی حضرت انسان کی عملی زندگی سے اس کتاب کو نکالا گیا ہے۔ بلکہ امت مسلمہ کی عملی زندگی

بھی قرآن کے تابع نہیں ہے۔ حالانکہ اس کتاب کا نزول تو ان حالات میں ہوا تھا کہ زندہ انسانوں کو ہدایت دے رہی تھی۔ وہ عملی واقعات کا رخ پھیر رہی تھی۔ وہ زندہ حادثات میں ہدایت تھی، ان واقعات کا ایک مستقل تاریخی وجود تھا اور وہ زندہ تھے۔ اس نے انسانوں کی کاپی لٹ دی۔ ان واقعات کا رخ پھیر دیا۔ اس کے نتیجے میں وہ ایک زندہ موجودہ معاشرہ وجود میں آیا۔ عام انسانی زندگی میں وہ ممتاز خصوصیات کا حامل تھا۔ لیکن امت مسلمہ کے حوالے سے تو اس وقت کی واقعاتی دنیا خصوصی اہمیت رکھتی تھی۔

اس کتاب کا تو اعجاز ہی یہ ہے کہ اس کا نزول، اس کی ہر آیت کا نزول ہی، ایک متعین واقعہ اور ایک متعین صورت حالات میں ہوا، ایک متعین اور زندہ سوسائٹی میں وہ نازل ہوا اور انسانی تاریخ کے ایک متعین پیرڈ میں وہ نازل ہوا۔ لیکن اس تاریخی رول کے ساتھ ساتھ اس کا یہ اعجاز اب بھی قائم ہے کہ وہ اب بھی ایک زندہ کتاب ہے۔ اس میں اب بھی یہ صلاحیت ہے۔ جو انسان کی موجودہ زندگی کا سامنا کر لے۔ بلکہ اس پر غور کیا جائے تو وہ یوں نظر آتی ہے کہ گویا اب بھی وہ امت مسلمہ کو اس کی جاری و ساری زندگی میں ہدایات دے رہی ہے۔ اس وقت امت مسلمہ کو اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی جاہلیت کے ساتھ ساتھ جو معرکہ درپیش ہے۔ اس میں وہ مسلسل اسے ہدایات دے رہی ہے۔ خود امت مسلمہ کی ذہنیت اور اس کے ضمیر کے اندر جو داخلی کشمکش برپا ہے۔ اس میں بھی وہ ہادی و رہبر ہے۔ اور یہ راہنمائی اس طرح ایک زندہ راہنمائی ہے جس طرح دور اول میں تھی، اسی طرح واقعاتی راہنمائی جس طرح ہوا کرتی تھی۔

ہم کیونکر اس قرآن کی عملیت اور فعالیت کو دریافت کر سکتے ہیں؟ اس کی پوشیدہ زندگی کا راز ہم کس طرح معلوم کر سکتے ہیں تاکہ اسے ہم دور حاضر میں اپنی زندگی کا راہنما بنالیں اور وہ جماعت مسلمہ کا گائیڈ اور راہنما بن جائے۔ اس مقصد کے لئے ہمیں اس جماعت کی زندگی کی تشکیل کا تفصیلی مطالعہ کرنا ہو گا۔ جس کو اس قرآن سے سب سے پہلے خطاب کیا۔ ایسا مطالعہ کہ ہماری نظروں میں گویا اسکرین پر وہ جماعت تشکیل پا رہی ہے، وہ درپیش واقعات و حادثات میں زندہ اور متحرک ہے۔ وہ مدینہ اور پورے

جزیرۃ العرب میں واقعات و حوادث کا مقابلہ کر رہی ہے۔ وہ دشمنوں کے ساتھ بھی برت رہی ہے اور دوستوں کے ساتھ بھی رواں دواں ہے۔ وہ اپنی خواہشات نفس کے ساتھ بھی برسرِ پیکار ہے اور اپنے ارد گرد پھیلی ہوئی جاہلی سوسائٹی کے ساتھ بھی برسرِ جنگ ہے اور اس پورے عرصے میں قرآن مسلسل نازل ہو رہا ہے۔ اور ان سب واقعات کے بالمقابل جن میں وہ اس جماعت کی راہنمائی اس کشمکش کے حوالے سے بھی کر رہا ہے جو خود اس کے پہلو میں اپنے نفس کے ساتھ جاری ہے اور اس معرکے میں بھی کر رہا ہے جو اس جماعت کو اپنے ظاہری دشمنوں کے ساتھ مکہ ان کے ارد گرد، مدینہ کے ماحول میں اور پورے جزیرۃ العرب میں درپیش ہے۔

ہاں! ہمارے لئے بہت ہی ضروری ہے کہ ہم کچھ عرصہ اس پہلی جماعت اسلامی کے ساتھ زندہ رہیں۔ اپنے ذہن کی اسکرین پر اسے اس کے حقیقی انسانی روپ میں دیکھیں۔ اس کی زندگی کے واقعات کو چلتا پھرتا دیکھیں بحیثیت انسانی اس کی مشکلات پر غور کریں اور پھر دیکھیں کہ یہ قرآن اس کی راہنمائی کس طرح براہ راست کر رہا ہے۔ اس کی روزمرہ زندگی میں بھی وہ اس کے لئے گائیڈ ہے۔ اس کے اصولی معاملات میں بھی وہ راہنما ہے۔ ہمیں اس اسکرین پر نظر آئے گا کہ قرآن مجید نے اس جماعت کا ہاتھ پکڑ رکھا ہے۔ قدم قدم پر اس کے ساتھ ہے۔ وہ کبھی گرتی ہے اور پھر اٹھتی ہے۔ کبھی راستہ کھودیتی ہے تو فوراً پھر جادہ مستقیم پر آجاتی ہے۔ کبھی کمزور پڑ جاتی ہے تو فوراً کھڑی ہو جاتی ہے۔ مشکلات کے پہاڑ ٹوٹتے ہیں تو صابر و شاکر ہے۔ وہ مشکلات سے پردہ شوار گزار گھاٹیوں کو بڑی مشقت سے عبور کرتی چلی جاتی ہے۔ وہ بڑے نظم و ضبط، صبر و مشقت کے ساتھ اور جدوجہد کے ساتھ مشکلات پر قابو پاتی ہے۔ اس اسکرین پر صاف نظر آتا ہے کہ اس جماعت میں تمام انسانی خصوصیات موجود ہیں۔ اس میں انسانی ضعف در ماندگی بھی ہے اور اس میں ہمت و مردانگی بھی ہے۔

اس پہلی جماعت اسلامی کے ساتھ قدرے زندگی بسر کرنے کے بعد ہی ہم یہ شعور پیدا کر سکتے ہیں کہ یہ کتاب تو ہمیں بھی بعینہ اس طرح خطاب کر رہی ہے جس طرح اس نے پہلی جماعت مسلمہ کو خطاب کیا تھا۔ اور یہ کہ آج کی انسانیت جسے ہم دیکھتے ہیں۔ جسے ہم اچھی طرح جانتے ہیں۔ جسے ہم اس

کی پوری خصوصیات کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں۔ یہ دعوت قرآن پر لبیک کہنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ یہ بعینہ پہلی جماعت کی طرح قرآنی قیادت اور قرآنی راہنمائی سے مستفید ہو سکتی ہے۔

اس جماعت مسلمہ کی زندگی پڑھ کر محسوس کریں گے یہ قرآن تو آج بھی ایک زندہ کتاب ہے۔ وہ ہمیں اس جماعت کی زندگی میں فعال نظر آئے گی۔ اور آج کے دور میں وہ ہماری زندگی میں فعال ہو سکتی ہے۔ یوں ہم محسوس کریں گے کہ یہ کتاب آج بھی ہمارے شانہ بشانہ کھڑی ہے اور کل بھی ہمارے ساتھ ہوگی اور یہ کہ یہ محض برائے ثواب تلاوت ہی کے لئے نہیں ہے۔ صرف جھومنے کے لئے نہیں ہے۔ اسے ہماری عملی زندگی سے دور نہیں رکھا جاسکتا نہ یہ ہماری کوئی ایسی تاریخ ہے جو گزر گئی اور اس کے صفحات الٹ کر رکھ دیئے گئے۔ اب عملی میدان کے ساتھ اس کو کوئی سروکار نہیں۔ اب جدید تاریخ میں اس کا کیا کام۔

قرآن کریم ایک ایسی حقیقت ہے، ایک ایسا وجود ہے جس طرح یہ کائنات ایک مستقل وجود رکھتی ہے، یہ کائنات اللہ کی وہ کتاب ہے جسے ہم دیکھتے ہیں اور مشاہدہ کرتے ہیں اور قرآن اللہ کی وہ کتاب ہے جسے ہم پڑھتے ہیں اور اس پر تدبیر کرتے ہیں۔ جس طرح کتاب کائنات وجود باری پر شاہد ہے، اسی طرح قرآن کریم بھی اپنی شان اعجاز کے ساتھ ذات باری پر شہادت ہے۔ اور یہ دونوں وجود یہاں جاری و ساری ہیں۔ یہ کائنات اپنے تمام قوانین قدرت اور نوامیس فطرت کے ساتھ متحرک ہے۔ اس کے خالق نے اس کی ڈیوٹی لگائی ہے وہ اسے پورا کر رہی ہے۔ سورج اپنے مدار میں متحرک ہے اور اپنا فریضہ سرانجام دے رہا ہے۔ چاند زمین اور تمام دوسرے ستارے اور سیارے اپنا اپنا فرض منصبی ادا کر رہے ہیں۔ زمانے کی دوری اور طوالت کا ان فرائض منصبی پر کوئی اثر نہیں ہے۔ نہ زمانے کی جدت نے اس کی کسی حرکت کو جدت دی ہے..... بعینہ اسی طرح قرآن کریم نے بھی ایک دفعہ انسانیت کی راہنمائی میں ایک بہترین کردار ادا کیا۔ وہ آج بھی اسی طرح موجود ہے، جس طرح تھا۔ انسانیت آج بھی اسی طرح ہے جس طرح تھی۔ اور یہ انسان اسی طرح اپنی حقیقت اور فطرت پر قائم رہے گا۔ اور یہ قرآن مجید اسی انسان کو اللہ کی جانب سے پکار ہے۔ جس طرح اس نے پہلے لوگوں کو پکارا، اس پکار میں

کوئی تغیر نہیں ہے۔ اس لئے کہ خود ذات انسانی اور فطرت انسانی میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے۔ اگرچہ اس کے ماحول اور اس کے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا میں تغیر اور تبدیلی واقعہ ہو گئی ہے۔ اور وہ خود بھی ان جدید حالات اور واقعات سے متاثر ہوا ہے۔ جبکہ قرآن مجید اسے اس کی اصل فطرت اور اس کی اصل حقیقت کو سامنے رکھ کر خطاب کرتا ہے۔ جس میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ نہ کوئی تغیر ہوا ہے۔ قرآن مجید آج بھی انسان کی زندگی کا رخ پھیر سکتا ہے اور کل بھی پھیر سکتا ہے، اس لئے کہ وہ اس راہنمائی کے لئے ہر وقت تیار ہے۔ اس لئے کہ وہ انسانیت کے خداوند قدوس کا آخری خطاب اور آخری پیغام ہے۔ اس کا مزاج اس طرح فطری ہے جس طرح اس کائنات کا مزاج ایک فطرت پر ہے۔ جس میں کوئی تغیر اور کوئی تبدیلی نہیں ہے۔

ذرا سوچئے یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہوگی کہ کوئی سورج کے بارے میں یہ کہے کہ یہ تو ایک قدیم ستارہ ہے۔ یہ ”قدامت پرست“ ہے۔ مناسب ہے کہ اسی سورج کی جگہ ایک جدید ترقی پذیر سورج ہو یا یہ کہ یہ انسان تو ایک قدیم مخلوق ہے۔ یہ قدیم اور رجعت پسند ہے۔ مناسب ہے کہ اسی انسان کی جگہ ایک نیا انسان ہو، جو اس نئی دنیا کی تعمیر و ترقی میں کام کرے..... اگر اس قسم کی بات اور اس قسم کے منصوبے مضحکہ خیز ہو سکتے ہیں۔ تو یہی بات قرآن کریم کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ جو اپنی حیثیت پر اسی طرح قائم ہے۔ اور اس کا مقام یہ ہے کہ وہ انسان کے لئے رب کا آخری پیغام ہے۔



مدینہ طیبہ میں اسلامی جماعت کے حالات میں اس سورت میں ایک زندہ تابندہ حصہ پیش کیا گیا ہے۔ یعنی ۲ھ میں غزوہ بدر کے متصلاً بعد اور ۳ھ میں غزوہ احد کے بعد تک اس دور میں امت مسلمہ جن حالات سے دوچار ہوئی۔ ان حالات میں قرآن کریم نے کیا کیا ہدایات دیں۔ کیا کیا تصرفات کئے اور جماعتی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں جو کام اس میں ذکر ہے۔

ان کا بیان ایسے شوکت اور قوت سے بھرپور الفاظ میں کیا گیا ہے کہ اسی دور کے پورے حالات جن سے تحریک اسلامی گزر رہی تھی، ان کی ایک مکمل تصویر کھچ گئی ہے۔ ان حالات میں جو جھڑپیں ہوئیں۔ جیسے حالات میں ہوئیں، ان کا نقشہ سامنے آتا ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ گویا سورت کا قاری زندہ طور پر ان حالات میں چل پھر رہا ہے، وہ اس تحریک میں ہے جو ان معرکوں میں حصہ لے رہی تھی۔ اور جو ان کا مقابلہ کر رہی تھی۔ انداز بیان ایسا ہے کہ لوگوں کے دلی راز دلی پوشیدہ جذبات، دلی وساوس اور تفکرات اور ایسے حالات میں انسانی جذبات اور میلانات کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے۔ اگر انسان تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کر لے تو جس طرح میں دیکھ رہا ہوں، اس طرح اسے بھی اپنے پردہ خیال پر یہ جماعت مسلمہ یوں چلتی پھرتی نظر آئے جس طرح گویا وہ زندہ نظر آرہی ہو، تمام چہرے اپنے خدو خال کے ساتھ صاف نظر آئیں، ان کے چہروں پر ان کے قلبی میلانات بھی صاف نظر آئیں۔ اس جماعت کے ارد گرد دشمن بھی صاف نظر آئیں۔ جو ان کے خلاف گھات میں بیٹھے ہیں، ان کے خلاف حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس جماعت کے اندر وہ شبہات اور غلط فہمیاں پیدا کر رہے ہیں، اس کو حقارت اور دشمنی کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اب اس کے خلاف جمع ہو رہے ہیں اور اب میدان میں آ پہنچے، وہ غرض اس معرکہ کی تمام حرکات و سکنات، اس کے تمام باطنی اثرات اور ظاہری اثرات اور ظاہری تاثر صاف صاف پردہ خیال پر نظر آتے ہیں۔

اس منظر میں قرآن کریم کا نزول ہو رہا ہے، تاکہ کفار کے مکرو فریب کا حال پاش پاش کر دے۔ ان کے پھیلانے ہوئے شکوک و شبہات کو زائل کر دے، مسلمانوں کے دلوں کو جمع اور ان کے قدموں کو پختگی عطا کرے۔ ان کی روح کو پاک اور ان کے افکار کو صاف کر دے۔ حالات پر تبصرہ کرے اور غلطیوں سے عبرت سکھائے۔ ان کے افکار کی تعمیر کرے اور ان میں سے آمیزش کو پاک کرے، ان کو آگاہ کرے کہ ان کا دشمن غدار اور امور جنگ میں سخت مکار ہے اور تاکہ وہ اس وادی پر خار میں، تحریک اسلامی کو تمام پھندوں اور کیو فلاج سے بچاتے ہوئے آگے بڑھائے، یوں جس طرح ایک ماہر تجربہ کار جرنیل اور اپنی فوج کو ظاہری اور چھپی ہوئی کمزوریوں سے باخبر جرنیل قیادت کرتا ہے۔

اس تاریخی پس منظر میں کے باوجود اس سورت میں قرآن مجید جو ہدایات اور احکامات دیتا ہے وہ بالکل عام، دائمی اور زمان و مکان کے قیود و حدود سے پاک ہیں۔ نہ ان میں اس دور کا کوئی رنگ نظر آتا ہے اور نہ اس ماحول کی کوئی جھلک نظر آتی ہے، ان ہدایات کا رخ پوری انسانیت اور ہر دور کی جماعت مسلمہ کی طرف ہے۔ آج کی جماعت ہو یا مستقبل کی جماعت ہو، بلکہ ان ہدایات کا مخاطب پوری انسانیت ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ شاید یہ آیت آج نازل ہو رہی ہیں اور آج کی جماعت مسلمہ کو آج کے مسائل میں ہدایات دی جا رہی ہیں۔ اور موجودہ صورتحال پر تبصرہ کر رہی ہیں۔ یہ اس لئے کہ ان آیات میں ایسے امور پر بحث کی گئی اور ایسے واقعات اور ایسے جذبات کا ذکر کیا گیا ہے جن کا تعلق وجدان کے ساتھ ہے، جس کا تعلق انسان کی نفسیات سے ہے، گویا اس وقت ایسے ہی حالات پیش نظر تھے اور اس سورت میں ان کا ذکر ہے..... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ صورتحال کچھ ایسی ہی تھی اور اللہ تعالیٰ جو علیم وخبیر ہے، نفس انسانی، اور انسانی اور تمام اشیاء کی حقیقت کا علم رکھتا ہے وہ ہمیشہ کے واقعات اور حالات کے بارے میں خوب جانتا ہے۔

اس لئے صاف نظر آتا ہے کہ یہ قرآن دعوت اسلامی کا قرآن، چاہے یہ دعوت جس دور میں ہو، اور جس جگہ بھی ہو، وہ اپنے ایک مستقل وطن میں جم گئی تھی۔ مسلمان مدینہ الرسول میں حکومت قائم کر چکے تھے۔ اور جس طرح ہم نے سورۃ البقرہ کی ابتداء میں تفصیل سے بتایا، مسلمانوں نے مدینہ میں اپنے پروگرام کے مطابق اقدامات شروع کر دیئے تھے۔



یہ سورت اس دور میں نازل ہوئی جس میں مدینہ کے اندر تحریک اسلامی کو کسی قدر قرار و سکون مل گیا تھا، وہ اپنے ایک مستقل وطن میں جم گئی تھی۔ مسلمان مدینہ الرسول میں حکومت قائم کر چکے تھے۔ اور جس طرح ہم نے سورۃ البقرہ کی ابتداء میں تفصیل سے بتایا، مسلمانوں نے مدینہ میں اپنے پروگرام کے مطابق اقدامات شروع کر دیئے تھے۔

اس دور میں بدر کی عظیم جنگ وقوع پذیر ہو گئی تھی۔ جس میں اللہ تعالیٰ نے قریش پر مسلمانوں کو فتح دی تھی۔ جن حالات میں یہ ٹکڑ ہوئی تھی اور جس ماحول میں مسلمانوں کو یہ غلبہ نصیب ہوا تھا، ان میں یہ عظیم کامیابی ایک معجزے سے کم نہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ خزرج قبیلے کے رئیس وقت عبد اللہ بن ابی ابن السلول کے دانت بھی کھٹے ہو گئے۔ اس کا غرور ٹوٹا اور وہ دین اسلام سے جس قدر نفرت کرتا تھا، اس نفرت میں قدرے کمی آئی، رسول ﷺ سے یہ جو بغض رکھتا تھا، اس میں قدرے کمی ہوئی، چنانچہ اس نے اب اپنی ظاہری نفرتوں کو دل میں چھپالیا۔ اور ایک منافق کی حیثیت سے اسلام میں داخل ہو گیا۔ وہ کہتا تھا: ”یہ ایک ایسی تحریک ہے جو مقبول ہو رہی ہے۔“ اور وہ ایک پڑگئی، اب اس تحریک کی راہ کوئی نہیں روک سکتا۔

بدر لکبریٰ کے بعد مدینہ طیبہ میں نفاق کی بنیاد پڑ گئی۔ یا منافقت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ اس لئے کہ بدر سے پہلے بھی بعض ایسے لوگ تھے، جو منافق تھے اور وہ اسلام میں محض اس لئے داخل ہو گئے تھے کہ ان کے اہالی و موالی سب اسلام میں داخل ہو گئے تھے۔ بہر حال اس وقت ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا تھا، جن میں بعض با اثر لوگ بھی شامل تھے۔ جو بظاہر اسلام میں داخل ہونے پر مجبور ہو گیا تھا، یہ ان کی مجبوری تھی کہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں شامل ہو جائیں۔ حالانکہ ان کے دل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف بغض و عداوت سے بھرے ہوئے تھے، وہ اس انتظار میں بیٹھے تھے کہ مسلمانوں پر کوئی مصیبت نازل ہو۔ وہ ہر وقت اس تلاش میں رہتے تھے کہ اہل اسلام کے اندر انہیں کوئی سوراخ ملے، وہ ایسے واقعات کے انتظار میں تھے۔ جس سے اہل اسلام کی قوت منتشر ہو اور ان کے صفوں میں انتشار پیدا ہو تاکہ انہیں اپنے دلی بغض اور حسد کے اظہار کا موقع ملے اور وہ اس نئی تحریک پر فیصلہ کن وار کر سکیں اگر ممکن ہو سکے ان منافقین کو ایک قدرتی عنصر ایسا مل گیا تھا جو اس کام میں ان کا قدرتی حلیف تھا، یعنی اہل یہود، جن کے دل بھی تحریک اسلامی اور مسلمانوں کے خلاف جل بھن گئے تھے۔ ان کو ان منافقین سے بھی، رسول اکرم ﷺ کے ساتھ زیادہ نفرت تھی۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ عرب کی جاہل اقوام میں ان کی جو قدر و منزلت، اہل کتاب ہونے کے ناطے تھی، اس میں تحریک اسلامی کی وجہ سے کمی آنے کا شدید خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ نیز وہ اس و خزرج کا باہم لڑا کر مدینہ میں اپنی برتری قائم

کئے ہوئے تھے، وہ اس سے قبل اسلام نے ختم کر دی تھی، جبکہ اس اور خزرج اللہ کے فضل سے بھائی بھائی بن چکے تھے اور اسلام کے سایہ میں وہ ایک ہی صف میں بنیان مرموص کی شکل میں کھڑے تھے۔

جب بدر میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی، یہ یہودی جل بھن گئے، ان کے دلوں کے بغض و عناد میں ابال آگیا۔ اس لئے اس سے جس قدر ممکن تھا، اسلام کے خلاف انہوں نے خفیہ سازشیں، مکاری اور فریب کاری شروع کر دی۔ وہ ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا ہو، مسلمانوں کے اندر حیرانی و پریشانی پیدا ہو، ان کے دلوں میں شکوک و شبہات پیدا ہوں، ان کے عقائد میں شبہات پیدا ہوں اور خود ان کے نفوس میں شک کا بیج بو دیا جائے۔

ان ہی دنوں غزوہ بنی قینقاع واقعہ ہوا، جس میں یہودیوں کی اسلام دشمنی کھل کر سامنے آگئی۔ حالانکہ یہودی قبائل اور رسول اکرم ﷺ کے درمیان معاہدے پختہ ہو چکے تھے۔ مدینہ تشریف لاتے ہی رسول ﷺ نے ان کے ساتھ یہ معاہدے کئے تھے۔

ادھر مشرکین کی حالت یہ تھی کہ وہ بدر الکبریٰ کی کامیابی سے سخت خوفزدہ تھے۔ وہ رات دن حضرت محمد ﷺ کے مدنی محاذ کی کامیابی پر سوچتے رہتے تھے۔ اس کامیابی سے ان کی تجارت، ان کے وقار اور حتیٰ کہ ان کے لیے وجود کے خطرات پیدا ہو گئے تھے اس سے وہ بے فکر نہ تھے۔ اس لئے وہ بھی اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاریاں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قبل اس کے کہ یہ خطرہ ناقابل علاج ہو جائے اس کا تدارک ضروری ہے۔

ان حالات میں صورتحال یہ تھی کہ مسلمانوں کے دشمنوں کے جذبات دشمنی جو بن پر تھے۔ ان کی قوت میں بھی جوش و خروش تھا، ان کے جذبات بغض و عناد اپنے شباب میں تھے۔ لیکن مسلمانوں کی تنظیم بہر حال اپنے ابتدائی مراحل میں تھی۔ اس کی تربیت اور ان کا نظم و نسق ابھی تک مکمل نہ تھا۔ ان میں وہ لوگ بھی تھے جو مہاجرین و انصار میں ممتاز اور تجربہ کار لوگ تھے۔ جو اسلام میں بہت ہی آگے تھے۔ لیکن ایسے بھی تھے جو ان سابقین مہاجرین و انصار کی طرح پختہ کار اور اسلام میں زیادہ پختگی نہ

رکھتے تھے۔ نیز اسلامی جماعت ابھی تک بہت زیادہ تجربات سے دوچار نہیں ہوئی تھی۔ جس سے اس کی ناہمواریاں دور ہو جاتیں۔ ان پر دعوت اسلامی کی حقیقت اچھی طرح ظاہر ہو جاتی۔ زمانے کے نشیب و فراز سے وہ واقف ہو جاتے اور تحریک اسلامی کی حکمت علمی اور نظام کار سے اچھی طرح واقف ہوتے۔

اس وقت منافقین کو مدینہ میں اہم مقام حاصل تھا۔ ان کا سربراہ عبداللہ بن ابی تھا۔ ان منافقین کے خاندان اور قبائلی رابطے ابھی تک قائم تھے، مسلمانوں پر ابھی تک یہ حقیقت نہ کھلی تھی کہ صرف اسلامی نظریہ حیات ہی ان کا خاندان ہے۔ یہی ان کا قبیلہ ہے، یہی ان کا مددگار ہے اور اس کے سوا کوئی قوت ان کی قوت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان منافقین کے نفوذ کی وجہ سے اسلامی صفوں میں جا بجا کمزوریاں تھیں، اس لئے منافقین اہل اسلام میں ابھی تک اثر و رسوخ بھی رکھتے تھے اور ان میں اچھی طرح گھل مل گئے تھے۔ (غزوہ احد کے بارے میں آیات کی تشریح کے وقت ان شاء اللہ اس نکتے کی وضاحت ہوگی)

اسی طرح اہل یہود کا بھی مدینہ کی سوسائٹی میں اہم مقام تھا۔ اہل مدینہ کے ساتھ ان کے صدیوں پرانے تجارتی اور حلیفانہ تعلقات تھے۔ اور ابھی تک ان کی دشمنی بھی کھل کر سامنے نہ آئی تھی۔ اور اہل اسلام کے دلوں کے اندر بھی تک یہ بات پختہ طور پر نہ بیٹھی تھی کہ ان کے لئے صرف ان کا نظریہ حیات ہی عہد و میثاق ہے۔ نظریہ ہی ان کا وطن ہے۔ نظریہ ہی ان کے معاملات اور معاہدوں کی اصلی اساس ہے۔ اس لئے جب مسئلہ نظریات کا آجائے تو اس وقت کوئی معاہدہ یا کوئی پختہ رابطہ بھی کام نہیں دیتا۔ ان حالات میں یہودیوں کے لئے یہ اچھا موقع تھا کہ وہ مسلمانوں کے اندر شکوک و شبہات پھیلائیں۔ انہیں بدراہ کریں اور ان کے اندر افواہیں پھیلانیں۔ بعض اہل اسلام ان کی باتوں پر کان بھی دھرتے تھے اور ان سے متاثر ہوتے تھے۔ بعض اہل اسلام ایسے بھی تھے کہ جب رسول اکرم ﷺ ان کی سازشوں کے ذریعہ کے لئے کوئی پیش بندی فرماتے تو ان یہودیوں کی مدافعت کرتے (مثلاً

جب بنی قینقاع کے بارے میں عبداللہ بن ابی نے سفارش کی اور اس معاملے میں رسول ﷺ کے بارے میں سختی کی)

دوسری جانب مسلمانوں کی حالت یہ تھی کہ انہیں بدر میں فتح ہوئی تھی۔ یہ ایک مکمل فتح تھی اور واضح فتح تھی۔ اس میں اہل اسلام نے بہت کم تیاری کی تھی اور یہ فتح معمولی جدوجہد کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی مٹھی بھر تعداد، بغیر ساز و سامان اور بغیر کسی بڑی تیاری کے نکلی۔ اس کا مقابلہ کفار کے ایک عظیم اور ساز و سامان سے لیس لشکر کے ساتھ ہوا۔ اور تھوڑی ہی دیر میں ی مد بھیڑ ہوئی تو اہل کفر کے مقابلے میں اہل اسلام کے حصہ میں ایک واضح فتح آئی۔

یہ فتح اہل اسلام اور اہل کفر کے درمیان ان کی پہلی مد بھیڑ میں ہوئی تھی۔ اوری در حقیقت اللہ کے معجزات میں سے ایک معجزہ تھی۔ آج ہمیں اس کی حکمت عملی کا ایک پہلو سمجھ میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس نئی اٹھنے والی تحریک کو قدرے ثبات و استحکام بخشنا چاہتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ تحریک دشمن کے ساتھ جنگ کے عملی تجربے سے کامیابی کے ساتھ گزر جائے تاکہ وہ آئندہ اپنے لئے راہ عمل طے کرے اور اعتماد کے ساتھ آگے بڑھے۔

یہ تو حکمت ایزدی لیکن غالباً مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ شاید ان کی کامیابی گویا ایک قدرتی امر ہے اور یہ ممکن ہی ان ہیں ہے کہ وہ کسی معرکے میں کودیں اور انہیں فتح نہ ہو، وہ جس طرف بڑھیں گے فتح ان کے قدم چومے گی۔ ہر حال اور ہر مرحلے میں کامیابی ان کے لئے مقدر ہے، اس لئے کہ وہ مسلمان ہیں اور اس لئے کہ ان کے دشمن اہل کفر ہیں اور ظاہر ہے کہ اہل کفر اور ایمان کے مقابلے میں فتح اہل ایمان کی ہی ہوگی۔

لیکن فی الحقیقت بات اس قدر سادہ نہ تھی۔ میدان جنگ میں فتح و شکست کا اصول اس قدر سادہ نہ تھا کہ بس صرف اسلام سبب فتح ہے اور محض کفر سبب شکست ہے۔ بلکہ ان اسباب کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ نفس انسانی کو اچھی طرح تربیت دی جائے۔ اپنی صفوں کو اچھی طرح درست اور

مرتب کیا جائے۔ جنگ کے لئے ضروری ساز و سامان تیار کیا جائے۔ افواج کے اندر نظم و اطاعت بکمال ہو اور جنگی اصول و قواعد کی پوری طرح پابندی کی جائے۔ انسانی نفسیات کا اچھی طرح خیال رکھا جائے اور میدان جنگ میں حرکات و سکنات کنٹرول میں ہوں۔ غرض یہ سب امور تھے جو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو میدان جنگ میں عملاً سمجھانا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اہل ایمان کو ہزیمت سے دوچار کیا اور اس کے بعد پھر سورت آل عمران میں اس پر زندہ جاوید تبصرہ فرمایا۔ جس نے اہل ایمان کی زندگیوں پر گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس تبصرے میں انہیں شکست کے اسباب بتائے گئے کہ یہ شکست بعض مسلمانوں کی غلطیوں کی وجہ سے ہوئی۔ ان تبصروں کے اندر ان کے اصلاح نفوس کے لئے تعمیری نصیحتیں بھی کی گئیں اور مسلمانوں کے اندر پختگی پیدا کی گئی۔

جب ہم غزوہ احد کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس تجربے کے لئے مسلمانوں کو بہت ہی قیمت ادا کرنی پڑی۔ وہ بہت بڑے خوف سے دوچار ہوئے، ایک بڑی تعداد زخمی ہوئی۔ معزز ترین لوگ شہید ان میں سرفہرست سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ تھے۔ اس سے بڑی قیمت وہ تھی جو ان کے لئے ناقابل برداشت تھی، یعنی رسول اللہ ﷺ بذات خود زخمی ہوں، ان کے چہرے پر زخم آئیں اور دانت مبارک شہید اور آپ گڑھے میں گر جائیں اور آپ کے رخساروں میں ذرہ کے حلقے چھ جائیں، یہ ایک ایسا صدمہ تھا جو مسلمانوں کے ناقابل برداشت تھا۔ اور وہ اس کو امر عظیم سمجھتے تھے۔

اس سورت میں غزوہ احد کے واقعات اور ان پر تبصرہ کو پیش کرنے سے بھی پہلے، سورت کا ایک بڑا حصہ ان متنوع ہدایات پر مشتمل ہے۔ جس میں اسلامی تصور حیات کے مختلف پہلوؤں کو صاف کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ تاکہ اس میں شرک اور جاہلیت کا کوئی شائبہ نہ رہے۔ ان ہدایات میں عقیدہ توحید کو صاف ستھرا اور نکھار کر رکھ دیا گیا ہے، اس میں اہل کتاب نے جو شرکیہ عناصر داخل کر دیئے تھے ان کی سخت تردید کی گئی۔ چنانچہ اہل کتاب کے معتقدات پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ اسی طرح اہل کتاب اسلامی عقائد و نظریات کے سلسلے میں اعتراضات کر کے اہل ایمان کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے کی جو سعی کر رہے تھے اس پر بھی بھرپور وار کیا گیا۔

بعض روایات میں یہ بات آئی ہے کہ اس سورت کی آیات ۸۳ کا نزول اس وقت ہوا جب یمن کے عیسائیوں کا مشہور وفد نجران رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کے لئے مدینہ آیا۔ یہ وفد ۹ھ میں آیا تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ۹ھ کے ان آیات کا نزول بعید از قیاس ہے، ان آیات کے مضمون ان کی فضا سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ آیت ہجرت کے متصلاً بعد کے ادوار میں نازل ہوئیں، جب کہ اسلامی جماعت نوخیز تھی اور اس کی صحیح تشکیل اور اس کے طرز عمل پر یہودی سازشوں کے اثرات بڑھ رہے تھے۔

وفد نجران کے سلسلہ میں وارد ہونے والی روایات درست ہوں یا نہ ہوں لیکن ان آیات کا موضوع یہ بتا رہا ہے کہ ان میں ان شبہات کی تردید کی گئی ہے جو نصاریٰ کی طرف سے وارد کئے جا رہے تھے۔ خصوصاً جن کا تعلق حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تھا یا جن کا تعلق عقیدہ توحید کی اس تعبیر سے تھا جسے اسلام نے پیش کیا اور ان آیات میں عیسائیوں کے عقائد غلطیہائے مضامین کو درست کیا گیا تھا۔ اور ان کے تمام ان خرافات تلبیسات کو دور کر کے بتایا گیا کہ وہ اس سچائی کی طرف آئیں جو خود انجیل میں بھی موجود ہے اور جس کی طرف قرآن مجید انہیں دعوت دے رہا ہے۔

لیکن اس حصے میں یہودیوں اور اہل ایمان دونوں کے لئے اشارات و تنبیہات موجود ہیں۔ خصوصاً اہل ایمان کو سخت تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ یہودیوں اور اہل کتاب کی سازشوں سے چوکنے نہیں۔ اور مدینہ کے ماحول میں جو خطرناک اہل کتاب موجود تھے وہ یہودی ہی تھے۔

غرض یہ حصہ جو اس سورت کا تقریباً نصف حصے پر مشتمل ہے، اس میں اسلامی نظریہ حیات اور اس وقت جزیرۃ العرب میں موجود منحرف اور باطل نظریات کے درمیان طویل کشمکش کا ذکر ہے اور یہ بحث صرف نظریاتی بحث ہی نہیں ہے جس کا عملی دنیا سے کوئی تعلق نہ ہو۔ بلکہ وہ مدینہ طیبہ کے اندر اٹھنے والی نوخیز تحریک اسلامی اور اس کے ان تمام دشمنوں کے درمیان برپا ہونے والی جنگ کا نظریاتی پہلو تھا۔ یہ جنگ عملاً برپا تھی پورے جزیرۃ العرب میں پھیلی ہوئی تھی اور اس میں تحریک اسلامی کے دشمن ہر وقت چوکنے تھے، وہ تاک میں بیٹھے رہتے تھے۔ تحریک کے لئے ہر وقت کنویں کھودتے رہتے

تھے۔ اور اس ہمہ گیر جنگ میں وہ تحریک کے خلاف ہر حربہ استعمال کر رہے تھے۔ اس میں ان کا پہلا ہتھیار یہ تھا کہ مسلمانوں کے عقائد کو متزلزل کر دیں۔ اور یہ نظریاتی جنگ بس جنگ تھی جو آج تک امت مسلمہ اور اس کے دشمنوں کے درمیان جاری و ساری ہے۔ یہ دشمن وہی ہیں جو تھے۔ وہی ملحد، وہی منکرین حق، وہی عالمی صہیونی اور وہی عالمی صلیبیت!!!

اس سورت کے مضامین پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے، اس وقت یہ لوگ جو وسائل اور جو دلائل کام میں لا رہے تھے آج بھی وہی دلائل اور یہی ذرائع استعمال کر رہے ہیں۔ اس وقت ان کے جو مقاصد تھے، آج بھی وہی مقاصد ہیں، اور اس وقت بھی قرآن ان کو جواب دے رہا تھا اور آج بھی وہ مدافعت کر رہا ہے۔ آج بھی قرآن ہمارے لئے مرجع ہے اور آئندہ بھی یہی ہو گا۔ جس طرح اس سے قبل تھا اور آج جو مسلمان قرآن مجید کی اس حیثیت سے انکار و اعراض کرتا ہے، اور اس ناصح مشفق سے نصیحت نہیں لیتا، یا اس مشیر ماہر سے مشورہ نہیں لیتا، اس جنگ میں جو اہل ایمان اور اعدائے ایمان کے درمیان جاری ہے، تو یقیناً ایسا شخص دشمنان اسلام کا جاسوس اور ایجنٹ ہے، اور وہ اس اسلحہ کو نظر انداز کر رہا ہے، جو اس معرکہ میں موجب ظفر ہے، وہ اپنے آپ کو دھوکہ دیتا ہے، وہ س امت کو دھوکہ دیتا ہے، اور وہ جو کچھ بھی کر رہا ہے وہ اسلام کے قدیم دشمنوں کے مفاد کے لئے کام کر رہا ہے، وہ اسلام کے جدید دشمنوں کا ایجنٹ ہے، یا تو وہ بہت بڑا حقدار ہے اگر وہ خود نادانی کر رہا ہے اور یا وہ بہت بڑا جت النفس ہے اگر وہ جان بوجھ کر کر رہا ہے۔



سورت کے اس حصے میں جو انتقادیات، جو مناظرہ اور جو تنقید اہل کتاب کے حوالے سے آئی ہے اس سے یہ اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت اہل کتاب کا خود اپنی کتاب کے بارے میں کیا موقف تھا، تحریک اسلامی کے بارے میں ان کا کیا موقف تھا اور اسلامی نظریہ حیات کے بارے میں ان کا موقف کیا تھا۔ اہل کتاب کا نقطہ نظر درج ذیل آیات سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے۔

☆ ”وہی اللہ ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں: ایک حکمت جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔“ (۷:۳)

☆ ”تم نے دیکھا نہیں انہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ان کا حال کیا ہے؟ انہیں جب کتاب الہی کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے تو ان میں سے ایک فریق پہلو تہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے منہ پھیر کا تا ہے۔“ (۲۳:۳)

☆ ”اے اہل کتاب تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑا کرتے ہو تورات اور انجیل تو ابراہیم علیہ السلام کے بعد نازل ہوئیں ہیں۔“ (۶۵:۳)

☆ ”ایمان لانے والو! اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ راست سے ہٹا دے۔“ (۷۰:۳)

☆ ”اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو۔“ (۷۱:۳)

☆ ”اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو انکار کر دو شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔“ (۷۳:۳)

☆ ”اہل کتاب میں سے کوئی ایسا تو ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دیدو تو وہ تمہارا مال تمہیں ادا کر دے گا۔ اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملہ میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا۔ الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اخلاقی حالت کا سبب

یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ ”امیوں (غیر یہودیوں) کے معاملے میں ہم سے کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی۔“ (۷۵:۳)

☆ ”ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے، حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی، وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں، یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا، وہ جان بوجھ کر بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔“ (۷۸:۳)

☆ ”کہو اہل کتاب یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے بھی تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے حالانکہ تم گواہ ہو۔“ (۹۹:۳)

☆ ”کہو اے اہل کتاب، تم کیوں اللہ کی باتیں ماننے سے انکار کرتے ہو، جو حرکتیں تم کر رہے ہو، اللہ سب دیکھ رہا ہے۔“ (۹۸:۳)

☆ ”تم ان سے محبت رکھتے ہو، مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے، حالانکہ تم تمام کتب آسمانی کو مانتے ہو، جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے بھی مان لیا ہے، مگر جب جدا ہوتے تو تمہارے خلاف ان کے غیظ و غضب کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔“ (۱۱۹:۳)

☆ ”تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے، اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔“ (۱۲:۱۳)

یوں اس پوری سورت میں نظر آتا ہے کہ اسلامی جماعت کے دشمن، اس کے خلاف صرف روایتی ہتھیاروں ہی سے کام نہ لیتے تھے، وہ صرف میدان جنگ میں، تیر و تفنگ ہی سے نہ لڑتے تھے، محض یہ نہ کرتے تھے کہ تمام دشمنوں کو جماعت اسلامی کے خلاف جمع کریں اور ان کے خلاف میدان

کارزار گرم کریں۔ جبکہ وہ تحریک اسلامی کے برخلاف نظریاتی جنگ میں رات و دن مصروف تھے۔ وہ تحریک کے خلاف شکوک و شبہات پھیلاتے تھے۔ خفیہ سازشیں کرتے تھے۔ دشمنوں کو بھڑکاتے، اس نظریاتی جنگ میں وہ سب سے پہلے اسلامی عقائد پر تنقید کرتے، اس لئے کہ امت مسلمہ کی تشکیل اور اس کی شخصیت کی اساس ہی عقائد پر تھی۔ اس لئے وہ ہر وقت اس کام میں لگے رہتے تھے کہ ان عقائد و ایمانیات کو کمزور کریں اور جس طرح ہو سکے ان کی بیخ کنی کریں۔ اس لئے کہ انہیں اچھی طرح یقین ہو گیا تھا۔ جس طرح آج امت کے دشمنوں کو یقین ہو گیا ہے کہ اس امت پر صرف اس صورت پر حملہ کیا جاسکتا ہے کہ اس کے عقائد کو کمزور کیا جائے، یہ صرف اس وقت کمزور ہوگی جب اس کے نظریات کمزور پڑ جائیں، اسے جسمانی شکست تب ہی دی جاسکتی ہے جب اسے روحانی شکست دی جائے۔ جب تک اس امت نے ایمان کی مضبوط رسی کا سہارا لیا ہوا ہے اس وقت تک وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ جب تک یہ امت اپنے اس مضبوط سہارے کو تھامے ہوئے ہے۔ اپنے نظریات کی روہ پر رواں دواں ہے، جب تک اس نے نظریاتی جھنڈے گاڑے ہوئے ہیں، جب تک یہ جماعت ایک نظریاتی جماعت ہے، جب تک ان نظریات سے اس کی پہچان ہے اور جب تک اسے اپنے ان نظریات پر فخر ہے اس وقت تک وہ اس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کا سخت ترین دشمن وہ ہے جو اس کے نظریات سے بدراہ کر رہا ہو، اور اللہ کے منہاج اور اللہ کے طریقوں سے بدراہ کر رہا ہو، لیکن یہ دشمن اپنی حقیقت کو ظاہر نہیں کرتا اور نہ اس کے دوسرے اہداف و مقاصد کا مسلمانوں کو پتہ ہوتا ہے۔

خوب سمجھ لو کہ امت مسلمہ اور اس کے دشمنوں کے درمیان ہر بات سے پہلے، نظریاتی دشمنی ہے، امت مسلمہ کے دشمن جب بھی چاہتے ہیں کہ وہ ارض اسلام پر قابض ہوں، اہل اسلام کے محاصل ان کے قبضے میں ہوں، ان کے خام مال ان کے تصرف میں ہوں، ان کی اقتصادیات پر ان کا کنٹرول ہو، تو وہ سب سے پہلے اہل اسلام کو نظریاتی شکست دیتے ہیں اس لئے کہ امت مسلمہ کے بالمقابل تمام تاریخی تجربات سے انہوں نے اس بات کو اچھی طرح پالیا ہے کہ وہ اپنے ان مقاصد میں اس وقت تک

کامیاب نہیں ہو سکتے جب تک وہ اپنے نظریات پر استحکام کے ساتھ کھڑی ہے، جب تک وہ اسلامی منہاج پر قائم ہے۔ جب تک وہ جانتی ہو کہ اس کے دشمن کیا کیا سازشیں کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ کے دشمن اور ان کے ایجنٹ اپنی پوری قوت اس بات پر خرچ کرتے ہیں کہ وہ اس امت کو پوری طرح دھوکے میں رکھیں، انہیں اس نظریاتی جنگ کا کہیں علم نہ ہو جائے۔ اور ج وہ اس جنگ کو خفیہ رکھنے میں کامیاب ہوں گے تو پھر ان کے لئے تمام مقاصد کا حصول بہت ہی آسان ہو جائے گا۔ جو وہ چاہتے ہیں، پھر وہ آزادانہ استعماری مقاصد کو پورے کر سکتے ہیں۔ امت کا اچھی طرح استحصال کر سکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ اس امت کے دل سے اس کے عقائد و نظریات کی عظمت کو نکال دیں۔

جب بھی اس مکر و فریب اور نظریاتی جنگ کے وسائل ترقی کرتے ہیں یہ دشمن ان ترقی یافتہ ذرائع کو کام میں لاتے ہیں، اور اسلامی نظریات میں شبہات پیدا کرتے رہتے ہیں، ان کی اہمیت کو کم کرتے رہتے ہیں۔ وہ اس میدان میں جدید سے جدید ہتھیار لے کر آتے ہیں۔ لیکن ان کے مقاصد وہی ہوتے ہیں جو روز اول سے ان کے پیش نظر تھے۔ ”اہل کتاب میں سے ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ راست سے ہٹا دے۔“ یہی ان کی مستقل اور خفیہ پالیسی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے سب سے پہلے ان کے نظریاتی ہتھیاروں کو کند کیا۔ اس نے جماعت مسلمہ کو سخت ترین ہدایات دیں کہ وہ اس سچائی پر سختی سے جم جائیں جس پر وہ قائم ہیں۔ اہل کتاب نے اس سلسلے میں جو شبہات پھیلانے قرآن کریم نے بڑی سختی اور قوت سے ان کی تردید کی۔ اور اس حقیقت کبریٰ کو نکھار کر رکھ دیا جس کا حامل یہ دین جدید تھا۔ جماعت مسلمہ کو مطمئن کیا، اس کو اس کے اصل مقام سے آگاہ کیا کہ اس کرۂ ارض پر اس کی کیا اہمیت ہے۔ یہاں اس کا مشن کیا ہے؟ اور یہاں ان نظریات کی اہمیت کیا ہے، جن کی وہ حامل ہے۔

چنانچہ اس سورت میں قرآن کریم امت مسلمہ کو ان سازشیوں کی سازش کے مقابلے میں اچھی طرح چوکنہ کر دیا۔ اپنے خفیہ مقاصد کے لئے جو اوجھے ہتھیار استعمال کر رہے تھے، انہیں طشت ازبام کیا، ان کے کے خطرناک عزائم سے پردہ اٹھایا، جماعت مسلمہ اور اسلام کے خلاف ان کے دل میں جو

نفرت و حقارت تھی اس سے انہیں آگاہ کیا اور بتایا کہ یہ سب دشمنیاں اس لئے ہیں اللہ نے ان پر اپنا فضل عظیم کیا ہے۔

قرآن کریم نے اس نوخیز جماعت کو بتایا کہ اس کائنات میں جو قوتیں کار فرما ہیں ان کی حقیقت کیا ہے۔ یہاں ان کا توازن کیا ہے، چنانچہ بتایا گیا کہ دشمنان اسلام کی کوئی حیثیت نہیں، اللہ کے مقابلے میں وہ پرکاش کی حیثیت رکھتے ہیں، انہوں نے خود اپنے دین کے مقابلے میں کفر اور بے راہ روی کا رویہ اختیار کیا، اپنی کتابوں کا انکار کیا اور اپنے انبیاء تک کو قتل کیا، یہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ جب تک اللہ کی مدد تمہیں حاصل ہو۔ وہ مالک الملک ہے، عزت و ذلت صرف اس کے ہاتھ میں ہے، وہ اس معاملے میں وحدہ لا شریک ہے، وہ عنقریب ان سازشی کفار پر اپنا عذاب نازل کر دے گا، کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ میدان بدر میں اس کا عذاب کفار مکہ پر کیونکر نازل ہوا۔ اس پر کچھ زیادہ وقت تو نہیں گزرا۔

امت مسلمہ کو اس وقت ان الفاظ میں یہ ہدایات دی گئیں۔

☆ ”اللہ وہ زندہ جاوید ہستی جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ اس نے تم پر یہ کتاب نازل کی جو سچائی لے کر آئی ہے اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے۔ اور اس نے وہ کسوٹی اتاری ہے۔ (جو حق و باطل کا فرق کرنے والی ہے) اب جو لوگ اللہ کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں۔ ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی۔ اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور برائی کا بدلہ دینے والا ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔“ (۳:۵۱ تا ۵۵)

☆ ”جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے، انہیں اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا۔ نہ اولاد وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ ان کا انجام ویسا ہی ہوگا جیسا فرعون کے ساتھیوں اور ان سے پہلے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ انہوں نے آیات الہی کو جھٹلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے

گناہوں پر انہیں پکڑ لیا، اور حق یہ ہے کہ اللہ بہت ہی سزا دینے والا ہے۔ بس اے محمد، جن لوگوں نے تمہاری دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے، ان سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور جہنم بڑا ہی ٹھکانہ ہے۔ تمہارے لئے ان دو گروہوں میں ایک نشان عبرت تھا، جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبر آزما ہوئے، ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے بچشم دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دوچند ہے۔ مگر (نتیجے نے ثابت کر دیا۔) اللہ اپنی نصرت سے جس کا چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔ دیدہ بینار کھنے والوں کے لئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے۔“ (۱۳:۳)

☆ ”اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے، جنہیں کتاب دی گئی، ان کے طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوانہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد، آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لئے ایسا کیا، اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات سے انکار کر دے، اللہ کو اس سے حساب لینے کی کچھ دیر نہیں لگتی۔“

☆ ”اس فرمان برداری کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے، اس کا وہ طریقہ ہر گز ہر گز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔“

☆ ”کہو، خدا یا! ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دیدے اور جس سے چاہے چھین لے، عزت دے، جسے چاہے، ذلیل کر دے، بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔“

☆ ”مومنین اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہر گزن نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اللہ اس سے کوئی تعلق نہیں، ہاں یہ معاف ہے کہ تم ان کے ظلم سے بچنے کے لئے بطور ایسا طرز عمل اختیار کر جاؤ، مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے۔ اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔“

☆ ”ابراہیم علیہ السلام سے نسبت رکھنے کا زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حق دار ہیں۔ اور اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔“ (۶۸:۳)

☆ ”کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں، حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کے تابع فرمان (مسلم) ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔“ (۸۳:۳)

☆ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی، تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمہارے لئے سب کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقع باقی ہے جبکہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے، اور جو اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے گا، وہ ضرور راہ راست پالے گا۔“ (۱۰۱:۳)

☆ ”اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے، تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ مسلم ہو، سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو، اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔“ (۱۰۳:۳)

☆ اب دنیا میں بہترین گروہ تم ہو، جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو، یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انہیں کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں سے کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں۔ مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر تم سے

لڑیں گے تو مقابلے میں پیٹھ دکھائیں گے۔ پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار ہی پڑی۔ کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں۔ ان پر محتاجی و مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف اس لئے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔“ (۱۱۲:۳)

☆ ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی جماعت کے لوگوں کے علاوہ دوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے، تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی انہیں عزیز ہے، ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمہیں صاف صاف ہدایات دیدی ہیں۔ اگر تم عقل رکھتے ہو، تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم تمام کتب آسمانی کو مانتے ہو اور جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم نے بھی مان لیا ہے، مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف ان کے غیض و غضب کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔ ان سے کہہ دو اپنے غصے میں آپ جل مرو، اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے..... تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی۔ بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس پر حاوی ہے۔“ (۱۲۰:۳)

اہل کتاب پر اس طویل بمباری (جس کا ایک مختصر حصہ یہاں قارئین کے لئے نقل کیا ہے) سے چند امور کھل کر سامنے آجاتے ہیں۔

پہلا یہ کہ مدینہ اور اس کے ارد گرد کے علاقوں میں، اہل کتاب نے اسلامی نظریہ حیات کے خلاف ایک عظیم نظریاتی جنگ برپا کر رکھی تھی، یہ نہایت ہی گہری مکاری پر مبنی تھی، اور اس میں اہل کتاب

اپنے تمام وسائل لیکر میدان میں آگئے تھے۔ اور ان کا مقصد وحید یہ تھا کہ اسلامی نظریہ حیات کو متزلزل کر دیا جائے اور اس کے نتیجے میں اسلامی صفوف کے اندر تفرقہ پیدا کر دیا جائے۔

دوسرا یہ کہ اس عظیم مہم کے نتیجے میں، بعض اہل اسلام اس نظریاتی جنگ سے متاثر ہو رہے تھے، اس لئے قرآن کریم نے اس سورت میں اس کا مختلف اسالیب کے ساتھ قلع قمع کیا اور اس کی جڑ کاٹ کر رکھ دی۔

تیسری بات یہ کھل کر ظاہر ہوتی ہے اور اسلامی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اسلام کے یہی دشمن ہیں جو اس محاذ پر مسلسل کام کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ دعوت اسلامی کے برخلاف یہی محاذ کھولے رکھا، جب بھی تحریک اسلامی اٹھی، جہاں بھی اٹھی، انہوں نے اس تحریک کے برخلاف نظریاتی جنگ شروع کر دی۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ جو علیم وخبیر ہے، جس نے آفاق کائنات میں یہ عظیم مشعل روشن کر دی تاکہ اسلام کے لئے کام کرنے والے اس سے دور دور تک روشنی حاصل کریں اور آنے والی نسلیں اپنے اس تاریخی اور روایتی دشمن سے چوکنار ہیں اور یہ بات اچھی طرح جان لیں کہ یہ لوگ ہیں جو اس نظریہ حیات اور اس امت کے دائمی دشمن!



اس سورت کا دوسرا حصہ غزوہ احد پر تبصرے کے لئے مخصوص ہے، اس حصے میں اسلامی عقیدہ اور اسلامی تصور حیات کے بعض اہم نکات طے کئے گئے ہیں، پھر یہ بتایا گیا ہے کہ ان نکات کی اساس پر کس طرح ایک اسلامی جماعت کی تنظیم و تشکیل ہوگی، ان واقعات، حادثات، میلانات اور احساسات کی تفصیلات دینے کے ساتھ ساتھ، اس حصے، اس دور کی جماعت مسلمہ کی شب وروز کو بھی کھول کر بیان کر دیا گیا ہے۔ اس وقت جماعت کے اندر مختلف درجات و اقسام کے جو لوگ پائے جاتے تھے۔ ان کی بھی مکمل وضاحت کی گئی ہے، جس طرح ہم اپنی ابتدائی تمہید میں کہہ آئے ہیں۔

اس حصے اور اس سے پہلے حصے کے درمیان ربط بالکل ظاہر ہے، پہلے حصے میں اسلامی تصور حیات کی تعمیر اور وضاحت تھی، یعنی معرکہ کارزار میں جس میں لوہا خوب گرم ہو، اور اس کے ساتھ دونوں حصوں میں یہ بتایا گیا ہے کہ اس کرۂ ارض پر حاملین دعوت اسلامی کے لئے ضروری ہے وہ اپنی جماعت کی صفوں کو درست کریں اور اس سلسلے میں ان پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں ان کا حق ادا کریں۔ اس کے ساتھ بتایا گیا کہ یہاں اللہ کی جانب سے فتح و شکست کے اصول کیا ہیں۔ اس موضوع پر قرآن نے اپنے خاص انداز میں ہدایات دیں ہیں اور واقعات کو بیان کر کے جماعت مسلمہ کی تربیت کی گئی ہے۔

یہاں ہم اس دوسرے حصے پر تفصیلی تبصرہ اس لئے نہیں کر سکتے کہ اس کا بیشتر حصہ چوتھے پارے میں آتا ہے۔ اس لئے تفصیلی بحث تو وہاں ہوگی البتہ یہاں اس قدر کافی..... اس میں اسلامی نظریہ حیات کے استحکام اور اسلامی جماعت کی تربیت و تشکیل کے بارے میں ہدایات دی گئی ہیں۔

غزوہ احد کی تفصیلات ختم کر کے جب یہ سورت اختتام تک پہنچتی ہے، تو نظر آتا ہے کہ یہاں اساسی موضوعات کو پھر دہرایا جاتا ہے۔ اس کا آغاز ان اشارات سے کیا جاتا ہے جو ایک مومن کے دل و دماغ کے لئے اللہ کی اس کھلی کتاب یعنی کائنات کے اندر پائے جاتے ہیں، جن پر جب ایک مومن غور و فکر کرتا ہے تو وہ غور و فکر اس کی دعا کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ یہ بڑی نرم اور پر کیف دعا ہے۔ یہ مشاہدہ کائنات پر مبنی دعا ہے۔ جس میں ایک مومن کے لئے بڑی بڑی نشانیاں ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیں۔

☆ زمین و آسمان کی پیدائش میں، اور رات اور دن کے باری باری سے آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان و زمین کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) ”پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے، تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بری ذلت و رسوائی میں ڈال دیا، اور پھر ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ اے مالک ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو، ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی، پس اے ہمارے

آقا جو قصور ہم سے ہوئے ان سے درگزر فرما جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیت لوگوں کے ساتھ کر، خداوند جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کر نیوالا نہیں ہے۔“ (۱۹۴:۳)

اس کا جواب اللہ تعالیٰ کی جانب سے آتا ہے، دعا قبول ہوتی ہے اور جو اعمال باعث قبولیت بنے ہیں وہ ہجرت، جہاد فی سبیل اللہ اور ایذاء فی سبیل اللہ ہیں، فرماتے ہیں:

☆ ”جواب میں، ان کے رب نے فرمایا، میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو، یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو، لہذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لیے لڑے اور مارے گئے ان سب کے قصور میں معاف کروں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزاء ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزاء اللہ کے پاس ہے۔“

اس میں غزوہ احد کے واقعات اور نتائج کی طرف اشارہ ہے..... اس کے بعد اس سورت میں اہل کتاب کا دوبارہ ذکر ہوتا ہے، جن کے بارے میں اس سورت کے پہلے حصے میں طویل بات ہو چکی ہے۔ اہل ایمان کو بتایا جاتا ہے کہ جس سچائی کے وہ حاملین ہیں، تمام اہل کتاب اس کے منکر نہیں ہیں، ان میں سے ایسے لوگ بہر حال ہیں جو ایمان لا چکے ہیں۔ اور سچائی کی شہادت دیتے ہیں۔ ”اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں، اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے قبل ان کی طرف بھیجی گئی تھی، اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں، اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سے قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔“ (۱۹۹:۳)

اور سب سے آخر میں مسلمانوں کو تلقین کی جاتی ہے کہ وہ راہ ایمان میں صبر پامردی، اللہ خونی کا مظاہرہ کریں اور کمر بستہ ہو جائیں۔ ”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلہ میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لئے کمر بستہ ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔“ (۲۰۰:۳) یہ ایک ایسا اختتامیہ ہے جو اس سورت کی فضا اور اس میں بیان کردہ مضامین اور واقعات کے ساتھ مناسب ہے۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

اس سورت کا مجمل تعارف اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک ہم ان تین خطوط کا قدرے ذکر نہ کریں جن پر اس سورت کے تمام مضامین چل رہے ہیں، یہ مضامین اس سورت میں منتشر بھی ہیں اور ایک جگہ بھی ہیں، مناسب ہے کہ ان کی وضاحت کردی جائے۔

پہلی لائن یہ ہے کہ اس سورت میں الدین اور الاسلام کی حقیقت اور ماہیت پر زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ بتایا گیا ہے کہ دین سے مراد صرف وہ عقائد نہیں جو اللہ تعالیٰ کے بارے میں رکھے جاتے ہیں، یعنی عقیدہ توحید، بایں مضمون اللہ ایک ہے، وحدہ لا شریک ہے، وہ جس طرح انسانوں کا الہ ہے بعینہ اسی طرح وہ اس پوری کائنات کا بھی الہ ہے۔ جس طرح کائنات اس کی مطیع ہے، انسان بھی مطیع ہیں، وہ اس کائنات کو بھی تھامے ہوئے اور اس انسانیت کو بھی ہر چیز اس سے قائم ہے۔ وہی ان کا محافظ ہے، اس لئے اللہ کو مجرد عقیدہ توحید یا مجرد بمعنی عقیدہ مقبول نہیں ہے، بلکہ وہ دین اللہ کے نزدیک مقبول ہے جو اسلام ہو۔ اور اس صورت حال میں اسلام کے معنی مکمل اطاعت اور مکمل انقیاد کے ہیں۔ باین صورت کہ انسان اپنی زندگی کے تمام معاملات میں اسی اللہ سے ہدایت لے۔ اپنے تمام فیصلے اس کی کتاب کے مطابق کرے، ان تمام رسولوں کی اطاعت کرے جن پر یہ کتابیں نازل ہوئیں۔ اپنی اصلیت کے اعتبار سے تمام کتابیں ایک ہی کتاب ہیں۔ تمام الہی ادیان بھی ایک دین ہیں یعنی اسلام، یعنی انسان کے دل و دماغ میں بھی اسلام اور اس کی عملی زندگی میں بھی اسلام، اور ہر دور میں مومن کا نقطہ اتحاد یہ ہوتا ہے

کہ وہ اپنے رسول کا مطیع فرمان ہوتا ہے، جب اسلام کا مفہوم یہ ہو کہ نظریاتی طور پر ایک الہ اور حی و قیوم کا عقیدہ رکھنا اور عملی زندگی میں پوری عملی زندگی میں اسلامی نظام کی اطاعت کرنا۔

یہ تمام سورت اس لائن پر جاری ہے اور تیس سے زیادہ مقامات پر اس نکتے کی وضاحت کی جاتی ہے کہ دین اسلام عقیدہ و عمل دونوں سے عبارت ہے، آیات کے بعض ٹکڑے یہ ہیں:

”اللہ وہ جس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے جو حی و قیوم ہے۔“ ”وہ گواہی دیتا ہے کہ نہیں ہے کوئی الہ مگر وہ یہی گواہی فرشتوں، اور سب اہل علم نے بھی دی ہے۔ وہ انصاف پر قائم ہے۔ اس زبردست حکیم کے سوا کوئی الہ نہیں۔“ ”اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔“ ”تو اگر یہ لوگ تیرے ساتھ جھگڑیں..... تو کہہ دیں..... میں اور میرے متبعین اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر چکے ہیں..... آپ اہل کتاب اور دوسرے امیوں میں سے یہ کہیں کیا تم اسلام میں داخل ہو گئے؟ اگر وہ اسلام لے آئیں، ہدایت پالیں گے۔“

”تمہیں معلوم ہے ان لوگوں کی حالت جنہیں کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا تھا۔ کہ جب انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلہ کرے، اس پر ان میں سے ایک فریق پلٹتے ہوئے منہ پھیر لیتا ہے۔“

..... ”کہو اللہ کی اطاعت کرو..... اور رسول کی اطاعت کرو، پس اگر وہ منہ پھیریں تو اللہ بھی کافروں کو محبوب نہیں رکھتا۔“ ”حواریوں نے کہا ہم اللہ کے مددگار ہیں، گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔“ اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے اس کتاب پر جو تو نے نازل کی، اور ہم نے رسول کی پیروی کی، پس لکھ دیجئے ہمیں بھی گواہوں میں سے۔“ ”کہہ دیجئے، اہل کتاب، آؤ اس کلمے پر متفق ہو جائیں جو ہمارے اور آپ کے درمیان برابر ہے۔ یہ اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں اور ہم آپس میں ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں، تو اگر وہ اس سے منہ پھیریں تو کہو: گواہ رہو کہ ہم تو مسلمان ہیں۔“ ”ابراہیم نہ یہودی تھا نہ نصرانی تھا، وہ تو سیدھا

مسلمان تھا وہ مشرکین میں سے نہ تھا..... ”کیا وہ اللہ کے نظام (دین) کے سوا کوئی اور دین کی تلاش میں ہیں؟ حالانکہ جو آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، چارہ ناچار اس کا مطیع فرمان ہے، سب نے اس کی طرف پلٹنا ہے۔“..... ”اگر کوئی اسلام کے سوا کوئی اور نظام (دین) تلاش کرے گا تو اس کی یہ سعی نامقبول ہوگی۔“..... غرض یہ اور تمام دوسری آیات میں یہ تفصیلاً بتایا گیا ہے کہ دین صرف اسلام ہے۔

وہ دوسری لائن جس پر پوری سورت چل رہی ہے وہ جماعت مسلمہ کے شب و روز ہیں۔ اس پوری سورت میں مسلمانوں کی تصویر کھینچی گئی ہے کہ یہ لوگ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کئے ہوئے ہیں۔ ان پر جو حکم بھی نازل ہوتا وہ بڑی دقت اور صفائی سے اس پر عمل کرتے ہیں۔ فوراً قبول کر لیتے ہیں اور فوراً ہی رو بہ عمل لاتے ہیں۔ اس کی تفصیلات تو ہم تشریح آیات کے وقت بتائیں گے، کچھ جھلکیاں یہاں بھی ملاحظہ ہوں۔

☆ جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ کہتے ہیں، ہم اس پر ایمان لائے، سب اللہ کی طرف سے ہے اور حقیقت یہ ہے کہ دانشمند لوگ ہی صحیح طرح نصیحت حاصل کرتے ہیں۔“..... ”وہ دعا کرتے ہیں، کہ اے پروردگار، جب تو نے ہمیں سیدھے راستے پر لگا چکا ہے، تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کیجیو، ہمیں اپنے خزانے فیض سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے۔ پروردگار! تو سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے، جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، تو ہرگز اپنے وعدے سے ٹٹنے والا نہیں۔“..... ”وہ لوگ جو کہتے ہیں: اے ہمارے رب، ہم ایمان لائے ہیں، ہمارے گناہوں کو بخش دے، اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا، صبر کرنے والے، سچے، یکسو ہونے والے، خرچ کرنے والے اور راتوں کو استغفار کرنے والے“..... ”حواریوں نے کہا: ہم ہیں اللہ کے مددگار، ہم اللہ پر ایمان لائے، گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں..... اے ہمارے رب جو تو نے کتاب نازل کی، ہم اس پر ایمان لائے، ہم نے رسول کی پیروی کی، تو ہمیں لکھ لیجئے گواہوں میں۔“..... ”تم خیر امت ہو جسے لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے۔ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو، اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔“..... ”اہل کتاب میں سے

ایک گروہ ایسا ہے جو راتوں کو کھڑا رہتا ہے وہ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور یوم آخرت پر ایمان لاتے ہیں، بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں، نیکوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھتے ہیں، ایسے ہی لوگ صالح ہوتے ہیں۔“

..... ”کئی ایسے نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ اللہ پرستوں نے مل کر قتال کیا اور اللہ کے رستے میں انہیں جو تکلیف پہنچی، اس کی وجہ سے انہوں نے نہ سستی کی اور نہ کمزوری دکھائی۔ نہ سرنگوں ہوئے اور اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی اے ہمارے رب، ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہو گیا اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔“..... وہ لوگ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا، ان میں جو اشخاص نیکو کار ہیں اور پرہیزگار ہیں ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ اور جن سے لوگوں نے کہا کہ ”تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو۔“ تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کارساز ہے۔“..... ”وہ لوگ جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں، اور آسمان وزمین کی ساخت پر غور و فکر کرتے ہیں، پروردگار، یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے، پس اے رب، ہمیں دوزخ کی آگ سے بچا۔“ تو نے جسے آگ میں ڈالا اور حقیقت بڑی ذلت اور رسوائی میں ڈال دیا۔ اور پھر ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہو گا، مالک، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو، ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی، پس اے ہمارے آقا، جو قصور ہم سے ہوئے ان سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر، خداوند جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنیوالا نہیں ہے۔“..... ”اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں، اسی کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی

طرف بھیجی گئی۔ اللہ کے آگے جھکتے ہیں اور اللہ کی آیات کو تھوڑی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔“..... یہ اور ایسی ہی دوسری آیات۔

تیسری لائن اس سورت میں یہ دی گئی ہے کہ اس پوری سورت میں مسلسل اہل ایمان کو یہ تلقین کی گئی ہے کہ وہ غیر اہل ایمان کے ساتھ دوستی نہ رکھیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اس ممانعت کے ساتھ یہ بھی سمجھا گیا کہ اہل کفر اس قابل ہی نہیں کہ وہ تمہارے دوست ہوں۔ نیز فیصلہ کن انداز میں یہ سمجھایا گیا ہے، قرآن کے نزدیک اس شخص کا ایمان کوئی ایمان نہیں ہے جو ایسے کفار کے ساتھ دوستی رکھتا ہے جو اپنے نظام میں کتاب اللہ پر فیصلہ نہیں کرتے، اور اپنی زندگی کو اسلامی نظام کے مطابق نہیں گزارتے، اس سے پہلے بھی ہم اسلام کی اس پالیسی کی طرف اشارہ کر چکے ہیں لیکن اس کی وضاحت کی اشد ضرورت ہے، اور اس سورت میں اس کو جس قدر کھولا گیا ہے، اس کا یہاں ذکر ضروری ہے، کچھ جھلکیاں ملاحظہ ہوں۔

”مومنین، اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ اللہ کے نزدیک کچھ شئی نہیں ہے۔ الا یہ کہ تم اس سے ڈر کی حالت میں ہو، اللہ تمہیں خود اپنے آپ سے خوف دلاتا ہے اور تمہیں اس طرف پلٹ کر جانا ہے، کہہ دو، تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے۔ اسے تم چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اسے جانتا ہے، بلکہ وہ ان چیزوں کو جانتا ہے جو آسمانوں اور زمین میں ہیں۔ اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔“

..... ”اہل کتاب کا ایک گروہ دل سے یہ چاہتا ہے کہ وہ تمہیں گمراہ کر دے، لیکن وہ خود گمراہ ہو رہے ہیں لیکن سمجھتے نہیں۔“..... ”اے ایمان لانے والو، اگر تم نے ان لوگوں سے ایک فریق کے پیچھے چلو گے جنہیں کتاب دی گئی ہے، تو وہ تمہیں تمہارے ایمان لانے کے بعد پھیر کر کافر بنادیں، اور اب تم کس طرح کفر کر سکتے ہو حالانکہ تم پر اللہ کی آیات پڑھی جا رہی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تم میں بذات خود موجود ہیں اور جس شخص نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا تو اس نے سیدھا راستہ پالیا، اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ اس طرح ڈرو جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں

موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو، اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑو اور تفرقہ نہ کرو۔“..... ”وہ تمہیں کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے، الا یہ کہ کچھ اذیت دیدیں۔ اگر وہ تم سے لڑیں، تو شکست کھائیں، پھر ان کو کسی طرف سے مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں بھی ہوں گے ذلت ان پر مسلط ہوگی۔“..... ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ، وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔ تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے، ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے۔ اور جو کچھ ان کے سینوں میں چھپا ہوا ہے وہ اس سے شدید تر ہے۔“..... ”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم ان لوگوں کے اشارے پر چلو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو تم کو الٹا پھیر لے جائیں اور تم نامراد ہو جاؤ گے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے، عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھادیں گے۔ اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سزا نازل نہیں کی۔ ان کا آخری ٹھکانہ جہنم ہے۔“..... ”اے نبی دنیا کے ملکوں میں اللہ کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں نہ ڈال دے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے، پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے۔ جو بدترین جائے قرار ہے۔“..... ”یہ اور بہت سے دوسری آیات اسی لائن پر ہیں۔

یہ تینوں خطوط باہم متوازن اور متوازی اس پوری سورت میں ایک ساتھ چلتے ہیں۔ یہ مل کر اس سورت کے مقاصد کو مکمل کرتے ہیں۔ یہ حقیقت توحید، توحید کے تقاضے، انسانی زندگی میں اس کے اثرات، انسانی شعور اور سوچ پر اس کے اثرات اور اس عقیدے کی روشنی میں اسلامی تصور حیات کی تشکیل اور پھر اس کی روشنی میں دشمنان اسلام کے ساتھ اپنے موقف کے تعین کے سلسلے میں اہم ہدایات دیتے ہیں۔

اس سورت میں جو آیات آئی ہیں ان کے درمیان موقع و محل کے لحاظ سے ایک زندہ اور گہرا ربط ہے۔ یہ سورت ایک عملی نظریاتی اور میدان جنگ کے موقع پر نازل ہوئی، نظریاتی جنگ اس وقت افکار

واذہان کے میدان میں لڑی جارہی تھی، جبکہ جسمانی جنگ معرکہ کارزار میں لڑی جارہی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں ہدایات و راہنمائی کا ایک زندہ ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ اس میں ہر جگہ ملے جلے اثرات اور اشارات پائے جاتے ہیں۔ مناسب ہے کہ اب ہم نصوص و آیات کا تفصیلی جائزہ لیں، اس سیاق و سباق میں ایک زندہ کلام اپنی طرف..... کھینچتا اور بہت ہی خوبصورت ہے۔



درس ۲۳ ایک نظر میں

اگر ہم ان روایات کو لے لیں، جن میں یہ کہا گیا ہے کہ اس سورت کی ابتدائی ۸۰ سے کچھ اوپر آیات اس موقع پر نازل ہوئیں جب وفد نجران رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مناظرے کے لئے آیا تھا، یہ وفد عیسائیوں پر مشتمل تھا، اور یہ لوگ رسول ﷺ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتے تھے۔ تو پھر اس سبق کی تمام آیات گویا اس موقع پر نازل شدہ تصور ہوں گی، لیکن یہ روایات خود اس حقیقت کو بیان کر دیتی ہیں کہ یہ وفد عام الوفود ۹ھ میں آیا تھا، اس وقت غلبہ اسلام کا شہرہ جزیرۃ العرب اور اس کے ارد گرد علاقوں میں پھیل گیا تھا اور جزیرۃ العرب کے مختلف علاقوں سے وفود رسول اکرم ﷺ کے ساتھ ملاقات کے لئے دھڑا دھڑا حاضر ہو رہے تھے، ان وفود میں سے بعض تو معلومات حاصل کرنے آئے تھے اور بعض ایسے تھے جو جدید حالات میں رسول اکرم ﷺ کے ساتھ معاہدات کی پیشکش بھی کرتے تھے۔

جیسا کہ میں اس سے پہلے کہہ چکا ہوں، کہ ان آیات میں جن موضوعات پر بحث کی گئی ہے اور جس انداز سے بحث کی گئی ہے۔ یہ دونوں اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ آیات ہجرت کے بعد قریبی زمانہ میں نازل ہوئیں۔ اس سورت میں زیادہ تر اہل کتاب کے ساتھ نظریاتی مباحثہ ہے۔ ان کے غلط عقائد کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر جو شبہات پیدا ہوتے تھے۔ ان کے جوابات ہیں، یا ان اعتراضات کے جوابات ہیں جو وہ رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی صحت کے بارے میں کیا کرتے تھے، یا وہ ہدایات ہیں جو اہل کتاب کے حوالے سے حقیقت توحید اور شرک کے بارے میں نازل ہوئیں، یا وہ خبر داری ہے جو اللہ نے یہاں اہل کتاب کی سازشوں کے مقابلے میں دی اور کہا کہ تم ان کے دھوکے میں نہ آؤ، اپنے موقف پر ثابت قدم رہو، ان موضوعات و مباحث کی وجہ سے میرا میلان اس طرف ہے کہ یہ آیات وفد نجران کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ وفد ۹ھ میں آیا تھا، اس لئے کہ ان آیات کے نزول کے لئے ۹ھ سے پہلے بھی مدینہ طیبہ میں ایسے حالات تھے کہ ان کا نزول ان میں ہوا یا یہ پوری سورت ان میں نازل ہو گئی ہو۔ اس لئے ان آیات کی تشریح کے وقت ہم واقعہ نجران ہی کو پیش نظر نہ رکھیں

گے بلکہ اس سورت کا خطاب عام اہل کتاب کو سمجھا جائے گا۔ کیونکہ تاریخی شواہد کے مطابق یہ واقعہ بہت متاخر ہے۔¹

جیسا کہ ہم نے اوپر تمہید میں کہا، ان آیات میں، اس اصلی کشمکش کا ذکر ہے، جو اس وقت تحریک اسلامی اور اس کے عقائد و نظریات اور اہل کتاب اور مشرکین اور ان کے عقائد و نظریات کے درمیان برپا تھی، یہ جنگ ظہور اسلام کے ساتھ ہی شروع تھی، اس میں کوئی وقفہ نہ تھا، خصوصاً اس وقت اس کشمکش میں بڑی تیزی آگئی تھی جب تحریک اسلامی کا ہیڈ کوارٹر مدینہ منقل ہوا اور وہاں ایک اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔ اس نظریاتی جنگ میں مشرکین اور یہودی شانہ بشانہ لڑ رہے تھے۔ اور ان کی اس مشترکہ مہم کو قرآن کریم تفصیل سے ریکارڈ کرتا ہے۔

یہ بات بعید از امکان نہیں ہے کہ جزیرۃ العرب کے اطراف و اکناف میں جو عیسائی آباد تھے، ان میں مذہبی پیشوا بھی اس نظریاتی جنگ میں کسی نہ کسی صورت میں شریک ہوں، نیز یہ بات بھی بعید از قیاس نہیں ہے کہ قرآن مجید نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں جو صحیح عقائد و نظریات پیش کئے تھے ان کا علم ان عیسائیوں کو ہو گیا ہو، اور وہ اس موضوع پر رسول اکرم ﷺ کے ساتھ بحث و مباحثہ کے لئے آئے ہوں، کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں عیسائی اپنی اصل راہ سے

¹ استاد محمد عزہ دروزہ اپنی کتاب سیرۃ الرسول میں لکھتے ہیں کہ بعض روایات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وفد نجران ہجرت نبوی کے زمانے میں سے پہلی چوتھائی میں آیا تھا۔ معلوم نہیں انہوں نے کن روایات پر یہ موقف اختیار کیا ہے۔ کیونکہ اکثر روایات وفد نجران کی آمد کی تاریخ ۹ھ ہی متعین کرتی ہیں۔ یعنی دوسرے وفد کے ساتھ، ہاں ابن کثیر نے اس احتمال کا ذکر کیا ہے کہ شاید یہ وفد صلح حدیبیہ سے پہلے آیا ہو، لیکن ابن کثیر نے بھی روایات سلف میں سے کسی روایت کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بہر حال اگر ان آیات کو وفد نجران سے متعلق گردانا جائے تو پھر یہ وفد پہلے آیا ہوگا، لیکن چونکہ اکثر روایات میں یہی آیا ہے کہ یہ وفد ۹ھ کو آیا تھا، اس لئے میں یہی موقف اختیار کرتا ہوں کہ ان آیات کا وفد نجران کے ساتھ تعلق نہیں ہے

ہٹ گئے تھے۔ اور اس موضوع پر قرآن کریم تنقید کر چکا تھا، اور عقیدہ توحید کے حوالے سے عیسائیوں پر رد آگیا تھا۔

اس سبق میں ابتداء ہی اسلام کے عقیدہ توحید کو اہل شرک کے انحرافات اور شبہات سے پاک و صاف کر کے بیان کیا گیا ہے، اور یہ قرار دیا گیا کہ قرآن کریم حق و باطل کے درمیان فرقان ہے، اور جو شخص بھی آیات الہی کا انکار کرے گا وہ کافر تصور ہو گا۔ چاہے وہ اہل کتاب میں سے، ان آیات میں قرآن کے حوالے سے بتایا گیا مسلمانوں اور اہل ایمان کا رویہ ان آیات کے ساتھ کیا ہے، اپنے رب کے ساتھ ان کا کیا رویہ ہونا چاہئے، واضح طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ ایمان کی کیا علامات ہوتی ہیں، وہ اس قدر واضح ہوتی ہیں کہ اہل ایمان کی پہچان میں کوئی غلطی نہیں ہوتی۔ اور کفر کی بھی کچھ علامات ہوتی ہیں اور اہل کفر کی پہچان میں بھی غلطی نہیں ہو سکتی۔ فرماتے ہیں:

”اللہ وہ زندہ جاوید ہستی جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، حقیقت میں اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اس نے تم پر کتاب نازل کی جو حق لے کر آئی ہے، اور ان کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے جو پہلے آئی ہوئی تھیں۔ اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے تورات و انجیل نازل کر چکا ہے، اور اس نے وہ کسوٹی اتاری ہے۔ اب جو لوگ اللہ کے فرامین قبول کرنے سے انکار کریں۔ ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی۔“ اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور برائی کا بدلہ دینے والا ہے، زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں، تمہاری صورتیں، جیسی چاہتا ہے بناتا ہے، اس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں۔ وہی اللہ ہے، جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں۔ ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیادیں ہیں۔ اور دوسری متشابہات، جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں، حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ ”ہمارا ان پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے

رب کی طرف سے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔“ (۸:۳۱ تا ۸۱)

”اللہ نے خود شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے، اور فرشتوں اور سب اہل علم نے بھی شہادت دی ہے، وہ انصاف پر قائم ہے، اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی اللہ نہیں، اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے، اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد، آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لئے ایسا کیا، اور جو کوئی اللہ کے احکام و ہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے، اللہ کو اس سے حساب لیتے کچھ دیر نہیں لگتی۔

اور اس سبق میں ایک تہدید تو ایسی آئی ہے جس میں روئے سخن یہود کی طرف ہے، مثلاً فرمایا ”جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، جو نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں، اور ان لوگوں کو بھی قتل کرتے ہیں جو عدل و انصاف کا حکم دیتے ہیں تو انہیں درناک عذاب کی خوشخبری دیجئے۔“ قتل انبیاء کا ذکر آتے ہی ذہن یہودیوں کی طرف چلا جاتا ہے، اس لئے کہ یہ کارنامہ وہی سرانجام دیتے رہے ہیں۔ ایک دوسری آیت میں آیا ہے۔ ”اہل ایمان اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو دوست نہ بنائیں۔“ اس آیت میں اگرچہ لفظ کافر واقع ہے تاہم اس سے مراد غالباً یہودی ہیں، اگرچہ اس میں مشرکین بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ اس لئے تحریک اسلامی کے اس دور تک بعض مسلمان، اپنے کافر مشرکین اقارب اور یہودیوں میں سے اپنے دوستوں کے ساتھ تعلقات قائم کئے ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں انہیں اب ایسے تعلقات جاری رکھنے سے منع کر دیا گیا اور اس قدر سخت الفاظ میں ان تعلقات کے انجام بد سے ڈرایا گیا، چاہے یہ دوست یہودی ہوں یا مشرکین ہوں۔ کیونکہ سب کے الکافرین کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اسی طرح ایک دوسری آیت ”ان لوگوں کو کہہ دو جنہوں نے کفر اختیار کیا، تم عنقریب مغلوب ہو گے اور تمہیں جہنم کی طرف لے جایا جائے گا، جو بہت ہی برا ٹھکانہ ہے، تمہارے لیے ان دو گروہوں میں سامان عبرت ہے جو ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے، ایک اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کافر تھا

’دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دوچند تھا۔“ اس آیت میں غزوہ بدر کے واقعات کی طرف اشارہ ہے، لیکن خطاب یہودیوں سے ہے، اس سلسلے میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک روایت منقول ہے، فرماتے ہیں کہ جب رسول اکرم ﷺ نے بدر کے دن قریش کو شکست دی اور آپ ﷺ مدینہ طیبہ لوٹے تو یہودیوں کو جمع کیا تو انہیں یہ نصیحت کی کہ اس سے قبل کے تمہارا وہ حال ہو جائے جو قریش کا ہو، تم مسلمان ہو جاؤ۔ انہوں نے کہا: محمد! بے شک تم نے قریش کے چند آدمیوں کو قتل کر دیا ہے مگر اس سے کہیں غرور میں مبتلا نہ ہو جاؤ کیونکہ وہ ناتجربہ کار تھے اور جنگ کے بارے میں زیادہ جانتے نہ تھے۔ اگر تم نے ہمارے ساتھ جنگ کی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم کچھ لوگ ہیں شائد آپ کو ہم جیسے لوگوں کبھی واسطہ نہ پڑے۔ ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت فرمائی کہ ”ان لوگوں سے کہہ دو کہ جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، بہت جلدی تم مغلوب ہو جاؤ گے اور پھر جہنم کی طرف تمہیں اٹھایا جائے گا“..... ان الفاظ تک ”ایک گروہ اللہ کے راستے میں لڑتا ہے۔“ یعنی بدر میں اور ”دوسرا کافر ہے۔“ (ابوداؤد)

اس طرح اس سبق کی آیت ”اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں، کیا تم نے بھی اس کی اطاعت اور بندگی قبول کی؟“ اگر کی، تو راہ راست پاگئے اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچانا ہے۔ آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔“ (۶۰:۳) میں رسول ﷺ کو خطاب ہے، اور یہ خطاب اگرچہ اہل کتاب کے ساتھ نظریاتی مباحثہ کے اس سبق کے آغاز میں ہے، تاہم یہ عام ہے اور مخالف خواہ اہل کتاب ہوں یا غیر اہل کتاب ہوں، اس آیت کا آخری حصہ ”اگر انہوں نے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔“ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت رسول ﷺ پر اہل کتاب کے خلاف جہاد فرض نہ ہوا تھا۔ اور آپ ان سے جزیہ بھی وصول نہ کرتے تھے۔ جس سے ہمارا یہ نظریہ درست معلوم ہوتا ہے کہ اس سبق میں جو زیر بحث آیات ہیں وہ ہجرت کے بعد ابتدائی دور میں نازل ہوئیں۔

غرض ان تمام آیات پر اچھی طرح غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا تعلق کسی ایک واقعہ مثلاً قدم نجران سے نہیں ہے، ان میں دی گئی ہدایات عام ہیں اور ان کا انطباق تمام مخالفین اسلام پر ہوتا ہے، ہاں جن واقعات کی نسبت سے ان آیات کا نزول ہوا ہے۔ ایسے واقعات میں ایک واقعہ وفد نجران کا بھی ہو سکتا ہے، کیونکہ ان ابتدائی دنوں میں ایسے مواقع بار بار وقوع پذیر ہوا کرتے تھے۔ کیونکہ اس دور میں جزیرۃ العرب میں مسلمانوں اور ان کے مخالفین کے درمیان ایک ہمہ گیر نظریاتی جنگ جاری تھی۔ خصوصاً یہود مدینہ کے ساتھ۔

اس پہلے سبق میں اسلامی تصور حیات کے بارے میں نہایت ہی اہم بنیادی تصورات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس نظریہ حیات کی نوعیت اور اس کے مزاج کے بارے میں بھی اہم وضاحتیں دی گئی ہیں۔ نیز یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اس نظریہ حیات کے عملی اثرات، انسانی زندگی پر کیا مرتب ہوتے ہیں، وہ آثار جو لازمہ ایمان ہیں، مثلاً اللہ تعالیٰ کو وحدہ لا شریک سمجھنا، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ بتا گیا ہے کہ ایک موحّد اللہ کا مسلم بھی ہو جائے، یہی دین ہے اور اس کے سوا کوئی دین نہیں ہے۔ اور مسلم ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دے اور اس کی اطاعت کرے۔ اس کے اوامر کو مانے، اس کی شریعت کو مانے، اس کے رسول اور رسول کے طریقہ زندگی کا اتباع کرے۔ پس اس نظریہ حیات کی رو سے اگر کوئی سر تسلیم خم نہیں کرتا، کوئی اطاعت نہیں کرتا، کوئی رسول کا اتباع نہیں کرتا تو وہ مسلم نہیں ہے۔ لہذا وہ ایسا دیندار نہیں ہے جس کے دین کو اللہ نے پسند کیا ہو۔ اور اللہ نے صرف اسلام کو پسند کیا ہے۔ اور اسلام جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا مکمل طور پر سر تسلیم خم کر دینے، اطاعت کرنے اور اتباع کرنے کا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بڑے تعجب کے ساتھ اہل کتاب پر یہ تبصرہ کرتا ہے جب انہیں اس طرف بلایا جاتا ہے کہ آؤ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کریں یَتَوَلَّی قَرِیْبُ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُونَ وہ منہ پھیر کر چلے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ قرآن کی اصلاح میں یہ اعراض کفر کے ہم معنی ہے، اور اس اعراض سے ان کے دعوائے ایمان کی قلعی کھل جاتی ہے اور اس سے ایمان کی نفی ہوتی ہے۔ اس حقیقت کی مزید وضاحت اس سورت کے حصہ دوم میں کی گئی ہے..... اس قدر اجمالی تعارف کے بعد اب مناسب ہے کہ اس درس کی آیات کی مفصل تشریح و تفسیر پیش کی جائے۔

درس ۲۳ تشریح آیات (آیات ۳۲ تا ۳۴)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الم (۱)

یہ حروف مقطعات ہیں، ان کی کوئی توضیح و تشریح تو ممکن نہیں ہے، البتہ ترجیحی بنیاد پر، میں اس کا وہی مفہوم بیان کرتا ہوں، جو میں نے سورۃ بقرہ کے ابتداء میں بیان کیا تھا، یعنی یہ اس چیلنج کی طرف اشارہ ہے کہ یہ کتاب انہی حروف سے بنی ہے، جو مخالفین اسلام کے دسترس میں ہیں، لیکن اس کے باوجود یہ کتاب معجزہ ہے، اور مخالفین اس جیسی کتاب لانے میں ناکام رہے ہیں۔

ان حروف کی جس تفسیر کو ہم نے ترجیح دی ہے، متعدد سورتوں میں اس چیلنج کی تشریح یا اشارہ خود اس سورت میں بھی پایا جاتا ہے جس کی ابتداء میں یہ حروف وارد ہوئے ہیں۔ مثلاً سورۃ بقرہ میں یہ اشارہ بطور صریح چیلنج موجود ہے

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ
وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۲۳)

”اور اگر تمہیں اس امر میں شک ہے کہ یہ کتاب جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے، یہ ہماری ہے یا نہیں تو اس کے مانند ایک ہی سورت بنالاء، اپنے سارے ہم نواؤں کو بلاؤ، ایک اللہ کو چھوڑ کر باقی جس جس کی چاہو، مدد لے لو، اگر تم سچے ہو تو یہ کام کر دکھاؤ۔“ (۲۳:۲)

زیر بحث سورۃ آل عمران میں، تحدی اور چیلنج کا اشارہ ایک دوسری نوعیت سے کیا گیا ہے، یہ کہ یہ کتاب اس اللہ کی جانب سے نازل کی گئی ہے۔ جس کے سوا کوئی دوسرا الہ نہیں ہے۔ اور یہ انہی حروف

و کلمات سے مولف ہے جن حروف و کلمات میں تمام دوسری کتب سماوی نازل ہوئی تھیں۔ اور جن پر خود اہل کتاب ایمان لایچکے ہیں، جن سے اس سورت کا زیادہ تر خطاب متعلق ہے۔ اس لئے یہ بات کوئی قابل تعجب یا قابل انکار نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ان ہی حروف سے مولف ایک نئی کتاب اپنے رسول پر نازل کرے۔

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ (۲) نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ (۳) مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۴) إِنَّ اللَّهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ (۵) هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۶) هُوَ الَّذِي أَنزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ فَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ (۷) رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ (۸) رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ (۹)

”اللہ وہ زندہ جاوید ہستی جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے، حقیقت میں اس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔ اس نے تم پر کتاب نازل کی، جو حق لے کر آئی ہے اور ان تمام کتابوں کی تصدیق کر رہی ہے

جو پہلے سے آئی ہوئی تھیں، اس سے پہلے وہ انسانوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل نازل کر چکا ہے، اور اس نے یہ فرقان اتارا ہے، اب جو لوگ اللہ کے فرامین کو قبول کرنے سے انکار کریں ان کو یقیناً سخت سزا ملے گی، اللہ بے پناہ طاقت کا مالک ہے اور برائی کا بدلہ دینے والا ہے، زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں، وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں، جیسی چاہتا ہے بناتا ہے، اس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور الہ نہیں ہے۔ وہی اللہ ہے، جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں: ایک محکمات، جو کتاب کی اصل بنیادیں ہیں اور دوسری متشابہات، جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ہمارا ان پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانش مند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اللہ سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ پروردگار! جب تو ہمیں سیدھے رستے پر لا چکا ہے تو پھر ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجیو، ہمیں اپنے خزانہ غیب سے رحمت عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے۔ پروردگار! تو یقیناً سب لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے، جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، تو ہرگز اپنے وعدے سے ٹلنے والا نہیں ہے۔“

یوں اس سورت کا آغاز ان منکرین اسلام اہل کتاب پر تنقید سے ہوتا ہے، جو رسول ﷺ کی رسالت کا انکار کر رہے تھے، حالانکہ وہ اپنے دین کی بنیاد پر اور اہل کتاب ہونے کے ناطے نبوت، رسالت، کتب سماوی اور وحی الہی کے تصور سے واقف تھے، اس لئے ان کا فرض تھا کہ سب سے پہلے اسلام لاتے اور رسول ﷺ کی تصدیق کرتے بشرطیکہ ان کی تصدیق صرف دلیل اور حجت کے اطمینان پر موقوف ہوتی۔

اس فیصلہ کن حملے میں، ان تمام شبہات کی بیخ کنی کر دی جاتی، جو اہل کتاب کے دلوں میں پائے جاتے تھے، یا جنہیں وہ جان بوجھ کر مومنین کے دلوں میں ڈالنا چاہتے تھے، اس لئے ان کا پروپیگنڈا

کرتے تھے۔ اس تنقید میں ان راستوں اور ان دروازوں کی نشان دہی کر دی گئی ہے جن کے ذریعہ یہ شبہات داخل ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں انسدادی طور پر بتا دیا گیا کہ اللہ کی آیات سے متعلق سچے مومنوں کا موقف کیا ہے اور ان کے بارے میں مخالفین اور منکرین کی سوچ کیا ہے۔ سورت کے اس آغاز میں سچے اہل ایمان کا تعلق باللہ، اللہ کے دربار میں ان کی عاجزی اور ان کی التجاؤں کی ایک خوبصورت تصویر کشی کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ وہ اللہ کی صفات کے بارے میں یہ تصور رکھتے ہیں۔
 اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ”اللہ وہ زندہ جاوید ہستی ہے جو نظام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔“

یہ خالص اور صاف ستھری توحید دراصل ایک مسلمان کے عقیدہ اور تمام غیر مسلموں کے عقائد کے درمیان ایک خط امتیاز کھینچ دیتی، جن میں ملحدین اور مشرکین بھی شامل ہیں اور منکرین اہل کتاب بھی شامل ہیں چاہے یہودی ہوں یا نصاریٰ ہوں، اپنے تصورات اور عقائد کے اختلاف کے مطابق، غرض توحید ایک مسلم اور تمام غیر مسلموں کے عقائد کے درمیان ایک خط امتیاز ہے، اس لئے کہ یہاں نظام زندگی کا تعین تصور حیات اور عقائد پر ہوتا ہے۔ یہ عقیدہ ہی جو نظام زندگی کا تعین کرتا ہے۔

اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے، خدائی میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے، وہ زندہ ہے، اور حیات اس کی ذاتی صفت ہے۔ وہ ہر قید سے آزاد ہے، زندہ مطلق ہے، وہ القيوم ہے، اس کائنات کو اسی نے تھما ہوا ہے، زندگی اس کی وجہ سے قائم ہے، ہر موجود اس کی وجہ سے موجود ہے۔ پھر وہ سب کو قائم رکھے ہوئے ہے۔ اس لئے اس کے بغیر کائنات میں نہ کوئی ہستی موجود رہ سکتی ہے اور نہ موجود ہو سکتی ہے۔

یہ ہے خط امتیاز ایک تصور حیات اور عقیدہ میں اور یہی فرق ہے ایک مسلم کے طرزِ عمل اور نظام زندگی میں بمقابلہ ایک غیر مسلم، اس سے اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں اسلامی تصور توحید اور اسلامی عقائد اور ان کے عقائد باطلہ اور عقائد جاہلیت کے اندھیروں کے درمیان بھی امتیاز ہو جاتا ہے

۔ جاہلیت کے تصورات میں مشرکین عرب کے اس وقت کے تصورات بھی شامل ہیں اور یہود و نصاریٰ کے وہ منحرف شدہ تصورات بھی جن کے وہ قائل تھے۔

قرآن کریم نے یہودیوں کے بارے میں ’یہ بات نقل کی ہے کہ وہ حضرت عزیر علیہ السلام کو ابن اللہ کا مقام دیتے تھے‘ قرآن کریم نے یہودیوں کے جس باطل عقیدے کا ذکر کیا ہے آج یہودی جس کتاب مقدس کے قائل ہیں اس میں موجود ہے، مثلاً سفر متکونین اصحاب ششم میں ذکر ہے۔

”جب روئے زمین پر آدمی بہت بڑھنے لگے اور ان کی بیٹیاں پیدا ہوئیں، تو خدا کے ”بیٹوں“ نے آدمی کی بیٹیوں کو دیکھا کہ وہ خوبصورت ہیں اور جن کو انہوں نے جنا ان سے بیاہ کر لیا۔ تب خداوند نے کہا کہ میری روح انسان کے ساتھ ہمیشہ مزاحمت نہ کرتی رہے گی کیونکہ وہ بھی تو بشر ہے اس کی عمر ایک سو بیس برس ہوگی۔ ان دنوں میں زمین پر جبار تھے اور بعد میں جب خداوند کے بیٹے انسانوں کی بیٹیوں کے پاس گئے تو ان کے لئے ان سے اولاد ہوئی۔ یہی قدیم زمانے کے سورما ہیں جو بڑے نامور ہوئے۔“

مسیحی تصورات میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، قرآن کریم نے ان کا قول نقل کیا ہے کہ ”اللہ تینوں میں سے ایک ہے“ اِنَّ اللّٰهَ ثَلَاثٌ شَكَّاهُ..... اور ان کا یہ قول اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ..... ”کہ اللہ مسیح بن مریم ہیں“ اور یہ کہ انہوں نے حضرت مسیح اور ان کی والدہ کو اللہ کے سوا والہ بنالیا تھا۔ اور انہوں نے اپنے احبار اور رہبان کو بھی اللہ کے علاوہ رب بنالیا تھا، مشہور مصنف آرنلڈ اپنی کتاب تبلیغ اسلام میں لکھتے ہیں:

”ظہور اسلام سے تقریباً ایک سو سال پہلے قیصر یوستینیان روسی سلطنت میں اتحاد پیدا کرنے میں بظاہر کامیاب رہا تھا، مگر اس کی وفات کے بعد سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، کیونکہ دارالسلطنت اور صوبجات کے درمیان ایک مشترکہ قومیت کا جذبہ بالکل باقی نہیں رہا تھا۔ ہر قلعے کو شش کی تھی کہ شام کے ملک کو مرکزی حکومت کے ساتھ دوبارہ وابستہ کرے اور اسے اس میں کسی قدر کامیابی بھی ہوئی تھی، مگر بد قسمتی سے اس نے مصالحت کے لئے جو طریقے اختیار کئے، ان سے اختلاف رفع ہونے

کی بجائے اور شدید ہو گیا، لوگوں کے دلوں میں مذہبی تعصبات نے قومی جذبے کی جگہ لے رکھی تھی لہذا قیصر نے کوشش کی کہ دین مسیحی کی تفسیر و تشریح ایسے طریق پر کرے جس سے مخالف فرقوں کے باہمی مناقشات مٹ جائیں اور جو لوگ دین سے منحرف ہو چکے ہیں ان کو آرتھوڈوکس، کلیسا اور مرکزی حکومت کے ساتھ متحد کر دیں۔ خلقیہ و نہ کے مقام پر مسیحی علماء کی جو مجلس ۴۵۱ء میں بیٹھی تھی اس نے اس عقیدے کا اعلان کیا تھا کہ ”حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دو اقنوم تسلیم کرنے چاہئیں، اس طور پر کہ ان میں کوئی اختلاط یا تبدیلی یا تقسیم یا علیحدگی نہیں ہے۔ ان کی فطرتوں کا جو اختلاف ہے جو ان کے اجتماع سے باطل نہیں ہو جاتا بلکہ ہر اقنوم کے خواص برقرار ہیں اور ایک ذات اور ایک وجود میں موجود ہیں۔ مگر اس طرح نہیں کہ یہ خواص دو ہستیوں میں منقسم یا الگ الگ ہوں بلکہ وہی ایک بیٹا ہے، اکلوتا، کلمۃ اللہ مگر مونوفرائٹ (Monophysites) فرقے نے اس عقیدے کو رد کر دیا کیونکہ وہ لوگ اس بات کے قائل تھے کہ ”مسیح کی ذات میں صرف ایک اقنوم ہے، یہ ذات مرکب ہے جس میں تمام ربانی اور انسانی صفات شامل ہیں۔ مگر وہ وجود جس میں یہ صفات ہیں، اس میں دوئی نہیں ہے بلکہ وہ ایک مرکب وحدت ہے۔“ اس فرقے کے لوگ خاص طور پر شام، مصر اور رومی سلطنت کے باہر ملکوں میں آباد تھے۔ چنانچہ ان دونوں فرقوں کے درمیان اس مسئلے پر دو صدیوں تک گرما گرم مباحثہ جاری رہا، یہاں تک کہ ہر قل نے آکر فریقین کے درمیان مونوتھیلیزم (Monothelism) کے عقیدے کے ذریعے سے مصالحت پیدا کرنی چاہی۔ اس عقیدے کا مفہوم یہ تھا کہ اقانیم کی دوئی کو تسلیم کرتے ہوئے مسیح کی واقعی زندگی میں ذات کی وحدت کو قائم رکھا جائے، اس لئے کہ ایک واحد ذات میں حرکت و عمل کے دو سلسلے قابل قبول نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ مسیح، جو ابن اللہ ہیں، ایک ہی ذریعے اور وسیلے سے انسانی اور ربانی دونوں قسم کے نتائج پیدا کرتے ہیں، یعنی کلمہ مجسم میں ایک ہی مشیت کار فرما ہے۔“

”مگر ہر قل کا بھی وہی انجام ہوا جو بہت سے صلح کرانے والوں کا ہوا کرتا ہے، کیونکہ نہ صرف مناظرے کی آگ اور بھڑک اٹھی بلکہ لوگوں نے قیصر پر بے دینی کا الزام لگایا اور دونوں فرقوں کو مورد عتاب بننا پڑا۔“

ایک دوسرے مسٹر کینن ٹیلر لکھتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے وقت مشرقی عیسائیوں کی حالت یہ تھی کہ یہ لوگ درحقیقت مشرکین تھے، وہ شہداء کے ایک طبقے کی پوجا کرتے تھے۔ اسی طرح عیسائی پیروں اور فرشتوں کی عبادت کرتے تھے، اور ان کا کم سے کم جو شرکیہ عقیدہ تھا وہ یہ ہے کہ بقول ان کے وہ ان الہوں کی بندگی محض اس لئے کرتے ہیں کہ کی بندگی کی وجہ سے انہیں قرب الہی حاصل ہوتا ہے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَى.....

غلط اعتقادات اور تصورات کے اس جنگل اور ڈھیر میں، جن کی طرف اس سے قبل ہم اشارہ کر چکے ہیں، اسلام آیا اور اس نے اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقیدے کا فیصلہ کن، صریح اور واضح ممتاز تصور دیا۔ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ..... ”نہیں کوئی الہ مگر اللہ، وہی زندہ ہے اور وہی ہے جو تھامنے والا ہے۔“..... یہ عقیدہ اور یہ تصور حیات ایسا تھا کہ اس نے فریقین کے راستے جدا کر دیئے۔ دونوں کا طرز عمل اور دونوں کا طریق زندگی جدا کر دیا..... جس شخص کے نظریہ اور شعور میں یہ ہو کہ اللہ ایک وحدہ لا شریک ہے اور اس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔ وہ زندہ ہے اور اس کے سوا اس مفہوم میں کوئی زندہ نہیں ہے، تمام دوسرے موجودات کا وجود اس کے ساتھ قائم ہے۔ اور وہی ہے جو تمام موجودات اور تمام زندوں کو تھامے ہوئے ہے..... جس شخص کا یہ عقیدہ ہو اور ان صفات کے ساتھ ہو، اس کا نظام زندگی اور طرز حیات یقیناً اس شخص سے مختلف ہونا چاہئے جس کی ذہنی دنیا پر غلط اور وہم پرستانہ تصورات کے بادل چھائے ہوئے ہوں جن کا اوپر ہم نے ذکر کیا۔ اس قسم کے غلط تصورات کے حامل شخص کی زندگی پر وہ اثرات مرتب نہیں ہو سکتے۔ جو اس شخص کی زندگی پر ہو سکتے ہیں ایسے خدا کا قائل ہو جو اس کی زندگی میں فعال اور متصرف ہے اور علی کل شیء قدیر ہے۔

یہ صرف توحید خالص کی برکت ہے جس کے نتیجے میں ایک انسان صرف ایک ہی الہ کی بندگی کر سکتا ہے۔ ایسے تصور میں کوئی شخص کسی غیر اللہ سے کوئی امداد طلب نہیں کرتا۔ وہ صرف اللہ سے نصرت کا طلبگار ہوتا ہے۔ نہ وہ غیر اللہ سے نظام حیات اور نظام قانون اخذ کرتا ہے، نہ وہ اخلاق و آداب غیر اللہ سے اخذ کرتا ہے۔ نہ وہ اجتماعی اور اقتصادی نظام اغیار سے لیتا ہے۔ غرض ایک موحد اپنی زندگی

کے کسی بھی شعبے میں غیر اللہ سے کچھ اخذ نہیں کرتا اور نہ ہی حیات بعد المات کے تصور میں غیر اللہ کو اہمیت دیتا ہے۔ رہے وہ کھوٹے، ٹیڑھے، پیچیدہ شرکیہ جاہلی عقائد تو ان کے حاملین کا ایک رخ ہوتا ہے نہ ان کو قرار و ثبات حاصل ہوتا ہے نہ ان میں حدود حلال و حرام ہوتے ہیں نہ ان میں صحیح اور غلط کے اندر کوئی تمیز ہوتی ہے نہ نظام اور شریعت میں نہ آداب و اخلاق میں نہ طرز عمل اور سلوک میں، غرض یہ تمام امور تب طے ہوتے جب کسی شخص کے عقیدے اور نظریے میں ان کی جہت طے ہوتی ہے، اس کے بعد ایک انسان، اس مصدر، اس جہت کی طرف متوجہ ہو کر اس کی بندگی اور اطاعت کرتا ہے۔

اور جب اسلام نے طے کر دیا کہ..... اللّٰهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ تو اس طرح ایک مسلمان اللہ وحدہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس طرح اس کے اور دوسرے عقائد والوں کے راستے جدا ہو گئے۔

یہی وجہ ہے کہ اس اعتقادی جدائی کی وجہ سے اسلامی نظام زندگی کا مزاج بالکل علیحدہ ہو گیا ہے۔ اسلامی زندگی اپنے تمام عناصر ترکیبی کے ساتھ پوری کی پوری اسلامی تصور حیات سے تشکیل پاتی ہے۔ اور اسلامی تصور حیات ایک خالص اور مکمل توحید پر مبنی ہے اور یہ عقیدہ توحید اس وقت انسانی ضمیر میں مستقلاً قرار نہیں پکڑتا جب تک اس کے کچھ عملی آثار زندگی میں مرتب نہ ہوں، مثلاً زندگی کے ہر شعبے میں عقیدہ توحید کے ساتھ انسانی نظام شریعت بھی اللہ تعالیٰ سے اخذ کرے اور زندگی کی ہر سرگرمی اور تگ و دو میں ذات خداوندی کی طرف متوجہ ہو۔

توحید خالص کے بیان کے بعد، ایسی جامع توحید کہ اللہ کی ذات میں بھی اس کا کوئی شریک نہ اور اس کی صفات میں کوئی شریک نہ ہو، اب اس منبع اور مصدر کا بیان ہوتا ہے جس سے کہ ایک مسلمان اپنا دین اخذ کرتا ہے۔ جہاں سے کتب سماوی اور رسولوں کی تعلیمات نازل ہوتی ہیں۔ یعنی جہاں سے ہر دور اور ہر زمانے میں انسانوں نے اپنے نظام زندگی اخذ کیا ہے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَأَنزَلَ التَّوْرَةَ
وَالْإِنْجِيلَ (۳) مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَأَنزَلَ الْفُرْقَانَ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا
بِآيَاتِ اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيدٌ وَاللَّهُ عَزِيزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۴)

”اس نے تم پر کتاب سچائی کے ساتھ اتاری جو اس کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہوا
اور وہ تورات اور انجیل اس نے اس سے پہلے نازل کیں لوگوں کی ہدایت کے لئے اور کسوٹی اتاری ہے
شک وہ لوگ جنہوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا۔ ان کے لئے شدید عذاب ہے اور اللہ غالب اور بدلہ
لینے والا ہے۔“

اس آیت کے پہلے جملے میں اسلامی تصور حیات کے تمام اساسی حقائق ذکر ہوئے ہیں اہل کتاب
وغیرہ میں سے ب جو لوگ حضرت محمد ﷺ کی رسالت کے منکر تھے۔ ان کی تردید کی گئی ہے اور اللہ
تعالیٰ کی جانب سے جو کچھ نازل ہوا وہ درست ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ ہدایت کا نزول صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہوتا ہے۔ تمام کتب سماوی اس
کی جانب سے ہیں اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے اور وہ حی اور قیوم ہے وہی ہے جس نے آپ
پر یہ قرآن کریم اتارا اور وہی ہے جس نے اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات اتاری وہی
ہے جس نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر انجیل اتاری اس لئے اللہ کی الوہیت اور اس کی بندگی میں اس
کے ساتھ کسی کا اشتراک واختلاط نہ ہو گا۔ وہی ایک الہ ہے جو اپنے مختار بندوں پر کتابیں نازل کرتا ہے
۔ اور وہ بندے اس سے ہدایت اخذ کرتے ہیں۔ اور وہ اخذ کرنے والے بھی اللہ کے بندے ہی ہوتے ہیں
اگرچہ وہ انبیاء ہوں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ کتب سماوی میں جو راہ ہدایت وہ ایک دین ہے اس لئے کہ آپ پر یہ کتاب جو
سچائی لے کر آئی ہے وہ ان تمام صداقتوں کی تصدیق کرتی ہے جو انبیاء سابقہ پر نازل ہوئیں۔ مثلاً

تورات اور انجیل میں، اور ان سب کتابوں اور رسالتوں کا ہدف ایک ہی رہا ہے یعنی لوگوں کو راہ راست پر لانا، پھر یہ کتاب جو آپ پر نازل کی گئی ہے۔ اس کی ایک دوسری صفت بھی ہے۔ وہ یہ کہ چونکہ کتب سماوی کے اندر ان کے ماننے والوں نے مرور زمانہ کے ساتھ ساتھ بہت تحریفات کی ہیں اس لئے یہ فرقان بھی ہے۔ یہ ان کتب سماوی کی اصل ہدایات اور ان محرفہ ہدایات کے درمیان فرق کرتی ہے اور یہ بتاتی ہے کہ کیا اصل ہے اور کیا انحراف اور کیا تحریف ہے، جیسا کہ اس کا ایک نمونہ ہم نے آرنلڈ کی کتاب دعوت الی الاسلام کے طویل اقتباس میں دیا تھا۔

اس میں ضمنی فیصلہ بھی کر دیا جاتا ہے کہ اہل کتاب ک لئے اس رسالت جدیدہ کے انکار کرنے کے لئے کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس رسالت کی راہ بھی وہی ہے جس پر سابقہ رسالتیں تھیں۔ یہ کتاب اسی طرح نازل ہوئی جس طرح اس سے قبل کتابیں نازل ہوئیں۔ جس طرح اس سے قبل ایک بشر رسول پر نازل ہوئیں، اسی طرح یہ کتاب بھی ایک بشر پر نازل ہوئی ہے۔ اور یہ کتاب ان تمام کتابوں اور رسولوں کی تصدیق کرتی ہے۔ جس طرح یہ حق پر مشتمل ہے، اسی طرح وہ کتابیں بھی سچائی پر مشتمل تھیں۔ اور اس کتاب کو اسی ذات نے اتارا جس کا حق ہے کہ وہ سچائی اتارے، اس لئے کہ صرف اسی ذات کو اختیار حاصل ہے کہ وہ انسانوں کے لئے نظام زندگی تجویز کرے، ان کے فکری تصورات ان کے لئے وضع کرے۔ ان کے لئے شریعت تجویز کرے۔ ان کے لئے اخلاق و آداب کا نظام تجویز کرے اور یہ تمام کتابیں اس کتاب منزل میں موجود ہوں۔

اس آیت کے دوسرے حصے میں ان لوگوں کے لئے ایک خوفناک تنبیہ کا ذکر ہے جو بغیر کسی حجت کے اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اللہ عزیز ہے، وہ بے پناہ قوتوں کا مالک ہے اور اس کی پکڑ شدید ہوتی ہے اور کبھی انتقام بھی لیتا ہے جو بہت خوفناک ہوتا ہے۔ اور وہ لوگ جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہیں گویا وہ تمام دینوں کا انکار کرتے ہیں جو اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہے، اہل کتاب نے پہلے اس کتاب کا انکار کیا جو ان پر نازل ہوئی ہے اور جس کی انہوں نے تحریف کی ہے۔ وہی اب اس کتاب کا انکار کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے خود اپنی کتابوں کی بھی تحریف کی تھی۔ اس لئے یہ

کتاب جدید ان کے لئے فرقان ہے۔ اس لئے یہاں یہ شدید دہمکی انہی کو دی گئی ہے۔ اور انہی سے کہا گیا ہے کہ تم اللہ کے انتقام سے بچو۔

عذاب الہی اور انتقام الہی کی دہمکی کے بعد انہیں یہ بھی کہہ دیا جاتا ہے کہ اللہ کی ذات سے کسی کی کوئی بات پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سے نہ کوئی چیز مخفی ہے اور نہ ہی اس سے کوئی چیز بچ سکتی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفَىٰ عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ”اللہ وہ ذات ہے جس پر زمین و آسمان دونوں کے اندر پائے جانے والی کوئی شے مخفی نہیں ہے۔“ یہ کہ اس پر کوئی بات مخفی نہیں ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے اس لئے کہ وہی الہ ہے، وہی ہے جس نے اس کائنات کو تھما ہوا ہے۔ اس لئے اس کا علم محیط ہے، سورت کے آغاز میں اس کی صفت قیومیت کا ذکر موجود ہے۔ نیز یہاں خصوصاً اس لئے بھی صفت احاطہ علم کا ذکر کیا گیا کہ اس آیت میں ایک خوفناک ڈراوا بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ممکن نہیں کہ اس سے کوئی چیز پوشیدہ رکھی جائے۔ ارض و سماء میں کوئی شے بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس سے کسی نیت و ارادہ کو بھی پوشیدہ نہیں رکھا جاسکتا۔ کوئی تدبیر بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس طرح اس کے نظام میں یہ بھی ممکن نہیں ہے کوئی سزا سے بچ نکلے گا یا اس کے حیطہ علم سے کچھ باہر رہ جائے گا۔

اللہ کے اس لطیف اور دقیق علم کے سائے، انسانی شعور کو خود اس کی پیدائش کے سلسلے میں ایک ٹچ دیا جاتا ہے، انسانی شعور کو یہ چٹکی، خود تخلیق انسان کے بارے میں دی جاتی ہے۔ انسان کی تخلیق جو پردہ غیب میں، رحم مادر کے پس پردہ اندھیروں میں عمل پذیر ہوتی ہے، جس کے بارے میں نہ انسان کا علم رسائی حاصل کر سکا ہے اور نہ ہی اس کا ادراک کرتا ہے۔ اور نہ ہی وہ عمل تخلیق انسان کے دائرہ قدرت میں آسکا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ”اللہ وہ ذات ہے جو رحم مادر میں تمہاری تصویر بناتا ہے، جس طرح چاہتا ہے، اس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے اور وہ عزیز و حکیم ہے۔“

وہ رحم مادر میں تمہیں ایک شکل و حرارت دیتا ہے، جس طرح اس کی مشیت ہوتی ہے پھر وہ تمہیں اس شکل و صورت کے ساتھ مناسب خصوصیات بھی عطا کرتا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس کے سوا کوئی ذات اس تصویر سازی میں شریک نہیں ہوتی، یہ کام وہ صرف اپنے ارادے اور اپنی مشیت سے کرتا ہے۔ ”جس طرح چاہتا ہے۔“ اس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔“ وہ عزیز ہے۔“ وہ اس تخلیق اور تصویر سازی پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ ”وہ حکیم ہے“ یہ تمام تخلیقی عمل بڑی گہری، ٹیکنالوجی پر مبنی ہے۔ اس میں نہ کوئی رکاوٹ آتی ہے، اور نہ اس کام میں اس کے ساتھ کوئی شریک ہے۔“

تخلیق انسان کی طرف یہاں اشارہ کرنے کا مقصد یہ ہے خطاب اہل کتاب سے ہے اور اہل کتاب کے اندر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تخلیق کے بارے میں نہایت ہی غلط خیالات اور شکوک و شبہات پائے جاتے تھے۔ اللہ ہی ہے جس نے حضرت عیسیٰ کی تصویر کشی کی، جس طرح اس نے چاہا، یہ عقیدہ باطل ہے کہ حضرت عیسیٰ بذات خود رب ہیں۔ یا خدا ہیں، یا خدا کے بیٹے ہیں یا کوئی لاہوتی ناسوتی اقنوم ہیں۔ اس لئے کہ یہ تصورات ناقابل فہم ناقابل ادراک ہونے کے ساتھ ساتھ، عقیدہ توحید کے صحیح، قابل فہم اور واضح تصور کے بھی خلاف ہیں۔

اس کے بعد قرآن مجید ان لوگوں کی نشان دہی کرتا ہے جن کے دلوں میں ٹیڑھ ہے۔ اور یہ لوگ وہ ہیں جو قرآن کریم کی قطعی الدلالت آیات کو چھوڑ کر ان آیات کے درپے ہوتے ہیں جن کے مفہوم میں تاویل کا احتمال ہوتا ہے تاکہ وہ ایسی آیات کی غلط تاویل کر کے اسلامی نظریات کے اندر شبہات پیدا کریں۔ یہ نشان دہی اس لئے کی جاتی ہے کہ اہل ایمان اور اہل حقائق کی حقیقی صفات بیان کر دی جائیں۔ یہ بتایا جائے کہ ان کا ایمان کس قدر خالص ہے۔ اور کس طرح اللہ کے قطعی احکام کو بلا چون و چرا عمل میں لاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ
فَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ وَمَا يَعْلَمُ

تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْوَعْدَ

”وہی ہے جس نے یہ کتاب تم پر نازل کی، اس کتاب میں دو طرح کی آیات ہیں، ایک محکمات جو کتاب کی اصل بنیادیں ہیں اور دوسری متشابہات، جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اور ان کو معنی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا حقیقی مفہوم اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا، بخلاف اس کے جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں، وہ کہتے ہیں، ہمارا ان پر ایمان ہے، یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں، اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے صحیح سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب ہدایت دینے بعد ہمارے دلوں ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر دے، اور ہمیں اپنی جانب سے رحمت عطا فرما، بے شک تو ہی داتا ہے۔ اے ہمارے رب، تو ایک قابل شک دن میں سب لوگوں کو یقیناً جمع کرنے والا ہے، بے شک تو کبھی اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔“

ایک روایت میں آتا ہے کہ وفد نجران کے عیسائیوں نے رسول ﷺ سے پوچھا کہ کیا آپ کا یہ عقیدہ ہے کہ آپ حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ سمجھتے ہیں؟ وہ ان الفاظ سے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اپنے عقائد باطلہ ثابت کرنا چاہتے تھے۔ مثلاً یہ کہ وہ بشر نہیں، روح اللہ ہیں اور روح اللہ کی وہ اپنی تعبیرات کرتے تھے۔ لیکن وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن کریم کی ان آیات کی بات بھی نہ کرتے تھے۔ جو اس موضوع پر محکمات تھیں، جن میں اللہ کی بے قید و حدانیت کا ذکر تھا۔ اور جن میں اس بات کی قطعی تردید کر دی گئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک یا اس کا کوئی لڑکا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان آیات کا نزول فرمایا اور ان کی اس سازش کا انکشاف کیا جس کی وجہ سے وہ ان متشابہ تعبیرات قرآن سے غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔ اور قطعی الدلالت آیات سے صرف نظر کرتے تھے۔

لیکن یہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے عام ہے، اس میں قرآن مجید کی آیات کے بارے میں مختلف مکتبہ ہائے فکر کے لوگوں کے مختلف مواقف پر تبصرہ کیا گیا ہے۔ چنانچہ اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ قرآن مجید ایک کتاب ہدایت ہے۔ اس میں بعض باتیں تو ایسی ہیں جن کا تعلق اصول ایمان اور اسلامی فکر کے بنیادی حقائق سے ہے۔ بعض میں اسلامی نظام حیات کی تفصیلات دی گئی ہیں اور بعض آیات میں ان غیبی امور کا بیان ہے جن کا صحیح تصور ہماری محدود عقل کے دائرہ قدرت سے باہر، جن پر ادراک انسانی اپنے موجود محدود وسائل علم کے ذریعہ قابو نہیں پاسکتا۔ اور ان نصوص میں اکثر وہ باتیں بیان کی گئی ہیں جو انسان کے ادراک سے باہر ہیں۔

قرآن مجید نے پہلے دو امور یعنی عقیدہ اور نظریہ تصورات اور افکار کے بارے میں اور اسلامی نظام حیات اور شریعت کے بارے میں قطعی الدلالت آیات نازل فرمائیں۔ جن کا تصور بھی ممکن ہے اور جن کے مقاصد بھی بالکل واضح ہیں اور یہی دو شعبے ہیں جو قرآن کا اصل موضوع ہیں۔ رہے وہ جن کی خبر رسول ﷺ نے خبر دی یا قرآن نے دی اور ہم نے انہیں سنایا پڑھا یا وہ غیبی خبریں جو قرآن نے سنائیں ہیں جن میں پیدائش مسیح کی خبر بھی ہے تو اس بارے میں ہدایت یہ ہے کہ جس حد تک انہیں سمجھ سکتے ہو تو ضرور راہوار ادراک کو طولانی دو لیکن حد ادراک سے آگے ایمان لاؤ کہ بس یہ خالق حقیقی کی جانب سے ایک حق بات اور ماہیت اور کیفیت کا ادراک فی الحال مشکل ہے، اس لئے کہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے وہ انسان کے موجودہ ذرائع سے وراء ہے۔

اب رہے وہ لوگ، تو وہ ان آیات پر غور، خود اپنی شخصیت کے حوالے سے کرتے ہیں، اگر وہ صحیح الفکر ہیں تو ان کی سوچ صحیح ہے۔ اگر ان کی فکر ٹیڑھی ہے تو ان کی سوچ بھی ٹیڑھی ہے۔ اور وہ اپنی اس ٹیڑھی فطرت کی وجہ سے گمراہ ہو گئے ہیں تو یہ لوگ قرآن کریم صاف ستھری اور واضح آیات سے صرف نظر کرتے ہیں۔ وہ واضح اصولوں کو ترک کر دیتے ہیں۔ وہ نہایت ہی مفصل ہیں اور جن کے اوپر اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی نظام زندگی قائم ہے۔ اور یہ لوگ تنابہات کے درپے ہوتے ہیں جن کی تصدیق کا دار و مدار صرف ایمان پر ہے اور یہ کہ اللہ کی جانب سے نازل کی گئی ہیں۔

اور یہ کہ ان کے صحیح معنی صرف اللہ جل شانہ کے علم میں ہیں۔ جیسا کہ انسانی ذرائع علم نسبتی ہیں اور ان کی قوت مدر کہ کامیدان کار محدود ہے۔ نیز ان کے صحیح فہم کا مدار اس براہ راست الہام اور شعور پر ہے جو کتاب اللہ کی صداقت کے بارے میں ایک صحیح الفکر آدمی کو حاصل ہوتا ہے کہ یہ پوری کتاب ایک سچی کتاب ہے۔ اور یہ کہ وہ سچائی کے ساتھ اتاری گئی ہے اور کسی پہلو سے بھی باطل نہ اس پر حملہ آور ہو سکتا ہے۔ اور ٹیڑھے دل و دماغ والے ان متشابہات کے پیچھے اس لئے پڑے رہتے ہیں کہ وہ ان آیات میں ایسے مواقع تلاش کر لیتے ہیں جن کے ذریعے وہ فتنے پیدا کرتے ہیں۔ ایسی تاویلات پیدا کرتے ہیں۔ جس سے اسلامی تصور حیات کے اندر شکوک پیدا کئے جاسکیں۔ اور جب ان کے ذریعے وہ فکری انتشار پیدا کر لیں تو پھر وہ فکری ژولیدگی کو ان آیات میں بھی داخل کر دیں جو بالکل قطعی اور واضح ہیں۔ حالانکہ ان متشابہات کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ..... ”حالانکہ اس کے اصل معنی صرف اللہ جانتا ہے۔“

رہے وہ لوگ جو علم میں پختہ کار ہیں، وہ لوگ جنہوں نے علم کے بل بوتے پر جان لیا ہے کہ انسانی عقل، انسانی فکر اور یہ عقل و فکر اپنی موجودہ قوت اور موجودہ ذرائع عقل و فکر کی مدد سے وہ ان متشابہات کے مفہیم نہیں پاسکتے۔ اس لئے وہ پوری شرح صدر اور اطمینان سے کہتے ہیں آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا..... ”ہم ان پر ایمان لائے، سب ہمارے رب کی طرف سے ہیں“ ان کا یہ ایمان انہیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے، بڑے وثوق سے کہ یہ آیات اللہ کی جانب سے ہیں، اس لئے یہ حق ہیں اور سچائی پر مبنی ہیں۔ اور جس چیز کا فیصلہ اللہ کر دے وہ بذات خود سچی ہوتی ہیں اور انسانی عقل کے نہ بات فرائض میں شامل ہے۔ اور نہ ہی اس کے دائرہ قدرت میں ہے کہ وہ ان آیات کے اسباب و علل کا کھوج لگائے..... اس کے مفہیم کی ماہیت معلوم کرے اور ان کے اندر پوشیدہ اسباب و علل کا کھوج لائے وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ..... کے سامنے جب یہ آیات پیش ہوتی ہیں تو وہ ان کی صداقت کو قبول کر لیتے ہیں۔ وہ اپنی دقت شعار فطرت اور فہم رسا کی وجہ سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ان کی عقل ان میں شک ہی نہیں کرتی۔ اس لئے کہ انہوں نے یہ بات پالی ہوتی ہے کہ علم اور خرد مندی یہ

ہے کہ جس حقیقت کا ادراک بذریعہ علم و عقل نہ ہو سکے اس میں دلچسپی نہ لی جائے۔ خصوصاً جو امور انسان کے ذرائع علم کے حدود سے باہر ہوں۔

وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ..... کی یہ ایک بہترین تصویر ہے، اس تصویر اور تعریف کا انکار وہی شخص کر سکتا ہے جو سطحی ہو۔ جو اپنے سطحی علم کی وجہ سے اس غرے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے سب کچھ حاصل کر لیا ہے۔ اور جو چیز ان کے علم میں نہیں ہے گویا اس کا وجود ہی نہیں ہے۔ وہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ سب کچھ پا گئے۔ اس لئے تمام حقائق کی صورت وہی ہے جو ان کے ذہن میں آتی ہو، اس سے وہ اللہ تعالیٰ کے مطلق اور بے قید کلام کا قیاس اپنی عقلیت کے پیمانوں اور فسیلوں کے مطابق کرتے ہیں، حالانکہ یہ پیمانے ان کی محدود عقل میں نہیں سماتے، اس لئے ہزار حقائق عقل بشری کے دائرے سے باہر ہیں۔ چونکہ وہ فطرتاً یقین کرنے والے ہوتے ہیں، اس لئے ان کی سچی فطرت تک سچائی جلدی پہنچ جاتی ہے اور تصدیق کر لیتی ہے اور مطمئن ہو جاتی ہے۔ وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ..... ”اور سچ یہ ہے کہ کسی چیز سے سبق صرف دانشمند لوگ ہی حاصل کرتے ہیں۔“

جب ایک انسان دانشمندی کے اس مقام تک آپہنچتا ہے تو ان کا اجر اللہ کی طرف سے ہوتا ہے وہ خشوع و خضوع اور گڑ گڑا کر دست بدعا ہو جاتے ہیں کہ اللہ۔ انہیں حق پر قائم رکھ کر ہدایت کے بعد گمراہ نہ کر، ان پر اپنی رحمت اور اپنے فضل کی بارش کر دے۔ خوف آخرت ان کے دامن گیر ہو جاتا ہے، جہاں انہیں لازماً جانا ہے، جس سے کوئی مفر نہیں۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ
(۸) رَبَّنَا إِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ

”وہ دعا کرتے ہیں کہ پروردگار! جب تو سیدھے راستہ پر لگا چکا ہے، تو پھر کہیں ہمارے دلوں کو کجی میں مبتلا نہ کر دیجو! ہمیں اپنے خزانہ رحمت سے عطا کر کہ تو ہی فیاض حقیقی ہے، پروردگار! تو یقیناً سب

لوگوں کو ایک روز جمع کرنے والا ہے۔ جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں تو ہرگز اپنے وعدے سے ٹلنے والا نہیں ہے۔“

جو لوگ علم میں پختہ کار ہیں ان کا اپنے رب کے ساتھ یہ تعلق ہے، اور یہ ایسا تعلق ہے جو ایک صحیح مومن کا ہونا چاہئے، جو اللہ کے کلام اور اللہ کے عہد پر پورا بھروسہ ہونے کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے فضل و رحمت کے صحیح شعور کے نتیجے میں حاصل ہوتا ہے، خصوصاً اس وقت جب ایک مومن اللہ کی قضا و قدر پر پختہ یقین بھی رکھتا ہو اور اللہ کا خوف بھی اس کے دل میں موجزن ہو۔ اور ایک مومن نہ غافل ہوتا ہے، نہ مغرور ہوتا ہے، نہ اپنے روز و شب میں کبھی اپنے فرائض بھولتا ہے۔

قلب مومن کی ضلالت اور گمراہی کے بعد دولت ایمان ملنے کی بڑی قدر دانی ہوتی ہے۔ اور کسی دھندلے تصور کے بعد اپنی آنکھوں سے حقیقت کو دیکھ لینے کی اس کے دل میں بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ اور حیرانی و پریشانی کے بعد راہ راست پانے سے اسے شعور ہوتا ہے۔ خلجان اور بے یقینی کے بعد اطمینان پانے پر وہ بہت ہی خوش ہوتا ہے، وہ دنیا کی تمام غلامیوں سے آزاد ہو کر ایک اللہ کی غلامی میں داخل ہو کر پر مسرت ہوتا ہے اور اسے یہ شعور ہوتا ہے کہ دولت ایمان دیکر اللہ تعالیٰ نے اسے بہت کچھ دیدیا ہے..... اس لئے وہ دوبارہ گمراہی کی راہ سے بہت ہی ڈرتا ہے، چونکہ وہ راہ راست پر آچکا ہوتا ہے اس لئے دوبارہ گمراہی کے نشیب و فراز اور تاریک راہوں میں پھنس جانے سے بہت خوف کھاتا ہے، وہ یوں ڈرتا ہے جس طرح وہ شخص جو ایک خوش گوار موسم میں گھنی چھاؤں میں بیٹھا ہو تو جھلسا دینے والی گرمی اور بے آب و گیاہ صحرا کے تصور سے بھی ڈر رہا ہو، حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی قدر اور ذوق یقین وہی شخص پاسکتا ہے جس نے بد بختی کے کڑے دن اور الحاد و زندگی کی ذہنی خشکی کے دن دیکھے ہوں۔ ایسا ہی شخص اچھی طرح اندازہ کر سکتا ہے کہ بے دینی گمراہی اور فسق و فجور کی زندگی کے مقابلے میں ایمانی زندگی کے اندر کس قدر مٹھاس ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ایسے مقامات پر ایک مومن ایسے خضوع و خشوع کے ساتھ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا..... ”اے ہمارے رب! راہ

ہدایت دکھانے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ کر دیجیو۔“ یہ پکارتے ہیں کہ انہیں گمراہی کے بعد ایک عظیم رحمت مل گئی ہے۔ کہیں وہ لٹ نہ جائے، یہ ایک ایسا انعام ہے جس سے بڑا کوئی انعام نہیں ہے۔

وَهَبْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ رَحْمَةً إِنَّكَ أَنْتَ الْوَهَّابُ..... ”ہمیں اپنے خزانہ غیب سے رحمت عطا کر تو، تو ہی فیاض حقیقی ہے۔“ یعنی یہ لوگ اپنے شعور ایمان کے ذریعہ یقین رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے فضل و رحمت کے سوا کچھ نہیں کر سکتے۔ خود ان کے دل بھی ان کے ہاتھ میں نہیں ہیں۔ اس لئے وہ اپنی ہدایت اور نجات اخروی کے لئے بھی اللہ کے سامنے دست بدعا ہوتے ہیں۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول ﷺ اکثر اوقات یہ دعا فرمایا کرتے تھے۔ ”تمام دل اللہ رحمان کی دوائیوں کی گرفت میں ہیں، جب وہ دلوں کو سیدھا کرنا چاہے تو سیدھا کر دیتا ہے۔ اور جب وہ ٹیڑھا کرنا چاہے تو وہ ٹیڑھا کر دیتا ہے۔“ اور جب ایک مومن کو صحیح طرح اس بات کا شعور حاصل ہوتا ہے تو وہ نہایت گرم جوشی کے ساتھ آستانہ درگاہ الہی کے ساتھ چٹ جاتا ہے، اور گڑگڑا کر اللہ تعالیٰ کی معاونت اور توفیق کا طلب گار ہو جاتا ہے اور اس کی طرف متوجہ ہو کر اس کی رحمت اور اس کے فضل و کرم کا طلب گار ہوتا ہے تاکہ وہ خزانہ محفوظ رہے، جو اس نے اس مومن کو عطا کیا ہے اور وہ کرم باقی رہے جن سے اسے نوازا گیا ہے۔

اس کے بعد روئے سخن اہل کفر کی طرف مڑ جاتا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے۔ ان کے بارے میں وہ سنت الہی کیا ہے۔ جس میں کوئی تبدیلی کبھی واقعہ نہیں ہوتی۔ معنی یہ کہ ان کے گناہوں پر ان سے ضرور مواخذہ ہو گا۔ اہل کتاب میں سے جو لوگ اس دین کا انکار کرتے ہیں اور اس کی راہ رو کے کھڑے ہوتے ہیں انہیں یہ دہمکی کی جاتی ہے کہ وہ باز آجائیں، رسول ﷺ کے واسطے سے انہیں متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ کفار مکہ کے انجام بد سے عبرت حاصل کریں، جو ان کی آنکھوں کے سامنے وقوع پذیر ہوا، جن میں ایک قلتِ قلبیہ کے مقابلے میں ان کے بھاری لشکر کو شکست ہوئی۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُعْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا
وَأُولَئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ (۱۰) كَذَّبَ آلُ فِرْعَوْنَ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ
كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ (۱۱) قُلْ لِلَّذِينَ
كَفَرُوا سَعْيُكُمْ وَسُحُورُكُمْ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وَبُئْسَ الْمِهَادُ (۱۲) قَدْ كَانَ
لَكُمْ آيَةٌ فِي فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَرَوْنَهُمْ
مِثْلَهُمْ رَأْيَ الْعَيْنِ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصَرِهِ مَن يَشَاءُ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي
الْأَبْصَارِ (۱۳)

”جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے، انہیں اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا نہ اولاد وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔ ان کا انجام ویسا ہی ہو گا جیسا کہ فرعون کے ساتھیوں اور ان سے پہلے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ انہوں نے آیات الہی کو جھٹلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ پس اے محمد! جن لوگوں نے تمہاری دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ ان سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم ہی برا ٹھکانہ ہے۔ تمہارے لئے ان دو گروہوں میں نشان عبرت تھا جو ایک دوسرے سے نبر آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے پچھتم دیکھ رہے تھے کہ وہ ان سے دوچند ہیں اور اللہ فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔ دیدہ بینار کھنے والوں کے لئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے۔“

یہ آیات بنی اسرائیل کو خطاب کرتے ہوئے کہی گئی ہیں۔ ان میں یہ دہمکی دی گئی ہے کہ وہ اہل کفر کے انجام پر غور کر لیں۔ پہلے جو ہو چکا ہے اور آئندہ جو ہونے والا ہے۔ اس میں ایک لطیف اور عمیق اشارہ ہے اس جانب کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کو ہلاک کیا اور بنی اسرائیل کو نجات دی لیکن یہ ہلاکت اس

لئے نہ تھی کہ فرعون فرعون تھا بلکہ اس لئے کہ وہ کافر تھا۔ اور نجات بنی اسرائیل بھی اس لئے نہ تھی کہ وہ قوم بنی اسرائیل سے نسبی رشتہ رکھتے تھے۔ بلکہ اس لئے تھی کہ وہ اہل ایمان تھے۔ اس لئے اب اگر وہ کفر اور گمراہی کا رویہ اختیار کریں گے تو وہ نجات کے مستحق نہ ہوں گے۔ اگر وہ گمراہ ہو گئے تو وہ اہل کفر کہلانے سے نہ بچ سکیں گے۔ اسی طرح وہ دنیا و آخرت میں اہل کفر کے انجام بد سے لازماً دوچار ہوں گے جیسا کہ بوجہ کفر آل فرعون کا یہ انجام ہوا۔

اسی طرح انہیں بدر کے میدان میں اہل قریش کے مقتل کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ اس صورت حال سے وہ محض اس لئے دوچار ہوئے کہ وہ کفار تھے۔ اگر وہ بھی کفر پر قائم رہے تو پھر سنت الہی یہی ہے کہ وہ لازماً اسی انجام سے دوچار ہوں گے جن سے اہل قریش دوچار ہوئے۔ اس لئے کہ اس انجام کا اصل سبب کفر تھا۔ اللہ کے ہاں کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں ہے، نہ وہاں سفارش چلتی ہے، صرف ایمان صحیح ہی وہاں شفیع ہو سکتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَئِكَ هُمْ
وَقُودُ النَّارِ

”جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، انہیں اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا اور نہ اولاد، وہ دوزخ کا ایندھن بن کر رہیں گے۔“

دنیا میں مال اور اولاد بچاؤ کا سہارا ہوتے ہیں لیکن یہ دونوں چیزیں اس دن کام نہ دیں گی جس کے آنے میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس دن کے آنے کا وعدہ اللہ نے کیا ہے اور اللہ کے وعدے میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ اللہ کا وعدہ کبھی ٹلتا نہیں، اہل کفر وہاں جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ یہاں انداز تعبیر ایسا اختیار کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان اہل جہنم سے انسانی خصوصیات سلب ہو جائیں گی اور وہ جہنم میں خس و خاشاک کی طرح سوختی کی اشیاء ہوں گے۔ اور اس وقت نہ مال اور دولت، نہ جاہ اور نہ سلطنت ان کے کچھ کام آئے گی۔

كَذَّابٍ آلٍ فِرْعَوْنَ ۖ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَآخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۚ وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ

”ان کا انجام ایسا ہی ہو گا جیسا کہ فرعون کے ساتھیوں کا اور اس کے پہلے کے نافرمانوں کا ہو چکا ہے کہ انہوں نے آیات الہی کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کے گناہوں پر انہیں پکڑ لیا، اور حق یہ ہے کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔“

یہ ایک ایسی مثال ہے جو تاریخ میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ اور اس کے کئی قصے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بڑی تفصیلات کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں کے بارے میں اللہ کی سنت ان قصوں میں پائی جاتی ہے۔ جہاں اللہ چاہے، اپنی اس سنت کو کام میں لاتا ہے۔ اس لئے اللہ کی آیات کو جھٹلانے والوں کو اس جہاں میں کوئی گارنٹی حاصل نہیں، نہ وہ محفوظ ہیں۔ اس لئے اب جو لوگ رسالت محمدیہ کا انکار کر رہے ہیں اور قرآن کریم کی تکذیب کر رہے ہیں جو آپ پر نازل ہوا ہے۔ ان کے لئے اس انجام ست دو چار ہونا یقینی ہے۔ اس دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اس لئے یہاں رسول اکرم ﷺ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ان کفار اہل کتاب کو اس انجام بد سے خبردار کریں۔ اگر وہ فرعون اور تاریخ اسلامی کے دوسرے نافرمانوں کے انجام بد کو بھول چکے ہیں تو خدا را اہل مکہ کے اس انجام بد پر غور کریں جس کا مظاہرہ ابھی ان کی آنکھوں کے سامنے ہو چکا ہے۔ یہ سب کچھ تکذیب آیات ہی کا شاخسانہ تو ہے۔

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَعْتٌ بَلَّوْنَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وَبُئِسَ الْمِهَادُ (۱۲) قَدْ كَانَتْ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِتْنَةِ الْبَنِي إِسْرَافِيلَ ۚ فَتَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَكْرَهُهُمُ مِثْلَهُمْ رَأْيِ الْعَيْنِ ۚ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصَرِهِ مَن يَشَاءُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ

”جن لوگوں نے تمہاری دعوت قبول کرنے سے انکار کر دیا، ان سے کہہ دو کہ قریب ہے وہ وقت، جب تم مغلوب ہو جاؤ گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے، تمہارے لئے ان دو گروہوں میں ایک نشان

عبرت تھا جو ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے، ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا کافر تھا، دیکھنے والے پچشم سردیکھ رہے تھے کہ وہ ان سے دوچند ہے۔“

اس آیت

يَكُونُ لَهُمْ مِثْلُهُمْ رَأْيِي الْعَيْنِ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں، یرون کی ضمیر اگر کفار کی طرف ہے اور ہم سے مراد اہل ایمان ہیں تو مفہوم ہو گا کہ اہل کفر کو اپنی ظاہری کثرت کے باوجود نظریوں آرہا تھا کہ اہل اسلام ان سے دو گنا ہیں۔ اور یوں یہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے تائید غیبی تھی کہ کفار کو اہل اسلام زیادہ اور وہ خود تھوڑے نظر آرہے تھے۔ یوں ان کے قدم اکھڑ گئے اور ان کے دل بیٹھ گئے۔

اور اگر اس کے برعکس لیا جائے یعنی یرون سے مراد ہو کہ مسلمان ہم ان کو دیکھ رہے تھے۔ تو مفہوم یہ ہو گا کہ مسلمانوں کو وہ اپنے دو گنا نظر آرہے تھے، وہ تین گنا تھے۔ اس کے باوجود اہل اسلام ثابت قدم رہے، اور فتح یاب ہوئے۔ اصل بات یہ ہے کہ تائید و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے دکھانا یہ مطلوب ہے کہ اہل کفر اپنے انجام پر غور کریں۔ اور اہل اسلام دلوں کو مضبوط کر لیں اور یقین کر لیں کہ ان کے اعداء کی تقدیر میں شکست لکھی جا چکی ہے۔ اس لئے وہ ان اعداء سے خوف نہ کھائیں۔ جیسا کہ ہم نے اس سورت پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ اس وقت جو صورتحال تھی، اس میں اہل کتاب کو اس قسم کی تنبیہ اور تحریف کی ضرورت تھی۔

قرآن کریم مسلسل اپنی عظیم حقیقت پر کاربند ہے اور اس عظیم سچائی میں سے ایک بات یہ ہے کہ اس دنیا میں جو لوگ کفر کرتے ہیں، آیات کو جھٹلاتے ہیں اور اسلامی نظام زندگی سے انحراف کرتے ہیں ان کی شکست کا وعدہ اب بھی اپنی جگہ قائم ہے اور قائم رہے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کا، اہل ایمان کے ساتھ یہ وعدہ بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ وہ فتح یاب ہوں گے اگرچہ وہ قلیل تعداد میں ہوں، اور نصرت اور

فتح صرف تائید ایزدی پر موقوف ہے اور یہ صرف اس کا اختیار ہے، جسے چاہے وہ فتح و نصرت سے نوازے۔ حقیقت اپنی جگہ اب بھی قائم ہے۔ منسوخ نہیں ہوئی۔

اہل ایمان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس حقیقت پر اچھی طرح مطمئن ہو جائیں۔ اور اس پر پوری طرح اعتماد کریں۔ اور میدان جہاد میں اپنی تیاریاں مکمل طور پر کریں جس قدر ممکن ہو، اور اس تیاری کے بعد پھر تائید خداوندی کا انتظار کریں۔ وہ نہ جلد بازی کریں، نہ مایوس ہوں، اگرچہ انہیں طویل انتظار ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ کیونکہ اللہ حکیم ہے وہ اپنی تدابیر خود اپنے وقت پر کرتا ہے، اور اس حکمت کے مطابق ہی اس کا وعدہ اپنے وقت پر پورا ہوتا ہے۔

إِنَّ فِي ذَلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ..... ”دیدہ بینار کھنے والوں کے لئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے دیکھنے والی آنکھ ہو، تدبیر کرنے والی بصیرت ہو، تب ہی ایک انسان عبرت حاصل کر سکتا ہے اور تب ہی قلب میں فہم پیدا ہوتا ہے۔ اگر بصیرت نہ ہو تو سامان عبرت شب و روز آنکھوں کے سامنے سے گزرتا ہے مگر آنکھ نہیں دیکھ پاتی۔“

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

اگلی آیت میں، جماعت مسلم کی تربیت کے سلسلے میں، اسے ان فطری میلانات اور فطری اسباب کے بارے میں آگاہ کیا جاتا ہے، جن کی وجہ سے انسان کی زندگی میں گمراہی اور انحراف کا آغاز ہوتا ہے، اس لئے اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ ان فطری میلانات کو ہر وقت ضبط کنٹرول میں رکھا جائے۔ اور ہر وقت زندگی کے اعلیٰ مقاصد کو پیش نظر رکھا جائے اور اصل مطمح نظر وہ اکرام و انعام ہو جائے جو کسی انسان کو یوم آخرت میں مل سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خواہشات دنیاوی میں گم ہو جانے، مرغوبات نفس کے درپے ہو جانے اور دوسرے فطری میلانات کا بندہ بن جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل بصیرت اور اس کی عقل سے عبرت آموزی ختم ہو جاتی ہے۔ اور انسان کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ حسی لذتوں اور دنیاوی

مرغوبات کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ اور بلند مقاصد نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ انسان کے احساسات مادی ہو جاتے ہیں وہ دنیائے قریب کی لذتوں کے دائرے سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور وہ ان اعلیٰ مقاصد کے حصول کی لذت سے محروم ہو جاتا ہے جس کا تعلق انسان کے خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کے منصب سے ہے۔ اور جو اس دنیا کی اس مخلوق کے شایان شان ہیں جسے اللہ نے اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ اس وسیع مملکت دنیا میں۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ یہ فطری میلانات اور دنیاوی مرغوبات چونکہ اللہ کی جانب سے انسان کے تکوینی فرائض ہیں اور یہ رجحانات و میلانات اس دنیا میں حیات انسانی کی نشوونما اور ترقی کے لئے اہم کردار ادا کرتے ہیں اور یہ ایک قسم کا فطری فریضہ ہیں اس لئے اسلام نے ان فطری میلانات کو ختم کرنے یا ان کی بیخ کنی کا کوئی اشارہ نہیں دیتا۔ ہاں اسلام یہ حکم دیتا ہے کہ ان میلانات کو ضابطے کا پابند بنایا جائے۔ ان کو منظم کیا جائے، ان کی تیزی کو کم کیا جائے ان کو اس طرح کنٹرول کیا جائے کہ ان پر انسان کو پورا پورا ضبط حاصل ہو انسان ان کا مالک اور متصرف ہو اور انسان ان سے آگے مقاصد عالیہ پر بھی نظریں جمائے ہوئے ہو اور اپنے آپ کو ان کی غلامی سے بلند سمجھتا ہو۔

اس لئے قرآن کریم کی آئینی آیات ان مرغوبات اور ان میلانات کے بارے میں بحث کرتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ اس آیت میں ان اخروی لذائذ مرغوبات جن کا تعلق کام و دہن سے ہے اور ان کا ذکر کرتے ہیں جن کا تعلق عقل و خرد سے ہوتا۔ اور یہ اخروی لذات ان لوگوں کا نصیب ہو گا جنہوں نے اس جہاں میں اپنے نفوس کے اوپر کنٹرول کیا۔ اور وہ اس جہاں میں عیش و عشرت اور لذات میں غرق نہ ہوئے اور انہوں نے یہاں اپنے آپ کو مقام انسانیت پر بلند رکھا۔

اس ایک ہی آیت میں قرآن کریم نے دوران کلام اس دنیا کی تمام اہم مرغوبات کو ایک ساتھ جمع کر دیا۔ مثلاً عورتیں، اولاد، مال، دولت، گھوڑے اور سواری، سرسبز و شاداب اراضی اور اس میں قسم قسم کے موبیشی، اس دنیا میں جس قدر مرغوبات ممکن ہیں وہ سب اس آیت میں جمع کر دی گئی ہیں۔ یا تو بذات خود یہ اشیاء مرغوبات میں شامل ہیں یا وہ انسان کے لئے فراہمی مرغوبات کا ذریعہ ہیں۔ اور اس

کے ساتھ ہی دوسری آیت میں ان مرغوبات اور لذائذ کا ذکر ہے، جو اللہ نے اہل ایمان کے لئے، اس جہاں میں تیار کی ہیں۔ ایسے باغات اور لذائذ کا ذکر ہے، جو اللہ نے اہل ایمان کے لئے، اس جہاں میں تیار کی ہیں۔ ایسے باغات جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی، پاکیزہ بیویاں، اور ان سب انعامات سے بڑا انعام ذات باری کی رضامندی اور خوشنودی۔ اور یہ انعام صرف ان لوگوں کے لئے ہیں جن کی نظریں ان دنیاوی لذائذ سے اونچی ہیں، جن کا تعلق اللہ سے قائم ہے، ذرا ان آیات پر غور فرمائیں۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ
مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْخَرْبِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ
الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ (۱۴) قُلْ أُوْنِيْكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ ذَلِكُمْ لِلَّذِينَ
اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ
مُطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (۱۵) الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا
إِنَّا آمَنَّا فَأَعْظِفْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۶) الصَّابِرِينَ وَالصَّادِقِينَ
وَالْقَانِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ (۱۷)

”لوگوں کے لئے مرغوبات نفس، عورتیں، اولاد، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں، خوش آئند بنادی گئی ہیں۔ مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔ حقیقت میں جو بہتر ٹھکانہ ہے، وہ اللہ کے پاس ہے۔ کہو: میں تمہیں بتاؤں کہ اس سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس باغ ہیں۔ جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہاں انہیں ہمیشگی کی زندگی حاصل ہوگی، پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے، اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں ”مالک! ہم ایمان لائے ہماری خطاؤں سے درگزر فرما اور ہمیں آتش دوزخ سے بچا۔“ یہ لوگ صبر کرنے والے

ہیں۔ راست باز ہیں۔ فرمانبردار اور فیاض ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔“

رُبِّیْنَ لِلنَّاسِ..... ”میں فعل مجہول کا صیغہ استعمال کر کے اس طرف اشارہ دیا گیا ہے کہ ان چیزوں کی طرف لوگوں کا میلان بتقاضی فطرت ہے۔ ان چیزوں کو محبوب بنا دیا گیا ہے اور ان کی تزئین کر کے ان کی محبوبیت میں اضافہ کر دیا گیا ہے۔ گویا یہ حقیقت واقعہ کے ایک پہلو کی تصدیق ہے۔ اس لئے کہ انسان کی شخصیت میں ان چیزوں کی طرف میلان اور رغبت رکھی گئی ہے۔ یہ اس کے اصل وجود اور اس کی ذات کا حصہ ہے۔ اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان خواہ مخواہ اس حقیقت کا انکار کرے۔ نہ خود انسان اپنی ذات میں ان میلانات اور رجحانات کو قابل اعتراض سمجھے۔ اس کرہ ارض پر انسانی زندگی کی ترقی اور نشوونما کے لئے ان میلانات کا موجود ہونا از بس ضروری ہے جیسا کہ اس موضوع پر اس سے پہلے ہم مفصل بحث کر آئے ہیں۔ لیکن یہ بھی حقیقت واقعہ ہے کہ انسان کی فطرت کاق ایک دوسرا پہلو بھی ہے جو ان میلانات اور فطری رجحانات میں توازن پیدا کرتا ہے اور وہ ایک قسم کا چوکیدار جو انسان کو ان میلانات میں مستغرق ہونے سے بچاتا ہے۔ اور یہ پہلو انسان کے عالم بالا کے ساتھ روحانی تعلق کو قائم رکھتا ہے۔ چنانچہ اس کی زندگی میں روحانی معنویت اور روحانی ہدایات پائی جاتی ہے۔ اور یہ پہلو انسان کی روحانی زندگی کا پہلو ہے جو اس کے اندر بلندی کی استعداد پیدا کرتا ہے۔ اس کے اندر ضبط نفس کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے نتیجے میں انسان ان دنیاوی مرغوبات کے استعمال میں ایک حد اعتدال پر قائم رہتا ہے۔ ایسی حدود کے اندر جس میں نفس کی تعمیر ہو۔ زندگی کا نشوونما ہو اور اس کے ساتھ ساتھ یہ جدوجہد بھی جاری رہے کہ انسانی زندگی کو حیوانیت کے نچلے مقام سے بلند کر کے عالم بالا کے روحانی افق تک پہنچایا جائے۔ انسان کے دل کا تعلق عالم بالا سے قائم ہو اور اس کا ہدف دار آخرت اور اللہ کی رضامندی ہو۔ نفس انسانی کی یہ دوسری جبلت اس کی پہلی فطری جبلت کو مہذب بناتی ہے۔ اور اس کو تمام حیوانی آمیزشوں سے پاک کرتی ہے۔ اور اسے ایسے حدود و قیود کے اندر بند کر دیتی ہے جس کے نتیجے میں فطری میلانات سرکش نہیں ہوتے اور انسان صرف

دنیاوی لذات کا گرویدہ نہیں ہو جاتا۔ اس طرح کہ انسانی روحانی قدریں دب جائیں۔ تقویٰ اللہ خوئی اور زندگی کی اونچی اقدار کی راہیں بالکل مسدود ہو جائیں۔

رُئِیَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ ”لوگوں کے لئے مرغوبات نفس کو مزین بنادیا گیا ہے۔“ بس یہ مرغوبات مستحب ہیں اور لذیذ ہیں..... یہ مکروہ اور غلیظ نہیں ہیں۔ انداز تعبیر ایسا ہے کہ جس سے ان مرغوبات کی غلاظت اور کراہت کا اظہار نہیں ہوتا۔ آیت صرف ان چیزوں کے مزاج اور ان کی حقیقت کو سمجھانا چاہتی ہے۔ اور ان کے اثرات کا اظہار مقصود ہے۔ نیز یہاں مطلوب یہ ہے کہ ان اشیاء کی قدر و منزلت اور ان کے مقام کا تعین کر دیا جائے، تاکہ وہ اس مقام سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ نہ وہ ان اقدار پر دست درازی کر سکیں جو ان کے مقابلے میں اعلیٰ و ارفع ہیں۔ انسان صرف ان دنیاوی شہوات میں غرق ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس کی نظریں دار آخرت پر مسلسل لگی ہوں، اگرچہ وہ بقدر ضرورت ان لذات سے بھی لطف اندوز ہوتا رہے۔

یہاں آکر معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام فطرت انسانی کو ایک حقیقت واقعہ کے طور پر لیتا ہے اور فطری میلانات کا مناسب لحاظ رکھتا ہے۔ اور وہ ان میلانات کو مہذب اور شائستہ بناتا ہے۔ اور ان کو رفعت دیتا ہے۔ وہ کسی صورت میں بھی ان میلانات کی بیخ کنی نہیں کرتا، جو لوگ آج کل علم النفس کے مضمون میں میلانات کی بیخ کنی کے نقصانات بیان کرتے ہیں یا وہ نفسیاتی الجھنوں پر بحث کرتے ہیں جو جذبات کی بیخ کنی کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ نفسیاتی الجھن جذبات کی بیخ کنی سے پیدا ہوتی ہے، وہ جذبات کے ضبط اور تہذیب سے پیدا نہیں ہوتی اور بیخ کنی کا مفہوم یہ ہے تقاضائے فطرت کو گندگی سمجھا جائے اور اس کے ارتکاب کو برا سمجھا جائے۔ ایسا کرنے کا انجام یہ ہوتا ہے کہ ایک فرد مختلف سمتوں سے مختلف قسم کے دو میلانات کے دباؤ میں آ جاتا ہے۔ ایک طرف اس کے شعور اور میلان اس کے نظریہ حیات، اس کے مذہب یا اس کے رسم و رواج کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے۔ مثلاً یوں کہ اس کا نظریہ یہ ہو کہ فطری میلانات تمام کے تمام گندے ہیں۔ ان کا وجود ہی نہیں ہونا چاہئے، اور درحقیقت وہ شیطانی میلانات ہیں۔ لیکن ہوتا یہ ہے کہ کوئی نظریاتی یا کوئی مذہبی شعور

کبھی بھی ان فطری رجحانات کے دبانے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس لئے یہ میلانات فطری ہوتے ہیں اور فطرت کے اندر اس کی گہری جڑیں ہوتی ہیں۔ نیز ان کا تعلق بسا اوقات وظیفہ بقائے انسانیت سے ہوتا ہے۔ ان کے بغیر بقائے انسانیت کا فرض ادا ہی نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی فطرت میں اللہ تعالیٰ نے یہ میلانات یونہی عبث طور پر نہیں ودیعت کئے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں نفسیاتی الجھن پیدا ہوتی ہے۔ اگر ہم ان نفسیاتی مباحث کو تسلیم بھی کر لیں تب بھی یہ بات نظر آئے گی کہ اسلام نے بہت پہلے فطرت انسانی کے ان دونوں رجحانات و میلانات کے اندر توازن پیدا کیا ہے۔ اس نے شہوات اور لذت اور اخلاقی بلندی اور پاکیزگی کے درمیان ایک حسین توازن پیدا کر کے دونوں کو اپنے مقام پر حدود کے اعتدال کے اندر کام کرنے کی اجازت دی ہے۔

رُئِيَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِصَّةِ
وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْخَرْبِ

”لوگوں کے لئے مرغوبات نفس، عورتیں، اولاد، سونے اور چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوشنما بنادی گئی ہیں۔“

عورتیں اور بچے انسانی خواہشات میں بہت ہی قوی اور شدید خواہشات ہیں۔ اور ان کے ساتھ ساتھ سونے اور چاندی کے ڈھیروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ دولت جمع کرنے کو وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ..... سے بیان کیا گیا ہے۔ اور اگر صرف مال و دولت کی مذمت مطلوب ہوتی تو مِنَ الْأَمْوَالِ..... کا لفظ ہوتا ہے مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِصَّةِ..... ہوتا لیکن قناطر مقلطرة یعنی مال و دولت اور سونے چاندی کے ڈھیر کے الفاظ ایک خاص شیڈ و دیتے ہیں۔ اور یہ سونے اور چاندی کے زیادہ سے زیادہ ذخار کا مطلب یہ ہے کہ ایک کہ دولت کا جمع کرنا بذات خود ایک مرغوب چیز ہے۔ رہے اس کے فوائد تو وہ سب کو معلوم ہیں یعنی یہ ڈھیر ایک انسان کے لئے ہر قسم کے شہوات کی فراہمی کا سبب بنتے ہیں۔ عورتوں، اولاد اور ڈھیر سے سونے چاندی کے ساتھ ساتھ یہاں

وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ..... کیا ذکر کیا گیا یعنی چیدہ گھوڑے۔ گھوڑے، جس طرح آج کے اس مادی اور صنعتی دور میں بھی محبوب سواری تصور ہوتے ہیں۔ اس دور میں نہایت ہی محبوب اور مرغوب ہوتے تھے۔ اور یہ اس لئے کہ ان میں حسن و جمال بھی ہوتا ہے۔ وہ ہر شوکت اور سرلیج الحركت ہوتے ہیں۔ ان میں ذہانت اور اپنے مالک کے ساتھ بے حد محبت بھی ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ جن لوگوں نے عملاً گھوڑے سواری نہیں کی ہوتی انہیں بھی اسے دیکھ کر خوب مزہ آتا ہے۔ جب تک ان میں اس قدر زندگی موجود ہو کہ وہ ایک مضبوط اور جوان گھوڑے کو دیکھ کر خوش ہوتے ہوں۔

ان کے بعد ان مرغوبات کے ساتھ ساتھ دوسرے مویشیوں اور زرعی اراضی کا ذکر کیا، مویشی اور زرعی اراضی کے درمیان چولی دامن کا تعلق ہوتا ہے۔ اس لئے ان کا ایک ساتھ ذکر ہوا۔ ذہن میں بھی وہ ساتھ ہوتے ہیں اور حقیقت واقعہ میں بھی۔ مویشی اور کھیت اور تروتازہ کھیت، جہاں نشوونما کا کام جاری رہتا ہے۔ انسان کے پسندیدہ مرغوبات ہیں۔ اس لئے کہ ان کھیتوں میں سے زندگی پھوٹ کر نکلتی ہے۔ اور یہ ایک عجیب نظارہ ہوتا ہے۔ بہت ہی پسندیدہ اور جب اس منظر کے ساتھ یہ شعور بھی وابستہ ہو جاتے کہ اس کھیت اور اس میں چلتی جوڑی کا مالک میں بھی ہوں تو واقعی یہ ایک فطرتاً پسندیدہ منظر ہوتا ہے۔

یہاں جن مرغوبات کا ذکر کیا گیا ہے۔ وہ مرغوبات نفس کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔ ان میں سے بعض ایسی مرغوبات ہیں جو اس سوسائٹی میں اعلیٰ ترین مرغوبات تھیں جن سے قرآن کریم اس دور میں خطاب کر رہا تھا اور بعض مرغوبات ایسی ہیں جو ہر زمانے میں نفس انسانی کے لئے مرغوب ہیں۔ اسلام ان مرغوبات کا ذکر کرتا ہے، ہر ایک کی قدر و قیمت متعین کرتا ہے۔ تاکہ یہ مرغوبات اپنی جگہ قائم رہیں اور زندگی کی دوسری قدروں پر دست درازی نہ کریں۔

ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰۃِ الدُّنْيَا..... ”یہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں۔“ یہ تمام مرغوبات جو پیش کی گئیں یا ان کے علاوہ جو دوسری فطرتاً پسندیدہ چیزیں ہیں..... یہ دنیا کی چند روزہ حیات کے لئے ساز و سامان ہیں..... جو اعلیٰ و ارفع اور دائمی زندگی کا سامان

نہیں ہیں..... نہ یہ ان آفاق عالیہ تک انسان کو بلند کرتے ہیں۔ یہ تو قریب ہی زمین کے اوپر زندہ رہنے کے اسباب ہیں۔ لیکن جو شخص اس سے بہتر مرغوبات چاہتا ہے ان سب زیادہ قیمتی، زیادہ بلند اور پاکیزہ مقاصد چاہتا ہے اور اس لئے چاہتا ہے کہ وہ ان مرغوبات ارضی اور شہوات نفسی میں مستغرق نہ ہو جائے اور بلندیوں تک اونچا ہونے کی بجائے زمین پر ہی پڑا نہ رہے تو جو شخص فی الواقعہ اس دنیائے ادنیٰ سے کہیں بلند آشیانے کی تلاش میں ہے تو قرآن کریم اس مقام بلند تک بھی اس کی راہنمائی یوں کرتا ہے۔

قُلْ أُوْنِسْكُمْ بِخَيْرٍ مِنْ دَلِكُمْ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُطَهَّرَةٌ وَرِضْوَانٌ مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ

”کہو! میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے زیادہ اچھی چیز کیا ہے؟ جو لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں، ان کے لئے ان کے رب کے پاس باغ ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہاں انہیں بیشکی کی زندگی حاصل ہوگی۔ پاکیزہ بیویاں ان کی رفیق ہوں گی اور اللہ کی رضا سے وہ سرفراز ہوں گے۔ اللہ اپنے بندوں کے رویے پر گہری نظر رکھتا ہے۔“

یہ ہے آخرت کا ساز و سامان، جس کا تذکرہ قرآن مجید کرتا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا جاتا ہے کہ آپ اہل تقویٰ مؤمنین کو اس بارے میں خوشخبری دے دیں۔ نعيم اخروی بھی عموماً انسانی خواہش ہی سے تعلق رکھتی ہیں لیکن اس کے اور اس دنیاوی انعام و اکرام کے درمیان ایک بہت ہی بڑا فرق بھی ہے۔ یہ ایک ایسا ساز و سامان ہے جس تک صرف ان لوگوں کی رسائی ہوگی جو اس دنیا میں اہل تقویٰ تھے، جس کے دل خوف اللہ سے بھرے تھے۔ ان کے دل یاد الہی سے معمور تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ کا خوفی کا شعور بیک وقت روحانی دنیا اور حسی دنیا کی اصلاح کرتا ہے۔ وہ نفس انسانی کو شہوات میں مستغرق ہونے سے بچاتا ہے۔ اس کی حفاظت کرتا ہے کہ وہ ان مرغوبات میں جانوروں کی طرح گم نہ ہو جائے۔ جن لوگوں کے دلوں میں خوف خدا ہوتا ہے وہ عالم آخرت کے ان حسی مرغوبات کو بھی غلیظ حسی لذتیت کے مقام سے ذرا بلند دیکھتے ہیں۔ اسے جانوروں کی طرح شہوت رانی سے ذرا اونچا مقام دیتے

ہیں۔ وہ اس زمین پر رہتے ہوئے اپنے دلوں میں اس مقام رفیع کی تمنا رکھتے ہیں، اس سے قبل کہ وہ اس جہاں فانی سے کوچ کریں اور رخصت ہوں۔

عالم آخرت کے اس پاک و صاف اور کامل ساز و سامان میں، اس دنیائے ونی کی ترک کردہ شہوات کا بہترین بدلہ ہے۔ بلکہ وہ انعام ان شہوات سے بہت زیادہ ہے۔ اس دنیا میں اگر وہ ان کھیتوں کے مالک تھے، جو سرسبز و شاداب تھے اور اچھی پیداوار دیتے تھے تو آخرت میں انہیں ایسے باغات دیئے جائیں گے جو مکمل ہوں گے، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ اور اس شعور اور یقین کے ساتھ ہوں گے کہ وہ ان باغوں میں ہمیشہ کے لئے ہوں گے اور وہ باغ بھی دائمی طور پر سرسبز ہوں گے جو موسمی نہ ہوں گے۔ اس دنیا کے موسمی کھیت کی طرح نہ ہوں گے۔ اگر دنیا میں عورتیں اور بچے ہیں تو وہاں بہت ہی پاکیزہ بیویاں ہیں۔ اور ان کی پاکیزگی گویا دنیاوی بیویوں کے مقابلے میں ایک امتیاز ہے اور بہتری ہے۔ رہے چیدہ گھوڑے، مویشی کھیت اور سونے چاندی کے ڈھیر، تو اس دنیا میں یہ وسائل عیش تھے۔ فراہمی مرغوبات کا سبب تھے۔ قیامت میں ان کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ اس لئے وہاں وسائل رغبت کی فراوانی ہوگی۔ اور وہ اپنی بڑی تعداد میں حاصل ہوں گے، پس وسائل کی کیا ضرورت جب مراد حاصل ہو۔

اور وہاں پر ساز و سامان سے بھی ایک عظیم نعمت ہوگی۔ یعنی رب ذوالجلال کی رضامندی۔ یہ رضامندی اس قدر عظیم نعمت ہے جو اس پوری دنیا کی شہوات اور پوری آخرت کی مرغوبات پر بھی بھاری ہے۔ اور پھر ذرا لفظ رضوان پر غور کریں، بذات خود لفظ رضوان کس قدر خوش کن ہے۔ تروتازہ ہے۔ انس و محبت کی خوشبو لئے ہوئے ہے۔

وَاللّٰهُ بِصِيْرٍ بِالْعِبَادِ ”اور اللہ اپنے بندوں پر گہری نظر رکھتا ہے۔“ وہ خوب جانتا ہے کہ ان کی فطرت کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس میں کیا کیا میلانات ہیں، اس فطرت کو کن کن ہدایات کی ضرورت ہے۔ وہ بھی اس کے علم میں ہیں، وہ فطرت انسانی کے امور کے فیصلے کی اچھی بصیرت رکھتا ہے، اس جہاں میں بھی اور آخرت میں بھی، اس لئے کہ وہ صالح فطرت ہے۔

یہاں اب اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کی صفات گنواتے ہیں، یہ کہ اب آپ کے ساتھ ان کا تعلق کیسا ہوتا ہے۔ اور وہ کیا اعمال ہوتے ہیں جن کی بناء بندے جنتوں کے انعامات کے مستحق ہو جاتے ہیں۔

الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا إِنَّنَا آمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۶) الصَّابِرِينَ
وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ وَالْمُسْتَعْفِرِينَ بِالْأَسْحَارِ

”یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ مالک! ہم ایمان لائے، ہماری خطاؤں سے درگزر فرما، اور ہمیں آتش دوزخ سے بچا، یہ لوگ صبر کر نیوالے ہیں راستباز ہیں، فرماں بردار اور فیاض ہیں اور رات کے آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔“ ان کی دعاؤں میں ان کے منہ سے جو بات نکلتی ہے وہ ان کے تقویٰ اور اللہ خونی کا نتیجہ ہوتی ہے وہ اللہ سے ڈر کر پہلے ایمان کا اعلان کرتے ہیں۔ پھر ایمان کو عند اللہ اپنا شفیع بناتے ہیں اور مغفرت طلب کرتے ہیں اور اپنے آپ کو آگ سے بچاتے ہیں۔

ان کی تمام صفات میں سے انسانی زندگی کی اقدار میں سے ایک اعلیٰ قدر کا ذکر ہے۔ خصوصاً جماعت مسلمہ کے لئے ان اقدار کی بہت اہمیت ہے۔ وہ صبر کرنے والے ہیں، صبر میں انسان ہر رنج و الم کو برداشت کرتا ہے۔ اور دعوت اسلامی کی راہ میں جو بھی مشکلا درپیش ہوں ان پر ثابت قدم رہتا ہے۔ دعوت اسلامی کی راہ میں اپنے فرائض سرانجام دیتا ہے۔ وہ اللہ کے سامنے تسلیم و رضا کا پیکر بن جاتا ہے اور حالات اس پر مصائب کے جو پہاڑ بھی توڑیں وہ اللہ کے حکم پر راضی برضا ہوتا ہے۔ وہ سچے ہیں۔ اس لئے کہ سچائی اس کائنات کی بنیاد ہے۔ سچائی کا دامن تھام کر وہ عام لوگوں سے اونچے ہو جاتے ہیں۔ جھوٹ کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کسی فائدے کے لئے یا کسی ضرر سے بچنے کے لئے سچائی چھوڑ دیتا ہے۔

اور فرمان بردار ہیں، یوں حق الوہیت ادا کرتے ہیں اور اپنی جانب سے واجبات بندگی پر کار بند ہوتے ہیں۔ اور صرف اللہ کی بندگی کرتے ہیں جس کے سوا اور کسی کی بندگی ان کے تصور حیات میں نہیں ہے۔

انفاق فی سبیل اللہ کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان دولت کے ہاتھوں ذلیل نہیں ہوتا۔ اور اسے بخل سے نجات ملتی ہے۔ اور انفاق کر کے ایک شخص عملاً انسانی اخوت کو ذاتی خواہش اور لذت پر ترجیح دیتا ہے اور وہ ایسے اجتماعی تحفظ کی فضا پیدا کرتا ہے جو سب انسانوں کے لئے خوشگوار ہو۔

اور رات کے آخری پہر میں استغفار تو ایک ایسا مقام ہے، جہاں گھنی اور خوشگوار چھاؤں، جس کی فضا تروتازہ ہے اور لفظ ”اشحار“ تو اس خاص وقت یعنی طلوع فجر سے قدرے پہلے ایسی خوشگوار اور پرسکون تصویر کشی کرتا ہے جو اپنی جگہ لا جواب ہے۔ یہ ایک ایسا وقت ہوتا ہے جب کائنات نہایت ہی پرسکون ہوتی، فضا صاف ہوتی ہے، اس وقت نفس انسانی کے روحانی تصورات جاگ اٹھتے ہیں۔ اچھے خیالات کا ذہن و قلب پر القاء ہوتا ہے۔ اس پر کیف فضا میں جب انسان کی جانب سے بارگاہ الہی میں استغفار ہو رہا ہو، تو پھر اس کا پر تو بھی نفس انسانی پر نہایت ہی روحانی اثرات ڈالتا ہے۔ اس وقت انسان کی روح اور اس کائنات کی روح رب کائنات اور خالق انسان کے سامنے ہم سبق اور ہم سمت ہو جاتی ہیں۔

ایسے صابروں، ایسے صداقت شعاروں، ایسے ہی اطاعت گزاروں، ایسے ہی دولت نثاروں اور ایسے بخشش کے طلبگاروں کا یہ حق ہوتا ہے کہ اللہ کی رضامندی ان کا استقبال کرے اس لئے کہ وہ اس کے مستحق ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ کی رحمت کی چھاؤں گھنی ہوتی ہے۔ اور اس کا پھل تروتازہ ہوتا ہے۔ اور وہ ہر لذت اور ہر شہوت سے اپنے اندر زیادہ مٹھاس رکھتی ہے۔ اگر ذوق سلیم ہو۔

یوں قرآن کریم، اس زمین کے اوپر سے اسے مخلوق ارضی سمجھتے ہوئے، نفس انسانی کی راہنمائی شروع کرتا ہے۔ آہستہ آہستہ اسے بلند کرتا ہے اور اسے ایک بلند افق پر ملاء اعلیٰ کی روشنیوں تک لے جاتا ہے، اور یہ عمل بڑے آرام سے، بڑی تسلی سے، بڑی نرمی اور شفقت سے وقوع پذیر ہوتا ہے۔ اس

روحانی ترقی میں انسان کی فطرت اور اس کے فطری میلانات کو پوری طرح مد نظر رکھا جاتا ہے۔ اس میں اس کی جسمانی کمزوریوں اور ناتوانیوں کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ اس محبت اور اس کے شوق کو بھی جوش دلایا جاتا ہے۔ اور اس میں کسی فطری جذبے کی بیخ کنی نہیں کی جاتی اور نہ ہی اسے کسی کام پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس مہم کے دوران عام زندگی رواں دواں رہتی ہے۔ اس میں تعطل نہیں پیدا کیا جاتا۔ یہ ہے فطرت اللہ یہ ہے اللہ کا نظام حیات، اس فطرت کے لئے اور اللہ اپنے بندوں کے حال سے اچھی طرح خبر دار ہے وَاللَّهُ بِصِيرٍ بِالْعِبَادِ!



یہاں تک تو اس سورت کا ہدف یہ تھا کہ عقیدہ توحید کو نکھار کر رکھ دیا جائے۔ یوں کہ اللہ ایک ہے۔ وہی اس کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ دنیا میں آنے والے رسول بھی ایک ہیں اور ان کی رسالت بھی ایک ہی اکائی ہے۔ اور یہ بتایا گیا تھا کہ آیات الہی اور افکار الہیہ کے بارے میں اصل اہل ایمان کا رویہ کیا ہوتا ہے اور جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہوتی ہے وہ ان افکار و آیات کتاب کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ انحراف کرنیوالوں کو اپنے انجام بد سے ڈرایا گیا اور اس سلسلے میں ان کی توجہ ماضی اور حال کے منخرین کے انجام بد کو بطور مثال پیش کیا گیا۔ اس کے بعد یہ بتایا گیا کہ عقیدہ توحید اور اسلامی نظریہ حیات ایک عام فطری نظام ہے اور اس میں فطری میلانات کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن متقین کی نظر ان سے بلند ہوتی ہے اور وہ ہر وقت اپنے رب کے سامنے گڑ گڑاتے ہیں۔

لیکن اب یہاں سے لیکر اس سبق کے اختتام تک ایک دوسری حقیقت سے ہمیں روشناس کرایا جاتا ہے۔ اور یہ دوسری حقیقت عقیدہ توحید اور اسلامی نظریہ حیات کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اگر پہلی حقیقت ہے تو دوسری کو بھی موجود ہونا چاہئے۔ وہ یہ کہ حقیقت توحید کا مصداق اور مظہر ہماری زندگیوں میں ہونا چاہئے۔ یہ تمام باتیں اس سبق کے آنے والے حصے میں بیان کی گئی ہیں۔

پہلے حصہ اول کے خلاصے کو پھر ذہن نشین اور مستحضر کیا جاتا ہے تاکہ اس کے نتائج دوسری حقیقت کے ذریعہ مرتب ہوں، اس حصے کا آغاز اس شہادت سے کیا جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔ اس عقیدہ کی شہادت فرشتے بھی دیتے آئے ہیں اور اصحاب العلم بھی اس کی تصدیق کرتے آئے ہیں۔ الہ ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ قوام بھی ہے یعنی اس کائنات کا نگہبان، اور اس کی قیومت کا یہ مفہوم ہے کہ وہ اس کائنات اور اس کے اندر انسان دونوں کو عدل کے مطابق چلاتا ہے۔ اور جب یہ بات مسلم ہے کہ اللہ ہی الہ اور قیوم ہے تو پھر دوسری بات خود بخود مستلزم ہو جاتی ہے کہ یہ اللہ کی بندگی کا اقرار کریں۔ یہ بندگی صرف اس کی ہو، اس کا حکم تمام انسانوں کی زندگی میں نازل ہو۔ اس کے مطابق فیصلے ہوں، تمام بندے اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کریں۔ اس کے سامنے جھکیں، اس ہستی کی اطاعت کریں جو قیوم ہے۔ اس کی نازل کردہ کتاب اور اس کے رسول کی سنت پر عمل پیرا ہوں۔

اور دوسری حقیقت کا اظہار یوں کیا گیا إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ
 ”اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔“ اس لئے اللہ اسلام کے سوا کوئی دین قبول نہیں فرماتے، اور اسلام کیا ہے۔ وہ سر تسلیم خم کرنا، اطاعت کرنا، اور ہر معاملے میں اتباع کرنا۔ اس لئے اللہ کے ہاں مقبول دین صرف عقلی تصور نہیں ہے۔ نہ صرف تصدیق بالقلب دین، دین یہ ہے کہ اس تصور حیات اور اس تصدیق و یقین کے تقاضے بھی پورے کئے جائیں اور تقاضے یہ ہیں کہ لوگ اپنے تمام امور میں شریعت کے مطابق فیصلے کریں۔ اور پھر شریعت جو فیصلہ کرے اسے بطیب خاطر قبول کریں اور اس نظام میں رسول خدا کی اطاعت کریں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم بڑے تعجب خیز انداز میں اہل کتاب کے بارے میں اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے کہ وہ دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ اللہ کے دین پر ہیں لیکن ان کا رویہ یہ ہے کہ جب انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے کہ آؤ اس کے مطابق فیصلہ کریں تو ان میں سے ایک گروہ روگردانی کرتا ہے جس سے ان کے دعوائے دین کی قلعی کھل جاتی ہے اور وہ باطل ہو جاتا ہے اللہ کے نزدیک

مقبول دین صرف اسلام ہے، اور اسلام بغیر سر تسلیم خم کرنے کے نہیں ہے۔ اسلام یہ ہے کہ رسول خدا کی اطاعت ہو اور امور زندگی میں فیصلے کتاب اللہ کے مطابق ہوں۔

یہاں کتاب اللہ سے اعراض اور روگردانی کی علت کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے، اور اس کی ایسی حسی اور واقعی تعبیر کی گئی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرے سے دین پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ اس لئے کہ وہ یوم الحساب کے عدل و انصاف کے تصور پر پوری طرح یقین نہیں رکھتے۔ وہ اس لئے کہ ان کا خیال تھا ”کہ انہیں دوزخ کی آگ میں صرف چند دن رہنا ہو گا۔ اس لئے کہ وہ اہل کتاب ہیں اور ان کے دین کے معاملے میں انہیں ان عقیدوں نے فریب میں ڈال دیا تھا جو انہوں نے جھوٹے طور گھڑے ہوئے تھے۔“ اور یہ ان کے لئے عجیب دھوکہ تھا، غرض اس وقت وہ نہ اہل کتاب ہیں اور نہ اہل دین ہیں۔ نہ مومن ہیں، کیوں؟ اس لئے کہ جب انہیں بلایا جاتا ہے کہ آؤ تمہاری کتاب کے مطابق کسی قضیے کا فیصلہ کریں تو وہ منہ موڑ کر بھاگتے ہیں۔

غرض قرآن کریم اس قطعیت اور جزم کے ساتھ دین کا مفہوم اور دین کی حقیقت یہاں بیان کرتا ہے۔ اس لئے تمام لوگوں کی جانب سے اب اللہ کے ہاں مقبول دین صرف دین اسلام ہے جو واضح صاف اور قطعی ہے۔ یعنی دین اسلام اور اسلام کا معنی ہے کتاب اللہ کے مطابق عدالتوں میں فیصلہ کرنا اور اس کے بعد اسے تسلیم کرنا اور اس پر عمل کرنا۔ اگر کوئی ایسا نہیں کرتا تو وہ دین دار نہیں ہے۔ وہ مسلم نہیں ہے۔ اگرچہ وہ دعوائے دین کرے اور دعوائے اسلام کرے۔ اللہ تعالیٰ دین کی جو حد بیان فرماتے ہیں، جو تعریف کرتے ہیں، جس کی تائید کرتے ہیں وہ وہی ہے جو اوپر ہم نے بیان کیا اور اللہ دین کی تعریف بیان کرنے میں کسی انسان کی خواہش کے تابع نہیں، وہ جس طرح جانتا ہے۔

نہ صرف یہ بلکہ جو شخص کفار کو دوست بناتا ہے۔ (اور سیاق کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار وہ ہیں جو عدالتوں کے اندر کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔) تو اس کا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو گا۔ ”کسی معاملے میں بھی اللہ سے متعلق نہ ہو گا۔ اس کے اور اللہ کے درمیان کوئی رابطہ نہ رہا۔ یعنی صرف اس لئے کہ اس شخص نے کافروں سے دوستی کی، یا کافروں کی نصرت کی یا کافروں سے نصرت

طلب کی۔ اور کافروہ جو اللہ کی کتاب پر اپنی عدالتوں میں فیصلے نہیں کرتے۔ اگرچہ زبانی طور پر وہ دعویٰ کریں کہ وہ دین اللہ پر ہیں۔

کفار کی دوستی سے اس قدر سختی سے منع کیا جاتا ہے کہ اگر تم باز نہ آئے تو اس سے تمہارا دین اپنی اساس سے ختم ہو جائے گا اور قرآن کریم اس تنبیہ اور ڈراوے کے ساتھ ساتھ انہیں اچھی طرح سمجھاتا بھی ہے۔ مسلمانوں کو یہ بصیرت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ ہی اس پوری کائنات میں اصل متصرف الامور ہے۔ وہ سردار ہے۔ اور اسی کے تصرف میں تمام امور ہیں۔ وہی مالک الملک ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے ملک عطا کرتا ہے جس سے چاہتا ہے ملک لے لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس سے چاہتا ہے عزت واپس لے لیتا ہے۔ اور لوگوں کی زندگی کے امور میں اس کا یہ تصرف بھی اس تکوینی تصرف کا ایک حصہ ہے جو وہ اس کائنات کو چلانے کے لئے کرتا ہے۔ دیکھئے وہ رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ وہ مردہ چیزوں سے زندہ چیزوں کو نکالتا ہے اور زندہ چیزوں سے مردہ چیزیں نکالتا ہے۔ اور یہی اس کا قیام بالعدل ہے۔ جس کے ساتھ وہ انسانوں کو تھامے ہوئے ہے۔ اور کائنات کو بھی تھامے ہوئے ہے۔ اس لئے اہل ایمان کو کیا ضرورت ہے کہ وہ اللہ کو چھوڑ کر کفار کے ساتھ دوستیاں قائم کریں۔ چاہے اہل کفار کی قوت بہت زیادہ ہو، ان کا مال بہت زیادہ ہو اور اولاد بہت زیادہ ہو۔

اس مکرر اور موکد ڈراوے اور تنبیہ سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس وقت نوخیز جماعت مسلمہ پر اس نکتے کی اچھی طرح وضاحت نہ ہوئی تھی۔ اور اس وقت اہل اسلام میں سے بعض لوگوں نے اپنے سابقہ خاندانی، قومی اور اقتصادی روابط بحال رکھے ہوئے تھے۔ یہ روابط مشرکین مکہ اور یہودیان مدینہ کے ساتھ بیک وقت تھے، اس لئے دین اسلام کی یہ تفسیر کی گئی اور انہیں اہل کفر کے ساتھ دوستانہ روابط نہ رکھنے کا حکم دیا گیا۔ نیز اس آیت سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے، دنیا میں انسان کی ظاہری قوتوں کی طرف میلان رکھتا ہے، ان سے متاثر ہوتا ہے، اس لئے انہیں بتایا جاتا ہے کہ اصلی قوت

کون ہے، اصلی حقیقت ان لوگوں کی کیا ہے، اور یہ کہ اسلامی نظریہ حیات کیا ہے۔ اور اس کے تقاضے کیا ہیں یعنی عملی زندگی میں۔

اور اس سبق کا خاتمہ اس قطعی فیصلے پر ہوتا ہے کہ اسلام اللہ اور رسول کی اطاعت کا نام ہے اور یہ کہ اللہ کی جانب چلنے کا واحد راستہ یہ ہے رسول اللہ کی اطاعت کی جائے۔ صرف یہ کافی نہیں ہے کہ کلمہ شہادت پر دل سے مجرّد یقین کر لیا جائے اور زبان سے اس کا اقرار کر لیا جائے۔ فرماتے ہیں ”کہہ دیجئے، اگر تم اللہ کو محبوب رکھتے ہو تو میری اطاعت کرو اللہ تمہیں محبوب رکھے گا۔“.....

”کہہ دو، اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو، اگر وہ اس سے منہ پھیریں، تو جان لو کہ اللہ کافروں کے ساتھ محبت نہیں رکھتا۔“..... پس یا تو اتباع ہو گا اور مکمل تابعداری کرو گے تو اللہ بھی اسے پسند کرے گا یا پھر کفر ہو گا جسے اللہ نہایت ہی ناپسند کرتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جس سے ایک مسلمان اور ایک کافر کے راستے جدا ہوتے ہیں۔ اس سبق کے اس دوسرے حصے پر اب تفصیل سے غور ہو گا۔



شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۱۸)

”اللہ نے خود اس بات کی شہادت دی ہے کہ اس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔ اور فرشتے اور سب اہل علم بھی راستی کے ساتھ اس پر گواہ ہیں کہ اس زبردست حکیم کے سوا فی الواقع کوئی الہ نہیں ہے۔“

یہ وہ پہلی حقیقت ہے، جس پر اسلام کے نظریاتی تصورات قائم ہیں یعنی عقیدہ توحید، الوہیت میں توحید، قومیت میں توحید اور یہ کہ اس کائنات کی پوری نگہبانی اصول انصاف و عدل پر منجانب اللہ ہو رہی

ہے۔ اس پہلی حقیقت کے ساتھ اس سورت میں کلام کا آغاز ہوا تھا اللہ لا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ”اللہ وہ ذات ہے جس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے اور وہ زندہ جاوید اور نگہبان ہے۔“ اس آغاز سے ایک تو اسلامی عقیدہ کا اظہار اور توضیح مقصود تھی اور دوسری جانب سے اہل کتاب کے پھیلانے ہوئے شبہات کا رد مطلوب تھا۔ ایک تو خود اہل کتاب کے لئے ان کے موروثی عقیدہ توحید کی تشریح اور توضیح بھی مقصود تھی دوسرے یہ کہ ان کے پھیلانے ہوئے شبہات کا جو اثر اہل اسلام پر ہو رہا تھا اس کی توضیح بھی مقصود تھی، کیونکہ بعض اوقات اہل اسلام بھی ان سے متاثر ہو جاتے تھے۔

اللہ کی شہادت کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے، یہ ہر اس شخص کے لئے کافی و شافی عقیدہ ہے، جو ایمان لاچکا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ اللہ کی گواہی تو ان کے لئے کافی و شافی ہو سکتی ہے۔ جو اللہ پر ایمان رکھتے ہوں، اور جو لوگ ایمان لے آئے ہوں۔ پھر ان کو شہادت کی ضرورت کیا رہتی ہے۔ حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اہل کتاب تو اللہ پر ایمان لاتے تھے لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ اللہ کے لئے اولاد بھی ٹھہراتے تھے اور اس کے لئے شریک بھی ٹھہراتے تھے۔ بلکہ مشرکین مکہ بھی خدا پر ایمان لاتے تھے۔ وہ گمراہ اس حوالے سے ہوتے تھے کہ وہ اللہ کے ساتھ کئی شرکاء بناتے تھے۔ کئی کو اللہ کے مساوی ٹھہراتے تھے۔ اللہ کے لئے بیٹے اور بیٹیوں کے قائل تھے۔ اس لئے جب قرآن کریم نے اس بات کی تصدیق کی کہ خود وہ جس خدا کے قائل ہیں وہ شہادت دے رہا ہے کہ اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہے۔ لہذا یہ شہادت ان کے تطہیر افکار کے لئے ایک مؤثر شہادت تھی۔

نیز یہ معاملہ جس طرح کہ ہم نے اس حصے سے قبل اپنے تبصرے میں اس کا جائزہ لیا ہے۔ یہ ایک بڑا ہی گہرا اور دقیق معاملہ ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کی جانب سے نظریہ توحید پر شہادت اس لئے دی گئی ہے کہ شہادت توحید کے ساتھ اس کے تقاضے بھی وابستہ ہیں اور ان تقاضوں کا ذکر بعد میں آ رہا ہے۔ اور وہ یہ عقیدہ توحید کے حاملین سے بندگی اور اطاعت بھی صرف اس وحدہ لا شریک کی متوقع ہے۔ اور وہ بندگی اور اطاعت بھی صرف اسلام کی شکل میں ہے۔ اور اسلام بھی سر تسلیم خم کر دینے اور مکمل انقیاد کے معنی میں مطلوب ہے۔ اسلام سے مراد صرف شعور، تصور اور عقیدہ مراد نہیں ہے۔ بلکہ اس سے

مراد عمل، اطاعت اور مکمل انقیاد بھی ہے۔ اور یہ انقیاد بھی اسلامی نظام زندگی کی اس شکل و صورت کے مطابق جو قرآن و سنت سے ماخوذ ہے۔ اس پہلو سے ہم دیکھتے ہیں کہ ہر دور اور ہر زمانے میں لوگوں کی اکثریت یہ دعویٰ کرتی ہے کہ وہ ایمان لائے ہیں، لیکن وہ اس اللہ کے ساتھ بے شمار غیروں کو شریک بھی ٹھہراتے ہیں، اس صورت میں جب وہ اپنے فیصلے ایسے قوانین کے مطابق کرتے ہیں جو شریعت پر مبنی نہیں ہیں اور وہ ایسے لوگوں کی اطاعت کرتے ہیں جو اللہ اور رسول کی اطاعت نہیں کرتے، اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے اخلاق و اقدار، اپنے تصورات و افکار اور اپنے حسن و قبح کے پیمانے غیر اللہ سے لیتے ہیں، تو یہ سب باتیں ان کے اس قول سے متصادم ہوتی ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، نیز ان کا یہ طرز عمل خود اللہ کی شہادت کے بھی منافی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔

اب سوال رہ جاتا ہے، ملائکہ اور علماء کی شہادت کا، تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ علماء اور ملائکہ کے مکمل طور پر اللہ اور اس کے اوامر و نواہی کی اطاعت کرتے ہیں، وہ صرف اللہ سے ہدایات لیتے ہیں۔ اور اللہ کی جانب سے جو کچھ نازل ہوتا ہے اس کی پیروی کرتے ہیں۔ نہ اس کے بارے میں بحث و مناظرہ کرتے ہیں۔ اور نہ ہی اس میں کسی قسم کا شک کرتے ہیں۔ بشرطیکہ یہ ثابت ہو جائے کہ یہ بات منجانب اللہ ہے۔ اس سورت میں اولو العلم کا حال بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا تھا۔ وَالرَّاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ يَقُولُونَ آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا..... ”اور علم میں جو لوگ پختہ کار ہیں وہ کہتے ہیں ہم ایمان لائے ہیں، سب کچھ ہمارے رب کی طرف سے ہے۔ یہ ہے اہل علم اور فرشتوں کی شہادت یعنی تصدیق، اطاعت اتباع اور انقیاد اور فرشتوں، اہل علم کی شہادت کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے اور وہ عدل و انصاف کے ساتھ قائم ہے۔ یعنی عدل و انصاف ایک ایسی صفت ہے جو اس کی شان الوہیت کے ساتھ وہ قائم و لازم ہے۔“

شَهِدَ اللَّهُ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ وَالْمَلَائِكَةُ وَأُولُو الْعِلْمِ قَائِمًا بِالْقِسْطِ

”اللہ خود اس بات کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی الہ نہیں ہے اور فرشتے اور سب اہل علم بھی شہادت دیتے ہیں کہ اللہ راستی اور انصاف کے ساتھ قائم ہے۔“ جس طرح عبارت نص سے معلوم

ہوتا ہے قائم بالقسط ایسی حالت ہے جو شان الوہیت کے ساتھ لازم ہے۔ اور یہ اس بات کی وضاحت ہے جو اس سے پہلے سورت میں کہا گیا کہ اللہ قیوم اور نگہبان ہے، مطلب یہ ہوا کہ اس کی نگہبانی عدل پر قائم ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس جہان کے چلانے کے لئے جو تدابیر اختیار کی ہیں، یا یہاں لوگوں کی زندگی کے قیام و دوام کے لئے جو تدابیر اختیار کی ہیں وہ عدل و انصاف کے اصولوں پر کی ہیں۔ اس لئے لوگوں کی زندگیوں میں عدل تب قائم ہو سکتا ہے جب ان کی زندگیاں کتاب اللہ کی شریعت پر استوار ہوں، جس طرح اس کائنات کو نوا میس فطرت کے عادلانہ اصولوں پر قائم کیا گیا ہے اور وہ استوار ہے۔ صرف اسی صورت میں انسان اور فطرت ہم آہنگ ہو کر چل سکتے ہیں، شریعت وہ نظام ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے۔ اگر یہ ہو گا تو اس جہان میں عدل و انصاف نہ ہو گا اور یہاں توازن و اعتدال قائم نہ ہو سکے گا۔ اس کائنات کی چلن اور انسان کی چلن کے درمیان تطابق اور ملائمت نہ ہوگی۔ نتیجہ ظلم، افتراق اور قوتوں کے ضیاع کی صورت میں برآمد ہوگا۔

انسانی تاریخ شاہد عادل ہے کہ اس میں انسانیت نے عدل و انصاف کا مزہ انہیں ادوار میں چکھا جن میں صرف کتاب اللہ کی حکمرانی رہی۔ اور ان کی زندگی اس طرح منظم اور استوار ہوئی جس طرح اس زمین کے گردش منظم اور استوار ہے۔ اس قدر جس قدر انسانی فطرت کے لئے ممکن ہو۔ یعنی فطرت انسانی کے رجحانات اطاعت اور جحانات معصیت کے درمیان توازن ہو۔ اور ان دونوں پلٹروں کے درمیان توازن ہو۔ اور انسان اسلامی نظام زندگی کے قیام اور کتاب اللہ کی حکمرانی کی صورت میں اللہ کی اطاعت کی طرف مائل ہو۔ اگر انسانی زندگی پر کوئی ایسا نظام حکمران ہو۔ جو خود انسان نے بنایا ہو تو اس میں لازماً انسانی جہلات کا دخل ہوگا۔ انسان کے تصور اور ادراک کا تصور اس میں شامل ہوگا۔ اور اس کے نتیجے میں یہ نظام کسی نہ کسی شکل میں ظلم اور تضاد کا شکار ہوگا۔ کبھی ایک فرد پوری سوسائٹی پر ظلم ڈھائے گا، اور کبھی ایک سوسائٹی ایک فرد پر ظلم کر رہی ہوگی، یا کبھی ایک طبقہ دوسرے طبقہ پر ظلم کر رہا ہو گا یا ایک قوم دوسری اقوام پر ظلم کر رہی ہوگی یا ایک نسل دوسری نسل پر ظلم کر رہی ہوگی

’رہا اسلامی نظام زندگی تو وہ ان تمام میلانات رجحانات سے پاک ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اللہ سب کا الہ ہے۔ اور اس ارض و سماء میں کوئی راز مخفی بھی نہیں ہے۔

لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ..... ”اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہی غالب ہے اور وہی حکیم ہے۔“ یہاں اس آیت کے اس ٹکڑے میں دوبارہ وحدت الہیت کو دو اہم صفات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ایک صفت یہ کہ وہ غالب ہے قوت والا ہے اور دوسری یہ کہ وہ حکیم ہے اور قدرت و حکمت دونوں ایسی صفات ہیں جن کا موجود ہونا اللہ کی شان عدل و نگہبانی کے لئے ضروری ہے۔ اس لئے کہ عدل کا مفہوم یہ ہے کہ حقدار کو حق ملے اور اسے حق دلایا جاسکے۔ اور اللہ کی صفات کا تصور یہ ہے کہ مثبت کارکردگی کا شعور دیتی ہے۔ اس لئے کہ اسلام کے تصور خدا میں کوئی سلبیت نہیں ہے۔ ایجاب ہی ایجاب ہے، اور یہ تصور اللہ کا سب سے مکمل تصور ہے۔ سب سے سچا تصور ہے، اور یہ تصور خود اللہ تعالیٰ نے اپنے حوالے سے پیش کیا ہے۔ اور اس مثبت اور ایجابی فعالیت کا اثر انسان پر یہ ہوتا ہے کہ انسان کا دل اللہ کے ارادے سے متعلق ہو جاتا ہے۔ اس لئے انسان کا عقیدہ زندہ اور موثر عقیدہ ہوتا ہے، وہ محض خشک تصور ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر فعالیت اور تروتازگی ہوتی ہے۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

اب اس حقیقت پر جسے اس ایک آیت میں دوبار دہرایا گیا، اس کا فطری نتیجہ مرتب کیا جاتا ہے وہ یہ کہ خدائی ایک ہے تو پھر بندگی اور انقیاد بھی صرف اسی خدائی کے لئے ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ إِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَعِيًّا بَيْنَهُمْ وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۱۹) فَإِنْ حَاجُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ

لِّلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَسْلَمْتُمْ فَإِنْ أَسْلَمُوا فَقَدْ اهْتَدَوْا وَإِنْ
تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ (٢٠)

”اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے، جنہیں کتاب دی گئی تھی۔ ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوانہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لئے ایسا کیا اور جو کوئی اللہ کے احکام ہدایات کی اطاعت سے انکار کر دے، اللہ کو اس سے حساب لینے میں دیر نہیں لگتی۔ اب اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں، تو ان سے کہو۔ ”میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔“ پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو۔ ”کیا تم نے بھی اس کی اطاعت اور بندگی قبول کی۔“ اگر کی تو راہ راست پا گئے۔ اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی۔ آگے خود اللہ اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔“

غرض تصور یہ ہے کہ ایک الہ ہے۔ اس لئے ایک ہی نظام ہے، پھر اس الہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ نہ ان کے تصور میں اس کے سوا کوئی تصور ہو، نہ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ اس نظام سے آزاد ہو..... جب اللہ ایک ہے تو پھر بندگی اور انقیاد بھی اسی کے لئے ہے۔ اور یہی اللہ اس بات کا حقدار بھی ہے کہ لوگ اس کے مطیع فرمان ہوں، ان کے قانونی نظام میں شریعت نافذ ہو اور ان کی اقدار حیات اور حسن و قبح کے پیمانوں میں یہ شریعت معیار ہو۔ اور ان کی پوری عملی زندگی اس شریعت پر قائم ہو۔

اگر ایک اللہ ہے تو پھر تصور حیات بھی ایک ہی ہوگا۔ اور یہ تصور و نظریہ وہی ہوگا جسے اس اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پسند کیا ہے۔ یعنی خالص عقیدہ توحید کا چمکتا ہوا اور صاف ستھرا۔

جس طرح ہم مکرر کہہ آئے ہیں کہ عقیدہ توحید کا پہلا تقاضا یہ ہے۔ اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ..... اللہ کے نزدیک نظام زندگی صرف دین اسلام ہے۔ اور اسلام صرف دعویٰ ہی نہیں ہے۔ وہ صرف جھنڈے کا نام بھی نہیں ہے۔ وہ صرف نعرے کا نام بھی نہیں ہے، وہ صرف ایک تصور اور خام خیال کا نام بھی نہیں ہے جہاں پر دل مطمئن ہو، اور وہ صرف انفرادی عبادات کا نام ہے جنہیں ایک بطور فرد ادا کرتا ہے۔ مثلاً نماز، حج اور روزے، ایسا ہر گز نہیں ہے۔ صرف یہ امور وہ اسلام نہیں ہیں جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں اس کے سوا کوئی دین قبول نہیں کرتا۔ بلکہ اسلام تو مکمل انقیاد کا نام ہے۔ اسلام مکمل عبادت کا نام ہے۔ وہ مکمل اتباع ہے۔ اسلام یہ ہے کہ عدالتوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے ہو رہے ہوں، جس کی تفصیلات عنقریب آرہی ہیں۔

اسلام یہ ہے کہ اللہ کو وحدہ لا شریک سمجھا جائے۔ یہ عقیدہ پختہ ہو کہ اس کائنات کو وہی تھامنے والا ہے۔ جبکہ اہل کتاب ذات باری اور ذات مسیح میں خلط کرتے تھے۔ بلکہ وہ اللہ کے ارادے اور مسیح کے ارادے کو بھی خلط کرتے تھے۔ اور اس موضوع پر خود ان کے درمیان کئی فرقے تھے اور ہر فرقے کا اپنا عقیدہ تھا۔ اور ان کے یہ اختلافات بعض اوقات اس قدر شدید ہو جاتے تھے کہ وہ قتل و غارت پر منہج ہوتے تھے۔ اس لئے یہاں اللہ تعالیٰ اہل کتاب اور جماعت مسلمہ کو بتاتے ہیں کہ ان اختلافات اور فکری ژولیدگی کا اصل سبب کیا تھا۔

وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِينَ اُوتُوا الْكِتَابَ اِلَّا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْعِلْمُ بَخِيًا بَيْنَهُمْ

”اور اس دین سے ہٹ کر جو مختلف طریقے ان لوگوں نے اختیار کئے جنہیں کتاب دی گئی تھی، ان کے اس طرز عمل کی کوئی وجہ اس کے سوا نہ تھی کہ انہوں نے علم آجانے کے بعد، آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے کے لئے ایسا کیا۔“

یہ اختلافات اس لئے نہ تھے کہ انہیں حقیقت واقعہ کا پتہ نہ تھا، کیونکہ اس کے پاس اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے بارے میں فیصلہ کن معلومات آگئی تھیں کہ اللہ صرف ایک ہے، انسان کی فطرت یہ ہے

کہ وہ صرف بندہ ہے، معبود نہیں ہے۔ یہ جو انہوں نے شدید اختلافات پیدا کئے یہ محض ایک دوسرے پر زیادتی کی خاطر کئے۔ ایک دوسرے پر ظلم اور دست درازی کے لئے جواز پیدا کیا گیا۔ ان کے لئے اللہ کے نظام عدل و انصاف میں کوئی جواز نہ تھا، اسلامی نظریہ حیات اور سماوی شریعت یا سماوی کتب میں ایسے اختلافات کے لئے کوئی جواز نہ تھا۔

اس سے قبل ہم مسیحی مورخ کا حوالہ دے چکے ہیں جس میں ہم نے بتایا کہ عیسائیوں کے ہاں سیاسی تحریکات کس طرح جان بوجھ کر مذہبی اختلافات پیدا کرتی تھیں اور یہودی اور عیسائی افکار کے درمیان اختلافات بھی اسی قبیل کے تھے۔ ہم یہ پڑھ چکے ہیں کہ مصر اور شام کے درمیان یہ مذہبی منافرت کس قدر پھیلی ہوتی تھی۔ شام میں چونکہ رومی سلطنت کی حکمرانی تھی۔ اس لئے مصریوں نے اس سیاسی نفرت کی وجہ سے رومی کیتھولک مکتب کو چھوڑ کر دوسرا مکتب فکر اپنایا۔ یا جس طرح روم کے قیصروں میں سے بعض نے یہ کوشش کی یہ تمام عیسائی مکاتب فکر ایک متوسط مکتبہ فکر پر متفق ہو جائیں، تاکہ ان کے زیر انقلاب رعایا کے درمیان فکری اتحاد پیدا ہو جائے، ان کا خیال تھا ایسے مذہب سے سب کے مقاصد پورے ہو جائیں گے۔ گویا عقیدہ ایک کھیل تھا اور اسے بڑی آسانی سے سیاسی اور ملکی مقاصد کے لئے بدلا جاسکتا تھا۔ حالانکہ درحقیقت یہ ایک عظیم ظلم تھا۔ اور یہ ظلم اور تعدی وہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا کرتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اسی حرکت پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے سخت سرزنش ہوتی ہے اور ٹھیک مناسب وقت پر وَمَنْ يَكْفُرْ بِآيَاتِ اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ..... ”اور جو کوئی اللہ کی ہدایات اور احکام کی اطاعت سے انکار کر دے، اللہ کو اس سے حساب لینے میں دیر نہیں لگتی۔“ یہاں اللہ تعالیٰ نے عقیدہ توحید میں اختلاف کرنے کو کفر سے تعبیر فرمایا، اور اہل کفر کو تنبیہ کی اور خوف دلایا کہ میں بہت جلد حساب لینے والا ہوں۔ اس لئے اگر زیادہ مہلت دوں تو یہ لوگ اختلافات اور کفر والحاد میں مزید سرگرداں رہیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیتے ہیں کہ آپ ان لوگوں سے فیصلہ کن بات کر دیں۔ یعنی اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سب سے تاکہ ان کے ساتھ بات چیت فیصلہ کن

مرحلے میں داخل ہو جائے۔ اور اس کے بعد اسے ختم کر دیا جائے، اور آپ اپنے واضح راستے پر اکیلے گامزن ہو جائیں۔

فَإِنْ حَابُّوكَ فَقُلْ أَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلَّهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأُمِّيِّينَ أَسْلَمُوا فَقَدْ اهْتَدَوْا وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ

”اگر یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں، تو ان سے کہو، ”میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔“ پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو ”کیا تم نے بھی اس کی اطاعت اور بندگی قبول کی؟“ اگر کی تو وہ راہ راست پا گئے۔ اور اگر اس سے منہ موڑا تو تم پر صرف پیغام پہنچا دینے کی ذمہ داری تھی..... آگے اللہ خود اپنے بندوں کے معاملات دیکھنے والا ہے۔“

اب مزید وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بہت کچھ کہہ دیا گیا، اس لئے اب یا تو تم لوگ اللہ وحدہ کی الوہیت کا اعتراف کرو، اس کی نگہبانی کا اعتراف کرو اور نتیجتاً اتباع اور انقیاد کرو ورنہ پھر تمہیں اس کا کوئی حل نہ ملے گا۔ اور یہ مباحثہ یوں نہیں جاری رہے گا۔ اور تم توحید اور اسلام سے محروم رہو گے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ رسول اللہ کو صرف ایک لفظ ایسا بتاتے ہیں جو بیک وقت نظریہ حیات اور نظام زندگی کا مظہر ہے۔ اور وہ یہ کہ اگر پھر بھی یہ لوگ تم سے جھگڑیں تو تم صاف کہہ دو کہ ہم نے اس کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ..... میں اسلام لایا اور میرے متبعین بھی، یہاں اہل ایمان کو متبعین کہہ کر اشارہ اس طرف مطلوب ہے کہ اسلام صرف تصدیق ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد اتباع بھی ضروری ہے، اسی طرح یہ تعبیر کہ میرا چہرہ اللہ کے سامنے جھک گیا ہے۔ اس لئے کہ اسلام محض قول و قرار کا نام بھی نہیں ہے۔ نہ صرف عقیدے اور تصور کا نام ہے۔ اس کے مفہوم میں انقیاد بھی داخل ہے۔ اتباع اور اطاعت بھی داخل ہے۔ چہرے کا مطیع ہونا مقصد ہے مکمل انقیاد و اتباع، اس لئے کہ

انسان کے جسم میں چہرے کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ چہرے مہرے ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کس قدر مطیع، متبع، فرمان بردار اور ہر وقت عمل کے لئے چاق و چوبند ہے۔

یہ ہے خود حضرت محمد ﷺ کا اعتقاد اور آپ کا نظام زندگی، نظام مصطفیٰ، اور مسلمان تو ہیں ہی وہ لوگ جو اس کے متبع اور مقلد ہیں، اس کے اعتقاد میں بھی اور اس کے عمل میں بھی اس لئے اب یہ اہل کتاب اور غیر اہل کتاب سے پوچھا جائے۔ اب یہ سوال کیا جائے جو دونوں کیمپوں کے درمیان واضح حد بندی کر دے۔ دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کر دے۔ جس میں کوئی اشتباہ نہ رہے اور دونوں کے درمیان کوئی فکری اختلاط والتباس نہ رہے۔

وَقُلْ لِلَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ وَالْأَقْبِيْنَ أَسْلَمُوا..... ”اہل کتاب اور امیوں (غیر اہل کتاب) سے کہو: ”کیا تم نے بھی سر تسلیم خم کر دیا؟“ یہاں اہل کتاب اور غیر اہل کتاب کا فرق اب ختم کر دیا جاتا ہے۔ اب دونوں ایک ہی مقام پر کھڑے ہیں۔ اہل کتاب اور مشرکین دونوں کو دعوت اسلام دی جاتی ہے اور یہ دعوت اسلام اسی مفہوم کے ساتھ ہے جس کی تشریح ہم کرتے ہیں۔ انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ عقیدہ توحید قبول کریں اللہ کی ذات میں اور اس کی قیومیت اور نگہبانی میں، اس کے بعد انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اس عقیدے کو اپنانے کے بعد پھر مطیع فرمان ہو جائیں اور اطاعت یہ ہوگی کہ وہ اپنی پوری زندگی میں فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کریں، اسلامی نظام زندگی کو اپنائیں فَإِنْ أَشْكُمَا فَقَدْ أَهْتَدُوا..... ”اگر انہوں نے یہ اطاعت قبول کر لی تو راہ راست پا گئے۔“

معلوم ہوا کہ ہدایت کا ظہور صرف ایک ہی شکل میں ہوتا ہے یعنی اسلام کی صورت میں یعنی اس کی ماہیت اور اس طبیعت کے مطابق، اس کے سوا کوئی اور صورت نہیں ہے، کوئی دوسرا تصور نہیں ہے، کوئی دوسرا طریق کار نہیں اور نہ کوئی دوسرا ایسا منہاج ہے جس کے ذریعہ ہدایت حاصل کی جاسکتی ہو۔ اس کے سوا جو بھی اور راستے ہیں وہ سب ٹیڑھے ہیں، وہ سب حیرانی و پریشانی کے راستے ہیں۔ وہ سب زلیغ و ضلال کے راستے ہیں۔

وَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاءُ وَاللَّهُ بِصَيْرٍ بِالْعِبَادِ..... ”اگر وہ منہ موڑیں تو تم پر صرف پیغام پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔“ پیغام پہنچانے کے بعد رسول کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ آپ کا کام ختم ہو جاتا ہے اور یہ اس وقت کی بات ہے جب آپ کو ان لوگوں کے ساتھ قتال کی اجازت نہ دی گئی تھی جو اسلام قبول نہیں کرتے یہاں تک کہ وہ باز آجائیں، بعد کا حکم یہ تھا وہ یا تو مکمل انقیاد اختیار کر لیں اور اسلامی نظام کے مطیع ہو جائیں یا پھر وہ معاہدہ کریں اور جزیہ ادا کر کے اسلامی نظام کے تابع ہو جائیں پھر وہ آزاد ہیں اس لئے کہ اسلام میں عقائد تبدیل کرنے کا کوئی جبر نہیں ہے۔

وَاللَّهُ بِصَيْرٍ بِالْعِبَادِ..... ”اللہ اپنے بندوں کے معاملات سے اچھی طرح باخبر ہے۔“ وہ اپنے علم اور بصیرت کے مطابق ہی ان کے معاملات کو چلاتا ہے اور ان کے تمام امور اسی کے ہاتھ میں ہیں ہر حال میں، اس لئے وہ اپنے بندوں کو اندھیرے میں نہیں رکھتا۔ اور وہ انہیں صاف صاف بتاتا ہے کہ ان کا انجام کیا ہو گا۔ وہ بتاتا ہے کہ گزشتہ تاریخ انسانیت میں اللہ کے باغیوں اور نافرمانیوں کا انجام کیا ہوتا ہے اور اب بھی اس کی سنت وہی ہے۔ فرماتے ہیں:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ أَلِيمٍ (۲۱) أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (۲۲)

”وہ لوگ جو اللہ کی ہدایات و احکامات ماننے سے انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں، جو خلق خدا سے راستی اور عدل کا حکم دینے کے لئے اٹھیں، ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دو، یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت دونوں میں ضائع ہو گئے۔ اور ان کا مددگار کوئی نہیں۔“

یہ ہے ان لوگوں کا حتمی انجام، ان کے لئے دردناک عذاب ہو گا، یہ عذاب دنیا و آخرت دونوں میں ہو گا۔ یہاں بھی وہ اس کی توقع کریں اور آخرت میں تو یقینی ہے ہی..... دنیا اور آخرت میں ان کے اعمال باطل ہوں گے، بے اثر ہوں گے۔ یہ عجیب تصویر کشی ہے، جبوظ کا لغوی معنی ہے۔ کسی مویشی کا زہریلی گھاس چر کر پھول۔ بظاہر تو اس صورت میں ایک مویشی خوب موٹا تازہ ہو جاتا ہے، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ آخر کار برباد اور ہلاک ہو جاتا ہے، یہاں بظاہر تو ان کے بڑے بڑے کارنامے ہیں لیکن قیامت میں ان کا کوئی فائدہ نہ ہو گا اور نہ ان کا کوئی حامی و مددگار ہو گا۔

قرآن کریم نے آیات الہی کا انکار کے ساتھ ساتھ انبیاء علیہم السلام کے قتل کا ذکر بھی کیا۔ جو ناحق قتل کئے گئے، اس لئے کہ قتل انبیاء علیہم السلام کے ساتھ کبھی حق یکجا نہیں ہو سکتا۔ اور ساتھ ہی یہ ذکر کیا کہ وہ لوگ ان افراد کو بھی قتل کرتے تھے جو عدل و انصاف کا حکم دیتے تھے۔ یعنی وہ لوگ انہیں اس لئے قتل کرتے تھے کہ وہ نظام الہی کے قائل اور داعی تھے جو عادلانہ نظام تھا۔ اور اس کے سوا کسی دوسرے نظام کے ذریعہ عدل کا قیام ممکن ہی نہ تھا۔ ان تمام صفات کے ذکر سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ یہ تو بیخ اور تخویف یہود کے لئے تھی۔ کیونکہ یہ ان کی تاریخی صفات ہیں اور ان صفات کے ساتھ وہ مشہور ہیں۔ جہاں بھی ان کا ذکر ہو ذہن اس کی طرف جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ اس میں نصاریٰ سے خطاب ہو، کیونکہ نزول قرآن کے زمانے تک انہوں نے بھی اپنے مذہب کے مخالفین کو ہزاروں کی تعداد میں قتل کیا تھا۔ کیونکہ جو شخص بھی رومی سلطنت کے سرکاری مذہب کے خلاف ہوتا تھا وہ اسے قتل کر دیتے تھے۔ ان میں وہ مسیحی بھی شامل تھے جو توحید کے قائل تھے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بشر سمجھتے تھے۔ اور یہ لوگ ایسے تھے جو نظام حکومت میں عدل و انصاف کا پرچار بھی کرتے تھے۔ یہود و نصاریٰ کے علاوہ یہ حکم ہر زمان و مکان میں تمام ان لوگوں پر صادق آتا ہے جو اس قسم کی متشددانہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہیں اور ہر دور میں کبھی بھی ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی ہے۔

یہاں یہ بات سمجھنے کے قابل ہے کہ قرآن کے الفاظ ”وہ لوگ جو آیات کا انکار کرتے ہیں۔“ سے مراد کیا ہے۔ ان سے مراد صرف یہ نہیں ہے کہ کوئی آیات الہی کا انکار کر کے کلمہ کفر ادا کر دے۔ اس

لفظ کے مفہوم میں یہ شامل ہے کہ کوئی وحدت الہیہ یا عقیدہ توحید کا قائل نہ ہو، پھر وہ صرف اللہ کی بندگی کا قائل نہ ہو۔ اور اس میں یہ بات از خود آجاتی ہے کہ کوئی مصدر اور منبع کا قائل نہ ہو جہاں سے انسانی زندگی کے لئے قانون سازی کی جاتی ہے اور حسن و قبح کی اقدار کا تعین کرنا ہے یعنی کتاب اللہ کا، اس لئے جو شخص ان امور میں بھی اللہ کے ساتھ کسی اور کو شریک کرے گا وہ بھی مشرک تصور ہو گا اور الوہیت کا منکر شمار ہو گا۔ اگرچہ وہ فقط زبان سے اسے ایک ہزار بار جھپتار ہے۔ اس مفہوم کا قیاس اظہار آنے والی آیات میں ملے گا۔

الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُونَ (۲۳) ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ (۲۴) فَكَيْفَ إِذَا جُمِعْنَا لَهُمْ لَيُومٍ لَا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۲۵)

”تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے۔ ان کا حال کیا ہے؟ انہیں جب کتاب الہی کی طرف بلایا جاتا ہے، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلے کرے، تو ان میں سے ایک فریق پہلو تہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے منہ پھیرتا ہے۔ ان کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ ”کہ آتش دوزخ تو ہمیں مس تک نہ کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو بس چند روز“ ان کے خود ساختہ عقیدوں نے ان کو اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔ مگر کیا بنے گی ان پر جب ہم انہیں اس روز جمع کریں گے جس کا آنا یقینی ہے؟ اسی روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ پورا پورا دیدیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہو گا۔“

یہ سوال سوالیہ ہے اور اسی سے ان کے اس عجیب اور متضاد موقف کی تشہیر مطلوب ہے۔ یہ موقف ان لوگوں نے اختیار کیا ہے جنہیں کتاب الہی کا ایک حصہ بھی خوش قسمتی سے ملا۔ مثلاً یہود کو تورات اور عیسائیوں کو انجیل کی شکل میں، اور یہ کتابیں کتاب اللہ کا حصہ اس اعتبار سے ہیں کہ کتاب اللہ تو وہ تمام ریکارڈ ہے جو اللہ کی طرف سے کسی بھی زمان و مکان میں کسی نبی پر اترا۔ کیونکہ اللہ کے ہاں اللہ بھی ایک ہے۔ نگہبانی بھی ایک ہے۔ اور حقیقتاً کتاب بھی ایک ہے۔ یہود و نصاریٰ کو تو اس کا ایک حصہ ملا اور مسلمانوں کو پوری کتاب ملی۔ اس لئے کہ قرآن کریم اصول الدین کا جامع ہے۔ اور سابقہ کتب کی توثیق کرتا ہے۔ یہ سوال ان لوگوں سے کیا گیا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا۔ تاکہ وہ کتاب ان کے درمیان برپا شدہ اختلافات کا بھی فیصلہ کر دے۔ ان کے تمام امور حیات میں وہ فیصلہ کن ہو۔ ان کی معیشت اور معاش میں وہ فیصلہ کن ہو۔ تو وہ اس دعوت کو قبول نہیں کرتے۔ ان کا ایک فریق اس سے پیچھے ہٹ منہ موڑ دیتا ہے۔ اور کتاب الہی اور شریعت الہیہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتا لہذا یہ ایک ایسا موقف ہے جو ایمان کے خلاف ہے اور وہ ان کے اس دعوے کے بھی خلاف ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں۔

الَّذِينَ آمَنُوا وَتَرَىٰ فِي كِتَابِ اللَّهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّىٰ فَرِيقٌ مِنْهُمْ مَعْرَصُونَ

”تم نے دیکھا نہیں کہ جن لوگوں کو کتاب کے علم میں سے کچھ حصہ ملا ہے۔ ان کا حال کیا ہے؟ انہیں جب کتاب الہی کی طرف بلایا جاتا ہے، تاکہ وہ ان کے درمیان فیصلے کرے، تو ان میں سے ایک فریق اس سے پہلو تہی کرتا ہے اور اس فیصلے کی طرف آنے سے منہ پھیرتا ہے۔“

اسی طرح اللہ تعالیٰ بعض اہل کتاب کے طرز عمل پر تعجب کا اظہار فرماتے ہیں، سب کے نہیں بعض کے طرز عمل پر کہ انہیں یہ دعوت دی جاتی ہے کہ وہ اپنے نظریاتی امور میں اور اپنے عملی امور میں کتاب الہی کی طرف رجوع کریں اور اس کا انکار کر دیں۔ وہ یہ انکار مسلمان ہوتے ہوئے کیسے کر سکتے ہیں، مسلمان بھی ہیں اور شریعت کو انہوں نے اپنی زندگی سے بدر کیا ہوا ہے۔ اور یہ یقین پھر بھی کئے جارہے ہیں کہ وہ مسلم ہیں۔ یہ تعجب انگیز سوال اس لئے کیا جا رہا ہے تاکہ مسلمان بھی سمجھ لیں کہ

حقیقت دین کیا ہے۔ اور حقیقت اسلام کیا ہے۔ اس لئے کہ ایسا نہ ہو کہ وہ اللہ کے ہاں اضحو کہ بن جائیں اور اس کی جانب سے ایسے سوال کا سامنا کرنا پڑے۔ اہل کتاب جو اسلام کے مدعی نہیں ہیں اگر ان کا حال یہ ہو گا اگر وہ کتاب اللہ کے مطابق اپنے فیصلے نہ کرائیں تو پھر اہل اسلام کے لئے ایک لمحہ فکریہ ہے۔ کہ اگر وہ اپنے فیصلے اللہ کی کتاب اور شریعت کے مطابق نہیں کرتے تو وہ اللہ کی جانب سے کس قدر نکیر، استنکار، تعجب اور قابل نفرت اور مضحکہ خیزی کے مستحق ہوں گے۔ یہ ایک ایسا تعجب ہے جو رفع نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک عظیم مصیبت ہے جس کا اندازہ نہیں کیا گیا۔ اور یہ اللہ کا اس قدر عظیم غضب الہی کو دعوت دینا ہے جس کے نتیجے میں ایک مسلم غضب الہی کا مستحق ہو سکتا ہے اور راندہ درگاہ بھی ہو سکتا ہے۔ اور اللہ کی رحمت سے محروم بھی ہو سکتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَنْ تَمْسَسَنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ وَغَرَّهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْضَحُونَ

”ان کا یہ طرز عمل اس وجہ سے ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ ”کہ آتش دوزخ تو ہمیں مس تک نہیں کرے گی اور اگر دوزخ کی سزا ہم کو ملے گی بھی تو چند روز“ ان کے خود ساختہ عقیدوں نے ان کو اپنے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال رکھا ہے۔“

یہ ہے ان کے اعراض کا اصل سبب، جس کی وجہ سے وہ کتاب اللہ کے مطابق اپنے فیصلے نہیں کراتے۔ اور ان کے موقف میں یہ تناقض ان کے اس دعوے کے باوجود ہے کہ وہ اہل کتاب ہیں، دراصل وہ قیامت کے دن حساب و کتاب کے بارے میں سنجیدہ ہی نہیں ہیں۔ یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن پورا پورا انصاف دین گے۔ اس پر انہیں کوئی بھروسہ نہیں ہے اور یہ بات ان کے اس قول سے اچھی طرح ظاہر ہوتی ہے کہ دوزخ کی آگ انہیں مس تک نہ کرے گی۔ اگر کوئی سزا ہوگی تھی تو وہ چند روزہ ہوگی۔ اگر یہ حقیقت نہیں تو پھر کیوں انہیں آگ نہیں چھوئے گی۔ اور ان کو چند روزہ سزا ہی کیوں ہوگی۔ وہ اصول الدین سے کیوں پھر گئے ہیں۔ وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کیوں نہیں کراتے۔ اگر ان کا اللہ کے عدل و انصاف پر یقین ہے تو پھر ان کا یہ موقف کیوں ہے؟ یہ ممکن نہیں ہے اگر

انہیں یوم الآخرۃ کے حساب کا یقین ہوتا تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتے۔ یہ دراصل وہ جھوٹ بولتے ہیں جس پر خود انہیں بھی یقین نہیں اور وہ اپنے ان خود ساختہ عقائد کے جال میں خود پھنس گئے ہیں وَعَرَّضْهُمْ فِي دِينِهِمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ..... ”ان کے خود ساختہ عقیدوں نے ان کو ان کے دین کے معاملے میں بڑی غلط فہمیوں میں ڈال دیا ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ اگر کسی دل میں قیام قیامت کا صحیح عقیدہ موجود ہے تو وہ شخص قیامت کے دن کے حساب و کتاب اور اللہ کی جانب سے عدل و انصاف کے بارے میں وہ سو قیانہ تصورات نہیں اپنا سکتا جو یہ لوگ اپنائے ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کسی معقول شخص کے دل و دماغ میں خوف آخرت اللہ کے مقابلے میں حیا دارانہ موقف ہونے کے بعد یہ بات آہی نہیں سکتی کہ اسے کتاب الہی کے مطابق فیصلے کے لئے بلایا جائے اور وہ انکار کر دے یا اعراض کر دے۔

آج ہمارے دور میں بھی مسلمانوں کی حالت ایسی ہی ہے جیسا کہ اہل کتاب کی تھی۔ آج کے مسلمان بھی بزم خود مسلمان ہیں۔ اور جب انہیں یہ دعوت دی جاتی ہے کہ آؤ کتاب اللہ کے مطابق اپنے فیصلے کرائیں اور شریعت نافذ کر دیں تو وہ روگردانی کرتے ہوئے اس بات سے انکار کرتے ہیں ان میں بعض کھاتے پیتے لوگ اس قدر بے حیا ہو گئے ہیں۔ زندگی دنیا کا نام ہے اور دنیا کے ساتھ دین کا تعلق کیا ہے۔ ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ لوگوں کی روزن مرہ کی عملی، اقتصادی اور اجتماعی روابط کے اندر دین کو گھسیڑنے کی ضرورت ہی کیا۔ بلکہ اب وہ کہتے ہیں کہ خاندانی زندگی میں بھی دین کی ضرورت نہیں ہے۔ اور ان خیالات کے حامل ہونے کے بعد بھی وہ مسلسل یہ دعویٰ کئے چلے جا رہے ہیں کہ وہ مسلمان ہیں۔ اس کے بعد ان میں سے بعض اس احمقانہ دھوکے میں مبتلا ہیں کہ اللہ انہیں پاک و صاف کرنے کے لئے صرف چند روز تک آگ میں ڈالے گا۔ اس کے بعد وہ جنت کی طرف لے جائے جائیں گے۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ مسلمان نہیں ہے۔ یہ حقیقت نہیں ہے۔ اور یہ اہل اسلام بھی دین سے اسی طرح دور ہو گئے ہیں جس طرح اہل کتاب دور ہو گئے تھے۔ اور یہ لوگ دراصل دین سے اس طرح بسہولت نکل گئے ہیں جس طرح کسی کے ہاتھ سے مچھلی چھوٹ جاتی ہے۔ یہ اس حقیقت سے نکل گئے

جسے اللہ نے پسند فرمایا تھا۔ اس لئے اسلام سے مراد انقیاد اور اطاعت ہے۔ اور زندگی کے ہر شعبے میں اللہ سے ہدایت اور تعلیم لینے کا نام اسلام ہے۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

”مگر کیا بنے گی ان پر جب ہم انہیں اس روز جمع کریں گے جس کا آنا یقینی ہے؟ اس روز ہر شخص کو اس کی کمائی کا بدلہ پورا پورا دیدیا جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہوگا۔“..... کیا حال ہوگا؟ یہ ایک خوفناک دہمکی ہے۔ دل مومن کانپ اٹھتا ہے، وہ سنتے ہی محسوس کرتا ہے کہ وہ دن نہایت ہی خوفناک اور سنجیدہ ہوگا، اللہ کے سامنے پیشی کا دن ہوگا۔ اس صحیح عدل ہوگا۔ اس دن کا تصور اور اس کا صحیح شعور ان باطل تصورات اور ان کے خود گھڑے ہوئے تصورات سے کوئی میل نہیں کھاتا۔ اس تہدید اور تنخویف کے بعد یہ حکم قائم ہے۔ یہ مشرکین کے لئے بھی ہے، ملحدین کے لئے بھی دعوائے اسلام رکھنے والے اہل کتاب کے لئے بھی اور آج کے مسلمانوں کے لئے بھی جو اپنی زندگیوں میں اسلام کو صحیح طرح نافذ نہیں کرتے۔ ان لوگوں کا اس دن کیا حال ہوگا جس کے آنے میں کوئی شک نہیں اور جس میں ہم ان سب کو جمع کریں گے۔ اور جس دن اللہ تعالیٰ کا نظام عدل اپنے طریقوں پر چلے گا۔ اور ہر شخص کو اس کی کمائی کا صلہ مل جائے گا۔ پورا پورا بغیر کسی ظلم اور بغیر کسی لحاظ کے، کسی پر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔ گو اللہ کے حساب میں کوئی روع رعایت ان سے نہ ہوگی۔..... آیت میں سوال کر دیا گیا ہے، لیکن اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا، دل کانپ اٹھے، بدن دہل گیا اور جواب از خود آنکھوں کے سامنے تھا۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

اس کے بعد ہر مومن اور خود رسول اللہ ﷺ کو ہدایت دی جاتی ہے کہ وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوں، اللہ کو اپنی الوہیت میں ایک سمجھتے ہوئے، اسے اس جہاں کا واحد نگہبان سمجھتے ہوئے، خود بشر کی

زندگی میں بھی اور اس کائنات کی تدبیر میں بھی کیونکہ یہ دونوں پہلو اللہ کی خدائی اور اس کی حاکمیت کے مظاہر ہیں اور ان میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ نہ اس کا کوئی مثل اور شبیہ ہے۔

قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكُ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۶) تُوَلِّجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوَلِّجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَمِيتِ وَتُخْرِجُ الْمَمِيتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۷)

”کہو خدا یا مالک کے مالک! تو جسے چاہے، حکومت دے اور جس سے چاہے، حکومت چھین لے جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلیل کر دے، بھلائی تیرے اختیار میں ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں، جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو، اور جسے چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔“

یہ نہایت ہی دھیمی اور پر مشیت آواز ہے۔ اس کی لفظی ترکیب دعائیہ ہے۔ لیکن اس کی روح میں گہری معنویت اور خشوع و خضوع ہے۔ اس میں اس..... کھلی کائنات کی کھلی کتاب پر نظر التفات ڈالی گئی ہے۔ بڑی نرمی اور بڑی محبت کے ساتھ انسان کے شعور میں ابال آتا ہے اس کو بتایا گیا ہے کہ وہ باری مدبر کائنات ہے اور ساتھ ہی انسانی امور کا بھی مدبر ہے۔ اس کی ہمہ گیر تدبیر کو یکجا کر کے ایک عظیم حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ وہ عظیم سچائی یہ ہے کہ اس کائنات کا الہ اور نگہبان اور اس کے اندر اس انسان کا الہ و نگہبان ایک ہی ہیں۔ یہ انسان اس کائنات کا ایک حصہ ہے۔ وہ اس سے علیحدہ کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اور دونوں میں اصل متصرف اللہ ہے۔ صرف اللہ کے نظام زندگی سے اس کائنات کی شان ہے۔ انسان کا فریضہ بھی یہی ہے۔ اور جس طرح یہ کائنات اللہ کے دین سے خارج نہیں ہو سکتی

۔ اسی طرح انسان کے لئے بھی دین الہی سے خارج ایک قسم کا انحراف ہے، حماقت ہے اور فساد ہے۔ اللہ فرماتے ہیں:

قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعْزِزُ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ

”کہو اے ملک کے مالک! تو جسے چاہے حکومت دے اور جس سے چاہے، چھین لے، جس کو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلیل کر دے۔“

یہ وہ حقیقت ہے، جو عقیدہ وحد الوہیت کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہے۔ ایک خدا کا مفہوم یہ ہے کہ وہی ایک مالک ہے۔ وہ مالک الملک ہے۔ اس کے ساتھ اس میں کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی جانب جو کچھ چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور اس کی یہ عطا عاریتاً ہوتی ہے جب چاہتا ہے اور جس سے چاہتا ہے اپنا ملک واپس لے لیتا ہے۔ اس لئے یہاں کوئی کسی چیز کا بھی اصلی مالک نہیں ہے کہ اپنی ذاتی خواہش کے مطابق اس میں تصرف کرے۔ انسانوں کی ملکیت عارضی ہے۔ عطائی ہے۔ اور یہ ان شرائط و قیود کے تحت ہے جن کے تحت عطا کنندہ نے عطا کی ہے۔ اس کی تعلیمات کے تحت حکومت اور ملکیت میں تصرف ہوگا۔ اگر عطا کنندہ کے شرائط کے خلاف کیا گیا تو وہ باطل ہوگا۔ اس دنیا میں مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس قسم کے ہر تصرف کو مسترد کر دیں اور آخرت میں خود اللہ تعالیٰ ایسے شخص سے حساب و کتاب لیں گے۔

نیز یہ اس کے اختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہے عزت بخشے اور جسے چاہے ذلیل کر دے۔ اس کے حکم اور ارادہ کی راہ میں کوئی رکاوٹ ڈالنے والا نہیں ہے۔ اس پر کسی کا کوئی جبر نہیں اور اس کے فیصلوں کو کوئی رد کرنے والا بھی نہیں ہے۔ وہ صاحب الامر ہے۔ تمام امور اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہی اللہ ہے اور شرک سے پاک، اور اس کے اس اختصاص اور اس کبریائی میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اس نگہبانی میں سب کا بھلا ہے۔ وہ اس کائنات اور انسان کی نگہبانی انتہائی عدل کے اصولوں پر کرتا ہے۔ جسے چاہتا ہے مملکت اور سلطنت دیتا ہے۔ اور جس سے چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ اور یہ سب کچھ انصاف و عدل کے ساتھ۔ جسے چاہتا ہے معزز بنادیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے اور یہ سب کچھ عدل کے ساتھ۔ وہ ہر حالت میں خیر ہی خیر ہے۔ ”اس کے ہاتھ میں بھلائی ہے۔“ ”وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔“

انسانی امور کی نگہبانی اور انسانی معاملات کا بھلائی کے ساتھ یہ انتظام یہ سب کے سب اس کے اس عظیم اور عظیم تر کائنات کی تدبیر کا ایک حصہ ہے۔ اور اس وسیع اور عریض نظام حیات کا ایک پر تو وہ فرماتا ہے۔

تُولِجُ اللَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُولِجُ النَّهَارَ فِي اللَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ
وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِخَيْرٍ حَسَابٍ

”تورات کو دن میں پروتا ہوا لے آتا ہے اور دن کو رات میں، جاندار میں سے بے جان کو نکالتا ہے اور بے جان میں سے جاندار کو، اور جسے چاہتا ہے بے شمار رزق دیتا ہے۔“

اس عظیم حقیقت کو ایک تصویر کشی کے انداز میں بیان کیا گیا ہے، جس کی ایک جانب قلب و شعور خوشی سے بھر جاتے ہیں اور دوسری جانب حواس اور نظر بھی مزے لیتی ہے۔ ایک غیر محسوس باہم حرکت رات اور دن کی شکل اختیار کرتی ہے۔ رات دن میں بدلتی ہے اور دن رات میں پرویا جاتا ہے اور شب و روز سلسلہ تسبیح کے دانے نظر آتے ہیں، مردہ سے زندہ چیز نکل رہی ہے اور زندہ سے مردہ، اور یہ حرکت اور مسلسل حرکت بلاشبہ یہ بتا رہی ہے کہ اس نظام میں خدائے حکیم کا ہاتھ ہے۔ جو شخص غور سے اور کان لگا کر سنے، اسے معلوم ہو گا کہ اس کائنات سے گہری صداقت پر مبنی آواز آرہی ہے۔

رات کو دن میں داخل کرنے اور دن کو رات میں داخل کرنے کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ گرمیوں میں رات کا ایک حصہ دن میں بدل جاتا ہے اور سردیوں میں دن کا حصہ رات بن جاتا ہے اور یہ

مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ رات کی تاریکی میں دن کی روشنی نفوذ کرتی ہے اور دن کی روشنی میں رات داخل ہوتی ہے، جو مفہوم بھی مراد ہو، لیکن اس منظر میں حسی طور پر نظر آتا ہے کہ دست قدرت ارض و سما کو حرکت دے رہا ہے اور یہ زمین جو ایک تاریک کمرہ ہے وہ سورج کے روشن کرے کے سامنے اپنے محور پر گردان ہے۔ یوں تاریک حصہ روشن حصے سے بدلتا رہتا ہے اور روشن تاریک سے یوں دھیرے دھیرے رات کی تاریکی دن کی روشنی کی طرف آرہی ہے۔ اور دن کی روشنی رات میں بدلتی ہے۔ آہستہ آہستہ رات لمبی ہوتی ہے اور دن کو کھاتی جاتی ہے اور اس طرح غیر محسوس طور پر دن بڑا ہوتا ہے اور رات کو کھاتا جاتا ہے۔ اور یہ ایک ایسی حرکت ہے جس کے بارے میں کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کی تتائیں اس کے ہاتھ میں ہیں۔ اور نہ ہی کوئی عقل مند یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ حرکت اتفاقاً کسی مدبر کی تدبیر کے بغیر ہی شروع ہو گئی۔

اسی طرح زندگی اور موت کا عجوبہ بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ زندگی موت کی طرف بڑھتی ہے اور موت سے زندگی نمودار ہوتی ہے۔ اور یہ کام بڑے آرام اور سکون سے ہوتا ہے۔ ایک زندہ مخلوق پر جو لمحہ بھی گزرتا ہے، اس میں زندگی کے ساتھ اس موت بھی طاری ہوتی رہتی ہے۔ اور اس کی زندگی کو موت کھاتی جاتی ہے۔ اور اس سے پھر حیات نمودار ہوتی ہے۔ ایک زندہ چیز سے خلئے مر جاتے ہیں اور ختم ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی جگہ جدید خلئے پیدا ہوتے ہیں اور کام کرتے ہیں۔ اور جو خلئے مر جاتے ہیں وہ دوسرے دور میں دوبارہ زندہ ہوتے ہیں۔ اور ان میں سے جو زندہ ہو گئے وہ دوسرے کے دور میں پھر مر جاتے ہیں۔ یہ حالت تو ایک زندہ جسم کی ہے۔ اب موت کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور یہ تمام زندہ مر جاتا ہے، لیکن اس کے خلئے ذرات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں جو دوسری ترکیب میں آتے ہیں اور دوسرے زندہ جسم میں آتے ہیں اور یہ زندگی اس میں داخل ہوتی ہے۔ یوں رات اور دن یہ دورہ یوں ہی چلتا رہتا ہے۔ اور کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ خود ان زندہ مخلوقات میں سے کوئی مخلوق تیار کر سکتا ہے۔ اور نہ ہی کوئی اس بات پر یقین کر سکتا ہے کہ موت و حیات کا یہ نظام از خود اتفاقاً اور مصادفہ قائم ہو گیا ہے۔

اس پوری کائنات میں ایک حرکت جاری ہے اور ہر موجود کے جسم کے اندر ایک حرکت جاری ہے۔ یہ ایک عظیم حرکت ہے مگر نہایت ہی خفیہ، نہایت ہی گہری اور نہایت ہی لطیف، قرآن کا یہ مختصر اشارہ اس مسلسل ذات کا انکشاف کرتا ہے انسان کے دل و دماغ کو ایک اشارہ دیا جاتا ہے اور اس حرکت سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ وہ قادر ہے، از سر نو پیدا کرنے والا ہے۔ اور مدبر ہے، کوئی شخص بھی یہ سعی نہیں کر سکتا کہ وہ اپنی کسی بھی تدبیر اور بہبود میں اللہ تعالیٰ سے علیحدہ ہو جائے جو لطیف اور مدبر ہے۔ اور کس طرح وہ اپنے لئے از خود کوئی نظام تجویز کر سکتے ہیں۔ جو خود ان کی اپنی خواہش نفس پر مبنی ہوں، اس لئے کہ وہ اس کائنات کا حصہ ہیں اور اس کائنات کی تنظیم وہ حکیم و خیر ہی کر رہا ہے۔

پھر وہ کس طرح ایک دوسرے کو غلام اور بندے بنا سکتے ہیں اور کیا جواز ہے کہ بعض دوسرے کے لئے رب اور الہ بن جائیں۔ حالانکہ سب کا روزی رساں اللہ ہے۔ اور سب لوگ اللہ کے عیال ہیں۔ فرماتے ہیں

وَتَزِدُّهُم مِّنْ تَشَاءِ بِغَيْرِ حِسَابٍ..... ”اور تو جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔“

یہ ایک آخری ڈچ ہے اور اس سے انسانی دل پر حقیقت کبریٰ منکشف ہو جاتی ہے۔ وہ کون سی حقیقت ہے؟ یہ کہ الہ ایک ہی ہے یعنی اللہ، وہی ایک کائنات کا نگہبان ہے۔ وہی ایک ذات ہے جو فعال ہے۔ وہ ایک ہی ہے جو مدبر ہے، وہی مالک ہے، وہی مدبر ہے۔ وہی داتا ہے، اور دین بھی اسی کا ہے۔ وہی مالک الملک ہے، وہی معز اور مدل ہے۔ وہی زندہ کر نیوالا اور مار نیوالا ہے۔ وہی دینے والا اور لینے والا ہے۔ وہی اس کائنات کا مدبر ہے جو نظام عدل پر تدبیر کرتا ہے وہی ہے جو بھلائی ہی بھلائی ہے۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

اس سے پہلے، اہل کتاب کے موقف پر استنکار اور تنبیہ کی گئی تھی، یہ آخری تبصرہ بھی اس کی مزید تائید ہے۔ پہلے اہل کتاب کے اس رویے کی مذمت کی گئی تھی۔ کہ انہیں جب اس بات کی طرف بلایا

جاتا ہے کہ آؤ اپنے فیصلے کتاب اللہ کے مطابق کریں تو وہ اس بات سے بھی اعراض کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں سمجھایا گیا تھا کہ کتاب اللہ اسی نظام زندگی پر مشتمل ہے۔ جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے اتارا اور یہ پوری کائنات بھی منہاج الہی کے مطابق رواں دواں ہے۔ جس میں خود انسان بھی شامل ہے۔ یہ اس بات کی تمہید تھی جو آگے آرہی ہے کہ مومنین کے لئے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اہل ایمان کے مقابلے میں کافروں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم، اس لئے کہ کافروں کی اس کائنات میں کوئی قوت نہیں ہے۔ نہ ان کا یہاں اختیار چلتا ہے، یہاں تو تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اللہ ہی اہل ایمان کا ولی و مددگار ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاتَ وَيَحْذَرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ (۲۸) قُلْ إِنْ تَخْشَوْا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْذَوْهُ يَعْلَمُهُ اللَّهُ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۲۹) يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا وَيَحْذَرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ (۳۰)

”مومنین، اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ ہاں یہ معاف ہے کہ تم اُن کے ظلم سے بچنے کے لئے بظاہر ایسا طرز عمل اختیار کر جاؤ مگر اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور تمہیں اس کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔ اے نبی لوگوں کو خبردار کر دو کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے خواہ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ بہر حال اسے جانتا ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں اور اس کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے۔ وہ دن

آنے والا ہے جب ہر نفس اپنے کئے کا پھل پائے گا۔ خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی، اسی روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اس سے دور ہوتا، اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے۔“

سابقہ آیت میں قرآن کریم نے اہل ایمان کے اس شعور کو بیدار کیا تھا کہ تمام امور اللہ کے ہاتھ میں ہیں، ہر قسم کی قوتوں کا مالک وہ ہے۔ تمام تدابیر وہ اختیار کرتا ہے اور رزق صرف اس کے ہاتھ میں، تو اب یہاں سمجھایا جاتا ہے کہ اہل ایمان پھر کس غرض کے لئے کافروں کے ساتھ دوستیاں قائم کرتے ہیں۔ قلب مومن میں یہ دو متضاد امور کس طرح جمع ہو سکتے ہیں۔ ایک طرف اللہ پر ایمان اور اللہ سے محبت دوسری جانب اللہ کے دشمنوں سے محبت جن کا حال یہ ہے کہ جب انہیں اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ اس کے مطابق فیصلے کئے جائیں تو وہ اس سے اعراض کرتے ہیں۔ اس لئے یہاں یہ شدید دہمکی دی گئی ہے کہ اگر مومن ایسے لوگوں سے محبت کرتا ہے جو کتاب اللہ اور شریعت کے مطابق فیصلے نہیں کرتے تو ان کا ایمان خطرے میں ہے۔ کفار کے دوستی مختلف شکلوں میں ممکن ہے۔ دل سے محبت کرے، ان کی مدد کرے یا ان سے مدد مانگے یہ سب موالات الکفار ہے۔

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ

”مومنین، اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور دوست ہرگز نہ بنائیں۔ جو ایسا کرے گا اس کا اللہ سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔“

بالکل یونہی، وہ اللہ کے نزدیک کچھ نہیں ہے۔ اس کا اللہ کے ساتھ نہ تعلق ہے اور نہ نسبت ہے۔ نہ وہ اللہ کے دین پر ہے اور نہ عقیدے پر، نہ اس کا اللہ سے ربط ہے اور نہ دوستی۔ یہ شخص اللہ سے دور ہے۔ وہ ہر چیز سے غیر متعلق ہو گیا ہے، جس کے ذریعہ کوئی بھی تعلق قائم ہو کرتا ہے۔ ہاں یہاں بعض غیر معمولی حالات میں استثناء رکھی جاتی ہے۔ بعض ممالک ایسے ہو سکتے ہیں جہاں بامر مجبوری ایسے تعلقات

رکھنے پڑتے ہیں۔ لیکن ان حالات اور علاقوں میں بھی صرف زبانی تقیہ جائز ہے۔ یہ جائز نہیں ہے کہ انسان دل سے اہل کفر کے ساتھ محبت کرے یا گہرے تعلقات قائم کرے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں تقیہ کا تعلق عمل سے نہیں ہوتا، تقیہ صرف زبان سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے جس تقیہ کا اجازت دی گئی اس میں یہ نہیں ہوتا کہ اہل ایمان اور کفار کے درمیان تعلقات قائم ہوں۔ اور اس سیاق میں کافر کا لفظ اس شخص کے لئے استعمال ہوا ہے جو شخص کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے سے روگردانی کرتا ہے۔ یعنی پوری زندگی میں، یہاں تو یہ بات ضمنی گئی مگر دوسری جگہ قرآن کریم نے صراحت کے ساتھ ایسے لوگوں کے لئے الکافرون کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نیز تقیہ میں یہ بات بھی شامل نہیں ہے کہ ایک مسلمان کسی بھی صورت میں اہل کفر کے ساتھ عملی تعاون کرے۔ اللہ کے ساتھ اس قسم کا کوئی دھوکہ نہیں کیا جاسکتا۔

ولایت اور محبت چونکہ دلوں کا کام ہے۔ انسانی ضمیر اور شعور کے ساتھ اس کا تعلق ہوتا ہے اور جذبہ اللہ خونی اور تقویٰ اس جرم سے باز رکھ سکتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ایک عجیب انداز میں اپنے غضب اور اپنے قہرانہ انتقام سے ڈرایا ہے۔ وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ ”اللہ تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔“ اور اسی کی طرف تو تمہیں آنا ہے۔ اور یہ تخویف اور ڈراوا مزید آگے بڑھ کر دلوں کو چھوٹا ہے، ان کی توجہ اس طرف مبذول کرتا ہے دیکھو تم اللہ کی نظروں میں ہو۔ اللہ سب کچھ جانتا ہے۔

قُلْ اِنْ تَحْضُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ اَوْ تُبْدُوهُ يَعْصِمُ اللَّهُ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

”اے نبی لوگوں کو خبردار کر دو کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اسے خواہ تم چھپاؤ یا ظاہر کرو اللہ بہر حال اسے جانتا ہے۔ زمین و آسمان کی کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے اور اس کا اقتدار ہر چیز پر حاوی ہے۔“

تہدید اور ڈراوے کی یہ انتہاء ہے۔ اللہ خوفی کو جوش میں لایا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اللہ کے انتقام سے اپنے آپ کو بچاؤ اللہ کے پاس علم و قدرت کے دور رس وسائل ہیں۔ اس سے بچ نکلنے کی کوئی جگہ نہیں ہے اور اس کے مقابلے میں کوئی مددگار نہ ہوگا۔

یہ تہدید اور ڈراوہ مزید آگے بڑھتا ہے اور دلوں کی گہرائیوں کو چھوتا ہے، اب اس خوفناک دن کو یادوں کے پردے پر لایا جاتا ہے جس میں ہر عمل اور ہر نیت پیش ہوگی اور اس دن ہر شخص کا مکمل سرمایہ اس کے سامنے ہوگا۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا
وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا

”وہ دن آنے والا ہے جب ہر نفس اپنے کئے کا پھل حاضر پائے گا۔ خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی
اس روز آدمی یہ تمنا کرے گا کہ کاش ابھی یہ دن اس سے دور ہوتا۔“

یہ ایک ایسا خطاب ہے جو قلب انسانی کی گہرائیوں تک اترتا چلا جاتا ہے، انسان کا کل سرمایہ اس کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے اور اسے یاد دلایا جاتا ہے کہ ایک دن وہ بذات خود اپنے اس سرمائے کے سامنے کھڑا ہوگا اور وہ پسند کرے گا اس کا یہ سرمایہ اس سے دور ہوتا لیکن افسوس کہ اس کی یہ خواہش ہر گز پوری نہ ہو سکے گی۔ یا وہ یہ خواہش کرے گا کہ یہ دن ہی نہ آتا، لیکن وہ تو آگیا ہے۔ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔ وہ پکڑا گیا ہے۔ اب کوئی چھٹکارا نہیں ہے۔ اب کوئی جائے فرار نہیں ہے!

اور یہ کلام عالی مقام قلب بشری پر مزید حملے جاری رکھتا ہے، اب اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنی ذات ہیبت مال سے ڈراتا ہے وَيَحْذَرُكُمْ اللَّهُ نَفْسَهُ..... ”اور اللہ اب تمہیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔“..... لیکن آخر میں اللہ تعالیٰ اس خوفناک ماحول میں بھی بندے کو اپنی رحمت کی کرن بھی دکھاتا ہے اور یہ اشارہ کرتا ہے کہ ابھی فرصت باقی ہے وقت ختم نہیں ہو گیا۔ واللہ رؤف بالعباد ”اور اللہ

اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے۔“ اور اللہ کی جانب سے قبل از وقت یہ تحذیر اور ڈراوا بھی اس کی مہربانی ہے اور اس بات کا ثبوت ہے کہ اللہ اپنے بندوں کی بھلائی چاہتا ہے۔

اہل ایمان اور کفار کے درمیان دوستی کے تعلق کے خلاف یہ عظیم حملہ، یہ ہمہ جہت حملہ، جس کے اندر مختلف قسم کے مفید اشارے، ہدایات اور نصیحتیں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ضروریات اس موقع پر کیوں پیش آئی، اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ اس دور میں اسلامی کیمپ اور اس ارد گرد پھیلے ہوئے مخالف کیمپ میں، لوگوں کے درمیان رشتہ داری، معاشی اور معاشرتی تعلقات موجود تھے۔ جماعت مسلمہ کے افراد کے تعلقات اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے قائم تھے۔ یہ تعلقات مکہ کے لوگوں کے ساتھ بھی تھے۔ اور مدینہ کے ارد گرد یہودیوں کے ساتھ بھی قائم تھے۔ ان تعلقات کی اساس رشتہ داری یا تجارت پر تھی۔ جبکہ اسلام یہ چاہتا تھا کہ اس کے اس جدید معاشرے میں لوگوں کے باہمی تعلقات صرف نظریہ حیات کی اساس پر ہوں۔ اس نظام زندگی کی اساس پر جو اس نظریہ حیات سے تشکیل پایا ہے۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جس میں اسلام کسی قسم کی کمزوری یا ترقی ہر گز برداشت نہیں کرتا۔

نیز اس سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے، انسانی دل و دماغ اور اس کی فکر و نظر ہر وقت اس بات کی محتاج ہے وہ ان مشکلات اور رکاوٹوں سے آزادی حاصل کرے اور ان بندھنوں کو توڑ دے جو اسلامی نظام اور اللہ کی راہ کی طرف آنے میں حائل ہوں..... ہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ اسلام اپنے دشمنوں کے ساتھ حسن سلوک سے منع نہیں کرتا۔ اگرچہ وہ اس کے دین کے دشمن ہوں۔ اس لئے کہ حسن سلوک اور حسن معاملہ ایک الگ چیز ہے اور ولاء اور دوستی ایک الگ معاملہ ہے۔ دوستی میں باہم محبت ہوتی ہے، ایک دوسرے کی امداد و نصرت ہوتی ہے۔ اور یہ کام وہ دل سے ہر گز نہیں کر سکتا جو مومن ہے۔ ایک مومن صرف مومنین کے ساتھ دوستی کر سکتا ہے جو رابطہ ایمان میں منسلک ہیں۔ اور جو اسلامی نظام زندگی میں باہم رفیق ہیں اور جو لوگ شریعت نافذ کرتے اور اس کے سامنے جھکتے ہیں۔

☆.....☆.....☆.....☆.....☆

سب سے آخر میں اس سبق کا اختتامیہ ایک فیصلہ کن انداز میں سامنے آتا ہے۔ اور وہ اس مسئلے کو فیصلہ کن انداز میں پیش کرتا ہے اور یہ مسئلہ وہی ہے جس کے ارد گرد یہ پوری سورت گھوم رہی ہے۔ یہ اختتامیہ فیصلہ کن اور مختصر انداز میں حقیقت ایمان اور حقیقت دین کو بیان کر دیتا ہے اور ایمان اور کفر کے درمیان ایک حد فاصل قائم کر دی جاتی ہے۔ یہ حد اس قدر واضح ہے کہ اب کسی کو کوئی غلط فہمی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللَّهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ
ذُنُوبَكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۳۱) قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا
فَإِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ (۳۲)

”اے نبی لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ کہو کہ ”اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کر لو۔“ پھر اگر وہ تمہاری یہ دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرنے سے انکار کرتے ہوں۔“

اللہ کی محبت صرف زبانی دعویٰ نہیں ہے اور نہ کوئی وہ وجدانی امر ہے۔ اس کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کا اتباع ضروری ہے۔ آپ کی سیرت اور نقش قدم پر چلنا ضروری ہے۔ اپنی زندگی میں اسلامی نظام رائج کرنا ضروری ہے۔ ایمان صرف چند کلمات ادا کرنے کا نام نہیں ہے۔ نہ یہ شعور اور جذبات سے عبارت ہے۔ نہ وہ صرف چند شعائر کے قیام کا نام ہے۔ بلکہ ایمان اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا نام ہے۔ اور اس منہاج پر عمل کا نام جس کے حامل رسول اللہ ہیں۔

پہلی آیت کی تفسیر میں امام ابن کثیر فرماتے ہیں ”یہ آیت ہر اس شخص کے کیس کا فیصلہ کر دیتی ہے جو اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس کا سلوک طریقہ محمدیہ پر نہیں ہے۔ یہ شخص فی الحقیقت جھوٹا ہے۔ یہاں تک کہ وہ شریعت محمدیہ کی اطاعت کرے۔ اور اپنے تمام اقوال اور اعمال میں دین محمدی کی اطاعت کرے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے۔“ جس شخص نے جو عمل کیا جو ہمارے کام کے مطابق نہیں ہے، تو وہ مردود ہے۔“

اور دوسری آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا..... ”کہہ دو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو بس اگر وہ منہ پھیر دیں۔“..... اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے طریقے کی مخالفت کفر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے اوصاف والے شخص سے محبت ہر گز نہیں کرتا۔ اگرچہ ایسا شخص یہ دعویٰ کرے یا یہ یقین کرے کہ وہ محب اللہ ہے۔“

امام شمس الدین ابو محمد، ابن قیم الجوزیہ اپنی کتاب زاد المعاد میں فرماتے ہیں۔ ”جو شخص کتب سیرت اور ثابت شدہ احادیث پر غور کرے گا اسے معلوم ہو گا بے شمار اہل کتاب اور مشرکین ایسے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی صداقت اور حقانیت کی شہادت دیتے ہیں۔ لیکن ان کی یہ شہادت انہیں اسلام میں داخل نہیں کرتی۔ تو معلوم ہوا کہ اسلام اس سے کہیں زیادہ کوئی اور چیز ہے۔ اسلام صرف علم اور معرفت کا نام نہیں ہے۔ اور نہ ہی وہ معرفت اور اقرار سے عبارت ہے۔ بلکہ اسلام عبارت ہے، معرفت اقرار اور اطاعت تینوں سے۔ یہ انقیاد اور طاعت ظاہری امور میں بھی لازمی ہے اور باطنی امور میں بھی۔“

دین اسلام کی ایک حقیقت اور ماہیت ہے اور جب تک وہ حقیقت اور ماہیت موجود نہ ہوگی دین نہ ہوگا۔ اور وہ حقیقت صرف رسول اللہ ﷺ کا اتباع ہے۔ شریعت کا اتباع ہے۔ کتاب اللہ کے مطابق عدالتی نظام کا قیام ہے۔ اور یہ حقیقت عقیدہ توحید سے پھوٹ کر نکلتی ہے۔ جس طرح اس عقیدے کی تشریح اسلام نے کی ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ اپنی ذات میں وحدہ لا شریک ہے۔ اس کا حق ہے کہ لوگ پوری

طرح اس کے غلام اور بندے ہوں، وہ اللہ کے احکام نافذ کرنے والے ہوں۔ ان میں شریعت الہیہ نافذ ہو اور وہ ایسی اقدار قائم کریں جن کے مطابق لوگ اپنے فیصلے کریں اور پھر ان پر راضی ہوں۔ اس عقیدے کی رو سے اللہ واحد نگہبان ہے۔ اس لئے وہی حاکم ہے اور لوگوں کے درمیان تمام اجتماعی تعلقات اس حاکمیت کی اساس پر قائم ہوں، جس طرح اس پوری کائنات کا نظام اس کے قانون قدرت کے مطابق رواں دواں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ انسان بھی اس کائنات کا ایک جزء ہے۔

جیسا کہ ہم نے تفصیل سے مطالعہ کیا اس سورت کا پہلا سبق بالکل وضاحت اور صاف ستھرے طریقے سے اس بات کا فیصلہ کر دیتا ہے کہ اللہ کے نزدیک مقبول نظام زندگی صرف اسلام ہے۔ اس سے فرار اور جان چھڑانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جو شخص بھی مسلمان بننا چاہتا ہے اسے یہ حقیقت تسلیم کرنا ہوگی۔ اسلام کی یہی صورت ہے، وہ صورت نہیں ہے جو آج کل لوگوں نے اپنے لئے خود گھڑ رکھی ہے۔ وہ محض اوهام ہیں، محض خرافات ہیں۔

درس ۲۴ ایک نظر میں

بعض وہ روایات، جن میں رسول اکرم ﷺ اور وفد نجران کے درمیان مناظرے کیا بیان آیا ہے۔ یہ کہتی ہیں کہ اس سورت میں جن قصوں کا ذکر ہوا ہے۔ مثلاً حضرت عیسیٰ کی ولادت، ان کی والدہ کی ولادت، حضرت یحییٰ اور دوسرے واقعات، ان شبہات کے رد میں نازل ہوئے۔ جن کو لے کر یہ وفد آیا تھا۔ اور ان لوگوں کے شبہات کی عمارت قرآن کریم کی اس آیت پر کھڑی کی گئی تھی جس میں کہا گیا کہ حضرت عیسیٰ کلمۃ اللہ..... ہیں جو مریم کی طرف آیا اور وہ ”اس کا روح“ ہیں نیز سورت مریم میں جن امور کا ذکر نہ ہوا تھا انہوں نے اس کے بارے میں رسول ﷺ سے جواب طلب کیا تھا۔

یہ بات درست بھی ہو سکتی ہے، لیکن اس سورت میں جس طرح ان قصوں کو لایا گیا ہے وہ بعینہ اسی طریقہ پر ہے جس طرح قرآن کریم قصوں کو لاتا ہے۔ یعنی کچھ حقائق پیش نظر ہوتے ہیں۔ اور ان قصوں کے ذریعے قرآن کریم ان حقائق کو ذہن نشین کرتا ہے اور وہ حقائق دراصل پوری سورت کا موضوع سخن ہوتے ہیں، جو اس موضوع کے گرد گھومتے ہیں۔ اور قصوں کو اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ خود بخود ان سے وہ حقائق ظاہر ہوتے ہیں اور ذہن نشین ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اور وہ حقائق زندہ حقائق بن جاتے ہیں اور یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ بعض حقائق اور تصورات کے قصوں کے ذریعے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذہن نشین کر دیا جاتا ہے، انسان پر ان کا گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ زندہ صورت میں نظر آتے ہیں۔ وہ حقائق زندہ حقائق بن جاتے ہیں اور یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ بعض حقائق اور تصورات کے قصوں کے ذریعے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذہن نشین کر دیا جاتا ہے، انسان پر ان کا گہرا اثر ہوتا ہے اور وہ زندہ صورت میں نظر آتے ہیں۔ وہ حقائق انسان کی زندگی میں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں جس طرح اسکرین پر کردار ہوتے ہیں۔ محض فلسفیانہ اور تجریدی انداز بیان کے مقابلے میں حکایتی انداز بیان بہت ہی موثر ہوتا ہے۔

اگر غور کریں تو ان قصوں سے بھی وہ حقائق اچھی طرح کھل کر سامنے آتے ہیں جو اس سورت کا موضوع ہیں اور یہ سورت ان حقائق پر مرکوز ہے۔ اور جن خطوط پر اس میں بحث ہو رہی ہے اسی پر یہ قصے چلتے ہیں۔ اس لئے ان قصوں میں ان کے شان نزول کا کوئی مخصوص واقعہ نظر نہیں آتا۔ بلکہ قصوں سے وہ واقعات لئے گئے ہیں جو اصل واقعات ہیں اور جن سے اسلام کا نظریاتی پہلو اچھی طرح واضح ہوتا ہے۔

اس سورت کا اصل مسئلہ جس طرح کہ ہم اس سے پہلے کہہ آئے ہیں۔ عقیدہ توحید ہے۔ یہ کہ اللہ اپنی ذات میں ایک ہے اور اس کے سوا کوئی الہ موجود نہیں ہے۔ اور یہ کہ وہ واحد نگہبان ہے اور اس جہاں کو چلانے والا ہے۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ اور دوسرے وہ قصص جو اس کی تکمیل میں یہاں لائے گئے ہیں وہ اس عقیدہ توحید کو اچھی طرح ثابت کرتے ہیں۔ یہ قصص اللہ کے لئے اولاد کے تصور کی نفی کرتے ہیں، اس لئے شرک کے تصور کو رد کرتے ہیں۔ وہ ان تصورات کو بعید از قیاس اور بعید از فہم بناتے ہیں۔ یہ ثابت کرتے ہیں کہ اس قسم کے شبہات غلط ہیں۔ اور ایسے تصورات کھوٹے تصورات ہیں۔ اس لئے حضرت مریم کی پیدائش کے واقعات کھول کر بیان کئے جاتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کی تصویر کھینچی جاتی ہے اور متعلقہ واقعات دیئے جاتے ہیں۔ یہ واقعات اس انداز میں لائے جاتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن میں اس کی بشریت کے بارے میں کوئی شبہ ہی نہیں رہتا۔ اور پھر یہ بتایا جاتا ہے کہ وہ اسی طرح رسول ہیں جس طرح دوسرے رسول گزرے ہیں۔ ان کا ہی مقام ہے جو ان رسولوں کا تھا۔ ان کی طبعی حقیقت بھی وہی ہے جو ان رسولوں کی تھی، یہ قصص حضرت عیسیٰ کی اور غیر معمولی پیدائش کے خارق العادت واقعہ کی ایسی تعبیر اور ایسی تشریح کرتے ہیں کہ جس سے اس اعجوبے کی دل لگتی تعبیر سامنے آ جاتی ہے۔ جس میں کوئی پیچیدگی اور کوئی لاینحل عقدہ نہیں رہتا۔ اور اس تعبیر پر دل و دماغ بالکل مطمئن ہو جاتے ہیں اور یہ معاملہ ایک عام اور عادی معاملہ بن جاتا ہے اس میں کوئی بات خارق العادت نظر نہیں آتی اور قصے کے آخر میں جو اختتامیہ آتا ہے وہ قابل غور ہے۔

إِنَّمَا مَثَلُ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ

”بے شک اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی پیدائش آدم کی طرح تھی۔ اس کو اللہ نے مٹی سے بنایا اور پھر اس کو کہا ہو جا، تو ہو گیا“

یوں دل کو یقین اور سکون نصیب ہو گیا۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس سادہ حقیقت کے بارے میں کیونکر شبہات پیدا ہوئے۔

اس سورت میں جو دوسرا اہم مسئلہ بیان کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ یہ دوسرا مسئلہ بھی پہلے مسئلے یعنی عقیدہ توحید پر مبنی ہے۔ یعنی دین اسلام ہے اور اسلام کا مفہوم اتباع اور انقیاد ہے۔ یہ بات بھی ان قصص کے اندر بڑی وضاحت سے بیان کی گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے کہتے ہیں ”میں اپنے سے پہلے نازل ہونیوالی کتاب تورات کی تصدیق کرتا ہوں اور اس لئے کہ میں حلال کروں بعض ان اشیاء کو جو تم پر حرام قرار دی گئی تھیں۔“ اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ رسالت کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ رسول دراصل بھیجا ہی اس لئے جاتا ہے کہ وہ لوگوں کے لئے نظام زندگی تجویز کرے۔ ان کے لئے حلال و حرام کا ضابطہ وضع کرے تاکہ اہل ایمان اسے تسلیم کریں اور اطاعت کریں۔ اس کے بعد حواریوں کی زبانی بھی اسی مفہوم کی تائید کی گئی۔ ”جب عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ یہ لوگ کفر پر کمر بستہ ہو گئے ہیں، تو آپ نے کہا کون ہے میری مدد کرنے والا اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے کہا: ”ہم ہیں اللہ کے مددگار ہم اللہ پر ایمان لائے، آپ گواہ رہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے اس پر جو تو نے اتارا ہے اور ہم رسول کے مطیع فرمان ہو گئے ہیں۔ ہمیں بھی آپ گواہوں میں لکھ دیجئے۔“

اس سورت کا ایک اہم موضوع یہ تھا کہ اہل ایمان اور ان کے اللہ کے درمیان تعلق کی کیا نوعیت ہوتی ہے۔ ان قصص میں تعلق باللہ پر بھی کافی بات ہوئی ہے۔ ان قصوں میں ان ن برگزیدہ ہستیوں کے حالات بیان ہوئے ہیں۔ جنہیں اللہ نے چن لیا تھا، اور ان میں سے بعض دوسروں کی اولاد تھے۔ ان قصوں میں بیگم عمران کے قصے میں تعلق باللہ کے موضوع پر روشنی پڑتی ہے۔ وہ اپنی بچی کے بارے میں اپنے رب سے یوں مخاطب ہوتی ہے جیسے اسے دیکھ رہی ہو، اسی طرح حضرت مریم سے حضرت

زکریا علیہ السلام کا مکالمہ، حضرت زکریا کا اپنے رب کے جناب میں عاجزانہ دعا اور التجاء، پھر حواریوں کا اپنے نبی کو لبیک کہا اور پھر اللہ تعالیٰ سے ملتی ہونا، یوں ان قصوں میں تعلق باللہ کے زندہ مناظر نظر آتے ہیں۔

جب یہ قصص ختم ہوتے ہیں تو ان پر ایسا اختتامیہ آتا ہے جس میں یہ تمام حقائق دہرا دیئے گئے ہیں جن کے لئے یہ قصص لائے گئے تھے۔ اور ان حقائق کو خلاصہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ اس خلاصے میں عیسیٰ علیہ السلام کی حقیقت بیان ہوتی ہے۔ مخلوق کا مزاج اور تخلیق میں ارادۃ الہیہ کے دخل کے بارے میں حقائق بیان ہوئے ہیں۔ یہ بیان خالص وجدانی بیان ہے۔ اہل کتاب کو ان حقائق کے تسلیم کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور ان کو پھر دعوت مباہلہ دی گئی۔

اس سبق کے آخر میں پھر ایک جامع اور مانع بیان دیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ آپ عام اہل کتاب کو اس حقیقت کی طرف دعوت دیں، چاہے وہ مناظرہ کے لئے آئے ہوں یا نہ آئے ہوں۔ جو اس وقت موجود تھے یا جو آج کے بعد کے ادوار میں موجود ہیں۔ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۶۴)

کہو، اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں، اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔“ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو، ہم تو مسلم ہیں۔“

یہاں یہ مباحثہ ختم ہو جاتا ہے، اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام لوگوں سے کیا مطالبات کرتا ہے۔ وہ زندگی کے کیا قواعد وضع کرتا ہے۔ یہاں دین اور اسلام کا مفہوم بتایا جاتا ہے۔ ہر وہ بھدی صورت صاف ہو جاتی ہے اور وہ تحریف شدہ نظام چھٹ کر رہ جاتا ہے۔ جس کے بارے میں اس کے ماننے

والوں کا دعویٰ ہوتا ہے کہ وہ اسلام ہے۔ اور وہ دین ہے حالانکہ وہ حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا۔ غرض اس سبق کا یہ اصل موضوع تھا اور یہی موضوع اس سورت کا بھی موضوع تھا۔ جسے ان قصص نے بیان کیا ایک دلکش اور دلچسپ کہانی کی شکل میں، جس میں گہرے اشارے موجود تھے۔ قرآن میں قصص کے بیان کی غرض وغایت ہی یہ ہے۔ اس غرض وغایت کے لئے یہ قصے مناسب اسلوب میں آتے ہیں۔ اور مختلف سورتوں میں ان قصص کو اسی خاص اسلوب میں لایا گیا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قصہ سورت مریم میں بھی بیان ہوا ہے۔ اور یہاں بھی یہ قصہ بیان ہوا ہے۔ یہاں اور وہاں دونوں جگہ اس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کے بعض حصوں کو مختصر بیان کیا گیا اور بعض تفصیلات دی گئی ہیں۔ مثلاً سورت مریم میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے حصے کو تفصیلاً بیان کیا گیا ہے، جبکہ حضرت مریم کی ولادت کا ذکر وہاں نہیں تھا۔ یہاں حواریوں کے ساتھ مفصل کلام، اور ولادت کا حصہ مختصر ہے۔ جبکہ یہاں اختتامیہ بہت ہی طویل ہے۔ اس لئے کہ یہاں جن موضوعات پر مباحثہ تھا وہ موضوعات بہت ہی اہم تھے۔ مثلاً عقیدہ توحید، دین کا صحیح تصور، وحی الہی اور رسالت کا تصور جبکہ یہ مسائل سورت مریم میں زیر بحث نہ تھے۔ ان نکات سے معلوم ہوتا ہے کہ بیان قصص میں قرآن کا اسلوب کیا ہے۔ یہ اسلوب ہمیشہ سورت کے موضوعات کے پیش نظر طے ہوتا ہے۔¹



¹ دیکھئے ”التصویر الغنی فی القرآن“، فصل القصہ

درس نمبر ۲۴ تشریح آیات (آیات ۳۳ تا ۶۴)

اب ہم آیات پر بحث کریں گے۔ اس قصے کا آغاز ان لوگوں کی فہرست سے ہوتا ہے جو برگزیدہ تھے اور جنہیں اللہ نے بار رسالت کے اٹھانے کے لئے چن لیا تھا۔ ابتدائے آفرینش سے یہ رسالت ایک تھی اور جس دین کو پیش کیا گیا وہ ایک ہی دین تھا۔ ان لوگوں کا انتخاب اس لئے ہوا تھا کہ وہ اقوام اور ازمہ کی طویل ترین انسانی تاریخ میں قافلہ ایمان کے سالار ہوں، اس میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ ایک ہی سلسلے کے تھے اور جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ان لوگوں کو نسب نامہ طبعی طور پر ملتا ہو اور وہ ایک دوسرے کی نسبی ذریت ہوں۔ (اگرچہ ان سب کا نسب نامہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت آدم علیہ السلام پر جا کر ملتا ہے) ان کا حقیقی نسب نامہ تو یہ ہے کہ ان سب کو اللہ تعالیٰ نے منتخب و مختار بنالیا تھا اور ان کا نسب نامہ ایک نظریاتی نسب نامہ تھا جس کے مطابق یہ قافلہ ایمانی چل رہا تھا۔

إِبْرٰهٖمَ اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّآلِ اِبْرٰهٖمَ وَّآلِ عِمْرٰنَ عَلٰی
الْعٰلَمِیْنَ (۳۳) ذُرِّیَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ (۳۴)

”اللہ نے آدم اور نوح اور آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام دنیا والوں پر ترجیح دے کر (رسالت کے لئے) منتخب کیا تھا۔ یہ ایک سلسلے کے لوگ تھے جو ایک دوسرے کی نسل سے پیدا ہوئے تھے۔ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔“

سیاق کلام میں حضرت آدم اور حضرت نوح کو بطور فرد گنوا یا ہے۔ لیکن حضرت ابراہیم اور عمران کے خاندانوں کا ذکر کیا گیا۔ اس میں اشارہ یہ ہے کہ حضرت آدم اپنی ذاتی حیثیت اور حضرت نوح اپنی ذاتی حیثیت میں قابل احترام اور برگزیدہ تھے۔ لیکن حضرت ابراہیم اور حضرت عمران کی اولاد بھی قابل احترام تھی۔ اور یہ احترام اور برگزیدگی اس اصول کے مطابق تھا جس کا ذکر سورۃ بقرہ میں ہوا ہے

۔ اور وہ قاعدہ اور اصول یہ ہے کہ برکت اور احترام جو خاندان نبوت میں آتا ہے وہ محض خونی وراثت کی وجہ سے نہیں آتا بلکہ وہ نظریاتی وراثت ہے۔

وَإِذْ أَتَىٰكَ إِبرَاهِيمُ رَبُّهُ بِكَلِمَاتٍ فَأَتَمَّهُنَّ قَالَ إِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِي قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ (۱۲۴)

”اور یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور وہ ان سب میں پورا اتر گیا تو اس نے کہا میں تجھے سب لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں۔“ ابراہیم نے عرض کیا: ”اور کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے۔“ اس نے جواب دیا میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔“

بعض روایات میں آتا ہے کہ عمران حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے تھے۔ تو اس صورت میں حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے اس خاص برائے کا ذکر ایک مخصوص مقصد کے لئے کیا گیا ہے یعنی حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے قصوں کے لئے بطور تمہید اس کا ذکر ہوا اور یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت یعقوب کا ذکر نہیں کیا گیا۔ اس لئے کہ یہ حضرات بنی اسرائیل کے پیشوا تھے، یعنی رسول ﷺ کے وقت اہل یہود تھے اور یہاں آئندہ بحث چونکہ نصاریٰ کے بارے میں ہونے والی تھی اس لئے حضرت موسیٰ اور حضرت یعقوب کے ذکر کی ضرورت نہ تھی۔

○ ○ ○ ○ ○

اس تمہیدی اعلان احترام کے بعد اب آل عمران کے بارے میں براہ راست بات شروع ہو جاتی ہے۔

إِذْ قَالَتِ امْرَأَةُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي إِنَّكَ أَنْتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (۳۵) فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنْثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعْتَ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنْثَىٰ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ (۳۶) فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكَ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنْ لَمْ يَرْزُقْهُ مِنْ يَشَاءِ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۷)

”جب عمران کی عورت کہہ رہی تھی کہ میرے پروردگار! میں اس بچے کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نظر کتی ہوں۔ وہ تیرے کام کے لئے وقف ہوگا۔ میری اس پیش کش کو قبول فرمایا تو سننے اور جاننے والا ہے۔ پھر جب وہ اپنی بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا: ”مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہوگئی ہے۔ حالانکہ جو کچھ اس نے جناتھا، اللہ کو اس کی خبر تھی..... اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔ خیر، میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے۔ اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔“ آخر کار اس کے رب نے اس لڑکی کو بخوشی قبول کر لیا، اسے بڑی اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا اور زکریا کو اس کا سرپرست بنادیا..... زکریا جس اس کے پاس محراب میں جاتا تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پوچھتا مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا۔ وہ جواب دیتی اللہ کے پاس سے آیا ہے اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔“

نذر کے اس قصے سے بیگم عمران کا دل کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ یہ مریم کی ماں تھیں۔ ان کا دل ذوق ایمان سے معمور ہے۔ وہ اپنے عزیز ترین اثاثے کو اللہ کے لئے پیش کرتی ہے۔ یعنی وہ بچہ جو ابھی تک ان کے پیٹ میں ہے۔ وہ اسے خالصتاً اللہ کے لئے پیش کرتی ہیں، اس پیش کش کے ساتھ کوئی شرط

اور قید نہیں ہے۔ اس کے ساتھ کوئی شرکیہ تصور وابستہ نہیں جیسا کہ اکثر نذروں میں ہوتا ہے۔ اس فعل میں اللہ کے سوا کسی کے حق کا تصور نہیں ہے۔ اور لفظ ”محرر“ سے اس بے قید نذر کی تعبیر نہایت ہی معنی خیز ہے۔ اس لئے کہ صحیح معنوں میں آزاد وہی شخص ہوتا ہے۔ جو اللہ کا ہو جائے۔ وہ ہر طرف سے بھاگ کر جناب باری میں پناہ لے لے۔ وہ ہر شخص، ہر چیز اور ہر قدر کی غلامی سے نجات پا کر نکل آئے اور بندگی صرف اللہ وحدہ کی اختیار کرے۔ صرف اسی صورت میں ایک انسان صحیح معنوں میں تمام غلامیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس صورت کے علاوہ تمام صورتوں میں کسی نہ کسی شکل میں غلامی موجود رہتی ہے اگرچہ بظاہر کسی کو آزادی نظر آئے۔

اس نکتہ کو پالینے کے بعد ہی یہ بات نظر آتی ہے عقیدہ توحید دراصل مکمل آزادی کا ایک چارٹر ہے۔ وہ شخص کیونکر آزاد تصور ہو سکتا ہے کہ جب وہ کسی معاملے میں اللہ کے سوا اوروں کا غلام اور تابع ہونے پر مجبور ہو، اپنی ذات و نفسیات کی دنیا میں، یا اپنے روزمرہ کے امور حیات کے معاملے میں یا اپنے طور طریقوں یا اقدار حیات کے معاملے میں یا قوانین اور دستور حیات کے سلسلے میں اس لئے کہ وہ یہ امور ہیں جو اس کی زندگی کو کنٹرول کرتے ہیں۔ اگر ایک انسان کا دل غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہو، یا غیر اللہ کی غلامی کے زیر بار ہو یا وہ کسی چیز کی محبت کا شکار ہو تو اسے کن معنوں میں آزاد کہا جاسکتا ہے۔ جبکہ اس کی زندگی میں ایسی اقدار کی قدر ہو اور ایسے قوانین پر عمل ہو رہا ہو جو غیر اللہ سے ماخوذ ہوں۔ دنیا میں انسانوں کو حقیقی آزادی اس وقت نصیب ہوئی جب انہوں نے اسلام کے نظریہ توحید کو اپنایا۔

زوجہ عمران کی یہ خشوع و خضوع کے عطر سے معطر دعا کہ اے رب میری نذر قبول فرما! وہ نذر جو اس کے دل کا ٹکڑا ہے۔ اس کا جگر گوشہ ہے۔۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ خالص اللہ کی مسلم او ر مطیع فرمان ہیں۔ وہ کلمۃ اللہ کی جہت کی طرف رخ کئے ہوئے ہیں۔ بالکل یکسو ہیں۔ ہر قید سے آزاد ہیں اور ان کے دل میں ماسوائے قبولیت نذر اور رضائے الہی کے جذبے کے اور کچھ نہیں ہے۔

فَلَمَّا وَصَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَصَعْتُهَا اُنْثٰی وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَصَعْتُ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی
وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَ اِنِّیْ اَعِیْذُهَا بِکَ وَ ذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ

”پھر جب وہ بچی اس کے ہاں پیدا ہوئی تو اس نے کہا: ”مالک! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہو گئی ہے۔ حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا، اللہ کو اس کی خبر تھی..... اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔ خیر، میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے۔ اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔“

اس کا خیال یہ تھا کہ میرا بچہ لڑکا ہو گا۔ اور گرجوں میں جن بچوں کی نذر دی جاتی تھی وہ بالعموم لڑکے ہوا کرتے تھے تاکہ وہ ہیکل کی خدمت کریں۔ اور وہ صرف عبادت کے لئے وقف ہو جائیں اور دنیا سے کٹ جائیں۔ لیکن وہ کیا دیکھتی ہے کہ بچہ لڑکی ہے۔ اس لئے وہ گڑ گڑا کر اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور نہایت ہی متأسفانہ انداز میں کہتی ہے۔

رَبِّ اِنِّیْ وَصَّعْتُهَا اُنْثٰی..... ”میرے رب! میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہو گئی۔“

وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَصَّعَتْ..... ”اور جو کچھ اس نے جنا، اس کا علم تو اللہ کو بہر حال تھا۔“ لیکن وہ یہ الفاظ اس لئے کہتی ہے کہ وہ خود متوجہ الی اللہ ہے اور ہدیہ پیش کرتی ہے۔ گویا وہ ان الفاظ سے اللہ کے ہاں معذرت پیش کر رہی ہے۔ کہ اگر لڑکا ہوتا تو وہ اپنے فرائض اچھی طرح ادا کرتا۔ وَیَسِّرُ الذَّکُوْرَ کَالْاُنْثٰی..... ”اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا۔“ یعنی جس مقصد کے لئے نذر مانی گئی ہے، اس مقصد کے لئے تو لڑکا ہی موزوں ہوتا ہے۔ وَ اِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ..... ”میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے۔“

”یہاں جس انداز سے بات ہو رہی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت زوجہ عمران اللہ تعالیٰ سے آمنے سامنے بات کر رہی ہیں، گو تخلیہ میں بات ہو رہی ہے، دل کی پوری بات بتائی جا رہی ہے۔ صاف صاف بتائی جا رہی ہے۔ اور اپنا پورا اثاثہ پیش کیا جا رہا ہے۔ براہ راست خدمت اقدس میں اللہ کے ان برگزیدہ بندوں کے تعلق باللہ کا یہی حال ہوتا ہے۔ محبت، قرب اور براہ راست رابطہ اپنے رب کے ساتھ سادہ الفاظ میں اخلاص کے ساتھ ہمکلامی، جس میں نہ تکلف ہے اور نہ پیچیدگی ہے۔ وہ بات

اس طرح کرتے ہیں جس طرح رب ان کے بالکل قریب ہے۔ ان سے محبت کرتا ہے، سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔

وَلِيَّ اَعْيُذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ

”میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔“ یہ وہ آخری بات ہے جو ایک ماں اپنے بچے کی نذر پیش کرنے بعد الوداعی طور پر کہتی ہے۔ اور اسے اپنے رب کی حمایت اور اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتی ہے۔ اور اس کے لئے اور اس کی اولاد کے لئے شیطان مردود سے پناہ مانگتی ہے..... اور یہ باتیں خلوص قلب کا مظہر ہیں، و بطیب خاطر یہ نذر دے رہی ہے اور اپنی محبوب اولاد کے لئے وہ جو تحفظ طلب کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ اسے شیطان مردود سے بچائے۔

فَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنْبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا..... ”آخر کار اللہ نے اس کی لڑکی کو قبول کر لیا اور اسے اچھی لڑکی بنا کر اٹھایا۔“ مال کے دل میں اخلاص اور للہیت کو جذبہ موجزن تھا، یہ اس کا صلہ تھا، یہ ایک خالص نذر تھی جو صرف اللہ کے لئے تھی، اور یہ اسے درحقیقت آنیوالے دور میں نفع روح کے لئے تیار کرنا تھا۔ کلمۃ اللہ کے حمل کے لئے اسے تیار کرنا تھا۔ تاکہ وہ حضرت عیسیٰ کی خارق العادت ولادت کے لئے تیار ہو جس کی کوئی مثال اس سے قبل موجود نہ تھی۔

وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا..... ”ذکر یا کو اس کا سرپرست بنادیا گیا۔“ وہ اس کے ولی اور ذمہ دار قرار پائے۔ اس دور میں حضرت زکریا ہیکل کے صدر نشین تھے۔ اور وہ حضرت ہارون کی اولاد سے تھے۔ اور ہیکل سلیمانی کی مجاوری اور انتظام ان کی اولاد کے ہاتھ میں چلا آ رہا تھا۔ یوں حضرت مریم کی نشوونما اور تربیت کا بابرکت سلسلہ شروع ہوا۔ اللہ تعالیٰ اسی نوخیز راہبہ کے لئے اپنے فیض خاص سے رزق کا خصوصی انتظام فرماتے تھے۔

كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّى لَكِ هَذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ..... ”زکریا جب کبھی اس کے پاس محراب میں جاتا، تو اس کے پاس کچھ نہ کچھ کھانے پینے کا سامان پاتا۔ پوچھتا، مریم! یہ تیرے پاس کہاں سے آیا؟ توہ جواب دیتی اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔“

ہم ان تفصیلات میں جانا نہیں چاہتے کہ یہ رزق کیسا تھا، جس طرح کہ مختلف روایات وارد ہیں، یہاں اس قدر کہنا کافی ہے کہ وہ رزق بڑا بابرکت تھا۔ آپ کے ماحول میں برکت تھی اور ہر طرف سے وہ چیزیں مہیا ہو رہی تھیں جن پر رزق کا اطلاق ہوتا ہے۔ اس قدر وافر رزق ہوتا تھا کہ ان کا کفیل بھی حیران رہ جاتا۔ حالانکہ وہ نبی تھا۔ وہ ان فیوض و برکات کو دیکھ کر حیرانی سے پوچھتا کہ یہ کیسے اور کہاں سے؟ لیکن حضرت مریم ایک مومن صادق کی طرح بڑے خشوع و خضوع کے ساتھ جواب دیتیں اور اللہ کے انعامات کا اعتراف کرتیں۔ اللہ کے کرم کا اقرار کر کے معاملہ اس کے حوالے کر دیتیں۔

هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ..... ”یہ اللہ کے پاس سے آیا ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔“ یہ وہ کلمات ہیں جو بتاتے ہیں کہ بندے کا تعلق اپنے رب کے ساتھ کیا ہوتا ہے۔ اور کس طرح بندگان عالی مقام اپنے ان رازوں کو راز ہی رہنے دیتے ہیں جو ان کے اور ان کے رب کے درمیان ہوتے ہیں۔ اور بات میں اس راز کے بارے میں بڑی تواضع اور کسر نفسی سے بات کرتے ہیں۔ اس کبر و غرور میں مبتلا نہیں ہوتے۔ یہاں حضرت مریم کے ہاں فراہمی رزق کے سلسلے میں غیر معمولی صورت حال دکھائی گئی اور جس پر حضرت زکریا نبی وقت کو بھی تعجب ہوا۔ وہ آئندہ آنے والے زیادہ عجائبات قدرت کے لئے بطور تمہید ذکر ہوئے۔ جن میں حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی ولادت شامل ہے۔

○..... ○..... ○..... ○..... ○..... ○

اس مقام پر (مریم جیسی اولاد اور اس کے پاس وافر رزق) کو دیکھ کر حضرت زکریا علیہ السلام کے دل میں امید کی کرن پھوٹی، آپ کی اولاد نہ تھی یہ ایک فطری خواہش تھی جو ہر انسان کے دل میں دسر قدرت نے ودیعت کی ہوئی ہوتی ہے۔ یعنی اولاد صالح کی زبردست خواہش۔ تاکہ انسان کی ذات تسلسل میں رہے۔ اور اس کے بعد اس کا کوئی جانشین ہو یہ وہ خواہش ہے جو بڑے بڑے عبادت گزاروں اور زاہدوں کے دل میں بھی موجزن رہتی ہے۔ ان لوگوں کے دل میں بھی جنہوں نے اپنے آپ کو عبادت کے لئے وقف کر لیا ہوتا ہے۔ اور جو ہیکل کی خدمت کے لئے وقف ہو چکے ہوتے ہیں۔ یہ وہ فطرت ہے جس اللہ نے لوگوں کی تخلیق کی ہے۔ اور یہ اس گہری حکمت کا نتیجہ ہے کہ اس جہاں میں زندگی کا تسلسل جاری ہے اور وہ دن رات چوگنی ترقی کر رہی ہے۔ اس مقام پر حضرت زکریا علیہ السلام سامنے آتے ہیں۔

هٰذَاكَ دَعَا زَكْرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِنْ لَدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ (۳۸) فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيحْيَى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِنَ الصَّالِحِينَ (۳۹) قَالَ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَقَدْ بَلَغَنِي الْكِبَرُ وَامْرَأَتِي عَاقِرٌ قَالَ كَذَلِكَ اللَّهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ (۴۰) قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً قَالَ آيَتُكَ أَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْرًا وَادُّكُرُ رَبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ (۴۱)

”یہ حال دیکھ کر زکریا نے اپنے رب کو پکارا ”پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر، تو ہی دعا سننے والا ہے اس پر سوز اور پر کیف دعا کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ فوراً قبول ہوئی اور اب یہ اولاد اور یہ قبولیت زمان و مکان کی قید سے وراء تھی۔ عام معتاد طریقے سے نظام ہٹ گیا۔ اس لئے کہ اصل سبب تو مشیت

”یہ حال دیکھ کر زکریا نے اپنے رب کو پکارا ”پروردگار! اپنی قدرت سے مجھے نیک اولاد عطا کر، تو ہی دعا سننے والا ہے۔“..... اس پر سوز اور پر کیف دعا کا نتیجہ کیا ہوا؟ یہ فوراً قبول ہوئی اور اب یہ اولاد اور یہ قبولیت زمان و مکان کی قید سے ماوراء تھھی۔ عام معتاد طریقے سے نظام ہٹ گیا۔ اس لئے کہ اصل سبب تو مشیت الہی ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ
مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ

”جواب میں فرشتوں نے آواز دی، جب وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا کہ اللہ تجھے یحییٰ کی خوشخبری دیتا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے ایک فرمان کی تصدیق کرنے والا بن کر آئے گا۔ اس میں سرداری اور بزرگی کی شان ہوگی۔ کمال درجے کا ضابطہ ہوگا۔ نبوت سے سرفراز ہوگا۔ اور صالحین میں شمار ہوگا۔“

وہ دعا جو دل سے نکلی اور پاک دل سے نکلی وہ قبول ہوگئی۔ اس لیے کہ اس دعا میں امید صرف اس ذات سے تھی جو دعا سنتا ہے۔ اور جس وقت چاہے اسے قبولیت کا جامہ پہنا سکتا ہے۔ فرشتوں نے زکریا کو ایک لڑکے کی خوشخبری دیدی۔ اس کا نام بھی ولادت سے پہلے یحییٰ رکھ دیا گیا۔ اور صفت و اخلاق بھی قبل از وقت بتا دیئے گئے۔ وہ اچھا سردار ہوگا۔ وہ اپنی خواہشات نفس کو اچھی طرح قابو میں رکھنے والا ہوگا۔ اور اس نے اپنے رجحانات اور میلانات کی لگام اچھی طرح تھام لی ہوگی۔ وہ مومن و مصدق ہوگا اور اس کے پاس اللہ کا جو فرمان آئے گا اس کی تائید کرنے والا ہوگا۔ نبی صالح ہوگا اور قافلہ صلحاء کا رکن ہوگا۔

بہر حال یہ دعا قبول ہوگئی۔ اور اس کی راہ میں وہ معمولی صورت حال حائل نہ ہو سکی جسے انسان روز مرہ کی زندگی میں دیکھتے ہیں۔ اور اسے ایک اٹل قانون سمجھتے ہیں۔ اور پھر یہ بھی سمجھتے ہیں کہ اللہ کی مشیت بھی اسی قانون کی پابند ہے۔ انسان جن امور کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر یہ فیصلہ کرتا ہے کہ یہ

قانون ہے اور اس سے انحراف ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک نسبتی امر ہے۔ یہ کوئی آخری مشاہدہ نہیں ہوتا۔ انسان کی عمر محدود ہے۔ اور اس کا علم محدود ہے۔ انسانی عقل طبعیات کے حدود کے اندر محدود ہے۔ وہ اللہ کے انتہائی قانون تک رسائی بھی نہیں پاسکتی۔ نہ وہ حقیقت مطلقہ کا ادراک کر سکتی ہے۔ کیا انسان کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ذرا انسان بن کر رہے۔ کیا اس کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ ”ابار قدر خود بشاس“ کے مطابق اپنی حدود میں رہے اور اس وادی بے کنار میں بغیر کسی راہنمائے باخبر کے داخل ہی نہ ہو۔ اس لئے کہ ممکنات اور مستحیلات کی وادی بے کراں ہے۔ تعجب ہے کہ انسان اللہ کی مشیت کے لئے وہ دائرہ تجویز کرتا ہے جو خود اس کے تجربے میں ہو اور جو اس کے علم قلیل کا دائرہ ہے۔

دعائے پر سوز کی یہ قبولیت خود حضرت زکریا علیہ السلام کے لئے بھی تعجب خیر تھی، بہر حال حضرت زکریا بھی تو انسان ہی تھے۔ چنانچہ ان کے دل میں بھی یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ دیکھیں کہ یہ خارق العادۃ واقعہ کیسے ظہور پذیر ہوگا، حالانکہ انسان کا روزمرہ کا مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔

قَالَ رَبِّ اَنِّیْ یُکُوْنُ لِیْ غُلَامٌ وَفَدَّ بَلْعَمَیْ الْکِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ

”زکریا نے کہا پروردگار، بھلا میرے ہاں لڑکا کہاں سے ہوگا۔ میں تو بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔“ اس کا جواب بڑی سادگی اور بڑی آسانی سے دیدیا جاتا ہے بات اپنی جگہ تک آجاتی ہے۔ اور ایسی حقیقت کو پیش کر دیا جاتا ہے جس کے فہم میں کوئی مشکل نہیں ہے۔ اور جس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی تعجب نہیں ہوتا۔ قَالَ کَذٰلَکَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ..... ”اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔“ یہی طریقہ ہے، جو فی الحقیقت روبہ عمل ہے۔ رات دن دہرایا جاتا ہے۔ اللہ کی مشیت کام کرتی رہتی ہے۔ اللہ کے کام روز و شب یونہی ہوتے ہیں۔ لیکن لوگ ان واقعات پر اچھی طرح غور نہیں کرتے۔ وہ اللہ کی اس کاریگری کا گہرا مشاہدہ اور اس پر غور نہیں کرتے۔ اور حقائق کو ذہن نشین نہیں کرتے۔

یونہی بسہولت بہ روانی وہ چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس میں اس کے لئے کیا مشکل ہے کہ زکریا کو بیٹا دیدے۔ اگرچہ وہ بوڑھا ہو گیا ہو اور اس کی عورت بانجھ ہو گئی ہو۔ بوڑھا ہونا اور بانجھ ہونا تو انسانوں کا مشاہدہ ہے۔ جس پر وہ اپنے لئے قواعد بناتے ہیں۔ اس لئے اپنے لئے ضابطہ بناتے ہیں۔ رہے اللہ تعالیٰ تو وہ انسانی ذہن کے قوانین و قیاسات کے پابند کیسے ہو گئے۔ وہ تو جس طرح چاہے تجربات کو پھیر دے۔ اس کی مشیت تو ہر قید سے آزاد ہے۔

لیکن حضرت زکریا کا راز ہوا رشوق سرپٹ دوڑ رہا تھا، بہر حال وہ بھی انسان تھے اچانک خوشخبری سن کر پریشان ہو گئے تھے۔ انہوں نے اپنے رب سے مطالبہ کیا کہ وہ ان کے لئے اس عجوبے کے ظہور کے لئے کوئی علامت مقرر فرمادیں تاکہ وہ مطمئن ہو کر انتظار کریں۔ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِي آيَةً..... ”میرے رب میرے لئے کوئی نشانی مقرر کر دے۔“ اب اللہ تعالیٰ ان کے لئے حقیقی اطمینان کا انتظام فرماتے ہیں۔ خود انہیں ان کی روزمرہ معمولات کے دائرے سے ذرا باہر لایا جاتا ہے۔ قرار دیا جاتا ہے کہ علامت یہ ہوگی کہ تین دن کے لئے تیری زبان بند ہو جائے گی، وہ لوگوں کی طرف متوجہ ہوں گے، بات نہ کر سکیں گے۔ صرف اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں گے، اللہ کا ذکر کریں گے اور اس کی تسبیح و تہلیل کریں گے۔

قَالَ أَيُّنَاكَ أَلَا تُكَلِّمُ النَّاسَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ إِلَّا رَمْرًا وَاذْكُرْ رَبَّكَ كَثِيرًا وَسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ

”کہا: ”نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے اشارہ کے سواء کوئی بات نہ کر سکو گے۔ اس دوران میں اپنے رب کو بہت یاد کرنا اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہنا۔“..... یہاں قرآن مجید خاموش ہو جاتا ہے لیکن ہم جانتے ہیں کہ یہ واقعہ عملاً ایسا ہوا۔ حضرت زکریا علیہ السلام کی زبان بند ہو گئی۔ اور وہ تمام روزمرہ کی زندگی سے نکل آئے۔ لوگوں کی روزمرہ زندگی کا قانون بھی معطل ہو گیا۔ دیکھو اس کی یہی زبان تھی جو زور سے چلتی تھی۔ آج بند ہے۔ لوگوں سے بات بند ہے اور اللہ

سے مناجات جاری ہے۔ سوال یہ ہے کہ اب وہ کس قانون فطرت پر جا رہے ہیں؟ وہ قانون یہ ہے کہ اللہ مطلق کی مشیت ہر قید و بند سے آزاد ہے۔ اگر ہم اپنی زندگی میں یہ اصول تسلیم نہ کریں گے تو پھر ان خوارق عادت معاملات کی اور کیا توجیہ کر سکتے ہیں۔ ہم اس بوڑھے اور عمر رسیدہ عورت کے ہاں اولاد کی پیدائش کی اور کیا توجیہ کر سکتے ہیں۔

○ ○ ○ ○ ○

یہ خارق عادت واقعہ یہاں اس لئے بیان کیا گیا کہ آگے عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا اصل خارق واقعہ بیان کیا جائے۔ جس کی وجہ سے بے شمار شبہات اور ناقابل یقین نظریات وجود میں آگئے تھے۔ پیدائش مسیح علیہ السلام دراصل اللہ کی تعالیٰ کی بے قید مشیت کے سلسلہ واقعات میں سے ایک واقعہ تھا۔ یہاں سے پیدائش مسیح کا واقعہ شروع کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلے حضرت مریم کو اس روض کی قبولیت کے لئے عبادت اور رجوع الی اللہ کے ذریعہ پاک کیا جاتا ہے۔

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّكِ اصْطَفَاكِ وَطَهَّرَكِ
وَاصْطَفَاكِ عَلَى نِسَاءِ الْعَالَمِينَ (۴۲) يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي
وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ (۴۳)

”اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے تجھے برگزیدہ کیا اور پاکیزگی عطا کی اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھ کو ترجیح دے کر اپنی خدمت کے لئے چن لیا۔ اے مریم! اپنے رب کی تابع فرمان بن کر رہ، اس کے آگے سر بسجود ہو اور جو بندے اس کے حضور جھکنے والے ہیں اس کے ساتھ تو بھی جھک جا۔“

یہ برگزیدگی کیا تھی؟ وہ یہ کہ اللہ براہ راست اس کے اندر اپنی ایک روح ڈالنے والے تھے۔ جس طرح اللہ نے حضرت آدم کے جسد خاکی میں سب سے پہلے روح ڈالی تھی۔ اور پھر یہ خارق العادہ واقعہ پوری انسانیت کے سامنے پیش کیا گیا اپنے خاص طریقے کے مطابق، فی الواقع یہ تاریخ انسانیت کی ایک

منفرد برگزیدگی ہے۔ اور بلاشبہ ایک عظیم واقعہ ہے..... لیکن آج تک اس عظیم واقعہ کا انسانیت کو صحیح علم نہ تھا۔ یہاں صفائی کی طرف اشارہ کر کے یہ تاثر دیا گیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے بارے میں یہودی جو شبہات پھیلاتے تھے اور جو ریک حملے کرتے تھے، وہ قابل مذمت ہیں۔ وہ حضرت مریم کی پاکیزگی میں شکوک و شبہات پھیلاتے تھے اور ان کی دلیل یہ تھی کہ آج تک تاریخ انسانیت میں ایسی خارق العادہ پیدائش کا واقعہ نہیں ہوا ہے۔ اس لئے یہ یہودی (اللہ انہیں غارت کرے) کہتے تھے کہ اس واقعہ کے پیچھے کوئی ناپسندیدہ راز ہے۔

یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی عظمت کا کیا مقام ہے، اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کا منبع صافی کس قدر بلند اور قابل اعتماد ہے۔ رسول ﷺ پر اہل کتاب، بشمول نصاریٰ، قسم کے الزامات عائد کر رہے تھے۔ آپ کی تکذیب کر رہے تھے۔ آپ کے دشمن تھے اور جدل و جدال پر ہر وقت آمادہ رہتے تھے۔ اسلام کی حقانیت کے خلاف شبہات پھیلاتے تھے۔ لیکن دیکھئے وہ اپنے رب کی جانب سے یہ پیغام لاتے ہیں کہ حضرت مریم علیہا السلام کی حقیقت یہ ہے اور یہ کہ وہ تمام دنیا کی عورتوں پر فضیلت رکھتی ہیں۔ یوں اسلام حضرت مریم کے مقام کو بلند آفاق تک اونچا کر دیتا ہے۔ لیکن موقعہ و محل ایسا ہے کہ حضرت مریم کے پیروکار آپ کے ساتھ بحث و مناظرہ کے لئے آئے ہوئے ہیں۔ اور حضرت مریم علیہا السلام کی تعظیم کو آپ کے لئے جواز بناتے ہیں کہ وہ رسول ﷺ پر ایمان نہ لائیں۔ اور حضرت محمد ﷺ کے دین کی تکذیب کریں۔

کیا سچائی ہے یہ، کس قدر عظمت ہے یہ اسلام کی، اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ رسول ﷺ سچے ہیں اور ایک سچے منبع سے فیض یاب ہیں۔ آپ پر وحی لانے والے بھی سچے ہیں۔ وہ سچائی سے اپنے رب سے لیتے ہیں۔ وہ حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں جو سچائی پاتے ہیں اس کا اعلان کر دیتے ہیں۔ اگر آپ اللہ کے سچے رسول نہ ہوتے تو وہ ان حالات میں اپنے دشمنوں کے متعلق اس سچائی کا اظہار نہ کرتے۔

يَا مَرْيَمُ اقْنُتِي لِرَبِّكِ وَاسْجُدِي وَارْكَعِي مَعَ الرَّاكِعِينَ..... ”اے مریم! رب کی تابع فرمان بن کر رہ، اس کے آگے سر بسجود ہو، اور جو بندے اس کے سامنے جھکنے والے ہیں، ان کے ساتھ تو بھی جھک۔“..... یعنی خضوع و خشوع اختیار کر، اللہ کی طاعت و عبادت میں مصروف رہ، اور ایسی زندگی بسر کر جو اللہ سے جڑی ہوئی ہو اور یہ سب کچھ عظیم ذمہ داری ادا کرنے کے لئے، جو آنے والی ہے۔

○..... ○..... ○..... ○..... ○..... ○

ذَٰلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِ إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُتْلَىٰ
أَقْلَامُهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ (۴۴)

”اے محمد! یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو وحی کے ذریعہ سے بتا رہے ہیں، ورنہ تم اس وقت وہاں موجودہ تھے۔ جب ہیکل کے خادم یہ فیصلہ کرنے کے لئے اپنے اپنے قلم پھینک رہے تھے اور نہ تم اس وقت حاضر تھے جب ان کے درمیان جھگڑا برپا تھا۔“

یہ اشارہ اس واقعہ کی طرف ہے جب ہیکل کے خدام کے درمیان یہ تنازع اٹھ کھڑا ہوا تھا کہ ان میں سے کون اس کا سرپرست ہو، جب اس کی ماں اسے لیکر ہیکل میں آئیں۔ وہ اسی وقت چھوٹی بچی تھی۔ ماں اس لئے لائی تھی کہ وہ اپنی نذر پوری کرے اور جو عہد اس نے اپنے رب کے ساتھ کیا ہے۔ اسے پورا کرے۔ اس آیت میں ایسے واقعہ کا ذکر ہے جو عہد قدیم میں مذکور نہیں ہے اور نہ عہد جدید میں مذکور ہے یعنی ان نسخوں میں جو آج کل مروج ہیں، لیکن یہ بات ایسی تھی جو احبار اور رہبان کے درمیان معروف تھی۔ یعنی خدام کا قلمیں پھینکنے کا واقعہ اس دور میں مشہور واقعہ تھا۔ اور یہ اس لئے تھا کہ کون اس کی کفالت کرے۔ قرآن کریم نے اس واقعہ کی تفصیلات نہیں دی ہیں۔ اور شاید اس لئے کہ سامعین قرآن کے نزدیک یہ واقعہ مشہور و معروف ہو گا۔ یا یہ کہ قرآن کریم نے واقعہ بتادیا اور اس

سے زیادہ تفصیلات بتانے کی ضرورت محسوس نہ کی کیونکہ واقعہ ہی یہ اسی قدر ہو گا۔ مثلاً انہوں نے کفالت کے لئے کوئی ایسا طریقہ طے کر لیا ہو گا۔ یعنی قلمیں پھینک کر یہ معلوم کرتے ہوں گے کہ کفالت کس کے حصے میں آئے۔ جیسا کہ آج کل قرعہ اندازی میں ہوتا ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اپنی قلمیں نہر اردن میں پھینکیں، تو سب قلمیں موجوں کے ساتھ بہہ گئیں مگر زکریا کی قلم اپنی جگہ ٹھہری رہی اور یہ ان کے درمیان علامت تھی کہ کفالت کس کے حصے میں آئے۔

بہر حال یہ سب واقعات پردہ غیب میں تھے۔ اس وقت نبی ﷺ حاضر نہ تھے۔ نیز رسول ﷺ کے علم تک بھی یہ بات نہ پہنچی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بات اہل ہیکل کے خفیہ رازوں میں سے ہو جسے عوام کے لئے شائع کرنا منع ہو، اور قرآن نے اس کا افشا کر کے، اس وقت کے علمائے اہل کتاب کو بتایا کہ حضرت محمد ﷺ رسول صادق ہیں اور قرآن کریم وحی الہی پر مبنی ہے۔ کسی روایت میں یہ نہیں ہے کہ اہل کتاب آئے بھی مناظرہ کے لئے تھے۔ اگر ان کے ہاں یہ واقعہ نہ ہوتا تو کہتے کہ ایسا کوئی واقعہ ہی سرے سے نہیں ہوا۔

اب یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا واقعہ شروع ہوتا ہے۔ لوگوں کے معمولات کے مطابق یہ عظیم اعجوبہ ہے اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کی معمول کے مطابق مشیت کی جو شان ہوتی ہے وہ اس کے خلاف ہے۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّكِ ابْنُ اللَّهِ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ (۴۵) وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ (۴۶) قَالَتْ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي وَلَدٌ وَلَمْ يَمَسِّنِي بَشَرٌ قَالَ كَذَلِكَ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۴۷) وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ

وَالْتُورَاةَ وَالْإِنْجِيلَ (۴۸) وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ
 مِنْ رَبِّكُمْ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطِّينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَأَنْفُخُ فِيهِ فَيَكُونُ
 طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِئُ الْأَكْمَهَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ
 وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدْخُرُونَ فِي بُيُوتِكُمْ إِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَةً
 لِّكُمْ إِن كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ (۴۹) وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرَةِ وَلَأَحْلَلْ
 لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ
 وَأَطِيعُوا (۵۰) إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ
 (۵۱)

”اور جب فرشتوں نے کہا ”اے مریم! اللہ تجھے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح
 عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ دنیا و آخرت میں معزز ہوگا، اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا۔ لوگوں
 سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی اور وہ ایک مرد صالح ہوگا۔“ یہ سن کر
 مریم بولی: ”پروردگار، میرے بچہ کہاں سے ہوگا مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔“ جواب
 ملا۔ ”ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔“ (فرشتوں نے پھر اپنے سلسلہ کلام میں کہا) اور اللہ
 اسے کتاب و حکمت کی تعلیم دے گا، تورات اور انجیل کا علم سکھائے گا۔ اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا
 رسول مقرر کرے گا۔ (اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کب طرف آیا تو اس نے کہا) میں
 تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی
 صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں۔ اور اس میں پھونک مارتا ہوں۔ وہ اللہ کے حکم سے پردہ بن جاتا ہے
 ۔ میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں
 تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس

میں تمہارے لئے کافی نشانی ہے۔ اگر تم ایمان لائیوالے ہو۔ اور میں تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنیوالا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے۔ اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کر دو جو تم پر حرام کی گئیں ہیں۔ دیکھو، میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانیاں لیکر آیا ہوں۔ لہذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، لہذا تم اس کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔“

حضرت مریم علیہ السلام اپنی پاکیزگی، اپنی یکسوئی اور اپنی پیہم عبادت گزاری کی وجہ سے اس بات کی اہل ہوئیں کہ وہ اس کے اس فعل کو قبول کر سکیں اور اس عظیم واقعہ کے لئے تیار ہو سکیں۔ اور دیکھئے اب وہ تیار ہیں اور اب ملائکہ ان کے ساتھ ہمکلام ہو رہے ہیں۔ انہیں اطلاع دی جاتی ہے۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ

”اور جب فرشتوں نے کہا ”اے مریم! اللہ تجھے ایک فرمان کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح بن مریم ہوگا۔ دنیا و آخرت میں معزز ہوگا، اللہ کے مقرب بندوں میں شمار کیا جائے گا۔ لوگوں سے گہوارے میں بھی کلام کرے گا اور بڑی عمر کو پہنچ کر بھی اور وہ ایک مرد صالح ہوگا۔“

اس آیت میں بات پوری طرح کھول کر انہیں بشارت دی گئی ہے۔ یہ بشارت اللہ کے کلام (فرمان) سے متعلق ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ نحو کے اعتبار سے لفظ مسیح کلمہ کا بدل یعنی کلمہ مسیح ابن مریم ہیں۔ اب اس تعبیر کلام کے بعد کوئی بات ہی نہیں رہتی..... یہ اور اس قسم کے دوسرے بے شمار امور، اصل غیبی امور ہیں اور ان کی ماہیت تک رسائی پوری طرح ممکن نہیں ہوتی۔ اور ہو سکتا ہے کہ یہ امور ان متشابہات میں سے ہوں، جن کے بارے میں اس سورت کے آغاز میں کہا گیا:

هُوَ الَّذِي أَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتَابَ مِنْهُ آيَاتٌ مُحْكَمَاتٌ هُنَّ أُمُّ الْكِتَابِ وَأُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ
فَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُونَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاءَ تَأْوِيلِهِ

”وہی اللہ ہے جس نے تم پر کتاب نازل کی ہے۔ اس کتاب میں دو طرح کی آیات درج ہیں، ایک محکمات، جو کتاب کی اصل بنیادیں ہیں اور دوسری متشابہات، جن لوگوں کے دلوں میں ٹیڑھ ہے، وہ فتنے کی تلاش میں ہمیشہ متشابہات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ اور ان کو معنی پہنانے کی توثیق کرتے ہیں۔“..... لیکن اس معاملے کا سمجھنا بہت ہی آسان ہے اگر ہم اسے اللہ ترسی کے ساتھ سمجھنا چاہیں۔ اور اللہ کی کاریگری اور اس کی قدرت کی نشانیاں ہمارے ذہن میں ہوں اور ہمیں یہ معلوم ہو کہ اللہ کی مشیت اور حدود و قیود سے آزد ہے جو اس نے اس جہاں رانی کے لئے خود وضع کئے ہیں۔

اللہ نے جب چاہا تو اس نے مٹی سے آدم کو پیدا کیا، اب تخلیق آدم براہ راست مٹی سے ہوئی اور مٹی میں نفخ روح ہوا ہو یا ابتدائی جرثومہ پیدا کیا گیا ہو اور وہ وجود آدم پر منتج ہوا۔ میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑتا کہ تخلیق آدم مجسمے سے ہوئی یا جرثومے سے۔ اس لئے کہ ان دونوں صورتوں میں وہ راز راز ہی رہتا ہے۔ جسے ہم راز حیات کہتے ہیں۔ وہ راز جس نے پہلی مخلوق کو حیات عطا کی۔ یا جس طرح آدم کے پہلے مجسمے میں روح ڈالی گئی یا جرثومے میں ڈالی دونوں صورتوں میں یہ ایک عظیم اعجاز اور معجزہ ہے۔ اس لئے کہ جرثومہ زندہ ہو یا پورے انسان کی زندگی میں یکدم روح ڈال دی جائے۔ دونوں صورتیں معجزہ ہیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ زندگی کہاں سے آئی؟ کیسے آئی؟ بہر حال ہم یہ بات قطعیت کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہ زندگی مٹی اور ان تمام مردہ عناصر سے علیحدہ کوئی چیز ہے۔ یہ ایک زائد چیز ہے۔ یہ عناصر سے علیحدہ ایک حقیقت ہے۔ اس کے کچھ آثار ہیں۔ اس کی کچھ علامات ہیں جو مٹی یا دوسرے عناصر کے اندر موجود نہیں ہیں۔ نہ دوسرے مردہ مادیات میں موجود ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ راز یعنی حیات کی اصلیت کیا ہے؟ یہ بات کافی نہیں ہے کہ اس حقیقت کا انکار کرنے کے لئے ہم صرف یہ کہہ دیں کہ ہم نہیں جانتے۔ جیسا کہ آج کل مادہ پرست عاجز آکر یہ کہہ جاتے ہیں لیکن ان کی اس بات کو نہ کوئی عقلمند آدمی اہمیت دیتا ہے نہ کوئی عالم اسے تسلیم کرتا ہے۔

اس راز کو ہم اس حقیقت کے باوجود نہیں جانتے کہ ہم نے راز حیات کے پانے کے سلسلے میں آج تک انتہائی کوششیں کیں لیکن وہ راز ہم نہ پاسکے۔ اس لئے کہ ہم نے اس راز کو معروف مادی ذرائع سے پانے کی کوششیں کیں۔ اور وہ اکارت گئیں۔ ہم نے زندگی کو موت کے جنگل سے چھڑانے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔..... ہم نہیں جانتے لیکن اللہ جس نے موت و حیات کی تخلیق کی وہ تو جانتا ہے۔ وہ کہتا ہے ”اس نے اپنی روح س میں پھونک دی“ اور اس کا اظہار اس نے لفظ کُن فیکُون سے کیا۔ یعنی ”ہو جا“ پس ہو گیا۔ اب یہ نفخ روح کیا ہے؟ کس طرح حالت موت پر یہ نفخ روح ہوتی ہے اور وہ حالت حیات میں بدل جاتی ہے اور یہ راز لطیف راز فہم سے باہر رہتا ہے۔

اس کی حقیقت کیا ہے؟ اس کی کیفیت کیا ہے؟ یہ وہ ماہیت و کیفیت ہے جس کا ادراک عقل بشری کے دائرہ قدرت سے باہر ہے۔ کیونکہ یہ اس کی شان اور مقام سے باہر ہے۔ اسے یہ قدرت ہی نہیں دی گئی کہ وہ اس کا ادراک کر سکے۔ اس کے کاسہ سر میں یہ سمندروں جیسی حقیقت سماہی نہیں سکتی؟ اس لئے انسان کا ایک اپنا مقصد تخلیق ہے۔ اس کے یہاں کچھ فرائض ہیں۔ یعنی فریضہ خلافت فی الارض اس کے لئے اسے اس راز سے آگاہی ضروری نہیں ہے۔ وہ یہاں حیات و موت کے کاروبار کے لئے نہیں پیدا کیا گیا تاکہ اسے حیات کی ماہیت بنائی جائے۔ اسے نفخ روح کی کیفیت سے آگاہ کیا جائے اور زندگی کی یہ پہلی سیڑھی پر اس زندگی کا اتصال ذات آدم سے کیسے ہوا؟ جب ان میں زندگی کاست ڈالا گیا۔

یہاں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ جب انہوں نے حضرت آدم میں اپنی روح پھونکی تو اس کی وجہ سے حضرت آدم کو یہ اعزاز حاصل ہوا یہاں تک کہ ان کو ملائکہ پر بھی فوقیت دی گئی۔ لہذا ضروری ہے کہ یہ اعزاز اور یہ حیات جرثومے اور میکربادت کے علاوہ بھی کوئی چیز ہے۔ یہی وہ نفخ روح ہے جس کی وجہ سے ہم یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ اس کرۂ ارض پر انسان ایک ایسی جنس ہے۔ اس کی تخلیق خاص طور پر علیحدہ ہوئی ہے۔ اور اس کائنات میں اس کا معتبر اور مکرم مقام ہے۔ جو دوسری زندہ چیزوں کو حاصل نہیں ہے۔

بہر حال یہاں ہمارا موضوع تخلیق انسان نہیں ہے۔ سیاق کلام میں کچھ دیر کے لئے ہم نے اسی نکتے پر اس لئے روشنی ڈالی ہے کہ بعض اوقات ایک قاری کے ذہن میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ انسان کی پیدائش اس طریقے پر کیسے ممکن ہے۔ یہاں اہم بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں راز حیات سے ہمیں آگاہ فرماتے ہیں۔ اگرچہ ہم اس کی ماہیت نہیں پاسکتے۔ اگرچہ ہم مردہ میں نفخ روح کی کیفیت کا ادراک نہیں کر سکتے لیکن راز حیات کو تو سمجھ سکتے ہیں..... حضرت آدم علیہ السلام کو براہ راست پیدا کر کے اللہ تعالیٰ نے پھر پیدائش انسانیت کے لئے ایک طبعی راہ متعین کر دی۔ یعنی میاں بیوی کے ملاپ کے نتیجے میں قافلہ انسانیت رواں دواں ہوا۔ یعنی بیوی کے پیدا کر دے انڈے کے ساتھ مرد کے جراثیم کے ملاپ یوں گودہری ہوئیں، نسلیں چلیں جس طرح یہ انڈہ زندہ ہے۔ اس طرح یہ جراثیم بھی زندہ ہے۔ دونوں متحرک ہیں۔

قافلہ حیات اس شاہراہ پر چل پڑا اور لوگ اس کے عادی ہو گئے۔ اب ایک مقام ایسا آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیش پا افتادہ راستے کو بدل دیا۔ مروجہ اصل ایک محدود وقت کے لئے معطل کر دیا گیا۔ ایک فرد کے بارے میں اس قاعدے کو معطل کر دیا اور ایک مثال ایسی پیدا کر دی گئی جو آدم علیہ السلام کی شکل میں ہو۔ اگرچہ تمامہ اس جیسی نہ ہو۔ یہاں اب صرف عورت سے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ وہی روح اس عورت میں پھونک دی جاتی ہے جس کی ابتدائی تخلیق ہوئی۔ اور اس عورت کے رحم میں زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ یہاں لاہوتی سوالات پیدا ہوئے۔ کیا یہ نفخ کلمہ ہے؟ کیا کلمہ ارادے کے متوجہ ہونے کا نام ہے؟ کیا کلمہ کن ہے؟ جو کبھی حقیقت ہوتا ہے اور کبھی محض توجہ ارادہ سے کنایہ ہوتا ہے۔ کیا کلمہ خود حضرت عیسیٰ ہیں یا کلمہ وہ ہے جس سے وہ وجود میں آئے؟..... یہ تمام مباحث ایسے ہیں جن سے شبہات ہی حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان مباحث کے نتیجے میں یقین حاصل نہیں ہوتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے ایک زندگی ایسی وجود میں لانی تھی جس کی کوئی مثال نہ ہو۔ اس نے اپنے بے قید ارادے کے ذریعے اسے وجود بخشا۔ اس زندگی میں اپنی جانب سے ایک روح پیدا کی۔ ہمیں اس روح کے آثار تو نظر آتے ہیں لیکن ہم اس کی ماہیت اور کیفیت ادراک سے قاصر ہیں۔ ہم پر فرض ہے کہ ہم اس سے

قاصر رہیں۔ اس لئے کہ اس ادراک کی وجہ سے ہماری اس قوت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا جو ہمیں اس کرہ ارض پر فریضہ خلافت کی ادائیگی کے لئے ضروری ہے۔

یہ معاملہ اس صورت میں بہت سہولت کے ساتھ سمجھا جاسکتا ہے اور اس صورت میں اس کے وقوع پذیر ہونے میں کوئی شبہ بھی پیدا نہیں ہوتا..... غرض ملائکہ نے حضرت مریم کو بشارت دی۔ اس بشارت میں اللہ کی جانب سے فرمان آنا تھا اس فرمان کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم بتایا گیا۔ ان کی نوع و نسب کا بھی ذکر کر دیا گیا۔ نسب نامہ مان کی طرف راجع ہوا۔ بشارت میں ان کی صفات اور اللہ کے ہاں ان کے لئے رتبہ بلند کا ذکر کیا گیا۔ دنیا و آخرت میں ان کی وجاہت کا ذکر بھی ہوا اور یہ اعلان بھی ہوا کہ وہ اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہو گا۔ اور یہ ذکر بھی ہوا کہ پیدا ہوتے ہی اس سے معجزات کا ظہور شروع ہو گا۔ ”گہوارے“ ہی میں لوگوں سے باتیں شروع کر دے گا۔ یعنی جوانی میں بھی بات کرے گا۔ اور اس کی صفات میں سے اہم صفت یہ ہو گی کہ وہ قافلہ صالحین میں سے ہو گا۔

مریم کنواری تھیں اس کی زندگی پاکیزہ تھی اس کی سوچ بابت ولادت ایسی ہی تھی جس طرح ماحول میں وہ دیکھ رہی تھی اس نے اس بشارت کو اسی طرح لیا جس طرح ایک جوان لڑکی اسے سمجھ سکتی ہے، وہ فوراً اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئیں، استدعا کی کہ یہ معاملہ ان کے فہم کے لئے ناقابل حل ہے۔ اس کی عقل حیران ہے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنِّیْ یَکُونُ لِیْ وَلَدٌ وَلَکُمْ یَعْسٰی بَشَرٌ..... ”میرے ہاں بچہ کہاں سے ہو گا، مجھے تو کسی شخص نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔“..... اس کا انہیں فوراً جواب دیا گیا اس جواب میں انہیں ایک سادہ سی حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ جسے انسان روز مرہ زندگی میں سلسلہ اسباب و مسببات کے ساتھ عادی ہو جانے کی وجہ بھول چکا ہے۔ اس لئے کہ اس کے ذرائع علم قلیل ہیں۔ اور وہ اپنے محدود دائرے عادت کے اندر بند رہتا ہے۔

قَالَ كَذَلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ..... ”وہ جب کسی کام کے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو بس کہتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔“

جب اللہ تعالیٰ اس معاملے کو ابتداءً آفرینش کی حقیقت سے وابستہ کرتے ہیں تو تعجب ختم ہو جاتا ہے۔ حیرانی جاتی رہتی ہے۔ دل مطمئن ہو جاتا ہے۔ اور انسان خود اپنے آپ سے تعجب کے ساتھ پوچھنے لگتا ہے کہ تمہیں اس قدر سادہ اور صاف بات پر تعجب کیسے ہو گیا۔ جو نہایت فطری اور قریب الفہم ہے۔

اس طرح قرآن کریم، اسلامی تصور، کو اس قدر سادگی اور فطری انداز میں، ایسے عظیم حقائق تک بھی پھیلا دیتا ہے۔ فطری انداز میں، قریب الفہم انداز میں اور وہ شبہات جنہیں فلسفیانہ جذبات مزید الجھاتے تھے۔ اسلام انہیں صاف کر کرے دلوں میں بٹھا دیتا ہے۔ اور وہ عقل کے بھی قریب آ جاتے ہیں۔

اس کے بعد اس بشارت کی مزید تفصیل بتائی جاتی ہیں، جس کی پیدائش کے لئے حضرت مریم کو منتخب کیا گیا اور جو بے مثال طریقے سے روبعمل آرہی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اس نئے آنے والے کی سیرت اور کردار کیا ہو گا۔ حضرت عیسیٰ کی آئندہ تاریخ بتائی جاتی ہے۔ اب بشارت اور تاریخ مستقل ساتھ ساتھ جاری ہیں تو یا بشارت بھی ہو رہی اور ساتھ ہی تاریخ بھی چلتی پھرتی ہے۔ یہ قرآن کریم کا اپنا اسلوب کلام ہے۔

وَيُعَلِّمُهُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَةَ وَالْإِنْجِيلَ..... ”اور اللہ اسے کتاب و حکمت کی تعلیم دے گا اور تورات اور انجیل کا علم سکھائے گا۔ اور بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول مقرر کرے گا۔“ کتاب سے کبھی مراد کتابت بھی ہوتی ہے اور کبھی اس سے مراد تورات اور انجیل بھی ہوتی ہے۔ اس صورت میں تورات اور انجیل کا عطف کتاب پر عطف بیان ہو گا۔ حکمت انسان کے ذہن میں

ایسے ملکہ کا نام ہے جس کے ذریعہ وہ ہر چیز کو اپنے مقام پر رکھتا ہے۔ جس کلمے ذریعہ انسان صحیح اور برے کی تمیز کر سکتا ہے۔ اور صحیح کا اتباع کر سکتا ہے۔ اور یہ حکمت اور ملکہ دراصل خیر کثیر ہے۔ تورات بھی حضرت عیسیٰ کی کتاب تھی جس طرح انجیل ان کی کتاب تھی، تورات اس دین کی اساس تھی جو وہ لیکر آئے تھے۔ انجیل دراصل اسی دین کا ایک مکملہ تھا، اس کے ذریعہ تورات کی اصل روح کا احیاء مطلوب تھا، وہ روح جو یہودیوں سے ختم ہو گئی تھی۔ ان کے دل اس روح سے خالی ہو گئے تھے۔ وہ لوگ جو مسیحیت پر بحث کرتے ہیں، ان میں سے اکثر لوگوں کے ذہن میں یہ بات نہیں ہوتی کہ حضرت مسیح کے دین کی اصل تورات ہے۔ اس میں وہ نظام شریعت ہے جس پر معاشرے کا نظام قائم ہے۔ انجیل نے اس میں بہت سی کمی بیشی کی ہے۔ وہی انجیل بذات خود تو وہ صرف احیائے دین کی ایک جدوجہد تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مقصد یہ تھا کہ ظاہری نصوص سے پیچھے جا کر انسان کے ضمیر اور اس کی روح کو پاک کیا جائے۔ اور وہ تحریک احیائے روح کیا تھی جس کی وجہ سے معاشرے نے آپ کے خلاف سازش کی تھی۔ وہ اور جس کے لئے آپ جدوجہد کرتے رہے تھے وہ یہ تھی:

وَرَسُولًا إِلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ أَنِّي قَدْ جِئْتُكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ أَنِّي أَخْلُقُ لَكُمْ مِنَ الطَّلِينِ كَهَيْئَةِ الطَّيْرِ فَانْفُخْ فِيهِ فَيَكُونُ طَيْرًا بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُبْرِئُ الْكَلْمَةَ وَالْأَبْرَصَ وَأُحْيِي الْمَوْتَىٰ بِإِذْنِ اللَّهِ وَأُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُونَ وَمَا تَدْخُلُونَ فِي بُيُوتِكُمْ ۖ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّكُمْ إِن كُنتُمْ مُّؤْمِنِينَ

”اور جب وہ بحیثیت رسول بنی اسرائیل کے پاس آیا تو اس نے کہا میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لیکر آیا ہوں۔ میں تمہارے سامنے مٹی سے پرندے کی صورت کا ایک مجسمہ بناتا ہوں۔ اور اس میں پھونک مارتا ہوں۔ وہ اللہ کے حکم سے پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں اور مردے کو زندہ کرتا ہوں۔ میں تمہیں بتاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا اپنے گھروں میں ذخیرہ کر کے رکھتے ہو۔ اس میں تمہارے لئے کافی نشانی ہے۔ اگر تم ایمان لاؤ لے ہو۔“

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی رسالت صرف بنی اسرائیل کے لئے تھی۔ اس لئے کہ آپ انبیائے بنی اسرائیل میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی، اور جس میں بنی اسرائیل کی زندگی کی تنظیم کے لئے شریعت موجود تھی۔ اور جس میں باہم معاملات اور اجتماعی تنظیم کے امور طے ہوئے تھے۔ وہی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کتاب بھی تھی، ہاں اس پر انجیل کا اضافہ کیا گیا تھا۔ اور مقصد یہ تھا کہ بنی اسرائیل میں روحانی پاکیزگی پیدا کی جائے اور ان کا ضمیر جاگ اٹھے اور قلب روشن ہو۔

اور وہ معجزہ جس کی بابت اللہ نے ان کی والدہ حضرت مریم کو بشارت دی تھی کہ وہ معجزہ ان کے پاس ہو گا۔ اور جس کے ساتھ اس نے بنی اسرائیل سے عملاً مباحثہ کیا وہ بھی یہی معجزہ احیاء تھا۔ یعنی مردہ چیز میں پھونک مار کر روح ڈال دینا، اور کسی چیز کا زندہ ہو جانا، اور مردہ انسانوں کو از سر نو زندہ کرنا اور مادر زاد اندھوں کو نظر عطا کیا جانا۔ اور کوڑھی کا تندرست ہونا اور غیب کی خبریں دینا مثلاً یہ کہ بنی اسرائیل نے کیا کھایا ہے اور کیا گھروں میں ذخیرہ کیا ہے۔ جیسا کہ یہ اشیاء نظروں سے اوجھل ہوں..... یہاں آیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبانی جن معجزات کا اظہار ہوا ہے۔ اور جن کی بشارت حضرت مریم کو دی گئی تھی اور جن کا اظہار پھر بعد میں حضرت عیسیٰ کی زبان سے بھی ہوا۔ یہاں آیت میں بار بار اس بات کی تاکید کی جاتی ہے کہ یہ سب معجزات کا جو اظہار ہوا، اور جو عملاً بنی اسرائیل کے سامنے پیش بھی ہوئے۔ یہ سب معجزات اللہ کی جانب سے تھے اور اللہ کے اذن سے تھے۔ ہر معجزے کے بعد اذن اللہ کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ محض اس احتیاط کی خاطر کوئی انہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذاتی کمال نہ سمجھے۔ ان تمام معجزات کا تعلق یا تو زندگی کی تخلیق سے ہے اور یا جس مخلوق سے زندگی نکل جائے۔ اس میں دوبارہ زندگی لوٹانے سے ہے۔ یا انسانی صحت کے ساتھ ان کا تعلق ہے جو کہ خود بقائے حیات کا ایک ذریعہ ہے۔ یا پھر ان معاملات کو دیکھنے سے جو بظاہر نظروں سے اوجھل ہوں۔ ان تمام معجزات کا تعلق اپنی حقیقت کے اعتبار سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے غیر معمولی تولد کے معجزے سے ہے۔ اللہ نے حضرت عیسیٰ کو اس طریقے سے وجود بخشا جس کی کوئی مثال ماسوائے حضرت آدم کے اور نہ تھی۔ اگر اللہ اپنی مخلوقات میں سے ایک مخلوق کے ہاتھ پر اس قسم کے معجزات کا اظہار فرما سکتے ہیں تو وہ بذات خود

اس طریقے پر معجزے کے طور پر خود حضرت عیسیٰ کو کیوں پیدا نہیں کر سکتے۔ اس لئے نہ ان شبہات کا کوئی جواز ہے جو حضرت عیسیٰ کے بارے میں پھیلائے گئے نہ ان کہانیوں کی ضرورت ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کے بارے میں خود عیسائیوں نے تصنیف کیں۔ اس لئے کہ جب معاملہ اللہ کی مشیت کا ہو جائے تو پھر کوئی استحالہ نہیں رہتا۔ اور خود انسانی عادت اللہ پر کوئی پابندی عائد نہیں کر سکتی۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَلَا حِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُم بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا أَمْرًا إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ

”اور میں اس تعلیم و ہدایت کی تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں جو تورات میں سے اس وقت میرے زمانہ میں موجود ہے۔ اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئیں ہیں۔ دیکھو، میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ لہذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، لہذا تم اس کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا راستہ ہے۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا یہ خاتمہ ہے۔ یعنی یہ تھی وہ دعوت جو آپ نے بنی اسرائیل کو دی۔ اس میں انہی بنیادی نکات کی وضاحت کی گئی ہے جو ہمیشہ اللہ کے دین کے اصل نکات رہے ہیں۔ اور جن کی طرف تمام رسول دعوت دیتے رہے ہیں۔ اور یہ وہ حقائق ہیں جن کی بہت ہی اہمیت ہے۔ خصوصاً جبکہ ان حقائق کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی زبان سے دہرایا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی ولادت ہی وجہ نزاع تھی اور یہ نزاعات اس لئے پیدا ہو گئے تھے کہ لوگوں نے دین اور رسولوں کی حقیقت پر غور نہ کیا۔ یعنی یہ کہ رسول بھی ایک ہیں اور ان کا دین بھی ایک ہے۔ اس لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَلَأَجَلٍ لَّكُمْ بَعْضُ الَّذِي حُزِرُمْ
عَلَيْكُمْ..... ”اور میں اس کی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوں جو تورات میں سے میرے سامنے
موجود ہیں۔ اور اس لئے آیا ہوں کہ تم پر بعض ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی
تھیں۔“

یہاں وہ سچا مذہب بیان کیا جاتا ہے جو مسیحیت کا اصل مذہب تھا۔ پس توراقت جو حضرت موسیٰ
علیہ السلام پر نازل کی گئی تھی اس میں وہ دین برحق پوری طرح موجود تھا۔ اور اس میں وہ پوری شریعت
موجود تھی جو اجتماعی زندگی کو بہترین طور پر منظم کرتی تھی۔ یعنی اس دور کی ضروریات کے مطابق اور
اس وقت بنی اسرائیل کے جو حالات تھے۔ ان کی نسبت سے اور اس نقطہ نظر سے کہ اس وقت وہ
انسانوں کے ایک خاص گروہ کے لئے ایک خاص نظام زندگی تھا۔ اور حضرت مسیح اپنی رسالت میں اسی
تورات پر اعتماد فرماتے تھے۔ آپ نے تورات کی تصدیق کی۔ ہاں اس میں بعض حرام چیزوں کو حلال
کر دیا گیا اور وہ چیزیں ان پر حرام بھی بطور سزای گئی تھیں، اس لئے کہ انہوں نے بعض گناہوں اور
بعض بد اعمالیوں کا ارتکاب کیا تھا۔ اور ان کی تربیت کے لئے اللہ تعالیٰ نے بعض چیزوں کو بھی حرام
کر دیا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بذریعہ عیسیٰ علیہ السلام ان پر رحم فرمایا اور وہ بعض اشیاء جو حرام کر دی
گئی تھیں انہوں کو دوبارہ حلال کر دیا گیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر دین کا یہ حقیقی مزاج ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی زندگی بذریعہ قانون
سازی منظم کرتا ہے۔ دین کا مزاج صرف تہذیب اخلاق نہیں ہوتا۔ نہ دین انسان کے تصورات اور
اس کے وجدان و شعور کو درست کرنے پر اکتفا کرتا ہے۔ نہ دین کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ وہ لوگوں
کے لئے کچھ عبادات تجویز کر دے اور وہ ان مراسم عبودیت کے عابد بن کر بیٹھ جائیں۔ ایسے جزوی
مسائل ہی پر اکتفاء کرنے والا دین، اپنے اصل معنوں میں دین نہیں ہوتا۔ دین تو صرف وہ ہوتا ہے جو
پوری زندگی کا نظام ہو، وہ اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ ہو۔ اور جو انسانوں کی زندگی کو اللہ کی منہاج کے مطابق
استوار کرے۔

اور یہ بات بھی درست ہے کہ ایمانی عقائد، مراسم عبودیت، اخلاقی قدریں اگر دین سے علیحدہ کر دی جائیں تو اس صورت میں دین صرف فقہ بن جاتا ہے۔ اور پھر وہ انسانی زندگی میں صحیح طرح کام نہیں کرتا۔ پھر یہ بات دینی مزاج کے خلاف ہو جاتی ہے۔

یہی وہ حادثہ ہے جو مسیحیت کے ساتھ پیش آیا کہ بعض تاریخی اسباب کی وجہ سے، اور پھر اس وجہ سے بھی کہ وہ ایک محدود وقت کے لئے نازل ہوئی تھی، اور وہ حضرت محمد ﷺ کی آخری نبوت کے لئے بطور تمہید آئی تھی۔ مسیحیت کی روحانی تعلیمات سے نظام شریعت علیحدہ ہو گیا۔ وہ تاریخی اسباب یہ تھے کہ یہودیوں اور مسیح علیہ السلام کے درمیان سخت عداوت پیدا ہو گئی۔ آپ کے بعد آپ کے انصار اور یہودیوں کے درمیان بھی سخت عداوت رہی۔ جس کی وجہ سے یہ شریعت تورات بھی ایک محدود قوم اور محدود وقت کے لئے تھی اور حضرت عیسیٰ کی اخلاقی تعلیمات بھی۔ تاکہ اللہ کے نظام قدرت میں طے شدہ منصوبے کے مطابق حضرت محمد ﷺ کی آخری اور جامع شریعت نازل ہو اور ہمیشہ کے لئے پوری انسانیت کے لئے شریعت ہو۔

بہر حال صورتحال یہ ہو گئی کہ مسیحیت ایک ایسا تناور درخت بن گئی جن میں نظام شریعت نہ تھا۔ اس لئے وہ ہمیشہ ان اقوام کی اجتماعی زندگی کٹرول کرنے سے عاجز رہی جن اقوام نے کبھی اسے قبول کیا۔ اس لئے کہ اجتماعی زندگی کی راہنمائی کے لئے ایک ایسا تصور حیات ضروری ہے جو زندگی کے ہر شعبے کی وضاحت کرتا ہو، وہ یہ بتاتا ہو کہ اس پوری کائنات میں انسان کی قدر و قیمت کیا ہے۔ اس کے اندر ایک مضبوط نظام عبادت ہو، اور ایک اچھا اخلاقی اور روحانی نظام بھی رکھتا ہو، اور اس کے بعد اس کے پاس ایک بہترین اجتماعی قانونی نظام ہو اور یہ اخلاقی اور قانونی نظام اس کے اصل تصور حیات سے ماخوذ ہو۔ اگر دین ان عناصر ترکیبی سے مرکب ہو تب وہ اجتماعی زندگی کو منظم کر سکتا ہے۔ اس وقت انسان کو حکمت دین بھی سمجھ میں آتی ہے اور وہ پھر انسانی نظام کی ضمانت دیتا ہے۔

غرض جب مسیحیت کی اخلاقی تعلیمات شریعت سے جدا ہو گئیں تو پھر مسیحیت اس قابل نہ رہی کہ وہ مکمل نظام حیات بن جائے۔ اس لئے لوگوں کی زندگی میں اخلاقی قدروں اور اجتماعی قدروں کے

درمیان مکمل جدائی واقع ہو گئی۔ اور ان کے اخلاق اور ان کے اعمال کے درمیان اتحاد نہ رہا۔ اس طرح ان کا اجتماعی نظام ایک فطری نظام نہ رہا جو ان کی اخلاقی قدروں سے ہم آہنگ ہو۔ اس لئے عیسائیوں کا اجتماعی نظام ہمیشہ یا تو ہوا میں معلق رہا، روحانی دنیا اس کا کوئی تعلق نہ رہا اگر وہ چلا بھی تو وہ ایک لولا لنگڑا نظام تھا۔

تاریخ انسانی کے اندر جب انسانیت اس صورت حال سے دوچار ہوئی تو یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا بلکہ ایک عظیم حادثہ تھا۔ یہ بہت ہی تباہ کن حادثہ تھا۔ یہ ایک ایسا عظیم واقعہ تھا جس کی وجہ سے انسانیت کے لئے بد بختی کے چشمے پھوٹے۔ انسانی حیرانی اور پریشانی کا شکار ہوئے۔ ان پر اخلاقی بے راہ روی کا سیلاب آیا۔ اور ایسی ایسی مصیبتیں آئیں جن میں لادین مادی اجتماعی نظام آج تک گرفتار ہے اور آج یورپ اس کی مثال ہے۔ چاہے اب یہ نظام ان ممالک میں ہو، جن کا مسیحیت کے ساتھ ابھی تک تعلق ہو۔ اس لئے کہ مسیحیت میں سرے سے کوئی اجتماعی نظام ہی نہیں ہے۔ یا ان ممالک میں ہو جہاں سے مسیحیت ختم ہو گئی ہے۔ بہر حال دونوں ممالک کے درمیان کوئی زیادہ امتیاز نہیں ہے۔ اس لئے کہ مسیحیت جس طرح اسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا تھا، اور جس طرح ہر وہ نظام جس پر دین کا اطلاق ہوتا ہے، ایک ایسا نظام تھا جس میں زندگی کے لئے ایک مکمل شریعت اور نظام و قانون موجود تھا۔ جو عقیدہ توحید پر مبنی تھا۔ اور جو ان اخلاقی تصورات پر قائم تھا جو اس عقیدے سے ماخوذ تھے۔ اس لئے موجودہ مسیحیت کو اس لئے مسیحیت نہیں کہا جاسکتا کہ اس میں وہ پورا نظام زندگی موجود نہیں ہے جو حضرت مسیح نے پیش کیا۔ بلکہ مسیحیت سرے سے دین ہی نہ ہوگی۔ غرض ان عناصر ترکیبی کے سوا زندگی کے مسائل کے حل کے لئے کوئی اجتماعی نظام قائم نہیں ہو سکتا جو مکمل بھی ہو، جو نفس انسانی کی پوری ضروریات کے لئے بھی کافی ہو، جو انسان کی عملی زندگی کے مسائل کے حل کرتا ہو اور جو حیات انسانی کا وثیقہ رابطہ اپنے رب کے ساتھ قائم کر دے۔ اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے اس قول کی تفسیروں اور مفہومات میں سے ایک مفہوم ہے، آپ فرماتے ہیں:

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ التَّوْرَةِ وَلَأَجَلٍ لَّكُمْ بَعْضُ الَّذِي حُزِمَ
عَيْكُمْ..... ”میں تصدیق کرتا ہوں تورات کے اس حصے کی جو میرے سامنے موجود ہے
اور تمہارے لئے بعض ان چیزوں کو حلال قرار دیتا ہوں جو تم پر حرام قرار دی گئی ہیں۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے اس منصب کے اظہار کا استدلال توحید الہی سے کرتے ہیں جو اسلام
میں پہلی عظیم حقیقت ہے، فرماتے ہیں

وَحِشُّكُمْ بِآيَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا (٥٠) إِبْرَاهِيمَ
وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَذَا صِرَاطٌ مُسْتَقِيمٌ

”دیکھو، میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں۔ لہذا اللہ سے ڈرو اور
میری اطاعت کرو۔ اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارے بھی، لہذا تم اس کی بندگی اختیار کرو، یہی سیدھا
راستہ ہے۔“

یہاں آپ اس نظریاتی تصور حیات کو پیش فرماتے ہیں جس پر اللہ کا دین قائم ہوتا ہے۔ فرماتے
ہیں کہ میں نے جو معجزات پیش کئے ہیں وہ میں نے اپنی طرف سے نہیں پیش کئے۔ بذات خود تو وہ ایک
بشر ہیں وہ ایسے معجزات کیسے صادر کر سکتے ہیں۔ یہ اللہ کے معجزات ہیں اور میری دعوت خدا خونی اور
اطاعت کے اساسی اصولوں پر قائم ہے۔ اس کے بعد وہ فرماتے ہیں کہ اللہ جس طرح میرا رب ہے اسی
طرح تمہارا رب ہے۔ اور یہ کہ وہ بذات خود رب نہیں ہیں بلکہ عبد ہیں۔ اس لئے بندگی اور عبادت رب
واحد کی کی جائے کیونکہ عبادت اس کے سوا کسی کی نہیں ہو سکتی۔ اس کے بعد ان تمام باتوں کا اظہار یعنی
یہ کہ رب واحد ہے۔ اسی کی بندگی ہوگی، رسول اور اس کے لئے ہوئے نظام حیات کی اطاعت ہوگی
۔ یہ تو ہے صراط مستقیم اور اس کے سوا جو کچھ بھی ہے وہ بے راہی، گمراہی اور انحراف ہے۔

○ ○ ○ ○ ○

ملائکہ کی جانب سے حضرت مریم کو بشارت، پھر آنے والے نبی کی صفات، اس کی رسالت، اس کے معجزات اور کلمات کے تذکرے کے بعد اب اس قصے میں اچانک وہ منظر آتا ہے جب حضرت عیسیٰ محسوس کرتے ہیں کہ بنی اسرائیل کفر اور انکار پر تک گئے ہیں، اب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جانب سے اللہ کے دین کی نشر و اشاعت اور اس کے قیام کے لئے ایک عام اپیل کی جاتی ہے۔

فَلَمَّا أَحَسَّ عِيسَىٰ مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ قَالَ
الْحَوَارِيُّونَ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۵۲) رَبَّنَا
آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ (۵۳)

”جب عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس کیا کہ بنی اسرائیل کفر و انکار پر آمادہ ہیں تو اس نے کہا: کون ہے اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے جواب دیا ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے۔ گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔ مالک جو فرمان تو نے نازل کیا ہے، ہم نے اسے مان لیا ہے اور رسول کی پیروی قبول کی، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ دے۔“

یہاں سیاق قصہ میں ایک بہت بڑا خلا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر نہیں کیا گیا کہ حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی۔ نہ یہ مذکور ہے کہ ان کی ماں ان کے ساتھ قوم کے سامنے آئی اور اس نے گہوارے میں ان سے باتیں کیں، یہ بات مذکور نہیں ہے کہ جو ان ہو کر انہوں نے تبلیغ رسالت شروع کی، نہ یہ مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ کو جن معجزات کے بارے میں بشارت دی گئی تھی وہ ان کے ہاتھ دکھائے گئے (جب کہ یہ سورت مریم میں مذکور ہے۔) اس قسم کے گیپ قرآنی قصوں میں بار بار آتے ہیں، اس کی ایک حکمت تو یہ ہے کہ تکرار نہ ہو، دوسری یہ کہ قرآن کریم میں قصص کے صرف وہی حصے دیئے جاتے ہیں جن کا تعلق اس سورت موضوع کلام سے ہوتا ہے باقی کڑیاں ترک کر دی جاتی ہیں۔

غرض، معجزات پیش کرنے اور تبلیغ شروع کرنے کے ساتھ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے محسوس کر لیا کہ یہ لوگ مان کر دینے والے نہیں ہیں، حالانکہ ایسے معجزات کا صدور کسی انسان سے ممکن نہ تھا۔ اور جن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان معجزات کے پس منظر میں صرف اللہ کی ذات کام کر رہی ہے۔ اللہ کی قوتیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مؤید ہیں۔ اور پھر ان امور کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی حقیقت تھی کہ حضرت مسیح اس لئے بھی تشریف لائے تھے کہ بنی اسرائیل پر ان کی نادانیوں کی وجہ سے جو چیزیں بطور سزا حرام کر دی گئیں تھیں انہیں حلال کر دیں، تاکہ ان پر تخفیف ہو جائے اور قیود اور بوجھ اتر جائیں۔

تو ایسے موقع پر آپ نے فرمایا قَالَ مَنْ أَنْصَارِي إِلَى اللَّهِ ”کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہے۔“ یعنی کون ہے جو دعوت دین، اور اسلامی نظام کے قیام کے سلسلے میں میری معاونت کرتا ہے۔ کون ہے جو میرے ساتھ اللہ تک پہنچنے کے سلسلے میں مددگار ہوتا ہے تاکہ میں اپنے فرائض اچھی طرح ادا کر سکوں..... یہ تحریک دعوت دین کا طریق کار ہے۔ کہ ہر داعی کے لئے انصار کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ جو اس کی دعوت کے علم اٹھا کر چلتے ہیں، جو اس کی حمایت کرتے ہیں اور اس دعوت کو مسلسل پھیلاتے ہیں اور پھر اس صاحب دعوت کی وفات یا چلے جانے کے بعد اسے لیکر اٹھتے ہیں تو قَالَ الْخَوَارِثُ نَحْنُ أَنْصَارُ اللَّهِ آمَنَّا بِاللَّهِ وَاشْهَدْ بِأَنَا مُسْلِمُونَ۔ ”حواریوں نے جواب دیا ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اللہ پر ایمان لائے۔ گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں۔“

حواریوں نے اسلام کا ذکر ان معنوں میں کیا، جن کا تعلق دین کی حقیقت سے ہے۔ اور انہوں نے پھر اپنے اسلام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گواہ بنایا اور اللہ کی مدد کے لئے تیار ہو گئے۔ یعنی اللہ کے رسول کی نصرت، دین اسلام کی نصرت اور اسلامی نظام حیات کی نصرت کے لئے وہ تیار ہوئے اور اس کے بعد وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ اس معاملے میں براہ راست اللہ سے بھی اپنا رابطہ قائم کرتے ہیں کہ وہ اس معاملے کے لئے تیار ہو گئے۔ اس لئے آپ بھی اس بات کے گواہ رہیں۔

رَبَّنَا آمَنَّا بِمَا أَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُولَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ

”مالک جو فرمان تو نے نازل کیا، ہم نے اسے مان لیا اور رسول کی پیروی قبول کی، ہمارا نام گواہی دینے والوں میں لکھ دے۔“

یہ جو انہوں نے براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ فرمائی، اور اللہ کے ساتھ بھی یہ وعدہ کیا، اس میں ایک اہم نکتہ پوشیدہ ہے۔ مومن کا ابتدائی عہد صرف اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ جب ایک رسول کسی پیغام کو اہل ایمان تک پہنچا دیتا ہے تو پھر اس کی ڈیوٹی ختم ہو جاتی ہے اور اب مومن کی بیعت اللہ تعالیٰ کے ساتھ قائم ہو جاتی ہے۔ اور جب رسول اس دنیا سے چلا جائے تب بھی یہ فریضہ اور یہ ذمہ داری مومن کے گلے میں پڑی رہتی ہے۔ اور اس بیعت میں، معاہدہ ذمہ داری میں یہ بات ہوتی ہے کہ وہ رسول کی اطاعت کرتے رہیں گے۔ اس لئے ایمان صرف عقیدے کا نام نہیں ہے جو انسان کے ضمیر میں ہوتا ہے بلکہ اتباع کا نام ہے اور رسول کے نظام کی اطاعت بھی ضروری ہے اور یہی وہ مفہوم ہے جس کے ارد گرد اس پوری سورت کے مضامین گھوم رہے ہیں۔ اس سورت میں اس مضمون کو مختلف طریقوں سے مکرر بیان کیا گیا ہے۔

یہاں حواریوں کے کلام میں ایک اہم جملہ ہے فَكُنْتُمْ مَعَ الشَّاهِدِينَ..... ”آپ ہمارے نام گواہی دینے والوں میں لکھ دیں۔“ سوال یہ ہے کہ وہ کیا شہادت دیتے ہیں اور کس بات کے وہ گواہ ہیں؟

در حقیقت ایک شخص جو ایمان لا کر مسلم بن جاتا ہے اور اللہ کے دین کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہے تو اس کے بعد اس کا فرض ہے کہ وہ اس دین کے بارے میں شہادت دے۔ وہ گواہی دے کہ اس دین کا یہ حق ہے کہ یہ قائم و دوام رہے۔ وہ ایسی شہادت دے کہ اس دین میں انسانوں کی جو بھلائی ہے وہ اس کی شہادت ہے۔ اور یہ مومن اس وقت تک شہادت نہیں دے سکتا جب تک وہ اپنے نفس اپنے اخلاق اور اپنی پوری زندگی کو اس دین کی جیتی جاگتی تصویر نہ بنالے۔ وہ ایسی تصویر بنائے کہ لوگ اسے دیکھتے ہی ایک مثال سمجھیں اور اس بات کی شہادت دیں کہ واقعی اگر دین کی یہ صورت ہے تو یہ دین اس

بات کا مستحق ہے۔ کہ وہ زندہ رہے۔ اور یہ کہ یہ دین اس پوری کائنات میں تمام نظاموں اور طریقوں اور سوسائٹیوں کے مقابلے میں افضل اور بہتر ہے۔

ظاہر ہے کہ کوئی شخص یہ شہادت اس وقت تک نہیں دے سکتا جب تک وہ اس دین کو اپنے لئے ضابطہ حیات نہ بنالے۔ جب تک وہ اسے اجتماعی نظام نہ بنالے۔ اور جب تک وہ اسے اپنے اور اپنی قوم کے لئے نظام قانون نہ بنالے۔ اور جب تک اس کے گرد ایسا معاشرہ قائم نہ ہو جائے جو اس نظام حیات کے مطابق اپنی زندگی کے معاملات کو چلاتا ہو۔ جو ایک خدائی نظام اور مضبوط نظام ہے۔ نیز یہ شہادت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ مومن اس نظام حیات کے قائم کرنے کے لئے جہاد شروع نہیں کرتا۔ اور جب تک وہ اس جہاد میں زندگی پر موت کو ترجیح نہیں دیتا یعنی اس معاشرے کے خلاف جس میں انسانی زندگیوں پر اسلامی نظام رائج نہ ہو اور یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ اقامت دین کا فریضہ خود اس کی زندگی سے بھی عزیز تر ہے۔ حالانکہ زندگی کی وہ تمام چیزوں کے لئے ایک عزیز متاع ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو شہید کہا جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ شہادت دیتا ہے۔

یہاں ان حواریوں نے دعا کی کہ اللہ ہمیں ایسے گواہوں میں لکھ دے، ہم دین کے لئے شہادت دیں گے۔ یعنی وہ یہ دعا کرتے ہیں کہ ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہماری زندگی دین مسیحی کا زندہ نمونہ بن جائے اور ہمیں توفیق دے کہ ہم ایک ایسے معاشرے کو وجود میں لانے کے لئے جہاد کریں جس میں یہ دین قائم ہو۔ اگر انہوں نے اس کا حق ادا کر دیا تو گویا انہوں نے اس دین کے حق کی شہادت دیدی کہ یہ دین سچا دین ہے۔

میں یہاں یہ بات کہوں گا کہ آج جو شخص بھی اپنے لئے ایمان اور اسلام کا دعویٰ کر رہا ہے وہ ذرا اس دعا پر غور کرے۔ یہ ہے اصلی اسلام، جس طرح حواریوں نے اسے سمجھا۔ جس طرح حقیقی مسلمانوں کے دل میں بھی یہ حقیقت اچھی طرح بیٹھی ہوئی ہے۔ اور جو شخص دین کے لئے شہادت نہ دے گا اور اسے چھپا کر رکھے گا تو اس کا دل گناہ گار ہے۔ یاد رہے کہ جو شخص اسلام کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنی عملی زندگی میں اسلام کے خلاف روش اختیار کرتا ہے، جو شخص اسلام پر یقین رکھتا ہے لیکن اسلامی فرائض

علی الاعلان ادا نہیں کرتا اور اسلامی نظام حیات کو عملاً قائم کرنے کے لئے جدوجہد نہیں کرتا۔ وہ یہ کام یا اپنی پر امن زندگی کے لئے کرتا ہے یا اپنی زندگی کو دین اسلام کی زندگی پر فوقیت دیتا ہے تو اس نے یقیناً شہادت حق دینے میں سخت کوتاہی کی یا اس نے اسلام کے خلاف دوسرے نظاموں کے حق میں شہادت دی۔ یہ ایسی شہادت ہے جو دوسروں کو بھی اسلام کی طرف آنے سے روکتی ہے اس لئے کہ وہ دیکھتے ہیں کہ اہل اسلام اسلام کے حق میں نہیں بلکہ اسلام کے خلاف شہادت دے رہے ہیں۔ اور اس شخص کا انجام عظیم بربادی ہے جو اپنے اس دعوے کی بنا پر کہ وہ مسلم ہے تمام لوگوں کو اسلام سے روکتا ہے۔ حالانکہ وہ دین کا مومن نہیں ہوتا بلکہ دین سے روکنے والا ہوتا ہے (اس موضوع پر استاد مودودی نے اپنی کتاب شہادت حق میں جو قیمتی بحث کی ہے اسے ضرور ملاحظہ فرمائیں۔ سید قطب)۔ اب بنی اسرائیل کے ساتھ قصہ عیسیٰ علیہ السلام کا آخری حصہ آتا ہے۔

وَمَكُرُوا وَكَرَّ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ (۵۴) إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنِي مَرْيَمَ اذْهَبِي فَرَفَعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهَّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بِبَيْنِكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۵۵) فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (۵۶) وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمُ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (۵۷)

”پھر بنی اسرائیل مسیح کے خلاف خفیہ تدبیریں کرنے لگے جواب میں اللہ نے بھی اپنی خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔ (وہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی)۔ جب اس نے کہا کہ ”اے عیسیٰ! اب میں تجھے واپس لے لوں گا اور تجھ کو اپنی طرف اٹھالوں گا۔“ اور جنہوں نے تیرا انکار کیا ان سے تجھے پاک کر دوں گا۔ اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر بالادست

رکھوں گا جنہوں نے تیرا انکار کیا ہے۔ پھر تم سب کو آخر کار میرے پاس آنا ہے۔ اس وقت میں ان باتوں کا فیصلہ کروں گا۔ جن میں تمہارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی ہے انہیں دنیا و آخرت دونوں میں سزا دوں گا اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے اور جنہوں نے ایمان اور نیک عمل کا رویہ اختیار کیا ہے انہیں ان کے اجر پورے دیئے جائیں گے اور خوب جان لو کہ ظالموں سے اللہ ہر گز محبت نہیں کرتا۔“

وہ مکاری جو یہودیوں نے اپنے رسول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کی وہ عظیم مکاری تھی اس کا تانا بانا بہت طویل و عریض تھا۔ جس طرح اناجیل میں مذکور ہے کہ انہوں نے اس پر الزام لگایا کہ اس نے اپنے منگیتریوسف نجار کے ساتھ تعلقات قائم کئے تھے۔ حالانکہ وہ پاک دامن تھیں اور ابھی یوسف کے ساتھ ان کی شادی نہ ہوئی تھی۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا۔ شغز اور اس کے بعد انہوں نے رومی حکمران بیلطس کے پاس ان کے خلاف شکایات کیں اور کہا کہ وہ لوگوں کو رومی حکومت کے خلاف بغاوت پر ابھارتا ہے۔ اور یہ کہ وہ گمراہ ہو گیا ہے اور عوام الناس کے عقائد خراب کر رہا ہے۔ چنانچہ بیلطس نے انہیں گرفتار کرنے کا حکم دیا کہ وہ خود اسے جو سزا دینا چاہیں دیدیں اس لئے کہ وہ اگرچہ ایک بت پرست تھا مگر یہ جانتا تھا کہ ایک ایسے شخص کو کس طرح سزا دے جس پر اس کا کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ یہ تھیں ان کی سازشیں بلکہ یہ ان سازشوں کا ایک حصہ تھا۔

وَمَكْرُوا وَمَكَرَ اللَّهُ وَاللَّهُ خَيْرُ الْمَاكِرِينَ..... ”وہ اس کے خلاف خفیہ تدبیریں کرنے لگے اور اللہ نے ان کے خلاف خفیہ تدبیر کی اور ایسی تدبیروں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے۔“

اللہ کی تدبیر اور یہودیوں کی تدبیر کے درمیان صرف ایک مشاکلت لفظی ہے ورنہ حقیقت کے اعتبار سے یہودیوں کی تدبیر مکر ہے اور اللہ کا جواب تدبیر ہے اور مکر کا مفہوم بھی تدبیر کرنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہاں لفظ مکر اپنے لئے اس لئے استعمال کیا ہے کہ اس سے اللہ ان کے مکر کی حقارت کا اظہار فرمائیں۔ اس لئے کہ ان کا مقابلہ اللہ سے کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ کہاں اور اللہ کہاں ان کا مکر کیا اور اس کے مقابلے میں اللہ کی تدبیر دونوں میں کیا مقابلہ ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنا یا سولی چڑھانا

چاہتے تھے۔ لیکن اللہ نے انہیں صحیح سلامت اپنے ہاں بلا لیا، اور انہیں ان کفار اور ان کے گندے ماحول سے پاک کر لیا۔ یعنی دور کر دیا، اور اس کے بعد انہیں یہ عزت دی گئی کہ وہ لوگ ان کے ماننے والے ہیں قیامت تک ان لوگوں کے مقابلے میں برتر رہیں گے جو ان کی تعلیمات کے ساتھ کفر کرتے ہیں۔ اور جس طرح اللہ نے چاہا ایسا ہی ہوا۔ اور اللہ نے مکاروں کے مکر کے بھٹے ادھیڑ دیئے۔

إِذْ قَالَ اللَّهُ يَا عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ هُوَ أَفْعَلُكَ وَإِيَّاهُ وَطَهَّرَكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوا إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ

”جب اللہ نے کہا کہ ”اے عیسیٰ! اب میں تجھے واپس لے لوں گا اور تجھ کو اپنی طرف اٹھالوں گا۔“ اور جنہوں نے تیرا انکار کیا ان سے تجھے پاک کر دوں گا۔ اور تیری پیروی کرنے والوں کو قیامت تک ان لوگوں پر بالادست رکھوں گا جنہوں نے تیرا انکار کیا ہے۔

آپ کی وفات کیسے تھی، آپ کا آسمانوں پر اٹھایا جانا کیسے تھا۔ یہ غیبی امور ہیں اور یہ متشابہات میں داخل ہیں۔ جن کی تاویل صرف اللہ جانتا ہے۔ اس لئے اس بارے میں بحث سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔ نہ عقیدہ میں فائدہ ہے اور نہ شریعت میں فائدہ ہے۔ جو لوگ اس کے پیچھے پڑتے ہیں اور اسے بحث و مجادلہ کا موضوع بناتے ہیں تو وہ آخر کار ایسے حالات تک پہنچتے ہیں جو ظاہری اور سطحی باتیں ہوتی ہیں۔ مزید التباس اور پیچیدگی میں پھنس جاتے ہیں اور وہ کوئی قطعی حقیقت سامنے نہیں لاسکتے۔ نہ دل کو کوئی تسلی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ ایسا امر ہے جس کی تاویل اللہ ہی جانتا ہے۔..... رہی یہ بات کہ اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو قیامت تک ان لوگوں سے برتر کر دیا ہے جنہوں نے ان کا انکار کیا ہے۔ تو اس کا مفہوم بہت ہی سہل ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متبعین وہی لوگ ہیں جو اللہ کے صحیح دین کو ماننے والے ہیں اور وہ اسلام ہے۔ اور اسلام وہ دین ہے جس کی حقیقت ہر نبی کے علم میں تھی۔ اور ہر رسول نے اسلام ہی کی تبلیغ کی۔ اور جب بھی کسی نے دین حقہ پر ایمان لایا تو وہ اسلام ہی تھا، جب وہ لوگ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں آتے ہیں جو ان کا انکار کرتے ہیں تو اپنی ایمانی قوت کی وجہ سے وہ لوگ جو ایمان لائے برتر ثابت ہوتے

ہیں۔ اس لئے وہ حضرت عیسیٰ کے متبعین ہیں۔ اللہ کا دین ایک ہے۔ اسی دین کو لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام آئے تھے۔ جس طرح ان سے پہلے اور ان کے رسول سب کے سب اسی دین کو لے کر آئے اور جو لوگ حضرت محمد ﷺ کا اتباع کرتے ہیں وہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد نبی آخر الزمان تک تمام رسولوں پر ایمان لاتے ہیں..... یہی عام مفہوم ہے جو اس سورت کے سیاق و سباق سے منطبق ہے۔ اور یہی مفہوم حقیقت دین اور حقیقت ایمان کے ساتھ مطابق ہے۔ اور اہل ایمان اور اہل کفر کا انجام کار یہی ہے کہ وہ سب اللہ کے سامنے جائیں گے۔

الْقِيَامَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۵۵) فَأَمَّا الَّذِينَ كَفَرُوا فَأَعَذُّهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (۵۶) وَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (۵۷)

”پھر تم سب کو آخر کار میرے پاس آنا ہے۔ اس وقت میں ان باتوں کا فیصلہ کروں گا جن میں تمہارے درمیان اختلاف ہوا ہے۔ جن لوگوں نے کفر و انکار کی روش اختیار کی ہے انہیں دنیا و آخرت دونوں میں سزا دوں گا اور وہ کوئی مددگار نہ پائیں گے، اور جنہوں نے ایمان اور نیک عمل کا رویہ اختیار کیا ہے، انہیں ان کے اجر پورے پورے دیئے جائیں گے اور خوب جان لو کہ ظالموں سے اللہ ہرگز محبت نہیں کرتا۔“

اس آیت میں اس بات کا فیصلہ کر دیا گیا ہے کہ ہر کسی کو کئے کی جزاء ملے گی اور اس قدر انصاف ہو گا کہ بال برابر بے انصافی بھی نہ ہوگی۔ اس سلسلے میں لوگوں کی تمنائیں جو بھی ہوں یا انہوں نے جو افتراء باندھا ہو..... اللہ کی طرف لوٹنا اٹل ہے۔ اس سے کوئی چھٹکارا نہیں اور دنیا و آخرت میں اہل کفر کے لئے عذاب طے ہو چکا ہے، کوئی نہیں ہے کہ اسے رد کر سکے۔ اور جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اس کے بعد نیک کام کئے انہیں پورا پورا اجر ملنا ہے۔ اس میں کوئی کمی بیشی ممکن ہی نہیں اور اللہ کبھی ظلم نہیں کرے گا اور وہ کیسے کرے گا جب وہ خود ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔

اور اہل کتاب کا یہ گمان کہ وہ محض چند دن ہی آگ میں داخل ہوں گے اور اپنے اس گمان پر انہوں نے اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے بارے میں جو صغریٰ کبریٰ ملایا وہ سب ان کی نفسانی خواہشات ہیں وہ فاسد ہیں، وہ باطل ہیں اور ان کی کوئی اصل و اساس نہیں ہے۔



جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ قصہ اس مقام تک پہنچ جاتا ہے، جس کے بارے میں اس وقت تک رسول ﷺ کا ان لوگوں کے ساتھ مناظرہ ہو رہا تھا تو اس کے بعد اس قصے پر ایک اختتامیہ آجاتا ہے اور اس اختتامیہ میں وہ تمام حقائق کھول دیئے جاتے ہیں جو اس قصے کے واقعات سے اخذ ہوتے ہیں۔ اور اب رسول اللہ ﷺ کو وہ بات بتادی جاتی ہے جسے اب اہل کتاب کے سامنے اس مباحثے کو ختم کرنے کے لئے پیش کر دیں، یہ ایک فیصلہ کن بات ہے جس کے ذریعہ یہ تمام مباحثہ اور مذاکرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اور اس میں وہ حقیقت بھی آجاتی ہے جسے لے کر آپ آئے ہیں۔ جس کی طرف آپ دعوت دیتے ہیں اور یہ نتیجہ مکمل یقین اور مکمل وضاحت کے ساتھ سامنے آتا ہے۔

ذَٰلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ (۵۸) إِبْرٰهٖمَ مَثَلٍ عِيسٰى
عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ (۵۹) الْحَقُّ
مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ (۶۰) فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا
جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ
وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللّٰهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ (۶۱) إِبْرٰهٖمَ
هَٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا اللّٰهُ وَإِبْرٰهٖمَ اللّٰهُ لَهُوَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ (۶۲) فَإِبْرٰهٖمَ تَوَلَّوْا فَإِبْرٰهٖمَ اللّٰهُ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ (۶۳) قُلْ يَا أَهْلَ

الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۶۴)

”یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمہیں سنارہے ہیں، اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے پیدا کیا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔ یہ اصل حقیقت ہے جو تمہارے رب کی طرف سے بتائی جا رہی ہے۔ اور تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں۔ یہ علم آجانے کے بعد اب جو کوئی آپ سے جھگڑا کرے تو اس سے کہو آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں۔ اور اپنے اپنے بال بچوں کو بھی لے آئیں اور اللہ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہے اس اللہ کی لعنت۔ یہ بالکل صحیح واقعات ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔ اور وہ اللہ ہی کی ہستی ہے جس کی طاقت سب سے بالا اور جس کی حکمت نظام عالم میں کار فرما ہے۔ پس اگر لوگ منہ موڑیں تو ان کا مفسد ہونا صاف کھل جائے گا اور اللہ مفسدوں کے حال سے واقف ہے۔ کہو اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا اپنا رب نہ بنالے۔“ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں۔“

اس اختتامیہ میں سے پہلے تو یہ کہا گیا کہ رسول ﷺ پر جو وحی نازل ہوئی ہے وہ حق ہے۔

ذَلِكَ نَتْلُوهُ عَلَيْكَ مِنَ الْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيمِ..... ”یہ آیات اور حکمت سے لبریز تذکرے ہیں جو ہم تمہارے سنارہے ہیں۔“ یہ قصے اور قرآنی ہدایات سب کی سب اللہ کی وحی پر مبنی ہیں اور خود اللہ انہیں پڑھ کر نبی ﷺ کو حکمت و دانائی کی آیات پرہ کر سنا تے ہیں۔ انداز بیان ایسا ہے جس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ رسول اکرم ﷺ کو اللہ تعالیٰ کا قرب اور خوشنودی حاصل ہے۔ جب خود اللہ تعالیٰ نبی ﷺ کو حکمت و دانائی کی آیات پڑھ کر سنا تے ہیں۔ اللہ دانا و حکیم ہیں انسانی زندگی اور

نفس کے حوالے سے اونچے حقائق اس کے پاس ہیں۔ اور وہ اس نے ایک خاص طریقے اور خاص اسلوب کے ساتھ وہاں ودیعت کئے ہیں۔ وہی بتا سکتا ہے کہ فطرت کے ساتھ ہرکلامی کا طریقہ کیا ہے۔ اور فطرت انسانی تک رسائی کا اسلوب کیا ہے۔ اور یہ حکمت اس انداز میں بتائی جاتی ہے جس کی کوئی سابق نظیر نہیں ہے۔ یعنی اس تمام انسانی حکمت کے ریکارڈ میں جس کا مصدر اور منبع اللہ نہ ہو۔

اس کے بعد یہ اختتامیہ حقیقت مسیح کا فیصلہ کر دیتا ہے، فیصلہ کن انداز میں بتایا جاتا ہے کہ اللہ کا ارادہ ہی ہر چیز کا خالق ہے۔ جس طرح اللہ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا۔ اللہ کے ہاں تخلیق کا عمل صرف یہ ہے۔

إِنَّمَا مَثَلُ عِيسَىٰ عِنْدَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ..... ”اللہ کے نزدیک عیسیٰ کی مثال آدم کی سی ہے کہ اللہ نے اسے مٹی سے بنایا اور حکم دیا کہ ہو جا اور وہ ہو گیا۔“

حضرت عیسیٰ کی ولادت اس اعتبار سے کہ وہ پیدائش انسانی کے عام ڈگر سے ہٹ کر ہے ضرور تعجب انگیز ہے۔ لیکن جب اسے حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کے حوالے سے دیکھا جائے، تو اس میں کوئی انوکھی چیز نظر نہیں آتی۔ پیدائش مسیح کے معاملے میں اہل کتاب کے درمیان جو بحث و مناظرہ اور جدل و جدال جاری تھا۔ اور اس سلسلے میں وہ عجیب و غریب قصے کہانیاں گھڑ رہے تھے۔ طلسماتی ماحول پیدا کر رہے تھے کہ وہ ایک عجیب بات ہے۔ محض اس لئے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ یہی اہل کتاب اپنی کتابوں میں صبح و شام یہ تلاوت کرتے تھے کہ حضرت آدم کو مٹی سے پیدا کیا گیا اور اس ڈھانچے میں پھر اللہ نے روح پھونکی اور اس سے بطور انسان آدم زندہ ہو گیا۔ اور وہ حضرت آدم کے بارے میں اس قسم کے قصے کہانیاں نہ گھڑتے تھے۔ اور نہ ہی بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ وہ آدم علیہ السلام کے بارے میں یہ سوچتے تھے کہ ان کی بھی ایک لاهوتی طبیعت ہے۔ اس لئے کہ جس عناصر سے آدم انسان بن کر آئے وہی عناصر ہیں جن سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام بن باپ پیدا ہو کر آئے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام میں اپنی روح پھونکی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں بھی روح ڈالی

۔ اور اس کا طریقہ کار ایک کلمہ کن سے مکمل ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے کن کہا اور جو اس نے پیدا کرنے کا ارادہ کیا تھا وہ فیکون ہو گیا۔

یہ حقیقت کس قدر سادہ ہے حقیقت آدم بھی یہ ہے اور حقیقت بھی یہی ہے۔ بلکہ تمام مخلوقات کی تخلیق کی بس یہی حقیقت ہے۔ اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جو ذہن انسانی میں بسہولت اور بوضاحت آجاتی ہے۔ تعجب تو اس پر ہے کہ ان واقعات کے بارے میں یہ طویل مجادلہ اور مباحثہ کیوں ہوتا رہا۔ حالانکہ یہ واقعہ اللہ کی سنت کبریٰ کے مطابق تھا۔ جو اس پوری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ یعنی تخلیق کرنا اور دوبارہ اٹھانا۔

دراصل یہ ہے انداز اس ذکر حکیم کا، یہ ذکر فطرت انسانی کو فطری منطق سے خطاب کرتا ہے۔ جو واقعی عملی سادہ ہوتی ہے۔ اس حکیمانہ انداز کلام کی وجہ سے دنیا کے پیچیدہ ترین مشکل ترین فلسفی مسائل بھی اسے سہل نظر آتے ہیں جیسے روزمرہ کے معمولات۔

سیاق کلام جب اس واضح فیصلے تک پہنچ جاتا ہے۔ تو روئے سخن اب رسول اکرم ﷺ کی طرف پھر جاتا ہے۔ اور آپ کو بتایا جاتا ہے کہ آپ اپنے سچے موقف پر قائم رہیں۔ جس کی تلاوت آپ کے سامنے کی جا رہی ہے اور جسے آپ کے حس و شعور میں بٹھایا جا رہا ہے جس طرح اہل ایمان کے حس و شعور میں اسے مضبوط طرح جاگزیں کیا جا رہا ہے اس لئے کہ اہل ایمان میں سے بعض افراد پر اہل کتاب کے شبہات اثر ڈال رہے تھے اور عجیب انداز میں تلبیس کر کے اہل ایمان کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

فرماتے ہیں: الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِنَ الْمُمْتَرِينَ..... ”تم ان لوگوں میں شامل نہ ہو جو اس میں شک کرتے ہیں“..... رسول ﷺ نہ تو شک کرتے تھے اور نہ ہی ان کے دل میں کوئی خلجان تھا۔ ان پر جو کلام نازل ہوتا تھا وہ اسے من جانب اللہ سمجھتے تھے۔ ایک لحظہ کے لئے بھی شک ان کے قریب نہیں آیا۔ یہاں مقصود یہ ہے کہ آپ اس ہدایت پر جم جائیں۔ اس سے معلوم

ہوتا ہے کہ جماعت مسلمہ کے دشمنوں نے اس دور میں اہل ایمان کے خلاف سازشوں کا جال پھیلا رکھا تھا، اور وہ اس سازش میں امت مسلمہ کے بعض افراد کو پھانس رہے تھے۔ امت مسلمہ کے خلاف یہ سازشیں آج بھی ہو رہی ہیں اور ہر دور میں ہوتی رہتی ہیں۔ اور اس بات کی ضرورت ہے کہ امت مسلمہ ان دھوکہ بازوں اور جھوٹوں کے مقابلے میں محتاط رہے۔ اس لئے کہ امت کے اس قسم کے دشمن ہر دور میں نیا جال لے کر آتے ہیں۔

غرض پیدائش مسیح کا مسئلہ حل ہو گیا۔ حقیقت واضح ہو گئی، اب اللہ تعالیٰ رسول کریم ﷺ کو اس طرف متوجہ فرماتے ہیں کہ وہ اب ان لوگوں کے ساتھ یہ مجادلہ اور مناظرہ ختم کر دیں اس لئے کہ مسئلہ واضح ہو گیا، سچائی واضح طور پر سامنے آگئی ہے اور حکم دیا جاتا ہے کہ اب آخری بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو مباہلے کی دعوت دی جائے

فَمَنْ حَاجَبَكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَنِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَةَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ

”یہ علم آجانے کے بعد جو کوئی آپ سے جھگڑا کرے تو اس سے کہو کہ آؤ ہم اور تم خود بھی آجائیں۔ اور اپنے بال بچوں کو بھی لے کر آئیں اور اللہ سے دعا کریں کہ جو جھوٹا ہے اس پر اللہ کی لعنت۔“

اس کے بعد اس موضوع پر رسول اللہ کے ساتھ جو لوگ مباحثہ کرتے تھے، رسول ﷺ نے بھرے مجمعے میں انہیں دعوت مباہلہ دی۔ یعنی سب آجائیں اور اللہ سے دست بدعا ہوں کہ اللہ جھوٹوں پر لعنت کرے۔ اس چیلنج کے انجام سے وہ لوگ ڈر گئے اور انہوں نے مباہلہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ رسول اللہ ﷺ کا موقف سچا ہے۔ لیکن جس طرح بعض روایات میں آتا ہے کہ اسلام اس لئے قبول نہ کیا کہ ان لوگوں کو اپنے معاشرے میں ایک بلند مقام حاصل تھا۔ نیز یہ لوگ ان کے مذہبی پیشواؤں میں سے تھے اور اس دور میں اہل کنیسہ کو اپنی سوسائٹی میں مکمل اقتدار حاصل تھا اور اس کے ساتھ ان کے بڑے مفادات وابستہ تھے۔ اس سوسائٹی میں وہ

عیش و عشرت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ جو لوگ دین اسلام سے اعراض کر رہے تھے ان کے سامنے کوئی دلیل نہ پیش کی گئی تھی بلکہ ان کے بعض مفادات ایسے تھے جنہیں وہ نہ چھوڑ سکتے تھے، کچھ ایسی نفسیاتی خواہشات میں وہ گھرے ہوئے تھے جن پر وہ یہ نہ کر سکتے تھے۔ حالانکہ سچائی واضح ہو گئی تھی اور اس میں کوئی شک و شبہ نہ رہا تھا۔

دعوت مباہلہ کے بعد اب اس اختتامیہ میں حقیقت وحی، حکمت قصص فی القرآن، اور حقیقت توحید کا بیان کیا جاتا ہے۔ شاید یہ آیات دعوت مباہلہ سے مجادلین کے انکار کے بعد اتری ہوں۔ اور ان لوگوں کو سخت دہمکی دی جاتی ہے جو اللہ کی اس زمین پر محض برائے فی سبیل اللہ فساد یہ مجادلے کرتے ہیں۔

إِن هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ (۶۲) فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِالْمُفْسِدِينَ

”یہ بالکل صحیح واقعات ہیں، اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔ اور وہ اللہ ہی کی ہستی ہے جس کی طاقت سب سے بالا ہے اور جس کی حکمت نظام عالم میں کار فرما ہے۔ پس اگر یہ لوگ منہ موڑیں تو ان کو مفسد ہونا صاف کھل جائے گا اور اللہ مفسدوں کے حال سے واقف ہے۔“

ان آیات میں جن حقائق کا بیان ہوا اس سے قبل ان کا بیان ہو گیا ہے۔ یہاں دعوت مباہلہ اور وفد کی جانب سے اس کے انکار کے بعد بطور تاکید دوبارہ ذکر کیا جاتا ہے۔ اس آیت میں البتہ نئی بات یہ ہے کہ جو اس سچائی کو قبول نہیں کرتے وہ درحقیقت مفسد ہیں اور خبردار کیا جاتا ہے کہ تم اللہ سے پوشیدہ نہیں ہو، وہ انداز قد سے پہچانتا ہے۔

اور وہ فساد جو منکرین توحید، توحید کا انکار کر کے پھیلاتے تھے وہ اللہ کے نزدیک ایک عظیم فساد تھا۔ اور دنیا میں جس قدر فسادات بھی رونما ہوتے رہتے ہیں وہ سب کے سب عقیدہ توحید سے انحراف کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں اور عقیدہ توحید کا اعتراف بھی محض زبانی اعتراف کافی نہیں ہے۔ اس لئے کہ

محض زبانی اعتراف کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ نہ ہی ایسا دینی اعتراف جو خالص منفی اعتراف ہو، اس لئے کہ محض قلبی اور زبانی اعتراف کے نتیجے میں وہ آثار ظاہر نہیں ہوتے جو انسانوں کی عملی زندگی میں نمودار ہونے ضروری ہیں۔ دراصل دنیا نے عقیدہ توحید کے لازمی آثار و نتائج سے انکار کر دیا ہے اور انسانی زندگی کے عقیدہ توحید کے آثار کو ختم کر دیا ہے۔ عقیدہ توحید کا پہلا لازمہ تو یہ ہے کہ ہمارا رب بھی ایک ہو، پھر اس رب کی غلامی اور بندگی بھی ایک ہو، اس لئے کہ بندگی صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے پھر اسی ایک رب کی اطاعت ہو، پھر تمام ہدایات بھی اسی ایک رب سے اخذ کی جائیں یعنی اس کے سوا عبودیت نہ ہو۔ اللہ کے سوا اطاعت نہ ہو اور اللہ کے سوا کوئی مرجع ہدایت نہ ہو۔ ہدایات چاہے قانون سازی میں ہوں، چاہے اقدار حیات اور فلسفہ حیات میں ہوں، چاہے اخلاق و آداب میں ہوں، غرض ان تمام امور میں جو اس کرہ ارض پر حیات انسانی سے تعلق رکھتے ہیں صرف اللہ سے ہدایت لی جائیں..... اگر ایسی صورت حال نہیں تو پھر شرک اور کفر کے سوا کوئی بات نہیں ہے۔ چاہے زبان سے جو کچھ کہتے جائیں۔ چہے قلب شعور میں مجرد عقائد جو بھی ہوں۔ الا یہ کہ لوگوں کی روزمرہ زندگی میں، تسلیم و رضا، اطاعت و فرمانبرداری، امر و نہی کی قبولیت کی فضا قائم ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ اس پوری کائنات کا نظام اس وقت تک درست طور پر چل ہی نہیں سکتا جب تک یہ تسلیم نہ کر لیا جائے کہ اس کا اللہ ایک ہی ہے۔ جو اس کے تمام معاملات کی تدبیر اور انتظام کرتا ہے۔ وَلَوْ كَانَتْ فِيهِمَا إِلَهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا..... ”اگر زمین و آسمان میں اللہ کے سوا کئی الہ ہوتے تو وہ بگڑ جاتے۔“ اور انسان کے حوالے سے اللہ کی خدائی کا ممتاز ترین مظہر یہ ہے کہ تمام بندے اس کی بندگی کریں۔ اور اللہ ان کے لئے نظام حیات تجویز کرے، ان کے لئے حسن و قبح کے پیمانے وضع کرے۔ لہذا جو شخص بھی یہ دعویٰ کرے کہ ان اشیاء میں سے کوئی چیز بھی اس کے لئے ہے۔ تو وہ گویا اللہ تعالیٰ کے مخصوص ترین حقوق پر دست درازی کرتا ہے اور اس معنی میں آپ کو لوگوں کے الہ اور رب قرار دیتا ہے۔

اور اس معنی میں جب اس کرۂ ارض پر بہت سے الہ پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر اللہ کی یہ زمین فتنہ و فساد سے بھر جاتی ہے۔ اور لوگ پھر لوگوں کی بندگی اور غلامی شروع کر دیتے۔ اس کے بعد پھر بندوں میں سے بعض بندے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انہیں یہ حق حاصل ہے کہ دوسرے لوگ ان کی ذاتی اطاعت کریں۔ اور یہ کہ انہیں بذات خود لوگوں کے لئے قانون بنانے کا حق حاصل ہے۔ اور یہ کہ وہ لوگوں کے بھلے برے کا فیصلہ از خود کر سکتا ہے۔ یہ تمام دعوے دراصل الوہیت کے دعوے ہیں۔ اگر ایسے لوگ فرعون کی طرح زبانی طور پر یہ نہ کہیں۔ اَنَا رَبُّكُمْ الْاَعْلٰی..... ”میں تمہارا بڑا رب ہوں۔“ اس لئے ایسے لوگوں کے لئے ایسے حقوق کا اقرار کرنا شرک اور کفر کا اقرار کرنا ہے۔ اور یہ دنیا میں بدترین فتنہ اور فساد ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس تہدید اور توبیخ کے بعد سیاق کلام میں اہل کتاب کو دعوت دی جاتی ہے کہ وہ ایسے نظریے کی طرف اٹھ آئیں جو فریقین کے درمیان یکساں ہے۔ یعنی صرف اللہ کی بندگی، اس کے ساتھ شرک نہ کرنا۔ اور ایک دوسرے کو رب نہ بنانا۔ اگر وہ یہ صورت نہیں اپناتے تو پھر ہماری راہیں ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئیں۔ اس کے بعد نہ ملاپ ہو سکتا ہے اور نہ مکالمہ۔ قُلْ يَا اَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا اِلٰی كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنِنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُونَ

”کہو اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔“ اس دعوت کو قبول کرنے سے اگر وہ منہ موڑیں تو صاف کہہ دو کہ گواہ رہو ہم تو مسلم ہیں۔“

اس میں شک نہیں ہے کہ یہ ایک منصفانہ دعوت ہے۔ ایسی دعوت ہے جس میں رسول ﷺ ان پر کسی قسم کی کوئی فضیلت و برتری حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اور نہ اہل اسلام اس میں کسی

قسم کی برتری چاہتے ہیں۔ ایک یکساں موقف جس کے سامنے سب کے سب برابری کی پوزیشن میں کھڑے ہوں گے۔ کوئی کسی پر برتری نہ چاہے گا۔ کوئی کسی دوسرے کو اپنا غلام نہ بنائے گا۔ یہ ایک ایسی دعوت ہے جس سے صرف بد فطرت اور مفسد ہی انکار کر سکتا ہے۔ جو یہ نہیں چاہتا کہ حق کے سامنے جھک جائے۔

یہ ایک ایسی دعوت ہے کہ وہ صرف اللہ کی بندگی کریں اور اس کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ کریں۔ نہ کسی بشر کو نہ کسی پتھر کو اللہ کی طرف ایسی دعوت کہ جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا غلام نہ ہو۔ نہ نبی کا غلام ہو نہ رسول کا غلام ہو بلکہ سب اللہ کے بندے اور غلام ہوں۔ نبی اور رسول تو وہ لوگ ہیں جنہیں اللہ نے تبلیغ دین کے لئے چن لیا ہوتا ہے۔ اس لئے نہیں منتخب کیا ہوتا کہ وہ اللہ کے ساتھ الوہیت یا ربوبیت میں شریک بن جائیں۔

فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ..... ”اگر وہ منہ موڑیں تو پھر صاف کہہ دو کہ ہم تو مسلم ہیں۔“ یعنی اگر وہ اس بات سے انکار کر دیں کہ وہ صرف اللہ وحدہ کی بندگی کریں گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور اس بات سے انکار کر دیں کہ بندگی صرف اللہ کے لئے ہے۔ بغیر کسی شرک کے۔ یہ دو ایسے مظاہر ہیں جن سے اللہ کی نسبت سے بندے کے موقف کا اظہار ہوتا ہے۔ تو اگر اس نظریے سے وہ منہ موڑیں تو تم اس کے مطابق اپنے اسلام کا اعلان کر دو۔ یہاں مسلمانوں اور ان لوگوں کو جو اللہ کے سوا ایک دوسرے کو رب مانتے ہیں، ایک دوسرے کے مقابلے میں پیش کیا گیا ہے جس سے اس بات کی فیصلہ کن وضاحت ہو جاتی ہے کہ اللہ کے نزدیک ”الْمُسْلِمُونَ“ کون ہیں، مسلمون وہ ہیں جو صرف اللہ کی بندگی اور اطاعت کریں اور صرف اللہ کی عبادت کریں اور ساتھ ساتھ باہم ایک دوسرے کو بھی اپنا رب بنائیں۔ یہ ہے مسلمانوں کی خصوصیت جو انہیں تمام ملتوں اور تمام مکاتب فکر سے جدا کرتی ہے۔ اور ان کے نظام زندگی کو تمام نظامہائے زندگی سے جدا اور ممتاز کرتی ہے۔ اب اگر ان میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے تو وہ مسلمان ہیں

اور اگر ان میں یہ خصوصیت نہیں پائی جاتی تو وہ مسلمان نہیں چاہے جس قدر وہ دعویٰ کریں اپنے مسلمان ہونے کا۔

اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان بندے کی غلامی سے مطلقاً آزاد ہو جائے اور اسلامی زندگی وہ واحد نظام زندگی ہے جو کسی انسان کو اس ہمہ گیر آزادی کی ضمانت دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کرۃ ارض میں جس قدر نظام ہائے حیات رائج ہیں ان میں بعض دوسرے لوگوں کو اپنا رب تسلیم کئے ہوئے ہیں۔ دنیا کی بہترین سے بہترین جمہوریتوں میں بدترین سے بدترین آمریتوں میں یہ صورت حال ہے۔ ربوبیت کا پہلا خاصہ یہ ہے کہ لوگ اس رب کی بندگی کریں۔ اور وہ رب لوگوں کے لئے اجتماعی نظم، طرز زندگی، ضابطے، قوانین اور نیک و بد کے پیمانے وضع کرے۔ اور اس وقت دنیا میں جس قدر نظام ہائے زندگی رائج ہیں ان میں یہ حق بعض افراد کو حاصل ہوتا ہے۔ بعض صورتوں میں یہ حق لوگوں کے کسی مجموعے کو حاصل ہوتا ہے۔ لوگوں کا یہ گروہ جو دوسروں کے لئے قوانین وضع کرتا، نیک و بد کے پیمانے وضع کرتا ہے اور ان کے لئے فکر اور فلسفہ وضع کرتا ہے یہی وہ گروہ ہے جو اپنے آپ کو اس زمین پر رب بناتا ہے۔ یہی مفہوم ہے اس آیت کا تم میں سے بعض بعض کو رب نہ بناؤ۔ ان لوگوں کے متبعین ان کو ربوبیت اور الوہیت کا مقام عطا کرتے ہیں اور پھر اللہ کے سوا ان کی بندگی کرتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان کے سامنے رکوع و سجود نہ کرتے ہوں، اس لئے بندگی ایک عبادت ہے اور یہ صرف اللہ کے لئے مخصوص ہے۔

صرف اسلامی نظام وہ نظام ہے جس میں انسان کے گلے سے غیر اللہ کی غلامی کا یہ جو اُترتا ہے۔ اور وہ مکمل طور پر آزاد ہو جاتا ہے۔ وہ اس قدر آزاد ہوتا ہے کہ وہ اپنے لئے تصور حیات، اپنے لئے اجتماعی نظم و نسق، اپنے لئے نظام زندگی اور طریقہ حیات اور اپنے نیک و بد کے پیمانے صرف اللہ سے اخذ کرتا ہے۔ اور اس کی حیثیت بعینہ وہی ہوتی ہے جو اس کرۃ ارض پر کسی بھی دوسرے انسان کی ہوتی ہے۔ پس زید دنیا کے تمام انسانوں کے ساتھ من کل الوجوہ مساوی ہو جاتا ہے۔ تمام لوگ ایک سطح پر

کھڑے ہوتے ہیں۔ تمام لوگوں کی نظریں ایک ہی مالک کی طرف اٹھی ہوئی ہوتی ہیں۔ اور ان میں کوئی بھی ایک دوسرے کا مالک نہیں ہوتا۔

اسی اور فقط اسی معنی میں اسلام اللہ کا دین ہے۔ اور یہی دین ہے جسے تمام رسل لے کر آئے، اور اللہ تعالیٰ نے رسولوں کو اسی مفہوم میں مبعوث فرمایا کہ وہ لوگوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔ اور لوگوں کے ظلم سے انہیں نکال کر اللہ کے انصاف کے اندر داخل کریں۔ پس اگر کوئی اس مفہوم کے مطابق اسلام سے منہ پھیرے، تو وہ اللہ تعالیٰ کی شہادت کے مطابق مسلم نہیں رہتا۔ چاہے تاویل کرنے والے کس قدر تاویلیں کر لیں۔ اور لوگوں کو گمراہ کرنے کے والے جس قدر گمراہ کریں بات یہی ہے۔

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ..... ”اللہ کے نزدیک معتبر دین صرف اسلام ہے۔“

○.....☆.....○.....☆.....○

درس ۲۵ ایک نظر میں

سورت کا یہ حصہ بھی انہیں خطوط پر چلتا ہے، جس پر ابتداءً یہ سورت چلی آرہی ہے۔ یعنی اہل کتاب اور جماعت مسلمہ کے درمیان برپا معرکہ آرائی، یعنی فریقین کے درمیان نظریاتی جنگ، اور دشمنان دین اور دین اسلام کے خلاف جو حیلہ سازی و مکاری یعنی جو فریب کاری اور دھوکہ بازی، جو کذب و افتراء اور مختلف قسم کی سازشیں اور تدابیر اختیار کر کے حق و باطل میں ہر وقت التباس پیدا کرتے تھے۔ شکوک و شبہات پھیلاتے تھے۔ اور جس طرح اس امت کو نقصان پہنچانے کے لئے ہر وقت گھات میں بیٹھے رہتے تھے اور جس طرح وہ بلا ناغہ مسلسل کام کر رہے تھے۔ ان کا ازالہ اور جواب، اور اس حصے میں مسلمانوں کو سمجھایا جا رہا تھا کہ وہ اس صورت حال کا مقابلہ اس طرح کریں کہ جس حق پر قائم ہیں اس پر علی وجہ البصیرت قائم ہوں اور یہ یقین پیدا کریں کہ ان کے دشمن باطل موقف پر کھڑے ہیں۔ نیز اس سورت میں متنبہ کیا گیا تھا کہ دشمن تمہارے بارے میں کیا کیا منصوبے بناتے ہیں۔ آخر میں پھر ان دشمنوں کی تشریح بھی کر دی گئی تھی۔ اور بتایا گیا تھا کہ ان کا مزاج، ان کے اخلاق، ان کے اعمال اور ان کی نیتیں کیسی ہیں۔ اور یہ باتیں کھول کر جماعت مسلمہ کے سامنے رکھ دی گئیں تاکہ وہ اپنے دشمنوں کو اچھی طرح جان لے۔ اور وہ جس علم و معرفت کا دعویٰ کرتے تھے۔ اس کی قلعی بھی کھول دی گئی تھی۔ اور پھر جن مسلمانوں کو وہ دھوکہ دے رہے، ان کا اعتماد ان پر سے اٹھادیا تھا۔ انہیں ان سے متنفر کیا گیا۔ اور ان کی مکاریوں کو طشت از بازم کر دیا گیا تھا کہ وہ نہ کسی کو دھوکہ دے سکیں اور نہ طمع کاری کر سکیں۔ یہ تھے مضامین پہلے سبق کے۔

لیکن اس سبق میں بھی اہل کتاب یعنی یہود نصاریٰ کے ساتھ بحث ہے، لیکن یہاں بتایا گیا ہے کہ خصوصاً ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ان کا موقف اور نظریہ تو بادی النظر میں غلط ہے۔ یہودی سمجھتے تھے کہ وہ یہودی تھے، عیسائی یہ سمجھتے تھے کہ وہ عیسائی تھے۔ حالانکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودیت اور نصرانیت دونوں کے وجود میں آنے سے بھی پہلے دنیا میں تشریف لائے تھے۔ وہ تورات و انجیل کے نزول سے بھی پہلے تشریف لائے تھے۔ لہذا ان کے بارے میں اس قسم کے دعوے کرنا

محض وہم ہے۔ جس پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو دین حنیف پر تھے۔ جو سیدھے راستے کا نام ہے۔ اور ان کے دوست اور پیروکار کہلانے کے مستحق وہی لوگ ہیں جو اس طریقے پر ہوں۔ اور اللہ بھی اہل ایمان کا دوست ہوتا ہے۔ لہذا ان لوگوں کے بارے میں یہ دعوے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کے پیرو اور دوست ہیں باطل قرار پاتے ہیں۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ رسولوں کے بارے میں اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ اہل اسلام تمام رسولوں کو برحق تسلیم کرتے ہیں اِنَّ اَوَّلٰی الثَّالِثِ بِاِبْرٰهٖمَ لَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِیُّ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِیُّ الْمُؤْمِنِیْنَ..... ”ابراہیم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس نسبت کے زیادہ حق دار ہیں۔ اور اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔“ (۶۸:۳)

اس کے بعد بتایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں اہل کتاب یہ مجادلہ کیوں کرتے ہیں؟ اس میں پردہ راز کیا ہے؟ بتایا جاتا ہے کہ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے دین کے معاملے میں گمراہ کر دیں، ان کے عقائد میں شبہات پیدا کئے جائیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ان کی گوشمالی کی جاتی ہے۔

يَا اَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِآیٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (۷۰) يَا اَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِآیٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ (۷۰) لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِالْحَقِّ وَالْحَقُّ بِالْبَاطِلِ وَاَنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ بِالْحَقِّ وَاَنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ بِالْحَقِّ

”اے اہل کتاب کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو، اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو۔“

اس کے بعد جماعت مسلمہ کو ان سازشوں کی ایک جھلک دکھائی جاتی ہے۔ جو سازشیں وہ اہل ایمان کے عقائد، ان کے اعتماد اور ان کے اطمینان کے خلاف وہ خفیہ طور پر کرتے تھے۔ اور نہایت ہی مکاری سے کام لیتے تھے اور وہ اسکیم یہ تھی کہ اہل کتاب میں سے کچھ لوگ صبح کے وقت اسلام کا اعلان

کریں گے اور شام کو پھر واپس اپنے کفر کی طرف لوٹ جائیں گے۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ اہل اسلام میں سے جو لوگ ثابت قدم نہیں ہیں ان کے دل میں یہ خلجان ڈال دیں کہ اہل کتاب صبح مسلمان ہوئے اور شام کو انہوں نے کفر کیوں اختیار کر لیا، اور ظاہر ہے کہ ہر جماعت کے اندر ایسے لوگ موجود ہوتے ہیں جو ثابت قدم نہیں ہوتے۔ خصوصاً جبکہ ان کے نزدیک اہل کتاب کتب اور ادیان کے بارے میں زیادہ علم رکھتے تھے۔

وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَانكُفَرُوا
آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ

”اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو، شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔“ یہ ان کا نہایت ہی مذموم منصوبہ تھا۔

اس کے بعد بتایا جاتا ہے، اہل کتاب کے اجتماعی اخلاق کیا ہیں اور یہ کہ معاہدات کے بارے میں ان کا نقطہ نظر کیا ہے۔ ان میں سے بعض تو ایسے ہیں جن کی امانت و دیانت مسلم ہے۔ لیکن ان میں اکثر ایسے ہیں ان میں دیانت نام کو نہیں ہے۔ اور انہوں نے اپنی اس بددیانتی اور بد عملی سے اپنے مذہبی عقائد میں سے بعض دلائل تلاش کر لئے تھے۔ حالانکہ اہل کتاب کا اصل دین ایک برحق دین ان باتوں کے ساتھ ان کے دین کا کوئی تعلق نہ تھا۔

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِذَا تَأَمَّنْهُ بِقِنطَارٍ يُؤَدُّهُ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ إِذَا تَأَمَّنْهُ بِدِينَارٍ لَا
يُؤَدُّهُ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ فَإِنَّمَا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ
عَلَى اللَّهِ الْكَذِبُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ

”اہل کتاب میں کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دیدو تو وہ تمہارا مال تمہیں ادا کر دے گا، اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں اس پر بھروسہ کرو وہ ادا نہ کرے گا۔ الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔“ اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی۔

یہاں آکر معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر کیا ہے۔ یہ کہاں سے اٹھتا ہے اور یہ کہ اس کا تعلق کس طرح اللہ خونی کے ساتھ ہوتا ہے۔

بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (۷۶) اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ
اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا وَّلَا يَخْلَافُ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

”جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچ کر رہے گا۔ وہ اللہ کا محبوب بنے گا۔ کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اپنے عہد اور قسموں کو تھوڑی قیمت دے کر بیچ ڈالتے ہیں تو ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ قیامت کے روز ان سے بات کرے گا، اور نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ بلکہ ان کے لئے تو سخت دردناک سزا ہے۔“

یہ سبق آگے بڑھتا ہے اور اب اس میں اہل کتاب کی ایک کج روی کو منظر عام پر لایا جاتا ہے۔ اور بتایا جاتا ہے کہ وہ دین کے معاملے میں جھوٹ تک بولنے میں کس قدر بیباک ہیں۔ اور یہ کام وہ دنیاوی مفادات اور نہایت ہی کم قیمت مفادات کے لئے کرتے ہیں۔

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلُؤُونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ

”اور ان میں سے کچھ ایسے لوگ ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اس طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں کہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے۔ حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں یہ خدا کی طرف سے ہے حالانکہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہوتا۔ وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔“

اور منجملہ اور امور کے جو وہ اپنی چالاکی سے کتاب میں داخل کرتے تھے، ایک یہ بات تھی کہ حضرت مسیح علیہ السلام الہ ہیں اور یہ کہ روح القدس بھی الہ ہیں۔ چنانچہ یہاں اللہ تعالیٰ اس بات کی تردید کرتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نہ کوئی ایسی آیت لے کر آئے ہیں اور نہ ہی انہوں نے ان لوگوں کو ایسے عقائد رکھنے کا کوئی حکم دیا ہے۔

مَا كَانَ لِمَسِيحٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (٤٩) وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (٨٠)

”کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کی بجائے تم میرے بندے بن جاؤ، وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی ہو جاؤ۔ جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے ہو اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہرگز نہ کہے گا کہ فرشتوں کو اپنا رب بنالو، کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمہیں کفر کا حکم دے جبکہ تم مسلم ہو۔“

اور اس مضمون کی مناسبت یہاں مسلسل دنیا میں بھیجے جانے والے انبیاء کے باہمی تعلق اور تعاون کے سلسلے میں لیے جانے والے اقرار کو بھی بیان کر دیا جاتا ہے کہ ان میں سے ہر سابق نبی یہ میراث آنے والے کے سپرد کرے گا اور اس کی مدد کرے گا۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْنَاكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ (۸۱)

”اور یاد کرو، اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ ”آج ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے، جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے۔ تو تم کو اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنا ہو گی۔“ یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟“ انہوں نے کہا ہاں، ہم اقرار کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا! اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔“

یہی وجہ ہے اہل کتاب پر یہ بات فرض ہو جاتی ہے کہ وہ نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں اور اس کی امداد کریں۔ لیکن ان کا وطیرہ تو یہ ہے کہ وہ اپنے نہ ان وعدوں کی پابندی کرتے ہیں جو انہوں نے اللہ کے ساتھ کئے اور نہ ان معاہدوں کی جو انہوں نے سابقہ رسولوں کے ساتھ کئے۔

ان مقدمات کا فطری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دین یعنی دین اسلام کے سوا کوئی اور دین اپنے لئے تلاش کرتا ہے۔ تو گویا وہ پوری کائنات کے نظام قدرت سے بغاوت کرتا ہے جیسا کہ اللہ نے اس کا ارادہ کیا ہے۔

أَفَعَلِيَ دِينِ اللَّهِ يُبْعَثُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ

”کیا یہ لوگ اللہ کے دین کا طریقہ چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان وزمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کے تابع ہیں (مسلم ہیں) اور اس کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔“ پس وہ لوگ جو اسلام سے خارج ہوتے ہیں، ان کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ اسی طرح وہ لوگ جو اسلامی نظام کی مکمل اطاعت نہیں کرتے، ان کا معاملہ بھی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس قدر نافرمان ہیں اللہ کے اس تکوینی نظام سے بھی خارج ہیں۔

یہاں رسول اللہ ﷺ اور اہل ایمان کو اللہ وحدہ کے دین پر ثابت قدمی کا اعلان کر دیں اور دین ان ہدایات کے اندر ہے جو رسول ﷺ اللہ کی جانب سے لے کر آئے اور آپ سے قبل دوسرے رسول لے کر آئے اور اللہ تعالیٰ کا اعلان ہے کہ وہ انسانوں کی جانب سے صرف اسی دین کو قبول کرے گا۔

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ..... ”اور جو شخص بھی اسلام کے سوا کسی اور دین کی پیروی کرے گا تو یہ اس کی جانب سے قبول نہ کی جائے گی اور آخرت میں وہ خسارہ پانے والوں میں سے ہو گا۔“

اب جو لوگ اس دین پر ایمان نہیں لاتے تو ان کے لئے ہدایت پانے کی کوئی امید نہیں ہے اور نہ ان کے لئے اللہ کی پکڑ سے بچنے کی کوئی امید ہے۔ الا یہ کہ وہ توبہ کریں۔ رہے وہ لوگ جو کفر کی حالت میں اس دنیا سے چلے جائیں تو انہیں وہ تمام مال و دولت کچھ فائدہ نہ دے گی جو انہوں نے بھلائی کی راہ میں خرچ کی۔ اور اگر وہ اپنے اس کفر کا اس کرہ ارض کو بھر کر سونا ادا کریں تو بھی یہ فدیہ قبول نہ ہو گا۔

اللہ کی راہ میں خرچ اور قربانی کے اس مقام پر اہل اسلام کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ اپنے مال و دولت سے اللہ کی راہ میں وہ چیزیں خرچ کریں جو انہیں پسند ہیں۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ..... ”تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنی وہ چیز خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو۔ اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہو گا۔“

غرض اس مختصر حصے میں، اس قدر عظیم حقائق اور بے شمار ہدایات جمع کر دی گئی ہیں۔ اور یہ اس عظیم معرکہ میں ایک مختصر جملہ ہے جو اس پوری سورت میں برپا ہے۔ اور اس کے فریق امت مسلمہ اور اس کے دشمنان ہیں۔ اور یہ معرکہ صدیوں سے یونہی برپا ہے۔ آج بھی امت معرکہ میں اسباب اور وسائل بالکل مختلف استعمال ہو رہے ہیں، لیکن لائن آج بھی وہی ہے لیکن آج یہ معرکہ طویل خطوط پر ہے۔

○.....☆.....○.....☆.....○

درس ۲۵ تشریح آیات (آیات ۶۵ تا ۹۱)

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تُحَاجُّوْنَ فِي إِبْرَاهِيمَ وَمَا أُنْزِلَتِ التَّوْرَةُ وَالْإِنْجِيلُ إِلَّا مِنْ بَعْدِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ (۶۵) مَا أَنْتُمْ هَؤُلَاءِ حَاجِّجْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاجُّوْنَ فِيمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ (۶۶) مَا كَانَ إِبْرَاهِيمَ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۶۷) إِنْ أَوَّلَى النَّاسُ بِإِبْرَاهِيمَ لِلَّذِينَ اتَّبَعُوهُ وَهَذَا النَّبِيُّ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَاللَّهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِينَ (۶۸)

”اے اہل کتاب تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیم علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی ہیں، پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہو۔ تم لوگ جن چیزوں کا علم رکھتے ہو ان میں تو خوب بحثیں کر چکے، اب ان معاملات میں کیوں بحثیں کرتے ہو جن کا تمہارے پاس کچھ علم بھی نہیں، اللہ جانتا ہے، تم نہیں جانتے، ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھا نہ عیسائی، بلکہ وہ تو ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہر گز مشرکوں میں سے نہ تھا۔ ابراہیم علیہ السلام سے نسبت رکھنے کا حق سب سے زیادہ اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس کی نسبت کے زیادہ حق دار ہیں۔ اللہ صرف انہی کا حامی و مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہوں۔“

محمد بن اسحاق، محمد سعید بن جبیر، یا عکرمہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے واسطے سے روایت کرتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا نجران کے نصاریٰ اور یہودیوں کے احبار رسول ﷺ کے پاس جمع ہوئے اور فرمایا آپ سے مباحثہ شروع کر دیا، احبار نے کہا ابراہیم یہودی تھا، نصاریٰ نے کہا وہ نصرانی

تھا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی یا اَھْلَ الْکِتَابِ لِمَ تُخَاجُّوْنَ فِیْ اِبْرَہِیْمَ..... ”اہل کتاب! تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو۔“ چاہے ان آیات کا شان نزول یہ ہو یا نہ ہو، بہر حال آیات بظاہر اس بات پر شاہد ہیں کہ وہ اہل کتاب کے بے بنیاد دعوؤں کے بارے میں نازل ہوئی۔ ان کا یہ تنازعہ رسول اکرم ﷺ کے ساتھ تھا یا رسول ﷺ کی موجودگی میں وہ آپس میں جھگڑتے تھے اور ان کے جھگڑے کے پس منظر میں یہ نظریہ کار فرما تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے یہ وعدہ فرمایا تھا کہ ان کی اولاد میں نبوت رہے گی تو اس طرح وہ یہ فضیلت اور ہدایت اپنے نام الاٹ کرنا چاہتے تھے۔ یہ تھا ان اصل مقصد، دوسرے یہ کہ وہ اس طرح رسول ﷺ کے اس دعویٰ کی تکذیب کرنا چاہتے تھے کہ رسول ﷺ اور آپ کی امت دین حنیف کے پیروکار ہیں اور حنفیت اولیٰ کے وارث ہیں۔ نیز اس طرح وہ مسلمانوں کے دلوں میں شبہات پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یا کم از کم بعض اہل اسلام میں وہ شک ڈالنا چاہتے تھے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ ان کی سخت ترین الفاظ میں تردید فرماتے ہیں اور ان کی خوس فہمی کو طشت ازبام کرتے ہیں جو کسی علمی دلیل پر مبنی نہیں ہے۔ اس لئے کہ ابراہیم علیہ السلام تورات سے بھی پہلے گزرے ہیں اور انجیل سے بھی پہلے گزرے ہیں۔ پس کس طرح ممکن ہے کہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی ہوں، لہذا یہ دعویٰ مکمل طور پر خلاف عقل ہے۔ صرف پیغمبروں کی تاریخ پر اچھتی نظر ڈالنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کا دعویٰ باطل ہے۔

یَا اَھْلَ الْکِتَابِ لِمَ تُخَاجُّوْنَ فِیْ اِبْرَہِیْمَ وَمَا اُنْزِلَتْ التَّوْرَۃُ وَالْاِنْجِیْلُ اِلَّا مِنْ بَعْدِہٖ اَقْلًا تَعْقِلُوْنَ

”اہل کتاب! تم ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں ہم سے کیوں جھگڑتے ہو؟ تورات اور انجیل تو ابراہیم علیہ السلام کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ پھر کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔“

اس کے بعد ان پر تنقید جاری رہتی ہے، وہ جو دلائل پیش کرتے تھے ان کا پول کھولا جاتا ہے۔ اور ان کی ہٹ دھرمی اور ان کے غیر معقول طرز عمل اور بحث و مباحثہ میں ان کے غیر منطقیانہ استدلال کی وضاحت کی جاتی ہے۔

هَآ اَنْتُمْ هُوَلَاءِ حَآجِبْتُمْ فِیْمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ فَلِمَ تُخَاجُّوْنَ فِیْمَا لَیْسَ لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ

”تم جن جن چیزوں کا علم رکھتے تھے ان میں تو خوب بحثیں کر چکے۔ اب ان معاملات میں کیوں بحثیں کرنے چلے جن کا تمہارے پاس کچھ بھی علم نہیں، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔“

انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں مباحثہ کیا، پھر انہوں نے بعض فقہی موضوعات پر بھی مجادلہ کیا، اور جب انہیں دعوت دی گئی کہ آؤ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کریں تو انہوں نے روگردانی کی۔ یہ دونوں موضوعات ایسے تھے جن کے بارے میں انہیں کچھ علم تھا۔ رہے وہ معاملات جو تمہارے وجود سے پہلے ہیں، تمہاری کتابوں سے پہلے ہیں۔ تمہارے اس دین سے پہلے ہیں جن پر تمہارا ایمان ہے۔ تو اس بارے میں تمہارے پاس نہ علم ہے اور نہ سند ہے۔ اگرچہ ہماری سند ہو، لہذا ان موضوعات پر تمہارا مباحثہ کرنا صرف بحث برائے بحث ہو گا۔ وہ محض تیرے چلانا ہو گا۔ کوئی بامقصد کام نہ ہو گا۔ بلکہ محض مطلب براری اور نفس پرستی ہو گی۔ اور جن لوگوں کا حال یہ ہو وہ ہرگز قابل اعتبار نہ ہوں گے بلکہ ایسے لوگوں سے بات نہ کرنا مناسب ہے اور نہ ان کی بات پر کان دھرنا مناسب ہے۔

ان حضرات کی بحث و تکرار کا پول کھولنے کے بعد اور اس بحث کی حیثیت ختم کر دینے کے بعد اور انہیں مکمل طور پر ناقابل اعتبار کر دینے کے بعد، اب اللہ تعالیٰ وہ اصل حقیقت بیان فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ کیونکہ تاریخ انسانی میں بہت زیادہ قدیم واقعات کی اصل حقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے۔ نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جو دین نازل فرمایا گیا تھا، اس کی حقیقت کو بھی اللہ ہی جانتا ہے

اور اللہ کا فیصلہ بہر حال قاطع ہے۔ اللہ کے فیصلے کے بعد کسی کے لئے کوئی بات کرنے کی گنجائش بھی نہیں ہے۔ الایہ کہ کوئی ہر صورت میں بغیر کسی دلیل و برہان کے مجادلہ پر اتر آیا ہو مآگابؑ اِبْرٰہِیْمُ یٰہُوْدِیًّا وَلَا نَصْرَانِیًّا وَلٰکِنْ کَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ

”ابراہیم علیہ السلام نہ یہودی تھا نہ عیسائی بلکہ وہ ایک مسلم یکسو تھا اور وہ ہر گز مشرکوں میں سے نہ تھا۔“ یوں اس سے پہلے اشارۃً بات کی گئی تھی کہ ابراہیم نہ یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے اس لئے کہ تورات و انجیل بعد میں نازل ہوئی۔ یہاں اس کی تصریح کر دی گئی ہے کہ وہ یہودی اور نصرانی نہیں تھے بلکہ وہ مسلم حنیف تھے۔ اور وہ اسلام کے سوا کسی اور ملت کی طرف مائل نہ تھے۔ اس لئے کہ وہ مسلم تھے۔ اور مسلم بھی ان معنوں میں تھے جن کی تفصیل ہم نے اس سے پہلے بیان کر دی ہے وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ..... ”اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھے۔“ یہ فقرہ سابقہ فقرے کی تاکید مزید ہے کہ وہ مسلم حنیف تھے۔ اور اس لئے کہ مسلم حنیف جو بھی ہو وہ مشرک نہیں ہوتا۔ اب حنیف مسلم کے بعد یہ کہنا کہ وہ مشرک نہ تھے اس میں چند لطیف اشارے مقصود ہیں۔

پہلا اشارہ یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ جن کے اندر عقائد کا انحراف اس حد تک پہنچ گیا ہے وہ درحقیقت مشرک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ابراہیم نہ یہودی ہو سکتا ہے اور نہ نصرانی بلکہ وہ مسلم حنیف ہی ہے۔

دوسرا اشارہ یہ ہے کہ اسلام ایک علیحدہ حقیقت ہے اور شرک بالکل ایک الگ چیز ہے۔ ان دونوں کا ایک جگہ اکٹھے کبھی نہیں ہو سکتا۔ اسلام مطلق توحید کا نام ہے اور توحید بھی از ہمہ جہت و باہمہ خصوصیات و باہمہ مقتضیات اس لئے اسلام شرک کے کسی رنگ کے ساتھ لگا نہیں کھاتا۔

اس میں تیسرا اشارہ یہ مطلوب ہے کہ مشرکین قریش اپنے آپ کو حنیفی اور دین ابراہیم علیہ السلام کے پیرو سمجھتے تھے۔ اور وہ خانہ کعبہ کے خادم اور مجاور تھے۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ وہ تو مسلم

حنیف تھے۔ اور تم مشرکین ہو وَمَا كَانُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ..... ”وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔“

جب ابراہیم علیہ السلام مسلم حنیف تھے اور مشرک نہ تھے تو یہود و نصاریٰ یا مشرکین میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ ان کے وارث ہیں۔ اور نہ ہی ان میں سے کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ ابراہیم کے دین کے والی ہیں حالانکہ وہ اس دین سے بہت ہی دور جا چکے ہیں۔ عقیدہ اور نظریہ وہ رابطہ ہے جس پر لوگ اسلام میں باہم جمع ہوتے ہیں۔ جبکہ ہم نسب، ہم قوم، ہم جنس اور ہم وطن ہو کر بھی لوگ دوسرے سے دور ہوتے ہیں۔ اگر وہ مسلمان نہ ہوں اور جب اسلامی نظریہ حیات کی اس مضبوط اساس پر اہل ایمان جمع ہوتے ہیں تو پھر ان کی نظر میں انسان وہ ہوتا ہے جو روحانی اعتبار سے انسان ہو۔ یعنی انسان اس وجہ سے ممتاز ہے کہ اس کے جسم میں اللہ نے ایک پاک روح ڈالی ہے۔ چنانچہ اس کا صحیح اکٹھ بھی عقیدے کی اساس ہو سکتا ہے جو اس کی روحی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت ہے۔ انسان کا اجتماعی نظام ان اساسوں پر قائم نہیں ہوتا جس پر مولیشیوں کا اکٹھ ہوتا ہے۔ مثلاً ای جگہ چرنے والے مولیشی، ایک جنس کے مولیشی، ایک چراگاہ والے مولیشی ایک ہی باڑے میں اور اہل زندان میں روکے ہوئے مولیشی باہم مل کر رہتے ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے ایک فرد اور دوسرے فرد، ایک گروہ اور دوسرے گروہ، ایک نسل اور دوسری نسل کے درمیان ماسوائے عقیدہ اور نظریہ حیات کے اور کوئی رابطہ نہیں ہوتا۔ اس میں ایک مومن دوسرے مومن سے محبت کرتا ہے، ایک مسلم گروہ کو دوسرے مسلم گروہ سے محبت ہوتی ہے۔ ایک اسلامی جماعت کا دوسرے اسلامی جماعت سے تعلق ہوتا ہے اور مسلم نسلوں کا دوسری مسلم نسلوں سے تعلق ہوتا ہے اور اس کی راہ میں زمان و مکان کی حدود حائل نہیں ہو سکتیں۔ اس تعلق کی راہ میں خون اور نسب کے فاصلے حائل نہیں ہو سکتے۔ قوم اور علاقے کے فاصلے حائل نہیں ہوتے۔ وہ باہم نظریاتی دوست ہوتے ہیں۔ صرف نظریہ کی اساس پر اور ان سب کے اوپر پھر ذات باری سب کی دوست ہوتی ہے۔ اِنَّ اَوَّلَى الْاَتَابِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ”ہم سے نسبت رکھنے کا سب سے زیادہ حق اگر کسی کو پہنچتا ہے تو ان لوگوں کو پہنچتا ہے جنہوں نے اس کی پیروی کی اور اب یہ نبی اور اس کے ماننے والے اس

نسبت کے زیادہ حق دار ہیں۔ اللہ صرف انہی کا حامی اور مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔ ”پس وہ لوگ جو حضرت ابراہیم کی زندگی میں ان کے پیرو رہے، اور ان کے نظام اور طریقے پر چلے، اور انہوں نے ان کے احکام کے مطابق فیصلے کیے تو وہی ان کے دوست تھے۔ پھر یہ نبی ان کے دوست ہیں جو اللہ کی شہادت کے مطابق ان کے دین پر ہیں وہ ان کے دوست ہیں، اس کے بعد وہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دوست ہیں جو اس نبی پر ایمان لائے۔ اور وہ اپنے نظام زندگی اور طریقہ حیات میں ان کے ہم رنگ ہو گئے۔ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ“ اللہ صرف ان کا حامی اور مددگار ہے جو ایمان رکھتے ہیں۔“ اس لئے کہ یہی لوگ اللہ کی پارٹی کے ہیں، یہی لوگ اللہ کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہیں یہی لوگ ہیں جو اللہ سے محبت اور دوستی رکھتے ہیں اور اس کے سوا ان کا کوئی ولی نہیں ہے۔ یہ لوگ ایک ہی خاندان ہیں۔ یہ ایک امت ہیں، چاہے صدیاں گزر جائیں، زمانے گزر جائیں، زمین اور وطن کے فاصلے طویل کیوں نہ ہوں، نسل اور قوم مختلف کیوں نہ ہو، خاندان اور قبائل مختلف کیوں نہ ہوں، یہ ایک ہیں، ایک رہیں گے۔

انسانی اجتماع کی یہ سب سے ترقی یافتہ شکل ہے جو حضرت انسان کے لئے موزوں ترین ہے، اور یہی صورت اسے حیوانوں کے ریوڑ سے ممتاز کرتی ہے۔ دوسری جانب مختلف قسم کی سوسائٹیوں میں سے یہ سوسائٹی سب سے عام اور بلا قید ہے۔ اس لئے کہ اس اجتماعی نظام کی اساس جس شرط کے ساتھ مشروط ہے وہ شرط اختیار ہے۔ انسان کے بس میں ہے کہ وہ اس شرط کو پوری کر دے۔ وہ شرط نظریاتی ہے اور ہر شخص کسی بھی نظریے کو اپنانے میں آزاد اور مختار ہے۔ جب کوئی شخص اپنی نسل تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ہم اجتماعی نظام کی اساس کسی نسل پر رکھ دیں تو کوئی شخص بہر حال اس نسل میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ اجتماعیت کو قومیت کی اساس پر استوار کریں تو پھر کوئی شخص اپنی قومیت تبدیل نہیں کر سکتا۔ اگر ہم اجتماعی نظام رنگ پر رکھیں تو کوئی بھی شخص اپنا رنگ نہیں بدل سکتا۔ اسی طرح اگر ہم زبان کی اساس پر اجتماعی نظام استوار کریں تو کوئی شخص اپنی زبان بھی نہیں بدل سکتا۔ اسی طرح اگر نظام طبقات پر مبنی ہو، تو طبقہ بدلنا بھی آسانی سے ممکن نہیں ہوتا۔ بلکہ بعض اوقات طبقات بھی ناقابل تبدیل ہوتے ہیں مثلاً ہندوستان میں اچھوت وغیرہ، یہی وجہ ہے تمام دوسری سوسائٹیوں میں بعض

طبقات کی راہ میں پردے حائل ہوتے ہیں اور وہ اس سوسائٹی کا ممبر نہیں بن سکتے۔ صرف نظریاتی اساس پر تشکیل پانے والی سوسائٹی اس عیب سے خالی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ نظریاتی سوسائٹی میں کوئی نظریہ اپنانے نہ اپنانے کا معاملہ ایک فرد کے اختیار میں ہوتا ہے۔ بغیر اس کے اس کی اصلیت بدلے، اس کی زبان بدلے، اس کا طبقہ بدلے، یا وصف بدلے جس کی اساس، اس کا پردہ اس میں شامل ہو رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نظریاتی سوسائٹی میں انسان کے مقام اور اس کے اکرام میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ اور اس کا نظریہ اجتماع ان عناصر کی اساس پر ہوتا ہے جو انسانی عناصر ہیں۔ ان پر نہیں جو جانوروں کو باہم اکٹھا کرتے ہیں۔ اب انسان کے لئے صرف دو راستے ہیں، ایک یہ کہ وہ اسلام کے نظریہ اجتماع کے مطابق وہ روحانی اور نظریاتی اساسوں پر جمع ہو اور انسانوں کی طرح رہے اور یا پھر حیوانوں کے ایک ریوڑ اور گلے کی طرح ہم جنس، جو اکٹھے ہوں یا ایسے مویشی اکٹھے ہوں جن کی چراگاہ ایک ہے۔ اور ان حدود و قیود کے اندر رہیں جو ان مویشیوں کے لئے بنائے گئے ہیں۔



اب امت مسلمہ کو بتایا جاتا ہے کہ اس جدل وجدال اور بحث و مباحثہ کے پس منظر میں اہل کتاب کا اصل منصوبہ کیا ہے؟ اس لئے اہل کتاب کی مکاریوں، ان کی خفیہ تدبیروں اور دین کے ساتھ اس کھیل کا بھانڈا امت مسلمہ کے سامنے بھرے چوراہے میں پھوڑا جاتا ہے وہ سترپاش پاش کر دیا جاتا ہے جس کے پیچھے چھپ کر یہ لوگ گھناؤنا کھیل کھیلا کرتے تھے اور انہیں جماعت مسلمہ کے سامنے صاف ننگا کر کے شرمندہ کر دیا جاتا ہے۔

وَدَّتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضْلُونَكُمُ وَمَا يُضْلُونَ إِلَّا أَنْفُسَهُمْ
وَمَا يَشْعُرُونَ (۶۹) يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَأَنْتُمْ
تَشْهَدُونَ (۷۰) يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ

وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (۷۱) وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ
الْكِتَابِ آمَنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَكُفُّوا آخِرَهُ
لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۷۲) وَلَا تَتُومِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبَعَ دِينَكُمْ قُلْ إِنْ هَدَى
اللَّهُ أَتَى يَوْمِي أَحَدٌ مِثْلَ مَا أُوتِيتُمْ أَوْ يُحَاجُّوكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ إِنْ
الْفَضْلَ بِيَدِ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ (۷۳) يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَنْ
يَشَاءُ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ (۷۴)

”اہل کتاب کا ایک گروہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہ راست سے ہٹا دے، حالانکہ وہ اپنے سوا
کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے ہیں مگر انہیں اس کا شعور نہیں۔ اے اہل کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا
انکار کر رہے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو؟ اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر
مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو؟ اہل کتاب میں سے ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی
کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے، اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دو۔ شاید اس ترکیب
سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔ نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی
کی بات نہ مانو، اے نبی! ان سے کہہ دو کہ ”اصل میں ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے اور یہ اسی کی دین کہ کسی
کو وہی کچھ دیا جائے گا جو کبھی تم کو دیا گیا تھا۔ یا یہ کہ دوسروں کو تمہارے رب کے حضور پیش کرنے کے
لئے تمہارے خلاف قوی حجت مل جائے۔“ اے نبی! ان سے کہو کہ ”فضل و شرف اللہ کے اختیار میں
ہے، جسے چاہے عطا فرمائے۔ وہ وسیع النظر ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ اپنی رحمت کے لئے جس کو چاہتا
ہے مخصوص کر لیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے۔“

اہل کتاب مسلمانوں کے خلاف جو عداوت دلوں میں چھپائے ہوئے تھے وہ نظریاتی عداوت تھی
، وہ ہر گز نہیں چاہتے تھے کہ یہ امت کبھی راہ راست پر آئے۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ یہ

امت پوری قوت پورے یقین اور پورے اعتماد کے ساتھ اپنے نظریات کی طرف لوٹ آئے۔ اس لئے ان کی تمام جدوجہد اس نکتے پر مرکوز ہے کہ وہ اسلامی نظام حیات سے اس امت کو ادھر ادھر کر دیں اور اسے صراطِ مستقیم سے پھیر دیں۔ وَدَّتْ طَائِفَةٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يُضِلُّوكُمْ..... ”اہل کتاب میں سے ایک گروہ یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح تمہیں راہِ راست سے ہٹا دے۔“ یہ ان کی نفسانی خواہش ہے۔ ان کے دلوں کی تہہ میں یہ جذبہ چھپا ہوا ہے۔ ان کی ہر سازش کے پیچھے ان کی یہ خواہش کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ ان کی ہر تدبیر، ہر بحث، ہر مناظرہ اور ہر تلبیس کے پس پشت یہی خواہش کارفرما ہے اور ان لوگوں کی یہ خواہش محض دشمنی، ہوائے نفس اور شرارت پر مبنی ہے۔ اس لئے وہ صریح گمراہی ہے۔ اس لئے کہ سچائی، بھلائی اور ہدایت و خیر خواہی کے جذبات کے نتیجے میں اس قسم کی خواہش کبھی پیدا نہیں ہوتی اور وہ جب بھی اہل اسلام کی گمراہی کے لئے کوئی جدوجہد شروع کرتے ہیں، اسی وقت وہ خود گمراہ ہو جاتے ہیں۔ وَمَا يُضِلُّوْا إِلَّا أَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ..... ”حالانکہ وہ اپنے سوا کسی کو گمراہی میں نہیں ڈال رہے مگر انہیں اس کا شعور نہیں ہے۔“ اور مسلمان جب تک اسلام پر قائم رہیں گے وہ اپنے ان دشمنوں کی تدابیر کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں گے۔ اہل کفر ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ اللہ تعالیٰ ہر وقت ان کو سازشیوں کی سازشوں سے بچانے والا ہے اور جب تک وہ یکے مسلمان ہیں ان کی تدابیر کو اللہ خود ان کے خلاف الٹاتا ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ اہل کتاب کو سختی سے جھنجھوڑتا ہے کہ وہ اپنے اس مشکوک اور کمزور موقف پر ذرا نظر ثانی کریں۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَلْبِسُونَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ

”اے اہل کتاب! کیوں اللہ کی آیات کا انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود ان کا مشاہدہ کر رہے ہو؟ اے اہل کتاب! کیوں حق کو باطل کا رنگ چڑھا کر مشتبہ بناتے ہو؟ کیوں جانتے بوجھتے حق کو چھپاتے ہو۔“

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت بھی اور آج بھی اہل کتاب حق اور سچائی کا مشاہدہ کر رہے ہیں اور واضح طور پر سمجھتے ہیں کہ یہ دین، دین حق ہے۔ ان میں سے بعض تو وہ تھے جو اچھی طرح جانتے تھے کہ ان کی کتابوں میں رسول آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت بشارتیں اور اشارے موجود ہیں، ان میں سے بعض ایسے تھے جو ان اشارات کے بارے میں بالصراحت بتلاتے تھے۔ اور کچھ لوگ ایسے تھے کہ وہ ان بشارتوں کی بناء پر شہادت حق بھی دیتے تھے لیکن بعض دوسرے ایسے تھے کہ وہ اگرچہ اپنی کتابوں سے کچھ نہ جانتے تھے لیکن رسول اکرم ﷺ اور آپ کے دین کو دیکھ کر واضح طور یقین کئے ہوئے تھے کہ یہ دین، دین حق ہے لیکن اس کے باوجود یہ لوگ کفر پر کمر بستہ تھے۔ اس لئے نہیں کہ دلیل و برہان میں کوئی کمی تھی بلکہ محض خواہشات نفسانیہ، ذاتی مصلحتوں اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی خاطر وہ کفر کر رہے تھے۔ قرآن کریم اہل کتاب کہہ کر انہیں کو پکارتا ہے۔ اس لئے کہ ان کی اس صفت اہل کتاب کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اللہ کی اس کتاب جدید کو سینہ سے لگائیں۔

ایک بار پھر اللہ انہیں پکارتے ہیں تاکہ انہیں ان کے اس فعل پر اچھا شر منندہ کریں کہ وہ حق پر باطل کا رنگ چڑھاتے ہیں، حق کو چھپاتے ہیں، حق کو ضائع کرتے ہیں، اور وہ یہ سب کچھ جانتے بوجھتے کرتے ہیں اور یہ ان کا سوچا سمجھا منصوبہ ہے۔ یہ ان کی نہایت ہی مکر وہ اور فتنج حرکت اللہ تعالیٰ نے اس وقت کے اہل کتاب پر جو تنقید فرمائی ہے، اس پر وہ اس وقت سے لے کر آج تک قائم ہیں۔ پوری اسلامی تاریخ میں ان کا کردار یہی رہا ہے۔ سب سے پہلے اس کا آغاز یہودیوں نے کیا اور یہودیوں کے بعد یہی منصب صلیبیوں نے سنبھال لیا۔ اور اس پوری تاریخ میں انہوں نے اسلامی علوم میں بعض ایسے افکار شامل کر دیئے کہ ان کی تنقیح صرف قرآن کریم کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ انہوں نے تمام اسلامی علوم میں حق کے ساتھ باطل ملا دیا ہے۔ ہاں ان کی ان خفیہ سازشوں سے صرف قرآن کریم محفوظ رہا ہے اس لئے کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ ابد الابد تک وہ قرآن کریم کو محفوظ رکھے گا۔ انہوں نے تاریخ اسلامی میں دسیہ کاری کی۔ اسلامی تاریخ کے واقعات میں ملاوٹ کی۔ انہوں نے ذخیرہ احادیث کے اندر احادیث گھڑ کر جعلی احادیث ملانے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ کا فضل تھا کہ اس نے اس کے مقابلے کے لئے بعض

ایسے رجال پیدا کئے جنہوں نے اس میدان میں داد تحقیق دی اور ذخیرہ احادیث کو ان کی جعل سازیوں سے پاک کیا۔ الایہ کہ انسان ک محدود جدوجہد کی وجہ سے کوئی چیز بچ گئی۔ لیکن وہ شاذ اور محدود ہو گئی۔ انہوں نے قرآن کے ذخیرہ تفاسیر میں بھی ملمع کاری کی اور اسے ایک ایسا صحرائے بے آب و گیا بنا دیا جس میں سے انسان کے لئے نشان راہ پانا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے اسلام کے بعض لیڈروں میں اپنے آدمی داخل کئے۔ سینکڑوں لوگ ایسے تھے جو مسلمان بن کر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے۔ اور آج دیکھئے کہ مستشرقین اور مستشرقین کے شاگردوں کی شکل میں اور بیسیوں ایسے لیڈر ہیں جو یہودیوں اور صلیبیوں نے ہمارے لئے لیڈر بنائے تاکہ وہ اس نام نہاد عالم اسلام میں یہودیوں اور صلیبیوں کے مفادات کا تحفظ کریں۔ اس لئے کہ اسلام کے یہ دشمن اگر کھل کر آئیں تو وہ یہ مفادات حاصل نہیں کر سکتے۔

یہ سازشیں مسلسل روبعمل ہیں۔ اور آج بھی اگر ہم ان میں سے کوئی جائے پناہ حاصل کر سکتے ہیں تو وہ صرف قرآن کے دامن میں حاصل کر سکتے ہیں جو محفوظ ترین کتاب ہے۔ اس قرآن کو اگر ہم اس تاریخی کشمکش میں اپنا مشیر بنالیں تو ہمیں محفوظ پناہ مل سکتی ہے۔

قرآن کریم یہاں ان لوگوں کی بعض کوششوں کو بھی ریکارڈ پر لاتا ہے جو انہوں نے جماعت مسلمہ کو اپنے دین سے بدراہ کرنے کی خاطر کی تھیں۔ اور یہ کام وہ حسب عادت نہایت ہی مکارانہ اور ذلیلانہ طریقہ کار کے مطابق کرتے تھے۔ فرماتے ہیں۔

وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَانكُفُّوا
آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ (۷۲) وَلَا تَتَّبِعُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ

”اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ اس نبی کے ماننے والوں پر جو کچھ نازل ہوا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کو اس سے انکار کر دو۔ شاید اس ترکیب سے یہ لوگ اپنے ایمان سے پھر جائیں۔ نیز یہ لوگ آپس میں کہتے ہیں کہ اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات نہ مانو۔“

کس قدر مکارانہ طریق کار ہے یہ؟ جیسا کہ ہم نے کہا یہ لوگ ایسے اچھے ہتھیار بھی استعمال کرتے تھے۔ اس لئے کہ اسلام لانا اور پھر اسلام سے پھر جانا، اس لئے ممکن تھا کہ بعض کمزور طبع لوگ، کم فہم لوگ، ایسے لوگ جو زیادہ ثابت قدم نہ تھے۔ اور جنہیں اپنے دین کی حقیقت کا بھی اچھی طرح علم نہ تھا، وہ متاثر ہو سکتے تھے۔ ان کے دل میں خلجان پیدا ہو سکتا تھا۔ خصوصاً عرب جو امی تھے۔ اور ان میں یہ بات عام تھی کہ دین اور کتب سماوی کے بارے میں اہل کتاب ان سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ وہ ایمان لاتے ہیں اور پھر مرتد ہو جاتے ہیں تو ظاہر ہے کہ انہوں نے اس دین میں کوئی خفیہ کمزوری یا نقص پکڑ لیا ہو گا۔ یا یہ کہ خود مرتد ہونے والے شک میں پڑ گئے کہ وہ فیصلہ نہیں کر پاتے کہ وہ کدھر جائیں اور ان کو کسی حال میں ثابت حاصل نہیں ہے۔ اور اہل کتاب کی جانب سے یہ دھوکہ آج تک جاری ہے۔ ہاں اس کی شکل و صورت اور طور طریقے حالات زمانہ کے مطابقت سے بدل گئے ہیں۔

ہاں آج کے دور میں مسلمانوں کے دشمنوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ وہ اب ان پرانی سازشوں پر ملمع کاری کر کے اہل اسلام کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ اس لئے تمام دشمنوں نے اسی پرانے اسلوب پر کچھ جدید طریقے وضع کئے ہیں اور ان کے ذریعے سے مسلمانوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ اب ان لوگوں نے عالم اسلام میں اساتذہ، فلاسفہ، محققین اور پی ایچ ڈی کے حاملین کی ایک جرار فوج چھوڑی ہوئی ہے۔ یہ سب لوگ درپردہ ان دشمنان اسلام کے ایجنٹ ہیں۔ پھر ان دشمنوں نے ہمارے مصنفین، شعراء، فن کاروں اور صحافیوں کو بھی اپنے جال میں پھنسا رکھا ہے۔ ان لوگوں کے نام مسلمانوں جیسے ہیں۔ اس لئے کہ وہ مسلمانوں کی اولاد ہیں اور بعض تو مسلمانوں کے علماء ہیں۔

ایجنٹ کی اس فوج کا کام صرف یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کے دل و دماغ میں شکوک و شبہات پھیلانے۔ اور اس کے لئے مختلف اسلوب اختیار کرے۔ کبھی وہ علم و ادب کے دروازے سے کام کرتے ہیں۔ کبھی وہ صحافی اور فنکار کے روپ میں کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ اسلامی اصول حیات کی قدر و قیمت کم کرنے، اسلامی نظریہ حیات کا مزاح اڑانے، اسلامی اصولوں اور نصوص میں ایسی تاویلیں کرنے میں

لگے ہوتے ہیں، جن تاویلوں کے وہ نصوص متحمل ہی نہیں ہو سکتے۔ یہ مسلسل ڈھول پیٹتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات رجعت پسندی ہے۔ اور وہ ہر وقت اس تبلیغ میں لگے رہتے ہیں کہ اسلامی نظریہ حیات کو ترک کر دیا جائے۔ اور اسے انسان کی عملی زندگی سے خارج کر دیا جائے۔ گویا کہ انسانی زندگی کو اس سے خطرہ ہے اور اس کو زندگی سے خطرہ ہے۔ یہ لوگ مسلمانوں کے شعور اور طرز عمل میں ایسے تصورات اور ایسی روایات اور ایسے اصول کو رواج دیتے ہیں جو اسلامی تصورات کے متضاد ہوتے ہیں اور جن سے اسلامی طرز عمل اور اسلامی روایات کی خوش شکست و ریخت ہوتی ہے۔ یہ ایجنٹ ان جدید جاہلی تصورات کو مسلمانوں کے نظریات میں جس قدر جاذب بناتے ہیں۔ اسی قدر ایمانی روایات کا حلیہ بگاڑتے ہیں۔ مزید برآں یہ کہ یہ ایجنٹ جنسیت کو ہر قید و بند سے آزاد کرتے ہیں۔ اور اساسوں کو بنیاد سے اکھاڑتے ہیں۔ جن کے اوپر پاکیزہ اخلاق استوار ہوتے ہیں اور معاشرے کو اس گندگی کے اندر گراتے ہیں جسے وہ جگہ جگہ پھیلاتے پھرتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ ایجنٹ اسلامی تاریخ کا بعینہ اسی طرح حلیہ بگاڑتے ہیں، جس طرح انہوں نے اپنی کتب سماوی کا حلیہ بگاڑا اور اس میں تحریف کی۔

لیکن آپ حیران ہوں گے یہ ایجنٹ ان سب کارناموں کے ساتھ پھر بھی مسلمان ہیں! کیوں مسلمان نہ ہوں؟ کیا ان کے نام مسلمانوں کی طرح نہیں؟ اور وہ ان ناموں کے ساتھ ساتھ روز دن چڑھے اپنے اسلام کا اظہار و اقرار بھی کرتے ہیں لیکن وہ مذکورہ بالا کارنامے کر کے گویا شام کے وقت وہ اسلام کا انکار کر دیتے ہیں۔ اور اس طرح یہ ایجنٹ وہ کردار ادا کرتے ہیں جو پرانے اہل کتاب کرتے تھے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دور قدیم اور آج کے ماحول اور طریقہ واردات میں قدرے فرق ہے۔

اہل کتاب آپس میں طے کرتے تھے کہ تم لوگ دن چڑھے اپنے اسلام کا اظہار کرو اور شام تک اعلان کر دو کہ ہم نے اسلام کا اعلان کیا تھا لیکن اب ہم نے اسے ترک کر دیا ہے۔ تاکہ اس طرح مسلمانوں کے دلوں میں شک پیدا ہو جائے اور وہ بھی اسلام سے لوٹ آئیں۔ لیکن یہ بات راز میں رہے۔ اس کا افشا بھی نہ کرو اور اپنے دین والوں کے علاوہ کسی اور اس راز سے خبردار بھی نہ کرو۔ وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَا تَبِعَ دِينَكُمْ..... ”اپنے مذہب والے کے سوا کسی کی بات پر اعتماد نہ کرو۔“

فعل ”اسلام“ کا فاصلہ اگر لام متعدی ہو تو اس کا مفہوم اعتبار اور اعتماد کرنا ہوتا ہے۔ یعنی اعتماد صرف اس پر کرو جو تمہارے دین کو ماننے والا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں صرف اپنے ہم مذہب لوگوں کے سامنے اپنے بھید کھولو۔ مسلمانوں کو ان باتوں کی خبر نہ ہونے پائے۔

آج صہیونیت اور صلیبیت کے ساتھیوں کا طرز بھی یہی ہے۔ یہ لوگ آپس میں ایک بات میں باہم مفاہمت کر لیتے ہیں۔ وہ یہ کہ اسلامی نظریہ حیات کے بسمل کو موقعہ پاتے ہی قتل کر دیا جائے۔ اس کے لئے ایسے مواقع شاید میسر نہ ہوں۔ اور ہو سکتا ہے کہ صہیونیوں اور صلیبیوں کے ان ایجنٹوں کے درمیان اس جو مکمل مفاہمت پائی جاتی ہے وہ پھر نہ پائی جائے۔ لیکن یہ مفاہمت ایک طرف ایک (کلائنٹ) (Client) کے درمیان ہے اور دوسری جانب اس کے ایجنٹ کے درمیان ہے۔ اس میں یہ موکلین بعض اوقات اپنے ایجنٹ کو اپنے اصل راز بھی بتا دیتے ہیں۔ جبکہ انہیں یقین ہو کہ وہ ان رازوں کو افشاء نہ کریں گے۔ اس کے بعد وہ اپنے آپ کو دوسرے روپ میں ظاہر کرتے ہیں اور اس رنگ میں نہیں آتے جس میں انہوں نے ان سازشوں کو تیار کیا ہوتا ہے۔ ان ایجنٹوں کے لئے پہلے سے حالات درست کر کے ماحول کو ان کے لئے سازگار بنا دیا جاتا ہے۔ تمام سہولتیں انہیں مہیا کر دی جاتی ہیں۔ اور جو لوگ اس کرۂ ارض پر اس دین کی حقیقت کو سمجھتے ہیں وہ نظروں سے اوجھل ہیں یا معاشرہ میں دھنکارے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ کہتے ہیں وَلَا تُؤْمِنُوا إِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِينَكُمْ..... اور اپنا راز انہی لوگوں کو بتاؤ جو تمہارے دین کے ماننے والے ہیں۔“

یہاں آکر اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو اس کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ آپ اعلان کر دیں کہ ہدایت تو سرف اللہ وحدہ کی ہدایت ہے۔ اور جو شخص اللہ کی ہدایت کو تسلیم نہیں کرتا وہ کبھی بھی ہدایت پا نہیں سکتا۔ کسی صورت میں بھی اور کسی طریقے سے بھی قُلْ إِنْ أَلْهَدَىٰ ٱللَّهُ ٱلْبَشَرَ فَمَا لَكُمْ إِلَىٰ ٱللَّهِ ۚ أَلَمْ يَكُنْ لَهُ ٱلْأَلَمُ ۚ (سورۃ اعراف ۱۸۰) ”اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے۔“

اور یہ فیصلہ ان کے اس قول کے جواب میں آتا ہے۔ ”اہل ایمان پر جو کچھ نازل کیا گیا ہے اس پر صبح ایمان لاؤ اور شام کے وقت اس کا انکار کر دو امید ہے کہ اس طرح وہ پلٹ آئیں۔“ مسلمانوں کو ان

کے اس مذموم منصوبے کے ردِ بعمل آنے کے خلاف متنبہ کیا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو گویا وہ دوبارہ کفر میں داخل ہو جائیں گے۔ اس لئے ہدایت صرف اللہ کی ہدایت ہے۔ اور یہ مکار جو تدابیر اختیار کرتے ہیں وہ خالص کفر ہے۔ اور یہ فیصلہ بیچ میں آتا ہے۔ یعنی بطور جملہ ”معرضہ“ ابھی تک اہل کتاب کی بات ختم نہیں ہوتی۔

أَبْ يُؤْتَىٰ أَحَدٌ مِّثْلَ مَا أُوتِيَهُ أَوْ يُجْزَىٰ عَنْكَ رِبْكَمُ أَوْ يَهُودُ أَوْ نَصَارَىٰ أَوْ يَهُودُ أَوْ نَصَارَىٰ أَوْ يَهُودُ أَوْ نَصَارَىٰ
لے جو تمہیں معلوم ہے اور وہ تمہارے رب کے ہاں تمہارے خلاف حجت پیش کریں۔ ”یہ فقرہ ان کے اس موقف پر دلیل ہے کہ ”اور اپنا راز انہیں لوگوں کو بتاؤ جو تمہارے دین کے ماننے والے ہیں۔ یہ لوگ اس بغض اور حسد میں مبتلا تھے کہ کسی دوسرے شخص کو بھی اسی طرح نبوت اور کتاب سے سرفراز کیا جائے جس طرح تم نبوت اور کتاب سے سرفراز ہوئے تھے“ انہیں یہ خوف دامن گیر تھا کہ اہل اسلام کو دین اور اسلام پر اطمینان نصیب نہ ہو جائے۔ اور وہ اس حقیقت پر مطلع نہ ہو جائیں جسے اہل کتاب نے چھپا رکھا ہے۔ حالانکہ وہ اسے جانتے ہیں اور نیز قیامت کے دن مسلمان اللہ کے ہاں اسے اہل کتاب کے پاس بطور حجت پیش نہ کر دیں۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا گویا مسلمانوں کی اس قولی شہادت کے سواء اللہ انہیں سزا نہ دے گا۔ یہ ایک ایسا تصور ہے جو اللہ کی ذات و صفات پر صحیح ایمان کے نتیجے میں نہیں پیدا ہوتا۔ نہ اس قسم کے تصورات ان لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہو سکتے ہیں جن کو اللہ کی ذات اور صفات، نبوت اور رسالت اور ایمان پر مبنی افکار و فرائض کا صحیح علم حاصل ہو۔“

چنانچہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان اور رسول کریم ﷺ کو اس بات کی طرف متوجہ فرماتے ہیں کہ انہیں آگاہ کر دیں کہ یہ تو اللہ کا فضل و کرم ہے اور یہ اس کی مرضی ہے کہ وہ کسی قوم کو کتاب و نبوت سے نواز دے۔

قُلْ إِنَّا بِأَعْيُنِنَا ذُرِّيَّتُكَ وَاللَّهُ يَبْصُرُ عَمَلَهُ (۷۳) يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهِ مَن يَشَاءُ
وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ

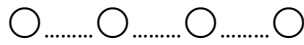
”اے نبی ان سے کہو کہ ”فضل و شرف اللہ کے اختیار میں ہے، جسے چاہے عطا فرمائے۔“ وہ وسیع النظر ہے اور سب کچھ جانتا ہے، اپنی رحمت کے لئے جس کو چاہتا ہے مخصوص کر لیتا ہے اور اس کا فضل بہت بڑا ہے۔“

اللہ کی مشیت نے اب فیصلہ کر لیا ہے اب نبوت اور رسالت سے اہل کتاب کے سوا دوسرے لوگوں کو سرفراز کر دے، خصوصاً جبکہ وہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے مواعید کی مخالفت کرتے چلے جائیں، جو ان کے باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو ذمہ داری ان پر ڈالی تھی اسے بھی توڑتے چلے جائیں، جو امانت اللہ نے ان کے سپرد کی تھی اس میں خیانت کرتے چلے جائیں، وہ اپنی کتاب کے احکام اور اپنے دین کے قوانین کو توڑتے چلے جائیں۔ اور پھر اگر کوئی انہیں دعوت دے کہ آؤ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کریں تو وہ انکار کر دیں، اور ان کے ان سب کارناموں کی وجہ سے انسانوں کی قیادت اور راہنمائی اسلامی نظام زندگی، اسلامی قائدین اور قرآن کریم کی راہنمائی سے آزاد ہو جائے، یہی وہ مقام تھا جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل اور اہل کتاب سے قیادت واپس لے لی اور اس بات امانت کو امت مسلمہ کے سپرد کر دیا۔ اور یہ اس امت پر اللہ تعالیٰ کا ایک بہت بڑا فضل اور احسان تھا۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ.....

”اللہ بڑی وسعت والا اور خبردار ہے۔“ اور یَجْتَنِّصُ بِرَحْمَتِهِ مَنۢ یَّشَآءُ..... ”وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لئے مخصوص کر لیتا ہے۔“ اس کا فضل و کرم بڑا وسیع ہے۔ اور اس کا علم بھی بڑا وسیع ہے، اس لئے وہ اس جگہ کو بھی خوب جانتا ہے ہے۔ جہاں اس کی رحمت نازل ہو۔ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ..... ”اس کا فضل بہت بڑا ہے۔“ اور کسی قوم کے لئے اس سے بڑا اور فضل کیا ہو سکتا ہے کہ وہ اسے ایک کتاب کی صورت میں ہدایت دے۔ اور کسی کو وہ اس سے بڑی کیا خیر و برکت عطاء کرے کہ ان کو رسالت عطا کر دے اور اس سے بڑی رحمت کا اور کیا مظاہرہ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی قوم میں رسول بھیج دے۔

جب اہل اسلام نے یہ سنا تو ان کے دل میں اللہ کے فضل و کرم کا احساس پیدا ہوا۔ انہوں نے یہ جان لیا کہ انہیں ایک عظیم ڈیوٹی کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ اور انہیں مخصوص طور پر یہ اعزاز دیا گیا ہے

۔ تو انہوں نے اپنے اس اعزاز کو بڑی دلچسپی کے ساتھ قائم رکھا۔ بڑی مضبوطی اور عزم سے اسے تھام لیا۔ بڑی قوت اور ثابت قدمی سے اس کی مدافعت کی۔ وہ حاسدوں اور مکاروں کی سازشوں کے مقابلے میں چوکنے ہو گئے۔ قرآن کریم کا یہی انداز تربیت تھا۔ اس لئے کہ یہ حکیم و داناکا کلام ہے۔ اور آج بھی امت مسلمہ کے لئے یہی عنصر موجب اصلاح و تربیت ہو سکتا ہے۔ ہر زمانے اور ہر نسل میں۔



آگے بڑھ کر مزید حالات اہل کتاب کی بابت بیان ہوتے ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ ان کے طرز عمل میں کس قدر تناقص پایا جاتا ہے۔ اور قطعی طور پر بتا دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا دین یعنی اسلام کن صحیح اور سچے اقدار پر استوار ہوا ہے۔ اس سلسلے میں بتایا جاتا ہے کہ اہل کتاب کے اندر باہمی معاملات میں کس قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِقِطْعَةٍ يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بَدِينَارٍ لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيِّينَ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۷۵) بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (۷۶) إِنْ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۷۷)

”اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمہارا مال تمہیں ادا کر دے گا اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں بھی اس پر

بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ۔ ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں۔ ”امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔“ اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے ایسی کوئی بات نہیں فرمائی ہے۔ آخر کیوں ان سے باز پرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور ہر برائی سے بچ کر رہے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا، کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، تو ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ قیامت کے روز ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ بلکہ ان کے لئے تو سخت دردناک سزا ہے۔“

جو اہل کتاب اس وقت اہل ایمان اور جماعت مسلمہ کے مقابلے میں اترے ہوئے تھے اور بحث و تکرار کر رہے تھے، ان کے بارے میں قرآن کریم کا تبصرہ نہایت ہی منصفانہ سچائی پر مبنی ہے۔ اور ان کے اوصاف بے کم و کاست بیان کئے گئے ہیں۔ اور جو اوصاف بیان کئے گئے ہیں، آج تک اہل کتاب کا یہی حال ہے۔ غرض اہل کتاب اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ جو دشمنی کر رہے تھے مسلمانوں اور اسلام کے خلاف وہ جس قدر گہری اور مذموم سازشیں کر رہے تھے اور جماعت مسلمہ اور دین اسلام کے خلاف وہ جس قدر شدید شر و فساد کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ ان سب حقائق کے باوجود ان میں سے جو لوگ اچھے تھے نہ ان کے فضائل چھپاتا ہے اور نہ ان کے بیان میں کمی کرتا ہے۔ حالانکہ وہ اس وقت وہ اہل اسلام کے ساتھ مقابلہ و مناظرہ کی حالت میں تھے۔ اس لئے قرآن مجید کہتا ہے کہ اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے ہیں کہ اگر ان کے ہاتھ میں لوگوں کے عظیم حقوق بھی آجائیں تو وہ انہیں تلف نہیں کرتے۔

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُؤَدُّهُ إِلَيْكَ..... ”اہل کتاب میں سے کوئی تو ایسا ہے اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمہارا مال تمہیں ادا کرے گا۔“ لیکن ان میں سے ایسے لوگ بھی ہیں جو پرلے درجے کے خائن، لالچی، اور ملمع کار ہیں جو کسی

کا حق نہیں لوٹاتے۔ اگرچہ وہ بہت ہی حقیر کیوں نہ ہوں، ہاں صرف وہ اس صورت میں ادا کریں گے کہ تم ان سے اصرار سے مطالبہ کرو اور ان کے سر پر سوار ہو جاؤ اور یہ حق مارنے کے لئے وہ ایک ایسا فلسفہ بھی گڑھتے ہیں جس میں سوچے سمجھے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَنْ إِتٰ تَأْمَنُهُ بَيْتًا لَا يُؤَدُّهُ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ فَإِنَّمَا ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّيَّانِ سَبِيلٌ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ”اور کسی کا حال یہ ہے کہ اگر تم ایک دینار کے معاملے میں بھی اس پر بھروسہ کرو تو وہ ادا نہ کرے گا الا یہ کہ تم اس کے سر پر سوار ہو جاؤ، ان کی اس اخلاقی حالت کا سبب یہ ہے کہ وہ کہتے ہیں ”امیوں (غیر یہودیوں کے معاملے میں) ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔“ اور یہ بات وہ محض جھوٹ گھڑ کر اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں حالانکہ انہیں معلوم ہے کہ اللہ نے کوئی ایسی بات نہیں فرمائی۔“

اور یہ بھی یہودیوں کی ایک خاص صفت ہے۔ صرف یہودی یہ بات کہتے تھے۔ ان کے ہاں اخلاق و آداب کے مختلف پیمانے تھے۔ امانت و دیانت تو صرف ایک یہودی اور دوسری یہودی کے درمیان معاملات کے لئے ہے۔ رہے غیر یہودی جنہیں وہ امی کہتے تھے۔ اور ان سے مراد ان کی صرف عربوں ہی سے تھی۔ تو ان کے اموال تلف کرنے اور ناجائز ہڑپ کر جانے میں وہ کوئی حرج محسوس نہ کرتے تھے۔ وہ بڑی بے تکلفی کے ساتھ غیر یہود کے ساتھ دھوکہ، فریب، ملمع کاری، استحصال جیسے جرائم کا ارتکاب کرتے تھے۔ بغیر کسی جھجک کے وہ ان کے خلاف اچھے ہتھیار استعمال کرتے اور مذموم حرکات کا ارتکاب کرتے۔

تعجب کی بات تو یہ ہے کہ ان کا کہنا یہ تھا کہ ان کا خدا اور ان کا دین انہیں اس بات کا حکم دیتا ہے۔ لیکن دراصل وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی فحش بات کا حکم نہیں دیتا۔ مثلاً یہ کہ وہ کسی گروہ کو حکم دے کہ وہ دوسرے گروہ کی دولت ناجائز اور ظالمانہ طور پر کھائے۔ اور اس کے ساتھ اپنے کئے ہوئے معاہدوں کی پابندی نہ کرے۔ اور اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کرے۔ اور ان کو بغیر کسی کراہیت اور حرج کے نقصان پہنچاتا چلا جائے۔ لیکن وہ یہودی تھے

۔ وہ یہودی جنہوں نے انسانوں کے ساتھ عداوت اور دشمنی کو اپنا دین بنا رکھا ہے۔ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ..... ”وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں، جانتے ہوئے۔“

اس مقام پر قرآن کریم انسانوں کے لئے اپنا واحد اخلاقی اصول طے کر دیتا ہے۔ یہ اس کا واحد اخلاقی معیار ہے۔ اور وہ اپنے اخلاقی نقطہ نظر کو خدا اور خدا خونی کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔

بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ (٤٦) اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَاِيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ لَا خَلٰقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُرْكَبُ عَلَيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ

”آخر کیوں ان سے باز پرس نہ ہوگی؟ جو بھی اپنے عہد کو پورا کرے گا اور برائی سے بچے گا وہ اللہ کا محبوب بنے گا، کیونکہ پرہیزگار لوگ اللہ کو پسند ہیں۔ رہے وہ لوگ جو اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں، تو ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا نہ ان کی طرف دیکھے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ بلکہ ان کے لئے تو سخت دردناک سزا ہے۔“

غرض یہ ایک اخلاقی اصول ہے، جس نے اس کا لحاظ رکھا، اللہ کے عہد کا پاس کرتے ہوئے اللہ خونی کا شعور رکھتے ہوئے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ محبت رکھے گا، اسے اعزاز اور اکرام نصیب ہوگا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ کئے ہوئے اس عہد کو دنیا کے ثمن قلیل کی وجہ سے توڑا، چاہے اسے یہ پوری دنیا کیوں نہ مل رہی ہو، تو اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا، اس لئے کہ یہ پوری دنیا بھی آخرت کے مقابلے میں متاع قلیل ہے۔ اللہ کے ہاں ایسا شخص ہرگز مقبول نہ ہوگا اور ایسے شخص کے لئے کوئی نرمی نہ ہوگی۔ نہ وہ صاف ہوگا اور نہ پاک، اس کی یہ حالت ہوگی وہ عذاب الیم میں مبتلا ہوگا۔

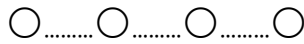
یہاں اشارتاً یہ کہا گیا ہے کہ وفائے عہد کا تعلق اللہ خوفی کے ساتھ ہے۔ اس لئے وفائے عہد میں کسی حالت میں بھی فرق نہیں آنا چاہئے۔ وہ دوست کے ساتھ ہو یا دشمن کے ساتھ ہو۔ وفائے عہد مصلحتوں پر موقوف نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وفائے عہد کا معاملہ اللہ کے ساتھ مربوط ہوتا ہے۔ اس کا ربط اور تعلق اس شخص کے ساتھ نہیں ہوتا جس کے ساتھ عہد کیا گیا ہو۔

یہ ہے اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر، ایفائے عہد میں بھی اور عمومی اجتماعی اخلاق میں بھی۔ یہ کہ اجتماعی معاملات میں سب سے پہلا معاملہ اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ ایک مسلمان سب سے پہلے ذات باری کو پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ سب سے پہلے اللہ کے غضب سے ڈرتا ہے۔ اور اس کی رضامندی کا طلب گار ہوتا ہے۔ اسلام میں اخلاقیات کی تہہ میں محرک مصلحت نہیں ہوتی، نہ اس کا سبب اجتماعی عادت ہوتی ہے اور نہ اخلاقیات سوسائٹی کے دباؤ کی وجہ سے رائج ہوتے ہیں، اس لئے کہ سوسائٹی کبھی راہ راست پر ہوتی ہے اور کبھی گمراہ ہوتی ہے۔ اور اس میں گمراہ کن اقدار اور پیمانے رائج ہو جاتے ہیں۔ لہذا اخلاقیات کے لئے ایسے ناقابل تغیر پیمانے وضع ہونا ضروری ہیں جن کے مطابق ایک فرد بھی اپنے اخلاق کو ناپے اور ایک سوسائٹی بھی ان کے معیار کو سمجھے۔ اور ناقابل تغیر ہونے اور مستحکم ہونے کے ساتھ ساتھ ان اخلاقی پیمانوں کا تعلق عالم بالا سے بھی ہو، جہاں سے پیمانے لئے جائیں۔ یہ پیمانے اور ان کا ماخذ انسانی اصطلاحات اور انسانی ضروریات سے بالا ہو، اس لئے کہ انسانی ضروریات اور مصلحتیں روز بدلتی رہتی ہیں۔ لہذا یہ ضروری ہے کہ یہ اصول اور پیمانے ذات باری سے اخذ کئے جائیں اور وہ اس طرح کہ سب سے پہلے معلوم کیا جائے کہ اللہ کی رضا کیا ہے۔ اس کی رضامندی پیش نظر ہو، اس کا خوف دل میں ہو، یوں اسلام انسانیت کو ایک ایسا اخلاقی نظام دیتا ہے جس کی جڑیں اس دنیا کی بجائے عالم بالا میں ہوتی ہیں اور وہ اسی روشن مستحکم اور سر بلند سرچشمے سے اپنے اخلاقی پیمانے اور اخلاقی اصول اخذ کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جو لوگ وعدہ خلافی کرتے ہیں اور امانت میں بددیانتی کرتے ہیں ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو تھوڑی قیمت پر بیچ ڈالتے ہیں۔ لہذا عہد و پیمان کا پہلا تعلق اللہ اور بندے کے درمیان ہے اور بعد میں اس کا تعلق ایک انسان اور دوسرے انسان کے ساتھ ہے

لہذا جہاں تک اللہ کا تعلق ہے ایسے عہد شکن لوگوں کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ ہاں اگر وہ اس عہد شکنی اور قسم توڑنے کے عوض کوئی دنیاوی مفاد حاصل کرنا چاہتے ہیں تو یہ مصالح دنیا آخرت کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں رکھتے۔ اس لئے ان کی اس عہد شکنی کی وجہ سے روز آخرت میں ان کے لئے کوئی جزا نہ ہوگی اس لئے کہ انہوں نے لوگوں کے ساتھ جو عہد کیا تھا وہ اللہ کے ساتھ بھی عہد تھا۔

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ہوتی ہے کہ فنی اعتبار سے قرآن کریم کا اسلوب تعبیر نہایت ہی مصورانہ ہے۔ یہاں اس حقیقت کہ اللہ ان پر کوئی توجہ نہ کرے گا اور ان کی کوئی رورعایت نہ ہوگی۔ یوں ادا کیا گیا ہے کہ اللہ نہ ان کے ساتھ بات کرے گا نہ ان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے گا اور نہ ہی انہیں پاک کرے گا۔ یہ وہ انداز ہے جو بالعموم نظر انداز کرنے کے لئے عام لوگوں کے درمیان متعارف ہے۔ قرآن کریم نے اس تصویری انداز بیان کو اس لئے اختیار کیا ہے تاکہ قیامت کے دن ان کی رسوائی کی ایک زندہ اور وجدانی تصویر آنکھوں کے سامنے آجائے۔ یہ زندہ اور وجدانی پیرایہ اظہار محض تجریدی انداز بیان سے زیادہ دلنشین ہوتا ہے۔ یہ قرآن کریم کا پیرایہ اظہار بہت ہی خوبصورت اور حسین و جمیل۔



ذرا آگے بڑھئے اور دیکھئے اہل کتاب کے کچھ اور نمونے، ایک نمونہ ان گمراہ کنندگان کا ہے جو خود کتاب اللہ کو لوگوں کی گمراہی کے لئے بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنی زبان کو موڑ کر چالاکی سے بات کرتے ہیں اور مراد کچھ سے کچھ بن جاتی ہے۔ وہ آیات کتاب میں ایسی توڑ پھوڑ کرتے ہیں جس سے مراد اور مفہوم ان کی متعینہ خواہشات کے مطابق ہو جاتا ہے اور اس توڑ اور پھوڑ کے بدلے میں ایک حقیر فیس وصول کرتے ہیں۔ اور اس فیس کا تعلق اس دنیا کے حقیر مقاصد کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ جو تحریفات اور تاویلات کرتے تھے منجملہ ان میں سے وہ عقائد تھے جو انہوں نے حضرت مسیح اور حضرت مریم کے بارے میں گھڑ رکھے تھے۔ اور وہ عقائد اہل کنسیا اور حکام وقت کے مفید مطلب تھے۔

وَإِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا يَلُؤُونَ أَلْسِنَتَهُم بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ
الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ
اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ (٤٨) مَا كَانَ لِبَشَرٍ
أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا
كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (٤٩) وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ
أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (٥٠)

”اور ان میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو کتاب پڑھتے ہوئے اسی طرح زبان کا الٹ پھیر کرتے ہیں
کہ تم سمجھو کہ جو کچھ وہ پڑھ رہے ہیں وہ کتاب ہی کی عبارت ہے۔ حالانکہ وہ کتاب کی عبارت نہیں ہوتی
۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ جو کچھ پڑھ رہے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا
، وہ جان بوجھ کر جھوٹی بات اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ کسی انسان کا کام یہ نہیں ہے کہ اللہ تو اس
کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے بندے بن جاؤ
، وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو، جیسا کہ اس کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے اور پڑھاتے ہو۔ وہ
تم سے ہر گز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنا لو کیسا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمہیں کفر کا
حکم دے جبکہ تم مسلم ہو۔“

جب اہل دین اخلاقی فساد میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو وہ دینی حقائق میں ملاوٹ کا ذریعہ بنتے ہیں اور یہ
کام وہ علمائے دین کے لباس میں کرتے ہیں۔ قرآن کریم یہاں اہل کتاب میں ایک گروہ کے جو حالات
بیان کر رہا ہے، ان سے ہم اپنے زمانے میں اچھی طرح واقف ہیں، اہل کتاب نصوص کتاب میں
تاویلات کرتے تھے۔ زبان کے ہیر پھیر سے مفہوم تبدیل کرتے تھے۔ اور اس طرح وہ طے شدہ نتائج

اخذ کرتے تھے۔ اور ان کا یقین یہ ہوتا تھا کہ کتاب اللہ کا مفہوم یہی ہے۔ اور یہی مفہوم ارادہ الہی کا اظہار ہے۔ حالانکہ جو نتائج وہ اخذ کرتے تھے وہ اصول دین سے متصادم تھے۔ ان کو یہ اعتماد تھا اکثر سامعین ان پڑھ اور بے علم ہیں اور وہ ان کے خود ساختہ نتائج اور آیات کے حقیقی مفہوم کے درمیان کوئی فرق اور امتیاز نہیں کر سکتے۔ حالانکہ ان کے نتائج جعلی اور جھوٹے تھے اور ان نتائج تک وہ آیات کو زبردستی کھینچ کر لاتے تھے۔

اہل کتاب کا یہ نمونہ ہمارے دور میں بعض دینی راہنماؤں میں پوری طرح پایا جاتا ہے جو بطور ظلم اپنے آپ کو دین کے حوالے سے پیش کرتے ہیں۔ جو دین میں تحریف کرتے ہیں۔ اور جو اپنی خواہشات نفسانیہ میں سے مزاج بناتے ہیں۔ وہ اپنے کاندھوں پر آیات الہی کو اٹھائے ہوئے پھرتے ہیں اور جہاں بھی انہیں کوئی مفاد نظر آئے اسی کی بھینٹ چڑھاتے ہیں جہاں بھی اس دنیا کے مفادات میں سے کوئی بھی مفاد ملتا ہے۔ ان آیات کے ذریعہ وہ اسے حاصل کرتے ہیں۔ غرض آیات الہی کو اٹھائے یہ لوگ اغراض دنیاوی کے پیچھے دوڑتے رہتے ہیں۔ اور پھر ان آیات کی گردن توڑ کر اور انہیں خوب مروڑ کر ان مفادات پر فٹ کرتے ہیں۔ وہ الفاظ کے مفہوم میں ایسی تبدیلی کرتے ہیں کہ وہ ان کے مقاصد اور رجحانات سے موافق ہو جائیں۔ اگرچہ یہ رجحانات دین کے اساسی تصورات اور اصول دین کے ساتھ متصادم ہوں۔ وہ اس میدان میں سہ گانہ جدوجہد کرتے ہیں اور ہر قسم کی بہتان تراشی کا ارتکاب کرتے ہیں اور ہر وقت اسی گھات میں بیٹھے رہتے ہیں کہ کسی طرح قرآن مجید کے کسی لفظ کا وہ مفہوم نکال لیں جو ان کی خواہشات نفسانیہ کے مطابق ہو، اور جس سے یہ رائج اور صاید خواہشات ثابت ہو جائیں۔

وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ

”وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا وہ جان بوجھ کر بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔“

قرآن کریم نے اہل کتاب کے ایک گروہ کا جو حال بیان کیا ہے، یہ ایک ایسی بیماری ہے جو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اس میں ہر وہ قوم مبتلا ہو جاتی ہے جو دین کا کام ایسے لوگوں کے سپرد کر دیتی ہے جو نام نہاد دیندار ہوتے ہیں اور جن کے نزدیک دین اس قدر ارزاں ہو جاتا ہے کہ اس کی قدر و قیمت ان کی اغراض دنیاوی میں سے ادنیٰ کے غرض کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ اور ان کی ذمہ داری کی حس اس قدر مانگ پڑ جاتی ہے کہ ان کا دل اللہ پر جھوٹ باندھنے سے بھی نہیں چوکتا۔ وہ لوگوں اور بندوں کی چالپوسی کی خاطر آیات الہی میں تبدیلی کرتے ہیں۔ اور اپنی غیر صحت مند خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وہ اللہ کے دین میں تحریف کا ارتکاب کرتے ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو اس خطرناک مقام سے آگاہ کرتے ہیں جہاں قدم پھسل جاتے ہیں اور جس کی وجہ سے بنی اسرائیل نے اپنے مقام قیادت کو کھو دیا۔

ان آیات کے مجموعی تاثر کے مطابق معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کا یہ گروہ کتاب اللہ میں سے مجازی تعبیرات پر مشتمل بعض جملے تلاش کر لیتا تھا اور پھر ان آیات کو توڑ مروڑ کر ان سے ایسے معانی نکال لیتا تھا جن کی محتمل وہ آیات نہ تھیں۔ یوں وہ اپنی تاویلات کے ذریعہ عجیب معانی نکالتے اور ان پڑھ لوگوں کو یہ تاثر دیتے کہ یہ مفہم کتاب اللہ کے مدلولات ہیں۔ حالانکہ وہ خود ان کے ایجاد کردہ تھے۔ وہ لوگوں سے کہتے یہ ہے وہ بات جو اللہ نے کہی ہے۔ حالانکہ اللہ نے تعالیٰ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی ہوتی۔ ان تاویلات کا مقصد اور ہدف یہ تھا کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت ثابت کر دیں، یعنی تین اقنوم باپ، بیٹا اور روح القدس، تین بھی اور ایک بھی اور وہ ایک اللہ ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ ان کے تصور سے پاک ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ایسے کلمات روایت کرتے تھے جو ان کے مزعومات کی تائید کرتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی ان تحریفات اور تاویلات کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ اپنے بندے کو نبوت کے لئے چن لے اور اس کو یہ عظیم منصب عطا کر دے اور وہ بندہ لوگوں کو حکم دے کہ وہ اسے الہ بنالیں۔ فرشتوں کو الہ بنالیں۔ یہ تو ممکن ہی نہیں ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يُوْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّانِيِّينَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ (٤٩) وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا الصَّلَاحَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ بِالْكَفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ (٨٠)

”کسی انسان کا یہ کام نہیں ہے کہ اللہ اس کو کتاب اور حکم اور نبوت عطا فرمائے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم لوگوں کے بندے بن جاؤ۔ وہ تو یہی کہے گا کہ سچے ربانی بنو، جیسا کہ اسی کتاب کی تعلیم کا تقاضا ہے جسے تم پڑھتے ہو اور پڑھاتے ہو۔ وہ تم سے ہر گز یہ نہ کہے گا کہ فرشتوں کو یا پیغمبروں کو اپنا رب بنا لو، کیا یہ ممکن ہے کہ ایک نبی تمہیں کفر کا حکم دے جبکہ تم مسلم ہو۔“

حضرت نبی ﷺ یہ یقین دہانی کراتے ہیں کہ وہ عبد ہیں اور اللہ تعالیٰ وحدہ لا شریک رب ہے اور تمام لوگوں کا فرض ہے کہ وہ صرف اس کی عبادت کریں۔ اس لئے اس بات کا امکان ہی نہیں ہے کہ وہ اپنے لئے مقام ربوبیت کو مخصوص کریں۔ کیونکہ مقام الوہیت کا تو پھر تقاضا یہ ہے لوگ عبادت بھی نبی کی کریں۔ اس لئے کوئی نبی لوگوں کو یہ نہیں کہہ سکتا کُونُوا عِبَادًا لِي مِنْ دُونِ اللَّهِ..... ”تم اللہ کے سوا میرے بندے بن جاؤ۔“ نبی کی دعوت تو یہ ہوتی ہے کہ کُونُوا رَبَّانِيِّينَ..... ”تم سب ربانی بن جاؤ۔“ اس لئے کہ جس کتاب کا تم نے علم حاصل کیا ہے۔ اس کی تعلیمات یہی ہیں۔ اور جس کی تم تدریس کرتے ہو اس کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اس لئے علم کتاب اور تدریس کا یہ تقاضا ہے کہ صرف اللہ کی بندگی ہو، پس نبی کیسے لوگوں کو یہ حکم دے سکتا ہے کہ وہ نبیوں اور فرشتوں کو اللہ کے علاوہ رب بنالیں۔ اس لئے کہ نبی اسلام لانے کے بعد لوگوں کو کفر کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔ حالانکہ اس کا مقام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت دے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت پانے کے بعد گمراہ کر دے۔ وہ اسلام کی طرف ان کا قائد ہے، اسلام سے نکلنے کے لئے ان کا قائد نہیں ہے۔

اس فارمولے کے مطابق وہ بات محال ہو جاتی ہے۔ جو لوگ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نیز ان کا یہ جھوٹ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ تمام آیات و روایات جو وہ پڑھتے ہیں اللہ اور رسول کی طرف سے ہو سکتے ہیں۔ اس لئے یہ لوگ جو بات کہتے ہیں اس کی حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ دعویٰ بے اعتبار ہو جاتا ہے جسے وہ بار بار اسلامی صفوف میں شبہات اور خلجان پیدا کرنے کے لئے دہراتے ہیں۔ اس لئے کہ قرآن کریم نے انہیں اچھی طرح ننگا کر کے رکھ دیا ہے۔ اور وہ جماعت مسلمہ کے سامنے کھلے میدان میں ننگے ہو گئے ہیں۔

ان لوگوں کی مثال بھی بعینہ ان اہل کتاب جیسی ہے جو علم دین کے مدعی ہیں جیسا کہ ہم اس سے پہلے بالتفصیل بیان کر آئے ہیں۔ یہ لوگ اس بات کے مستحق ہیں کہ قرآن کریم کی یہ آیات ان کے سامنے پیش کی جائیں۔ کیونکہ یہ لوگ بھی قرآنی نصوص کو توڑ مروڑ کر پیش کرتے ہیں اور انہوں نے بھی اللہ کے سوا کئی ارباب قائم کر رکھے ہیں اور وہ ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ آیات کو توڑ موڑ کر ان سے وہ مفاہیم نکالیں جو خود انہوں نے گھڑ رکھے ہیں۔

وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ

”وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہم پڑھ رہے ہیں یہ اللہ کی طرف سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی طرف سے نہیں ہوتا، وہ جان بوجھ کر جھوٹ بات اللہ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں۔“



اس کے بعد تمام رسولوں اور رسالتوں کے قافلہ ایمانی کے درمیان اللہ تعالیٰ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کے حوالے سے ایک مضبوط رابطے کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے مطابق وہ تمام لوگ اس عہد کو توڑنے والے اور فاسق قرار پاتے ہیں جو نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ پر ایمان نہیں لاتے۔ یہ

لوگ نہ صرف یہ کہ اللہ سے کئے ہوئے عہد سے منحرف ہوتے ہیں، بلکہ وہ اس پوری کائنات کے ناموس اعظم سے بھی خارج ہو جاتے ہیں۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَىٰ ذَٰلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ (۸۱) فَمَنْ تَوَلَّىٰ بَعْدَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۸۲) أَفَعَيِّرُ دِينَ اللَّهِ يَبْغُوبَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ (۸۳)

”یاد کرو جب اللہ نے پیغمبروں سے عہد لیا تھا کہ ”آج ہم نے تمہیں کتاب و حکمت و دانش سے نوازا ہے، کل اگر کوئی دوسرا رسول تمہارے پاس، اسی تعلیم کی تصدیق کرتا ہوا آئے جو پہلے سے تمہارے پاس موجود ہے، تو تم کو اس پر ایمان لانا ہو گا اور اس کی مدد کرنی ہو گی۔“ یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا ”کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو“ اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو۔“ انہوں نے کہا ہاں ہم اقرار کرتے ہیں، اللہ نے فرمایا۔ ”اچھا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں، اس کے بعد جو اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔ کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ چھوڑ کر کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ حالانکہ زمین و آسمان کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی تابع فرمان (مسلم) ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔“

اللہ تعالیٰ نے ایک نہایت ہی خوفناک اور پختہ معاہدہ لیا، اور اس معاہدے پر وہ خود گواہ بن گیا اور اپنے تمام نبیوں کو اس پر گواہ بنایا یہ معاہدہ تمام رسولوں سے لیا گیا تھا۔ مضمون یہ تھا کہ جس رسول کو بھی کتاب و حکمت دی جائے اس کا فرض یہ ہو گا کہ وہ اس کے بعد آنیوالے رسول کی تائید کر دے اگر بعد

میں آنے والا رسول خود اس کی تعلیمات کی توثیق و تائید کر رہا ہو۔ تائید کے ساتھ سابقہ رسول کا یہ بھی فرض ہے کہ اس کی نصرت کرے اور اس کی شریعت کی اطاعت کرے۔ یہ معاہدہ اللہ اور ہر رسول کے مابین طے پایا تھا۔

قرآن کریم نے تاریخ انسانی کے طویل ترین دفتر کو لپیٹ کر تمام رسولوں کو ایک جگہ جمع کر دیا۔ وہ ایک ہی منظر میں سب جمع ہیں۔ اللہ جل شانہ ان کو ایک ساتھ خطاب فرما رہے ہیں تو کیا انہوں نے اس معاہدے کا اقرار کر لیا اور اللہ کی بھاری ذمہ داری کو قبول کر لیا۔ اللہ تعالیٰ سوال فرماتے ہیں قَالَ أَفَرَزْتُكُمْ وَأَخَذْتُكُمْ عَلَىٰ ذَلِكُمْ أَصْرِي..... ”کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میری طرف سے عہد کی بھاری ذمہ داری اٹھاتے ہو؟“ وہ سب جواب دیتے ہیں - قَالُوا أَفَرَزْنَا..... ”ہم اقرار کرتے ہیں۔“..... پس رب ذو الجلال اس معاہدے پر خود بھی گواہ بن جاتے ہیں اور ان کو بھی گواہ بناتے ہیں - قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ..... ”فرمایا تو گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔“

یہ ایک عظیم اور دہشت انگیز منظر، جس کی تصویر کشی قرآن کرتا ہے، اسے دیکھ کر دل کانپ اٹھتے ہیں، اس منظر میں تمام انبیاء و رسل جناب باری میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ معززین ارض کا یہ قافلہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا، ایک دوسرے پر تکیہ لگائے کھڑا ہے اور سب کے سب لوگ عالم بالا کی ربانی ہدایت کے منتظر ہیں۔ یہ سب اسی حقیقت اور سچائی کی نمائندگی کرتے ہیں جو ایک ہے اور جس کے بارے میں اللہ کا حکم یہ ہے کہ پوری انسانیت کی تعمیر اس کی اساس پر کی جائے جس میں کوئی انحراف نہ ہو، کوئی دوئی نہ ہو، کوئی تعارض نہ ہو اور کوئی تصادم نہ ہو، اس سچائی کے نمائندے وہ لوگ ہیں جو لوگوں میں سے برگزیدہ ہیں۔ ان میں سے ہر برگزیدہ اس سچائی کو دوسرے برگزیدہ کی طرف منتقل کرتا چلا آیا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ذات کو بھی انبیاء الے مختار کی طرف منتقل کرتا جاتا ہے۔ اس لیے کہ نبی کی ذات اس کی اپنی نہیں ہوتی ہے۔ نہ اس مہم میں اس کا کوئی ذاتی مقصد یا خواہش ہوتی ہے، نہ نبی ذاتی اور شخصی عزت و تکریم کے لئے کام کرتا ہے وہ تو بندہ مختار ہوتا ہے اور ایک ذمہ دار مبلغ ہوتا

ہے۔ یہ ذات باری ہی ہے جو مختلف ادوار میں مختلف نسلوں کی طرف دعوت اسلامی کو منتقل کرتا چلا آتا ہے اور مختار ان رسل اسے جس طرح چاہتے ہیں چلاتے ہیں۔

دین کے اس تصور اور اللہ کے ساتھ اس سلسلے میں طے ہونے والے اس عہد کے نتیجے میں اللہ کا دین خالص ہو جاتا ہے۔ اس میں کوئی ذاتی عصبیت نہیں داخل ہوتی۔ یعنی رسول کی ذات بھی اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ رسول کی قوم کا اس دین پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس کے پیروکاروں اور ان کے خاندانوں کے مخفی اثرات سے بھی یہ دین پاک و صاف ہوتا ہے۔ اسی طرح متبعین کی ذات اور ان کی قوم قبیلے کی شخصیت کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دین اسلام ایک ایسا دین ہے جس میں ہر معاملہ اللہ کے اختیار میں ہوتا ہے، دین بھی ایک اور اللہ بھی ایک، اور اسی ایک دین کو لیکر انسانے کی تاریخ میں قافلہ رسل بھی ایک، جو نہایت ہی معزز اور ممتاز قافلہ ہے۔

اس حقیقت کے سائے میں ہمارے سامنے اب وہ لوگ کھل کر آ جاتے ہیں جو اپنے آپ کو اہل کتاب کہتے ہیں۔ یہ لوگ نبی آخر الزمان پر ایمان نہیں لاتے۔ اور پیچھے رہ جاتے ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ وہ اپنے دین کی وجہ سے ایمان نہیں لاتے، حالانکہ خود ان کے دین کا تقاضا یہ ہے کہ وہ نبی آخر الزماں پر ایمان لائیں اور اس کی نصرت اور تائید کے لئے اٹھیں۔ لیکن یہ لوگ محض تعصب کی وجہ سے یہ ایمان نہیں لاتے۔ اس لئے کہ یہ دین ان تک جن رسولوں نے پہنچایا ہے ان سے تو اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی پختہ عہد لیا ہے اور انہوں نے اپنے رب کے ساتھ یہ عہد باندھا ہے اور یہ عہد برسر عام اور اجلاس میں طے پایا کہ وہ نبی آخر الزمان کی نصرت کریں گے۔ اس لئے جو لوگ نبی آخر الزمان پر ایمان نہیں لاتے وہ درحقیقت فاسق اور بدکار ہیں۔ وہ عہد شکن ہیں۔ وہ اس کائنات کے اسی نظام کو توڑنے والے ہیں۔ جو اپنے رب کا فرماں بردار ہے، جو ناموس قدرت کا مطیع فرمان ہے۔ اس لئے کہ یہی ناموس اس پوری کائنات کا مدبر ہے۔ اور یہ پوری کائنات اس کی مشیت پر چل رہی ہے۔

فَمَنْ تَوَلَّى بَعْدَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ (۸۲) أَفَعَيِّرُ دِينَ اللَّهِ يَبْغُوءَ وَلَهُ
أَسْكَنُ مِنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ طُغُوًّا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ

”اس کے بعد جو شخص اپنے عہد سے پھر جائے وہی فاسق ہے۔ کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ چھوڑ کر کوئی اور دین چاہتے ہیں؟ حالانکہ زمین و آسمان کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی تابع فرمان (مسلم) ہیں اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔“

حقیقت یہ ہے کہ نبی آخر الزمان کی اطاعت سے صرف فاسق ہی منہ موڑ سکتا ہے اور اللہ کے اس دین سے وہی شخص منہ موڑ سکتا ہے جو شاذ اور مردود ہو، وہ اس کائنات کے پورے طبعی نظام میں شاذ ہو گا اور مردود ہو گا اور اس پوری تابع فرمان کائنات میں بھی فساد کنندہ اور شر انگیز ہو گا۔

اللہ کا دین ایک ہے، سب رسول ایک دین لے کر آئے، سب نے اس پر پختہ معاہدہ کیا۔ اللہ کا عہد بھی ایک ہے، جس کے فریق تمام رسول ہیں۔ لہذا اس دین پر ایمان لانا، اس رسول پر ایمان لانا اور اتباع کرنا، اس رسول کی نصرت کرنا اور اسلامی نظام قائم کرنا اور تمام دوسرے نظاموں کا مقابلہ کرنا دراصل اس عہد کی وفاداری ہے۔ اس لئے جس شخص نے بھی دین اسلام سے روگردانی کی گویا اس نے اللہ کے تمام ادیان سے منہ موڑا۔ اور اس نے اللہ کے عام عہدوں کو توڑا..... اس لئے کہ وہ اسلام جس سے اس کرۂ ارض پے اسلامی نظام کا قیام مطلوب ہو، اس کا اتباع اور اس کے ساتھ خلوص کا مظاہرہ، دراصل اس پوری کائنات کا اسلام اور ناموس قدرت ہے۔ یہ اسلام اس کائنات کے ہر زندہ چرند پرند کا اسلام ہے۔

یہ ہے کہ اسلام اور سر تسلیم خم کرنے کی ایک گہری شکل، ایک ایسی شکل و صورت جو تکوینی ہے جو انسان کے شعور پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جس سے انسانی ضمیر میں اللہ خونی پیدا ہوتی ہے۔ ایک عظیم قانون قدرت کی صورت جو قہار و جبار ہے۔ جو تمام کائنات کی مردہ اور زندہ چیزوں کو ایک ہی سنت الہیہ اور شریعت الہیہ کے تابع فرمان بناتی ہے۔ اور جس کے مطابق دونوں کا مال اور انجام ایک ہے۔ یہ ہے اسلام وَاللّٰہِ یُرْجَعُوْنَ..... ”اور سب نے اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔“..... لہذا یہ سب چیزیں آخر کار لازماً اسی اللہ کی پلٹ کر جائیں گی جو سب کو گھیرے ہوئے ہیں، سب کا مدبر ہے اور نہایت ہی جلال و عظمت کا مالک ہے اور اس انجام سے کوئی راہ فرار نہیں ہے۔

اگر انسان اپنی کامیابی اور سعادت چاہتا ہے، اگر وہ راحت اور اطمینان چاہتا ہے، اگر وہ اطمینان قلب اور صلاح حال چاہتا ہے تو اس کے لئے ماسوائے اس کے کوئی اور راہ نہیں ہے کہ اسلامی نظام زندگی کی طرف رجوع کرے۔ اپنی ذات میں بھی، اپنے نظام زندگی میں بھی اور اپنے اجتماعی نظام میں بھی تاکہ اس کی زندگی اس پوری کائنات کے نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے۔ اور اس فطرت کائنات کے برخلاف اپنے لئے کوئی علیحدہ نظام زندگی وضع کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ اس لئے کہ اس کا یہ خود ساختہ نظام، نظام کائنات کے ساتھ متضاد ہو گا جو اللہ تعالیٰ کی تخلیق کردہ ہے۔ اور یہ انسان طوعاً و کرہاً اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کا پابند ہے۔ وہ نظام جو اس کے تصور اور شعور میں ہے، جو اس کی عملی زندگی اور اس کے باہمی تعلقات میں ہے، جو اس کی تمام جدوجہد اور سرگرمیوں میں ہے۔ جب اس کائناتی نظام کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے گا، تو یہ ہم آہنگی اس کے اور اس پوری کائنات کی عظیم قوتوں کے درمیان ایک تعاون پیدا کر دے گی۔ اور ان کے ساتھ ہم آہنگ ہو جائے گا، تو یہ ہم آہنگی اس کے اور اس پوری کائنات کی عظیم قوتوں کے درمیان ایک تعاون پیدا کر دے گی۔ اور ان کے درمیان کوئی تصادم نہ ہو گا۔ اس لئے کہ جب انسان کائناتی قوتوں کے ساتھ تصادم کی راہ لیتا ہے تو وہ پاش پاش ہو جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ اور اگر اس کا وجود نہیں مٹتا تو وہ کم از کم فریضہ خلافت کی ادائیگی کے قابل نہیں رہتا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تیار کیا ہے۔ اور اگر وہ قوانین قدرت اور کائناتی اصولوں کے ساتھ ہم آہنگ ہو جاتا، جو خود اسے اور اس کے گرد پھیلی ہوئی پوری کائنات کو کنٹرول کرتے ہیں۔ خواہ زندہ ہوں یا غیر زندہ تو اس صورت میں وہ تمام اسرار کائنات کا رازدان ہو گا، وہ اس کی قوتوں کو مسخر کر دے گا ان سے مفاد حاصل کرے گا اور اسی طرح وہ راحت، آرام اور سکون حاصل کرے گا۔ اور بے چینی، قلق اور خوف سے نجات ملے گی۔ مثلاً کائنات کا مفادیوں ہو گا کہ ایک کائناتی قوت کو جلانے اور تخریب کے لئے استعمال کرنے کے بجائے وہ کھانے پکانے، گرمی حاصل کرنے کے لئے استعمال کرے گا۔ اور اس سے روشنی حاصل کرے گا۔

انسانی مزاج اپنی اصلیت کے اعتبار سے ان کائناتی قوتوں اور نوامیس کے ساتھ ہم آہنگ ہے۔ انسان کا وجود ان اسی طرح اپنے رب کی اطاعت چاہتا ہے جس طرح اس کائنات کی پوری زندہ اور غیر

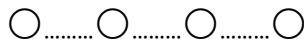
زندہ اشیاء اس کے سامنے سر بسجود ہیں۔ جب ایک انسان قوانین فطرت کے خلاف راہ اختیار کرتا ہے۔ تو وہ صرف نظام فطرت کے خلاف ہی نہیں جاتا بلکہ وہ خود ان قوانین طبعیت کے بھی خلاف جاتا ہے جو اس کے نفس کے اندر موجود جاری و ساری ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ہر وقت پریشان، شکستہ حیران اور بے چین نظر آتا ہے۔ اور اس کی زندگی اسی طرح برباد ہو جاتی ہے جس طرح آج کا ایک گمراہ، بے راہ و انسان کی زندگی ہوتی ہے۔ اور جسے ہم ہر طرف دیکھ رہے ہیں۔ حالانکہ آج کے انسان نے علمی میدان میں بڑی بڑی فتوحات حاصل کی ہیں اور وہ مادی ترقی کے بام عروج پر ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس وقت انسانیت ایک انتہائی تلخ روحانی خلا میں مبتلا ہے۔ اور یہ ایک ایسا خلا ہے جسے فطرت انسان بھول نہیں سکتی۔ یعنی انسانیت ذوق یقین سے محروم ہے۔ اس کی زندگی اسلامی نظام سے محروم ہے، اس لئے کہ یہی نظام زندگی، ان مادی ترقیات اور قوانین فطرت کے درمیان توازن پیدا کر سکتا ہے جس میں انسان کی تنگ و دو اور قوانین فطرت کی رفتار ایک سمت میں ہو جاتی ہے۔

انسانیت اس وقت جھلس دینے والی تپتی دھوپ میں سرگردان ہے اور وہ اسلامی نظام زندگی کی گھنی چھاؤں سے محروم ہے جس میں کو خوشگوار زندگی بسر کر سکے۔ اور شر و فساد سے اسے نجات ملے جس میں وہ محض اس لئے گرفتار ہے کہ وہ اسلام کے شاہراہ مستقیم اور جادہ مانوس سے ہٹ گئی ہے۔ اس دشوار گزار راستے اور حیرانی و پریشانی، قلق و بے چینی اور اضطراب و گمراہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ وہ ہر وقت بھوک، افلاس اور روحانی خلا اور محرومیت کے احساس کا شکار ہے۔ اور اسی صورت حال سے اس نے فرار کا یہی ایک راستہ پایا ہے۔ کہ حشیش، چرس اور ہیروئن جیسی منکرات اور تباہ کن ذرائع اختیار کئے ہوئے ہے۔ یہ جنونی سرعت، احمقانہ حرکات، اخلاقی بے راہ روی سے اس خلا کو بھرنا چاہتی ہے۔ لیکن ناکام ہے۔ اور یہ صورت حال باوجود اس بے پناہ مادی ترقی، بے حد و حساب پیداوار اور ساری زندگی کی بے پناہ سہولیات کے باوجود جوں کی توں ہے۔ بلکہ اس قلق اور اس حیرانی اور ان پریشانیوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اور اسی نسبت سے ہو رہا ہے جس نسبت سے مادی ترقی میں اضافہ ہوتا ہے اور دنیاوی سہولیات اور آسائشوں میں اضافہ ہوتا ہے۔

یہ خوفناک اور تلخ خلا، انسانیت کو ایک خوفناک بھوت کی طرف بھاگ رہا ہے۔ لیکن بھاگتے بھاگتے وہ جس مقام تک بھی پہنچتی ہے، ہر جگہ یہ بھوت اس کے پیچھے کھڑا نظر آتا ہے، آج جو شخص بھی مغرب کے مالدار اور ترقی یافتہ دور میں جاتا ہے اس کے احساسات میں پہلا تاثر یہ بیٹھتا ہے کہ یہ سب لوگ بھاگ رہے ہیں۔ کوئی بھوت ہے جو انہیں بھاگ رہا ہے اور اس سے بھاگ رہے ہیں، بلکہ وہ خود اپنی ذات اور اپنے سائے سے بھاگ رہے ہیں۔ اس شخص پر بہت جلد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ ان مادی ترقیات نے اور حسی لذتیت نے ان لوگوں کو گندے کیچڑ میں لت پت کر دیا ہے۔ وہ بے شمار نفسیاتی بیماریوں کا شکار ہو گئے ہیں۔ ان کے اعصاب شل ہو گئے۔ وہ بے راہ روی کے ہيجان میں مبتلا ہیں اور اپنی اس روحانی کمی کو منکرات، منشیات اور دوسری مہلک اشیاء کے استعمال سے پورا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ جنوں کی حد تک جرائم پیشہ ہو گئے ہیں اور ان کی زندگی ہر قسم کے شریفانہ تصور سے خالی ہے۔

ان لوگوں نے اپنی شخصیت ہی کو گم کر دیا ہے، اس لئے کہ انہوں نے اپنے وجود کا اصل مقصد ہی بھلا دیا ہے۔ وہ روحانی سعادت سے محروم ہو گئے ہیں۔ اس لئے کہ انہوں نے اسلامی زندگی کو کم کر دیا ہے۔ جو انسان کی روحانی اور جسمانی زندگی کے درمیان ہم آہنگی پیدا کر کے اسے ان روحانی امراض سے نجات دیتا ہے جس میں مبتلا ہیں۔ اور وہ اس خلجان میں مبتلا اس لئے ہیں کہ وہ معرفت خداوندی سے محروم ہیں جس کی طرف انہوں نے لوٹنا ہے۔



صرف تاریخی اور جغرافیائی اعتبار سے ہی نہیں، بلکہ حقیقی نفس الامری کے اعتبار سے امت مسلمہ ہی وہ امت ہے جس نے اس عہد کو اچھی طرح اپنا لیا ہے، جو اللہ اور اس کے نبیوں کے درمیان طے پایا تھا، صرف اس امت نے اس حقیقت کا ادراک کیا ہے کہ اللہ کا دین ایک ہے اور اس کا نازل کردہ نظام زندگی بھی ایک ہے۔ اور وہ قافلہ انبیائے کرام بھی ایک ہے جنہوں نے تاریخ میں ہمیشہ اسی واحد دین کو پیش کیا۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نبی آخر الزماں کو یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ اس حقیقت کبریٰ کا اعلان کرے

یعنی یہ کہ یہ امت تمام نبیوں پر ایمان لاتی ہے، وہ تمام رسل کا احترام کرتی ہے۔ وہ دین اسلام کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ دین جس کے سوا کوئی دوسرا دین اللہ کے ہاں قبول نہ ہو گا۔

قُلْ آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ عَلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَا أُوتِيَ مُوسَىٰ وَعِيسَىٰ وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ (۸۴) وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ (۸۵)

”اے نبی کہو کہ ”ہم اللہ کو مانتے ہیں، اس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی، ان تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام، اسحاق علیہ السلام، یعقوب علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں۔ اور ان ہدایات پر بھی یقین رکھتے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئی۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابع فرمان ہیں۔“ اس اسلام کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے، اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔“

یہ ہے اسلامی تصور حیات، جو بہت وسیع ہے اور اس میں تمام سابقہ رسالتیں شامل ہیں اور اسلامی نظام کے جھنڈے تلے وہ تمام رسول جمع ہیں جنہوں نے کبھی بھی رسالت خداوندی کا فریضہ سرانجام دیا۔ اسلامی نظام کی اساس عقیدہ توحید پر ہے اور اس کے تصور کے مطابق تمام انبیاء کا منبع ہدایت ایک ہے یعنی ذات باری اور ذات باری، اور تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ پہلی آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اللہ کی ذات پر ایمان لانے کا حکم ہے۔ پھر اس کتاب پر ایمان لانے کا حکم ہے جو مسلمانوں پر نازل ہوئی اور پھر ان کتابوں پر ایمان لانے کا ذکر ہے جو مسلمانوں سے قبل دوسرے انبیاء پر نازل ہوئیں۔ اور اس کے بعد یہ فقرہ

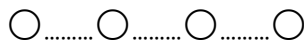
وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ..... ”اور ہم اس کے مسلم ہیں۔“ ان الفاظ سے اسلام کا ان الفاظ میں اقرار کرنا اپنے اندر ایک خاص مفہوم رکھتا ہے۔ پہلے یہ کہا گیا کہ اسلام کا مفہوم سر تسلیم خم کرنا، اطاعت کرنا ہے اور خشوع و خضوع ہے۔ حکم کا اتباع ہے اور اسلامی نظام، اسلامی طریقہ کار اور اسلامی ناموس کی اطاعت ہے۔ اور یہ مفہومات پہلی آیت اَقْعِيْزِ دِيْنَ اللّٰهِ يَبْعُوْا، وَلَهُ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَإِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ۔ ”اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) چھوڑ کر کوئی اور طریقہ چاہتے ہیں؟ حالانکہ آسمان و زمین کی سازی چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کے تابع فرمان ہیں۔ (مسلم ہیں) اور اس کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔“ سے اخذ ہوتے ہیں، اس لئے کہ اس کائنات کی تکوینی اشیاء کے اسلام کا صرف یہی مفہوم ہو سکتا ہے۔ کہ وہ مطیع فرمان ہوتی ہیں، وہ نظام کائناتی کے تابع ہوتی ہیں اور ضابطہ تکوینی کے اندر جکڑی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر مناسب موقع پر اسلام کے اس خاص مفہوم کو واضح فرماتے ہیں کہ اسلام عملی نظام کا نام ہے تاکہ لوگوں کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے کہ اسلام صرف زبانی اقرار یا صرف تصدیق کا نام ہے جو دلوں میں بیٹھ جاتی ہے اور اس کے بعد اس ایمان و تصدیق کے عملی اثرات کا وجود میں آنا ضروری نہیں ہے مثلاً اسلامی نظام زندگی کی اطاعت اور انسانی زندگی میں اس نظام کے قیام کے عملی جدوجہد..... غرض آنے والی عمومی توضیح اور بیان سے پہلے یہ نہایت ہی اہم نکتہ ہے جس پر قدرے غور ضروری ہے اور جس میں بتاکید کہا گیا ہے۔ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ..... ”جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور طریقہ بطور دین اسلام اختیار کرے گا، اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام و نامراد رہے گا۔“

ان آیات کے بعد جو مسلسل لفظ اسلام کے مفہوم کی توضیح کرتی ہیں، اب اسلام کے مفہوم میں کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی۔ اور نہ ان آیات میں تحریف کی جاسکتی ہے نہ توڑ پھوڑ کیا جاسکتا ہے نہ اسلام کا اب کوئی اور مفہوم بیان کیا جاسکتا ہے۔ جس کا علم قرآن کو نہ ہو۔ اسلام بہر حال وہی اسلام ہے جس کی اطاعت یہ پوری کائنات کر رہی ہے اس نظام کی صورت میں جو اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے وضع کیا ہے۔

یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ اسلام صرف شہادتین کے اقرار تک محدود ہو جائے اور شہادتین کے تلفظ و اقرار کے بعد اس پر وہ مفہوم اور وہ حقیقت منبج نہ ہو جو اسلام کے مفہوم میں داخل ہے۔ یعنی ذات باری وحدہ لا شرک ہے اور ذات باری وحدہ قیوم ہے، نظام کائنات کو تھامے ہوئے ہے۔ ہم نے اس کی بندگی کرنی ہے اور اس سے ہدایت اخذ کرنی ہے۔ اور یہ کہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور ہم نے ان کی اطاعت کرنا ہے۔ اس نظام کو قبول کرنا ہے جسے وہ لے کر آئے ہیں۔ اس شریعت کو اپنی زندگی میں نافذ کرنا ہے۔ جسے وہ لے کر آئے ہیں اور اپنے تمام فیصلے اس کتاب کے مطابق کرنے ہیں جسے وہ لے کر آئے ہیں۔

اسی طرح اسلام اس حد تک بھی محدود نہیں ہے کہ ایک انسان دل میں تصدیق کر لے کہ اللہ ایک ہے وہ غیب پر بھی ایمان لائے، قیامت کو بھی مانے، الہ کی کتابوں اور رسول کو بھی برحق تسلیم کرے، بغیر اس کے کہ اس تصدیق کے بعد کوئی عملی مفہوم بھی زندگی میں ظاہر ہو۔ اور وہ حقیقت نفس الامری وجود میں آئے جیسا کہ اوپر ہم نے تفصیل بیان کی۔

پھر اسلام محض عبادات اور شعائر بندگی تک بھی محدود نہ ہو گا نہ مراقبے اور ذکر اذکار تک محدود ہو گا، یا محض اخلاقی اور روحانی اصلاح کے کسی نظام تک بھی محدود نہ ہو گا۔ بغیر اس کے یہ تمام امور ایک منظم نظام حیات کی عملی شکل میں ظاہر نہ ہوں، جس کی اساس خدائی تعلیمات پر ہو، جس میں دل بھی اللہ کی طرف متوجہ ہوں، مراسم عبودیت اور شعائر بھی اللہ اکیلے کے لئے ہوں، تصور اور ذکر و اذکار بھی اللہ کے لئے ہوں، اس میں خدا خونی کے ذریعہ اصلاح قلوب ہو اور لوگوں کو رشد و ہدایت دی جاتی ہو، اس لئے کہ جب تک ایک پاک و صاف اور چمکتا دکتا اجتماعی نظام قائم نہ ہو گا اس وقت تک ان تمام امور کے کوئی اچھے اثرات مرتب نہ ہوں گے۔



یہ ہے اسلام جیسا کہ اللہ کو مطلوب ہے، اسلام کا مفہوم وہ نہیں جسے لوگوں کی مختلف نسلوں میں سے ایک تہی دامن نسل اپنی خواہشات نفسانیہ کے دباؤ کے تحت چاہتی ہے۔ اور نہ اسلام کا مفہوم وہ ہے جو اسلام کے دشمن اسے پہنانا چاہتے ہیں۔ جو اسلام کے خلاف مورچہ زن ہیں اور مسلمانوں میں انہوں نے ان تحریفات کے لئے اپنے ایجنٹ چھوڑے ہوئے ہیں جو جگہ جگہ کام کر رہے ہیں۔

بس اب جبکہ لوگوں پر اسلام کا مفہوم واضح ہو گیا، پھر بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اسلام کو اس مفہوم میں قبول کرنا نہیں چاہتے جس طرح اللہ چاہتے ہیں، محض اس لئے کہ جانتے ہوئے وہ محض اپنی خواہشات نفسانیہ کے تحت ایسا کرتے ہیں تو یقیناً ایسے لوگ آخرت میں سخت گھائے میں ہوں گے۔ اللہ نہ انہیں راہ راست پر لائے گا اور نہ ہی عذاب سے نجات دے گا۔

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ الرُّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ (٨٦) أُولَئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَلَّا عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ (٨٧) خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ (٨٨)

”کیسے ہو سکتا ہے کہ اللہ ان لوگوں کو ہدایت بخشے، جنہوں نے نعمت ایمان پالینے کے بعد پھر کفر اختیار کیا حالانکہ وہ اس بات پر گواہی دے چکے ہیں کہ یہ رسول حق پر ہے اور ان کے پاس روشن نشانیاں آپکی ہیں۔ اللہ ظالموں کو تو ہدایت نہیں دیا کرتا۔ ان کے ظلم کا صحیح بدلہ یہی ہے کہ ان پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی پھٹکار ہے، اسی حالت میں وہ ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کی سزائیں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔“

یہ خوفناک دہمکی دیکھ کر ہر وہ دل جس میں ذرہ برابر بھی ایمان ہو وہ کانپ اٹھتا ہے اور جن کے دل میں دنیا و آخرت دونوں کے بارے میں ذمہ داری کا احساس ہو اور یہی مناسب سزا ہے اس شخص کی جسے نجات کا خوبصورت موقعہ ملے اور وہ اس سے فائدہ نہ اٹھائے بلکہ اس سے اعراض برتے۔

لیکن اس کفر و اعراض کے باوجود اسلام توبہ کے دروازے کھلے رکھتا ہے۔ اسلام کسی گمراہ کے لئے واپسی کے دروازے بند نہیں کرتا، لیکن اسے ہدایت کی طرف آنے پر مجبور بھی کرتا کہ وہ دروازہ ہدایت پر خود دستک دے۔ بلکہ اسلام اس کے قریب ہوتا ہے اور اس کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہونے دیتا۔ اور یہاں تک کہ وہ اس پر امن محفوظ مقام تک آجائے اور عمل صالح شروع کر دے تاکہ معلوم ہو کہ اس نے توبہ صحیح طرح کر لی ہے۔

إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۸۹)

”البتہ وہ لوگ بچ جائیں گے جو اس کے بعد توبہ کر کے اپنے طرز عمل کی اصلاح کر لیں گے۔ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔“

رہے وہ لوگ جو توبہ نہیں کرتے اور نہ باز آتے ہیں وہ لوگ جو اپنے کفریہ رویے پر اصرار کرتے ہیں اور کفر میں آگے ہی بڑھتے ہی اور جو لوگ کفر ہی کی پناہ میں رہتے یہاں تک کہ وقت دیا ہوا ختم ہو جائے اور اختیار اور رد و قبول کی میعاد چلی جائے اور وہ وقت آپہنچے جس میں جزا اور سزا کا عمل شروع ہو جائے تو اس قسم کے لوگوں کے لئے نہ رجوع کا کوئی مقام ہے اور نہ توبہ کرنے کا وقت ہے نہ انہیں نجات ملے گی۔ انہیں ان کا کوئی عمل فائدہ نہ دے گا اگرچہ انہوں نے دنیا میں اس قدر سونا خرچ کیا ہو جس سے دنیا بھر جاتی ہو۔ اگرچہ یہ عمل انہوں نے خیر و برکت سمجھ کر کیا ہو، جب تک یہ عمل اللہ کے حوالے سے نہ کیا گیا ہو۔ اس لئے ایسے اعمال اللہ کے ہاں نہ پہنچیں گے اور نہ وہ اعمال اللہ کے لئے ہوں گے۔ وقت ختم ہونے کے بعد اگر وہ پوری دنیا بھر کر کفارہ ادا کریں تب بھی وہ قبول نہ ہو گا۔ وہ عذاب قیامت سے نہ بچ سکیں گے۔ اس لئے کہ میعاد ختم اور دروازے بند ہو چکے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ارْتَدَّوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ
وَأُولَئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ (۹۰) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنُ
يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِمْ مِلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَى بِهِ أُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ
أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ مِنْ نَاصِرِينَ (۹۱)

”مگر جن لوگوں نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا، پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے ان کی توبہ بھی
قبول نہ ہوگی، ایسے لوگ تو پکے گمراہ ہیں، یقین رکھو، جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں
جان دیدی ان میں سے کوئی اگر اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لئے روئے زمین بھر کر سونا فدیہ میں
دے تو اسے قبول نہ کیا جائے گا۔ ایسے لوگوں کے لئے درناک سزا تیار ہے۔ اور وہ اپنا کوئی مددگار نہ
پائیں گے۔“

یوں سیاق کلام میں اس مسئلے کا فیصلہ کن تصفیہ کر دیا جاتا ہے اور اسے تاکید الی الفاظ میں کر دیا جاتا
ہے جس میں کوئی شک اور شبہ نہیں رہنے دیا جاتا۔

اللہ کے اصولوں کے خلاف انفاق، اور اللہ کے راستے میں نہ خرچ کئے جانے والے اموال کے غیر
موثر قرار دینے کے بعد اور یہ فیصلہ کرنے کے بعد کہ دارالعمل کے ختم ہونے کے بعد اگر روئے زمین کو
بھر کر بھی انفاق کرے وہ قبول نہ ہوگا، یہاں اللہ تعالیٰ بیان فرمادیتے ہیں کہ وہ کون سا انفاق ہے جو اللہ
کو پسند ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ (۹۲)

”تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ اپنی وہ چیزیں (اللہ کی راہ) میں خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز
رکھتے ہو۔“ اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہوگا۔

امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ ابواسحاق ابن عبداللہ ابن ابی طلحہ سے روایت کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں انہوں نے انس بن مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا انصار مدینہ میں ابو طلحہ بہت ہی مالدار تھے۔ اور ان کو ان کی دولت سے محبوب ترین ایک کنواں تھا جسے ”حاء“ کہتے تھے۔ یہ مسجد نبوی کے بالمقابل تھا۔ رسول ﷺ اس کنویں پر جایا کرتے تھے۔ اور اس کا پاک و صاف پانی پیا کرتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ..... ”تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم ان چیزوں کو خرچ نہ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو۔“ تو ابو طلحہ نے کہا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اس وقت تک نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم ان چیزوں کو خرچ نہ کرو جنہیں تم پسند کرتے ہو۔“ اور میرا محبوب مال تو ”حاء“ کنواں ہے۔ اور وہ میری طرف سے صدقہ ہے۔ میں اس کا ثواب اور عند اللہ اس کی جزاء چاہتا ہوں۔ اس پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: واہ! واہ! یہ تو بڑا نفع بخش اور قیمتی مال ہے۔ یہ تو نفع بخش مال ہے۔ میں نے سن لیا لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ اسے اقرباء کے درمیان تقسیم کر دیں تو ابو طلحہ نے کہا: تو اللہ کے رسول ﷺ آپ ایسا ہی کر دیں۔ تو رسول ﷺ نے اسے اس کے قریب اور چچا زادوں کے درمیان تقسیم کر دیا۔ (روایت مسلم و بخاری)

مسلم بخاری نے ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمر نے کہا: یا رسول اللہ ﷺ خیر میں مجھے جو حصہ ملا ہے، اس سے اچھی جائیداد مجھے کبھی نہیں ملی تو اس کے بارے میں آپ کیا مشورہ دیتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اصل جائیداد اپنے پاس رہنے دو پیداوار سبیل اللہ کر دو۔“

اسی راستے پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اکثر ایک دوسرے سے آگے بڑھے، یوں وہ اپنے رب سے بھلائی کی تلاش میں اس آیت پر لبیک کہتے رہے۔ اس دور میں جب اللہ تعالیٰ نے انہیں اسلام کی طرف ہدایت دی۔ اللہ کی آواز پر لبیک کہہ کر انہوں نے مال اور دولت کی غلامی سے اپنے آپ کو رہائی دلائی۔ دلی بخل اور کنجوسی سے نجات پائی اور ذاتی لالچ سے پاک ہوئے۔ اور یوں اس مقام بلند تک جا پہنچے جو نہایت بلند نہایت ہی روشن، چمکدار تھا، آزاد، ہلکے پھلے ہر قید و بند سے نکلے ہوئے۔

فی ظلال القرآن

پارہ ----- ۴

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پارہ چہارم ایک نظر میں

یہ پارہ سورۃ آل عمران کے آخری حصہ اور سورۃ نساء کے ابتدائی حصہ پر مشتمل ہے۔ یعنی آیت وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَاءِ..... تک سورۃ آل عمران کا آخری حصہ چار اجزاء پر مشتمل ہے جو سورت کے موضوع اور مضمون کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں جن کے بارے میں ہم سورۃ آل عمران پر تبصرہ کرتے وقت بحث کر آئے ہیں۔ یعنی پارہ سوئم میں۔ یہاں اس بحث کے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں تبصرہ دیکھا جاسکتا ہے۔

یہاں مختصر آئیہ جان لینا چاہئے کہ سورۃ آل عمران کے ان چار اجزاء میں پہلا ان مکالمات پر مشتمل ہے جو مدینہ طیبہ کے ابتدائی دور میں اہل کتاب اور اہل ایمان کے درمیان ہوئے۔ یہ مکالمات اس تاریخی پس منظر میں ہوئے جس کے بارے میں ہم آغاز صورت میں وقت کا تعین کر چکے ہیں۔ یہ مکالمات رمضان ۲ھ کے بعد ماہ شوال ۳ھ کے بعد تک کے دور میں ہوئے۔ اس سے پہلے سورۃ آل عمران تقریباً اس عظیم الشان معرکہ پر تبصرہ ہے۔ ان تبصروں کے ذریعہ اسلامی تصور حیات کی ماہیت، دین کی حقیقت، اسلام کی حقیقت اور اس نظام کی حقیقت بیان کی گئی ہے جو اسلام نے پیش کیا اور اسلام سے قبل تمام رسولوں نے اس نظام کو پیش کیا۔ ان تبصروں میں اہل کتاب کی حقیقت اور ان کے موقف کو بھی واضح کیا گیا جو رسول اکرم ﷺ کے ساتھ دینی امور میں مجادلہ کیا کرتے تھے اور آپ کے صحابہ کرام کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ یہ واضح کیا گیا کہ اہل کتاب دین اسلام سے کس قدر دور جا چکے ہیں اور یہ کہ مدینہ میں وہ جماعت مسلمہ کے خلاف جو سازشیں کر رہے تھے اس سورت میں اس کا بھی اکتشاف کیا گیا اور یہ بتایا گیا کہ ان کی ان سازشوں کے پس پردہ کیا خفیہ محرکات کام کر رہے ہیں۔ ان تمام امور پر روشنی ڈال کر اسلامی جماعت کو ان سب معاملات کے بارے

میں خبردار کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ وہ ایک عظیم خطرے سے دوچار ہے۔ اسے غفلت نہ کرنا چاہئے اور ان امور میں دشمن کی کوئی بات تسلیم نہیں کرنا چاہئے۔

آیات کا دوسرا ٹکڑا جو اس سورت کے ایک بڑے حصے پر مشتمل ہے، وہ ایک دوسرے معرکے پر محیط ہے۔ یہ معرکہ صرف مکرو فریب اور زبانی جدل و مباحثہ پر ہی موقوف نہیں بلکہ یہ معرکہ تیر و سنان ہے اور ضرب و حرب پر مشتمل ہے۔ یعنی غزوہ احد، اس کے واقعات، اس میں پیش آنے والے واقعات کے اسباب و نتائج، غزوہ احد پر یہ تبصرہ اس مخصوص اسلوب میں ہے جو قرآن مجید کا شاہکار اور اس کا اعجاز ہے، یہ آیات اس معرکہ کے اختتام پر نازل ہوئیں، اس لئے ان میں بھی اسلامی تصور حیات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس معرکہ کے حوادث کے حوالے سے اسلامی جماعت کی تربیت کا سامان فراہم کیا گیا ہے۔ اسلامی تصور حیات کے نقطہ نظر سے اس معرکہ میں جو غلطیاں ہوئیں یعنی اسلامی صفوں میں جو انتشار پیدا ہوا اور بعض وہ اقدامات جو اضطراب اور پریشانی کا باعث ہوئے۔ ان واقعات کی وجہ سے ان حالات میں قرآن کریم نے جماعت مسلمہ کو ہدایت دی کہ وہ اپنی راہ پر گامزن رہے، اور اس راہ میں جو مشکلات پیش آئیں انہیں انگیز کرے اور وہ مقام اور مرتبہ حاصل کرے جو اس امانت عظمیٰ کے شایان شان ہے، جو اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کے سپرد کی ہے اور اللہ نے اس امت کو یہ نظام دے کر جس اعزاز پر فائز کیا ہے اور جس عظیم فریضہ کے سرانجام دینے کے لئے منتخب کیا ہے، اس پر وہ اللہ کا شکر بجالائے۔

تیسرے حصے میں روئے سخن پھر اہل کتاب کی طرف پھر جاتا ہے۔ اور اہل کتاب کو متوجہ کیا جاتا ہے کہ وہ معاہدات کو ایک ایک کر کے توڑ رہے ہیں، جو رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ مدینہ طیبہ میں تشریف لاتے ہی طے کئے تھے۔ ان کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ انہوں نے صحیح اسلامی تصور حیات سے انحراف کر لیا ہے اور یہ کہ انہوں نے اپنی پوری تاریخ میں مختلف اوقات میں اپنے انبیاء کے مقابلے میں مسلسل جرائم کا ارتکاب کیا ہے۔ اس کے بعد امت مسلمہ کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل

میں اہل کتاب کی پیروی نہ کریں اور راہ حق میں انہیں جو جانی اور مالی نقصانات پیش آرہے ہیں، ان پر صبر کریں اور ہر حال میں اپنے دشمنوں سے ہرگز متاثر نہ ہوں۔

حصہ چہارم میں بتایا گیا ہے کہ صحیح اہل ایمان کے نزدیک اپنے رب کے ساتھ تعلق کی کیا نوعیت ہوتی ہے، جب وہ اس کائنات میں باری تعالیٰ کی آیات و نشانات پر غور کرتے ہیں تو ان کے دلوں میں ایمان باللہ راسخ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے رب اور رب کائنات کی طرف بڑے خشوع اور خضوع کے ساتھ متوجہ ہوتے ہیں۔ اور ان کا رب ان کی ایسی دعاؤں کو قبول کرتا ہے اور ان کے گناہوں کو معاف کر کے انہیں اجر عظیم عطا کرتا ہے۔ اس کے مقابلے میں اہل کفر کے حالات یہ ہیں کہ انہیں صرف اس دنیا کا متاع قلیل دیا گیا۔ یعنی اس کرۂ ارض پر اور یہ کہ آخرت میں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے جو ان کے لئے تیار ہے اور نہایت ہی برا ٹھکانہ ہے۔ اس سورت کا خاتمہ اس پکار پر ہوتا ہے، جس میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو صبر کرنے، مشکلات برداشت کرنے، باہم متحد ہو کر دشمنوں کے مقابلے میں چوکنا ہونے، اور ہر وقت اللہ کا خوف دل میں رکھنے کی دعوت دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اس دنیا اور آخرت میں کامیاب ہوں۔



یہ چار اسباق جو باہم مربوط ہیں اور ایک ہی سلسلہ کلام میں پارہ سوئم میں بیان کئے ہوئے ہیں مضامین کا تکملہ ہیں اور انہی خطوط پر آگے بڑھ رہے ہیں جن کے بارے میں ہم پارہ سوئم کے آغاز ہی میں تفصیلاً بحث کر آئے ہیں اور مزید تفصیلات اس وقت بیان ہوں گی جب ہم ان پر تفصیلاً بحث کریں گے اور آیات کی تفسیر بیان کریں گے۔

اس پارے کا دوسرا حصہ سورۃ نساء کے ابتدائی حصہ پر مشتمل ہے۔ اس پر بحث سورۃ نساء کے ابتدائیہ میں ہوگی، ان شاء اللہ اور اللہ ہی ہے جو توفیق اور ہمت دینے والا ہے۔

سبق ۲۶ ایک نظر میں

اس سبق میں اہل کتاب کے ساتھ جدل و مناظرے کا یہ معرکہ اپنی انتہاؤں کو پہنچ جاتا ہے۔ اگرچہ یہ آیات وفد اہل نجران کے مباحثے کے ضمن میں نہیں آتیں جیسا کہ روایات میں بھی ذکر آتا ہے، لیکن اپنے مضمون اور مفہوم کے اعتبار سے یہ ان آیات کے ساتھ ملتی جلتی ہیں اور انہی کا مکملہ ہیں جو وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئیں۔ موضوع وہی ہے، اگرچہ روئے سخن خاص یہودیوں کی طرف ہے۔ اور بتا دیا گیا کہ وہ مدینہ کے اہل ایمان کے خلاف کیا کیا خفیہ سازشیں، کس کس طرح کر رہے ہیں۔ یہ مجادلہ مکمل بائیکاٹ اور مکمل علیحدگی پر منتهی ہوتا ہے اور پھر روئے سخن اس سبق میں تھوڑی دیر ہی میں اہل اسلام کی طرف پھر جاتا ہے اور صرف انہیں مخاطب کیا جاتا ہے۔

بتایا جاتا ہے کہ امت مسلمہ کی حقیقت کیا ہے، اس کا نظام زندگی کیا ہے، اس کے فرائض کیا ہیں، یعنی اس طرح جس طرح سورہ بقرہ میں بنی اسرائیل کے ساتھ مکالمہ ختم کرنے کے بعد امت مسلمہ کو مخاطب کیا گیا تھا۔ اس لحاظ سے ان دونوں سورتوں میں مکمل مماثلت پائی جاتی ہے۔

اس سبق کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ نبی اسرائیل پہ کھانے پینے کی ہر چیز حلال تھی۔ ہاں حضرت یعقوب علیہ السلام نے بعض اشیاء سے پرہیز کرتے ہوئے انہیں اپنے لئے ممنوع قرار دیا تھا۔ یہ اس سے بہت پہلے کی بات ہے کہ جب توراۃ نازل ہوئی۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے ہاں محرمات طعام کی جو فہرست مروج تھی، اسلام نے ان اشیاء میں سے بعض کا استعمال چونکہ جائز قرار دے دیا تھا، اس لئے یہودیوں کو اس پر سخت اعتراض تھا۔ حالانکہ یہ اشیاء صرف یہودیوں کے لئے حرام قرار دی گئی تھیں اور یہ بھی اس لئے کہ وہ نافرمانیاں کا ارتکاب کرتے تھے اور ان پر یہ چیزیں حرام کر کے انہیں سزا دی گئی تھی۔

اس کے بعد تحویل قبلہ پر وہ جو اعتراضات کرتے تھے، اس کا بھی جواب دیا گیا ہے۔ اس سے پہلے سورۃ بقرہ میں ایک طویل بحث ہو چکی تھی۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ خانہ کعبہ بیت ابراہیم علیہ السلام ہے۔ اور یہ پہلا گھر ہے جو اس کرۃ ارض پر صرف اللہ کی عبادت اور بندگی کے لئے بنایا گیا۔ اس لئے جو لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وارث ہونے کے مدعی ہیں، ان کی جانب سے بیت ابراہیم علیہ السلام کو قبلہ قرار دینے کی مخالفت ناقابل فہم ہے۔

اس کے بعد اہل کتاب کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ وہ آیات الہی کا انکار کرتے ہیں، اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی راہ اختیار کرنے سے روکتے ہیں۔ وہ صحیح اور صراط مستقیم چھوڑ کر ٹیڑھے راستوں پر بھٹک رہے ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ یہ گمراہی اسلامی نظام زندگی پر بھی چھا جائے، حالانکہ وہ حق کو اچھی طرح پہچان چکے ہیں، اور وہ بے خبر نہیں ہیں۔

ایسے حالات میں قرآن کریم اچانک اہل کتاب کو چھوڑ کر امت مسلمہ کو مخاطب کرتا ہے اور انہیں زور دار الفاظ میں متنبہ کرتا ہے کہ وہ اہل کتاب کی اطاعت نہ کریں کیونکہ ان کی اطاعت عین کفر ہے۔ اور اہل ایمان کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ عین اسی وقت کفر اختیار کریں جب نبی ان کے سامنے اللہ کی کتاب پیش کر رہا ہو، اور رسول اللہ ان میں موجود ہوں اور انہیں اس کتاب کی تعلیم بنفس نفیس دے رہے ہوں، وہ ان کا تزکیہ کرتے ہوئے انہیں اللہ خونی کی تعلیم دے رہے ہوں، اور انہیں یہ تلقین کر رہے ہوں کہ وہ اسلام پر اپنی زندگی میں جے رہیں اور اسی حالت میں اسلام میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ رسول اللہ اور کتاب اللہ انہیں یاد دلارہی ہے کہ کسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو جوڑا، یہ اس کی بڑی نعمت تھی کہ اس نے، اسلام کے جھنڈے تلے، ان کی صفوں کو یکجا کیا۔ حالانکہ اس سے قبل ان کی حالت یہ تھی کہ وہ ٹکڑے ٹکڑے تھے، اور باہم برسر پیکار تھے۔ بلکہ وہ آگ کے گڑھے کے کنارے کھڑے تھے اور اس میں گرنے ہی والے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بچایا اور یہ نجات انہیں اسلامی نظام زندگی کے سبب ملی۔ پھر یہ کتاب تمہیں کتاب تمہیں حکم دیتی ہے کہ تم ایک ایسی امت کی شکل اختیار کرو جس کا مشن اس دنیا میں نیکی اور بھلائی کی طرف بلانا اور برائی سے منع کرنا

ہو، اور نصب العین کے محافظ رہیں کہ تم نے اسلامی نظام زندگی کو بروئے کار لانا ہے۔ پھر تمہیں ڈرایا جا رہا ہے کہ تم اہل کتاب کی وسوسہ اندازیوں اور دسیسہ کاریوں پر کان ہی نہ دھرو کیونکہ یہ لوگ تمہاری صفوں کے اندر ہیں، وہ تمہارے اندر اختلافات ڈال کر تمہیں بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہتے ہیں۔ جس طرح وہ خود ان ہی کے اختلافات کی وجہ سے دنیا اور آخرت میں تباہی سے دوچار ہوئے۔ روایات میں قرآن کریم کے اس انتباہ کا پس منظر بیان کیا گیا ہے کہ اوس اور خزرج کے درمیان یہودیوں نے اختلاف پیدا کر کے ایک عظیم فتنے کے بیج بودیئے تھے۔

اس کے بعد قرآن کریم امت مسلمہ کو یاد دلاتا ہے کہ اس کرۂ ارض پر اس کا مقام و منصب کیا ہے؟ حضرت انسان کی زندگی کے ڈرامے میں امت مسلمہ نے کیا کردار ادا کرنا ہے۔

كُنْتُمْ حَيُّوْاُ اُمَّةً اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاٰمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَتُوْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

”تم تو وہ خیر امت ہو جسے تمام لوگوں کی خاطر برپا کیا گیا ہے، تمہارا فرض یہ ہے کہ تم بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور اللہ پر ایمان لاؤ۔“ یوں اللہ تعالیٰ تمہاری رہنمائی کرتا ہے کہ تمہارا مشن کیا ہے؟ اور تمہاری سوسائٹی کا رنگ ڈھنگ کیا ہونا چاہئے۔

اس کے بعد مسلمانوں کے دشمن کی ذرا خبر لی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ وہ اہل اسلام کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، نہ ہی وہ مسلمانوں پر غلبہ پاسکتے ہیں، ایسا غلبہ جو مکمل بھی ہو اور دائمی بھی ہو، ہاں وہ یہ کر سکتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کی جدوجہد کے دوران انہیں اذیت دے سکتے ہیں، البتہ مسلمان اگر اسلامی نظام زندگی اور اپنے منہاج پر قائم رہے تو اللہ کی نصرت انہیں حاصل رہے گی۔ ان دشمنان خدا پر اللہ تعالیٰ نے ذلت مسلط کر دی ہے۔ وہ ہمیشہ حالت مسکینی میں رہیں گے۔ اللہ کا غضب ان کو گھیرے رہے گا۔ اور یہ سب کچھ محض اس لئے ہو گا کہ انہوں نے اپنی پوری تاریخ میں ہمیشہ معاصی کا ارتکاب کیا۔ ناحق اپنے نبیوں تک کو قتل کیا۔ اہل کتاب میں سے بہر حال ایسے لوگ بھی ہیں جنہوں نے ہمیشہ حق کا

ساتھ دیا۔ ایمان لے آئے اور انہوں نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں اہل اسلام کا منہاج اپنایا۔ اور نیکی اور بھلائی کے پھیلانے کا مشن ان کا نصب العین بن گیا۔ ایسے لوگ بہر حال صالحین میں سے ہیں۔ ہاں جن لوگوں نے کفر کا راستہ اپنایا، اسلام کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا، تو وہ لوگ اپنے کفر کی وجہ سے ماخوذ ہوں گے، ان کی دولت انہیں کوئی نفع نہ دے گی، ان کی اولاد انہیں کوئی فائدہ نہ دے سکے گی۔ اور انجام کار انہیں ایک عظیم تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔

اس سبق کا خاتمہ اہل ایمان کو اس بات کا خوف دلانے پر ہوتا ہے کہ وہ ایمانداروں کے مقابلے میں دوسرے لوگوں کے ساتھ کوئی خفیہ دوستی قائم نہ کریں۔ اس لئے کہ یہ دوسرے لوگ اپنے دلوں کے اندر مسلمانوں کے خلاف بغض وعداوت چھپائے ہوئے ہیں۔ ان کی باتوں سے اہل اسلام کے خلاف بغض وعداوت ٹپکتی ہے۔ اور ان کے دلوں کے اندر اہل اسلام کے خلاف جو لاواپک رہا ہے وہ نہایت ہی خوفناک ہے۔ انتہائی غصے اور نفرت کی وجہ سے وہ اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں اور اہل اسلام پر اگر کوئی آفت و مصیبت آتی ہے تو یہ نہایت ہی خوش ہوتے ہیں اور اگر اہل اسلام کے لئے کوئی کامیابی ظہور پذیر ہوتی ہے تو وہ بہت کبیدہ خاطر ہو جاتے ہیں۔ ان توضیحات کے آخر میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کے ساتھ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ وہ ان کا نگہبان اور محافظ ہے۔ اگر وہ صبر سے کام لیں اور اللہ خونی کارویہ اختیار کریں تو اللہ ان کے دشمنوں کے تمام ہتھکنڈوں کو ناکام کر دے گا۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ﴾..... ”جو کچھ وہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ اس پر حاوی ہے۔“

یہ طویل توضیحات اور متنوع اشارے، اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ اس دور میں جماعت مسلمہ اور اہل ایمان کی صفوں میں اہل کتاب کس طرح گھسے ہوئے تھے اور کیا کیا سازشیں کر رہے تھے۔ اور بے چینیاں پھیلا رہے تھے۔ اور یہ کہ اس سبق نے اس وقت بحرانی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ نیز یہاں اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ اس وقت تحریک اسلامی کو کس قدر مضبوط راہنمائی کی ضرورت تھی، تاکہ وہ اپنے اور جاہلیت کے کامریڈوں کے درمیان پائے جانے والے تعلقات و روابط کی نوعیت کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اسلامی نظریہ حیات اور جاہلیت کے درمیان ایک قطعی امتیاز پیدا کر دیا جائے۔ اور

پہلی تحریک اسلامی کے بعد آئندہ نسلوں کے لئے بھی یہ ہدایت اور توضیح کام آئے۔ اور آنے والی نسلوں کو متنبہ کر دیا جائے کہ ان کے موروثی دشمن کون ہیں؟ یہ ایسے دشمن ہیں کہ وہ نئے نئے روپ اور نئے نئے وسائل لے کر میدان میں آتے ہیں لیکن ہیں وہ ایک ہی۔



درس ۲۶ تشریح آیات (۱۲۰ تا ۹۲)

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ (۹۲) كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حَلَالًا لِّبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَى نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَةُ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَةِ فَاتْلَوْهَا إِنَّ كُنْتُمْ صَادِقِينَ (۹۳) فَمَنْ افْتَرَى عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۹۴) قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۹۵) إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ (۹۶)

”تم نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ تم وہ چیزیں (اللہ کی راہ میں) خرچ نہ کرو جنہیں تم عزیز رکھتے ہو اور جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے بے خبر نہ ہو گا۔ کھانے کی یہ ساری چیزیں (جو شریعت محمدی میں حلال ہیں) وہ بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھیں۔ البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنہیں توراۃ کے نازل کئے جانے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ ان سے کہو، اگر تم سچے ہو تو لاؤ توراۃ اور پیش کرو اس کی کوئی عبارت..... اس کے بعد بھی جو لوگ اپنی جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے رہیں وہی درحقیقت ظالم ہیں۔“

یہودیوں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ ہر قسم، شبہ اور ہر دلیل ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے تھے، اور ہر طرح کا حیلہ اور مکر و فریب کام میں لاتے تھے تاکہ وہ رسالت محمدیہ کی صحت میں کوئی شبہ پیدا کر دیں۔ تحریک اسلامی میں فکری بحران پیدا کر دیں اور لوگوں کے دلوں میں اضطراب پیدا کر دیں۔ چنانچہ یہ لوگ ہر وقت شکوک و شبہات پھیلاتے پھرتے تھے۔ جب قرآن کریم نے یہ دعویٰ کیا کہ وہ توراۃ کی تصدیق

کرتا ہے تو انہیں یہ اعتراض کرنے کا موقع ملا اگر قرآن کریم توراۃ کا مصداق ہے تو پھر اس کا جواز کیا ہے کہ وہ بعض چیزوں کو حلال قرار دیتا ہے جو بنی اسرائیل کے لئے حرام تھیں۔ روایات میں آتا ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں اونٹوں کا گوشت اور دودھ کی مثال پیش کی۔ کیونکہ چیزیں بنی اسرائیل پر حرام تھیں۔ اگرچہ اونٹ اور اس کے دودھ کے علاوہ بھی بعض ایسی چیزیں تھیں جو بنی اسرائیل کے لئے حرام تھیں مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے حلال کر دیا تھا۔

یہاں قرآن کریم ان کی توجہ اس تاریخی حقیقت کی طرف مبذول کرتا ہے جسے وہ جان بوجھ کر نظر انداز کر رہے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ وہ قرآن کریم کے اس دعویٰ میں تشکیک پیدا کریں کہ وہ توراۃ کا مصداق ہے۔ دلیل یہ دیتے کہ بعض ایسی چیزوں کو حلال قرار دیا جو بنی اسرائیل پر حرام تھیں، حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ کھانے کی وہ ساری چیزیں جو شریعت محمدیہ میں حلال ہیں، وہ بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھیں، البتہ بعض چیزیں ایسی تھیں جنہیں توراۃ کے نازل کئے جانے سے پہلے بنی اسرائیل نے خود اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ یہ اسرائیل حضرت یعقوب ہیں۔ روایات میں آتا ہے کہ وہ ایک شدید مرض میں مبتلا ہوئے تھے، اور انہوں نے یہ منت مانی تھی کہ اگر وہ تندرست ہو گئے تو وہ بطور نفل اونٹ کا گوشت کھانا ترک کر دیں گے۔ اونٹ کا دودھ نہ پیئیں گے اور یہ دونوں چیزیں انہیں بہت پسند تھیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کی منت اور نذر کو قبول فرمایا اور بنی اسرائیل میں یہ سنت یعقوبی چل پڑی اور انہوں نے بھی ان چیزوں کو حرام کر لیا جو ان کے باپ نے حرام کی تھیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر بعض دوسری چیزیں بطور سزا بھی حرام کر دی تھیں، اس لئے کہ انہوں نے بعض جرائم کا ارتکاب کیا تھا۔ ان محرمات کی طرف سورت انعام کی آیات (۱۴۶) میں اشارہ کیا گیا ہے۔

وَعَلَى الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِي ظُفْرٍ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْعَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُومَهُمَا إِلَّا مَا حَمَلَتْ ظُهُورُهُمَا أَوِ الْحَوَايَا أَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ذَلِكَ جَزَيْنَاهُمْ بِبَعْثِهِمْ وَإِنَّا لَصَادِقُونَ

”اور جن لوگوں نے یہودیت اختیار کی ان پر ہم نے سب ناخن والے جانور حرام کر دیئے تھے، اور گائے اور بکری کی چربی بھی، بجز اس کے جو ان کی پیٹھ یا ان کی آنتوں سے لگی ہوئی ہو یا ہڈی سے

لگی رہ جائے۔ یہ ہم نے اس کی سرکشی کی سزا نہیں دی تھی اور یہ جو کچھ ہم کہہ رہے ہیں بالکل سچ کہہ رہے ہیں۔ ”جبکہ اس تحریم سے قبل یہ چیزیں ان کے لئے حلال تھیں۔

ان کی تردید کر کے اللہ تعالیٰ انہیں اس حقیقت کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ کھانے پینے کی چیزوں میں اصل الاصول یہ ہے کہ وہ جائز ہیں، اور بنی اسرائیل پر بعض چیزیں ان کے مخصوص حالات کے پیش نظر حرام کی گئی ہیں، اس لئے اگر ان میں سے بعض چیزوں کے استعمال کو مسلمانوں کے لئے حلال قرار دے دیا گیا تو یہ کوئی قابل اعتراض بات نہیں ہے، اس لئے کہ اپنی اصلیت کے اعتبار سے وہ حلال تھیں۔ اس لئے اس حلت سے قرآن کریم اور شریعت الہیہ کی صحت میں شک نہیں کیا جاسکتا۔

اس موقع پر قرآن کریم انہیں چیلنج دیتا ہے کہ لائیں وہ توراۃ اور اسے پڑھیں اور منجشم خود دیکھ لیں کہ ان چیزوں کی حرمت کے اسباب صرف ان کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یہ اسباب عام نوعیت کے نہیں ہیں۔ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَةِ فَاتْلُوهَا إِنَّ كُنْتُمْ صَادِقِينَ..... ”کہہ دو کہ اگر تم سچے ہو تو توراۃ لے آؤ، پڑھ کر بتاؤ۔“

اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں متنبہ کرتے ہیں کہ ان میں سے جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں وہ ظالم ہیں۔ وہ نہ سچائی کے ساتھ انصاف کرتے ہیں، نہ خود اپنے آپ کے ساتھ انصاف کرتے ہیں اور نہ انسانیت کے ساتھ انصاف کرتے ہیں۔ اور ظالموں کی سزا بھی کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ اس لئے یہاں قرآن کریم اس پر اکتفاء کرتا ہے کہ انہیں ظالم کہہ دے کیونکہ ظلم کے ساتھ ہی ان کے ظالم کا انجام متعین ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ افتراء اللہ تعالیٰ پر باندھ رہے ہیں حالانکہ وہ خود اللہ کے دربار میں حاضر ہونے والے ہیں۔ وہاں وہ کیا جواب دیں گے؟



اہل کتاب کے اعتراضات میں سے ایک اعتراض تحویل قبلہ پر بھی تھا، یہ اعتراض بھی وہ بار بار دہراتے تھے۔ یہ اعتراض اس لئے پیدا ہوا تھا کہ رسول ﷺ نے ہجرت فرمائی تو مدینہ طیبہ میں آپ

سولہ سترہ یا اٹھارہ مہینوں تک نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے پڑھتے رہے تھے۔ باوجود اس کے کہ اس سے پہلے سورۃ بقرہ میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی تھی اور یہ بتایا گیا تھا کہ خانہ کعبہ دراصل حقیقی اور اصلی قبلہ تھا اور بیت المقدس کو عارضی طور پر، بعض مصلحتوں کے تحت قبلہ قرار دیا گیا تھا جس کی وضاحت اللہ تعالیٰ نے اپنی جگہ کر دی تھی، لیکن اس اظہار حقیقت کے باوجود یہودی بار بار اسی اعتراض کو دہراتے رہتے تھے۔ یہ کام وہ اس لئے کرتے تھے کہ اہل ایمان کے دلوں میں فکری انتشار اور تشکیک پیدا کی جائے اور ایک واضح حقیقت کے اندر التباس پیدا کیا جائے۔ یہ کام آج ہمارے دور میں بھی اسلامی نظریہ حیات کے ہر موضوع کے بارے میں دشمنان دین کی جانب سے بڑے منظم طریقے سے کیا جاتا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ از سر نو ان کے شبہات اور تلبیسات کی تردید فرماتے ہیں۔

قُلْ صَدَقَ اللَّهُ فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (۹۵) اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ (۹۶) فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حُجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللَّهَ عَنِيْ عَنِ الْعَالَمِينَ (۹۷)

”کہو اللہ نے جو کچھ فرمایا ہے سچ فرمایا ہے، تم کو یکسو ہو کر ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرنی چاہئے اور ابراہیم شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لئے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے۔ اس کو خیر و برکت دی گئی تھی اور تمام جہاں والوں کے لئے مرکز ہدایت بنایا گیا تھا۔ اس میں کھلی نشانیاں ہیں، ابراہیم کا مقام عبادت ہے اور اس کا حال یہ ہے کہ جو اس میں داخل ہو امانوں ہو گیا۔ لوگوں پر اللہ کا حق یہ ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔“

یہ الفاظ کہ ”اللہ نے جو کچھ کہا سچ کہا“ اس طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے جو وضاحت کر دی ہے وہ درست ہے یعنی یہ کہ خانہ کعبہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اس لئے تعمیر فرمایا تھا کہ یہ لوگوں کے لئے زیارت گاہ ہو اور جائے امن و سلامتی ہو، اور اہل ایمان کے قبلہ اور جائے عبادت ہو۔ اسی لئے یہاں حکم دیا جاتا ہے کہ تم حضرت ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ اور نظریہ حیات ہمہ جہت توحیدی نظریہ تھا جس میں شرک کا کوئی شائبہ نہ ہو فَاتَّبِعُوا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ..... ”پس ابراہیم کے طریقے کی پیروی کرو اور وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔“ یہودیوں کا زعم یہ تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وارث ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم انہیں بتاتا ہے کہ یہ ہے دین ابراہیمی کی حقیقت۔ اور وہ دین یہ ہے کہ ہر قسم کے شرک سے نفرت کی جائے۔ اور یہاں اس حقیقت کا اظہار دو مرتبہ کیا گیا ہے۔ ایک مرتبہ یہ کہہ کر کہ وہ حنیف تھے۔ اور دوسری مرتبہ یہ کہہ کر کہ وہ مشرکین میں سے نہ تھے۔ اور یہود کا حال یہ ہے کہ وہ مشرک ہیں۔

اس کے بعد فیصلہ کیا جاتا ہے کہ رو قبلہ ہونا دین کے اصولوں میں سے ہے۔ اس لئے کہ اس کرۂ ارض پر یہ پہلا گھر ہے جو اللہ کی پرستش کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ اور اسے ابتدائے تعمیر سے صرف اس مقصد کے لئے مخصوص کیا گیا ہے کہ وہ طواف کرنے والوں، عبادت کرنے والوں اور رکوع و سجود کرنے والوں کے لئے مخصوص رہے۔ نیز یہ ایک متبرک مقام ہے، اور وہ اس مفہوم میں جائے ہدایت ہے کہ یہاں ملت ابراہیمی کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اور اس میں وہ واضح علامات ہیں کہ یہ ابراہیم کی جائے قیام ہے۔ ایک تفسیر یہ بھی ہے کہ اس سے مراد وہ تاریخی پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر فرماتے تھے۔ یہ خانہ کعبہ کے ساتھ متصل تھا۔ مگر خلیفہ راشد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے قدرے ہٹایا تاکہ طواف کرنے والوں کی وجہ سے ان لوگوں کو تکلیف نہ ہو جو اس کے پاس نفل ادا کرتے ہیں۔ اس لئے اہل اسلام کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اس کے پاس نماز پڑھیں وَاتَّخِذُوا مِنْ مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى..... ”اور حضرت ابراہیم کے مقام کو جائے نماز بناؤ۔“

اس گھر کے فضائل میں سے ایک بات یہاں بتائی جاتی ہے کہ اس گھر میں جو شخص داخل ہوا وہ پر امن رہے گا۔ اس لئے یہ گھر ہر اس شخص کے لئے امن کی جگہ ہے جو یہاں داخل ہو جائے۔ اور یہ حیثیت اس کرۂ ارض پر کسی دوسرے مقام کو حاصل نہیں ہے۔ اور اس کی یہ حیثیت اس وقت سے چلی آرہی ہے جب اسے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل نے تعمیر کیا۔ یہاں عربوں کے دور جاہلیت میں بھی اسے یہ حیثیت حاصل رہی ہے جبکہ وہ بالعموم دی ابراہیمی سے منحرف ہو گئے تھے اور وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح خالص موحد نہ رہے تھے۔ حضرت حسن بصری کے قول کے مطابق اس برے دور میں بھی یہ احترام و مقام اسے حاصل تھا۔ وہ فرماتے ہیں کہ ”ایک شخص اگر دوسرے کو قتل کر دیتا تو تو ایک اونی کپڑا اپنی گردن کے ارد گرد لپیٹ لیتا۔ اس حالت میں اسے اگر مقتول کا وارث بھی ملتا تو وہ اسے خانہ کعبہ میں کچھ نہ کہتا اور اس کے نکلنے کا انتظار کرتا۔“ غرض اس بیت اللہ کو اس وقت بھی یہ اعزاز حاصل تھا جب اس کے ارد گرد کے لوگ جاہلیت میں ڈوبے ہوئے تھے۔ اللہ تعالیٰ اہل عرب پر اپنے احسانات جتلاتے ہوئے فرماتے ہیں اَوَلَمْ يَكُنْ لَنَا حَرَمًا آمِنًا وَيَتَخَفَتُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ..... ”ہم نے ایک پر امن حرم بنادیا حالانکہ ان کے گرد و پیش لوگ اچک لے جاتے ہیں۔“ (۲۹:۶۷)

اور بھی خانہ کعبہ کے احترام کی ایک وجہ ہے کہ حدود کے اندر شکار کرنا حرام ہے اور وہاں پرندوں کو ان کے گھونسلوں سے نکالنا بھی ممنوع ہے۔ نیز وہاں کے درختوں کو کاٹنا بھی ممنوع ہے۔ صحیحین نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے (الفاظ مسلم کے ہیں) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا ”اس شہر کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ اس وقت سے جب اللہ تعالیٰ نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے آئی ہوئی حرمت کی وجہ سے یہ تاروز قیامت حرام ہے۔ اس میں مجھ سے پہلے کسی کے لئے جنگ کرنا جائز قرار نہیں دیا گیا۔ میرے لئے بھی صرف دن کے ایک تھوڑے سے وقت کے لئے جائز کیا گیا۔ لہذا وہ اللہ کی جانب سے آئی ہوئی اس حرمت کی وجہ سے تاروز قیامت حرام ہوگا۔ اس کی جھاڑیوں کو نہ کاٹا جائے گا، اس کے شکار کو نہ بھگایا

جائے گا وہاں کسی گم شدہ چیز کو نہ اٹھایا جائے، الا یہ کہ معلوم ہو کہ کس کی ہے، اور اس کی گھاس کو نہ کاٹا جائے گا.....“

یہ ہے وہ خانہ خدا جسے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لئے چنا ہے۔ اور یہ اس کا وہ گھر ہے، جسے اس نے یہ شرافت عطا کی۔ اس کرۂ ارض پر یہ وہ پہلا گھر ہے جو صرف عبادت کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہ ان کے باپ حضرت ابراہیم کا گھر ہے اور اس کے اندر ایسی علامات اور شواہد موجود ہیں جو اس بات پر گواہ ہیں کہ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر فرمایا۔ اسلام بھی ملت ابراہیمی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اس لئے حضرت ابراہیم کا تعمیر کردہ بیت اللہ سب سے زیادہ اس بات کا مستحق ہے کہ مسلمان اس کی طرف متوجہ ہوں، جو زمین میں جائے امن ہے، اس میں لوگوں کے لئے سامان ہدایت ہے اور دین اسلام کا یہ ایک مرکز ہے۔

چنانچہ یہاں طے کر دیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوگوں پر بیت اللہ کا حج کرنا فرض کر دیا ہے۔ بشرطیکہ کسی کی استطاعت ہو اور اگر استطاعت کے باوجود کوئی حج نہ کرے تو گویا وہ کفر کا ارتکاب کرے گا۔

فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَنْ دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حُجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا وَمَنْ كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَفِيرٌ عَنِ الْعَالَمِينَ (۹۷)

”لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے، اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ اللہ تمام دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔“

یہاں انداز تعبیر قابل توجہ ہے، فرضیت حج نہایت ہی عموم اور شمول پر مشتمل ہے۔ اس کے لئے علی الناس ”تمام لوگوں پر“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس میں پہلا اشارہ تو یہ ہے کہ یہ حج ان یہودیوں پر

بھی فرض کیا گیا ہے جو اس وقت رسول اکرم ﷺ کے ساتھ مناظرہ اور محاربہ کر رہے ہیں کہ کیوں مسلمانوں نے اس کی طرف منہ کر کے عبادت کرنا شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے خود اہل کتاب سے بھی یہی مطالبہ کیا ہے کہ وہ گھر کا حج کریں۔ اس کی طرف متوجہ ہوں، کیونکہ یہ ان کے باپ ابراہیم کا تعمیر کردہ ہے اور پھر اس کرۂ ارض پر یہ پہلا گھر ہے اللہ کا اور جو صرف اس کی عبادت کے لئے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس لئے اعتراض کرنے والے یہودی اپنے فرائض سے انحراف کر رہے ہیں، یہ تقصیر ہیں اور اللہ کی معصیت کر رہے ہیں۔ اور اس عمومیت میں دوسرا اشارہ اس طرف ہے کہ تمام لوگوں سے مطالبہ یہ ہے کہ اس دین کا اقرار کر لیں اور اس دین کے فرائض اور شعائر ادا کریں۔ اور وہ بھی خانہ کعبہ کی طرف متوجہ ہوں اور حج کریں جس طرح اہل ایمان کر رہے ہیں۔ اور اگر یہ سب لوگ ایسا نہ کریں گے تو گویا وہ کفر کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ اگرچہ وہ زبانی طور پر یہ دعویٰ کریں کہ وہ اس دین پر ہیں اور اللہ تمام جہان والوں سے بے نیاز ہے، اسے قطعاً اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ سب لوگ ایمان لائیں یا سب لوگ حج کے لئے جائیں۔ حج میں تو ان کے لئے مصلحت ہے، صرف ان کی فلاح ہے۔ انہیں چاہئے کہ وہ ایمان لائیں اور اللہ کی عبادت کریں۔

حج پوری عمر میں ایک بار فرض ہے اور یہ فرض اس وقت عائد ہو جاتا ہے جب انسان کو اس کی استطاعت ہو جائے، جس میں ذاتی صحت، سفر کا امکان اور راستوں کا امن و امان شامل ہے۔ اس کی فرضیت کے وقت میں اختلاف ہے۔ وہ لوگ جن کا خیال ہے کہ یہ آیات ۹ ہجری میں نازل ہوئیں جسے عام الوفود کہا جاتا ہے، اور اس سلسلے میں بعض روایات بھی وارد ہیں یا ان کی رائے یہ ہے کہ ۹ ہجری میں حج فرض ہوا ہے۔ اس کا استدلال اس سے بھی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ۹ ہجری کے بعد ہی حج فرمایا۔ اس سے قبل جلد دوم میں تحویل قبلہ فیصلہ سے بحث کرتے ہوئے ہم نے یہ کہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے حج کی تاخیر اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتی کہ حج کی فرضیت ہی بعد میں ہوئی۔ ہو سکتا ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض مصروفیات اور مخصوص حالات کی وجہ سے حج مؤخر فرمایا ہو۔ مثلاً یہ کہ مشرکین حج کے موقعہ ننگے ہو کر حج کرتے تھے، اور یہ حرکت وہ فتح مکہ کے بعد تک کرتے رہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے ساتھ اختلاط کو

ناپسند فرمایا ہو اور جب ۹ ہجری میں سورۃ نازل ہوئی اور مشرکین کے لئے طواف کعبہ حرام قرار دے دیا گیا تو اس کے اگلے سال بعد رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے خود حج ادا فرمایا۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ حج اس سے پہلے فرض ہو چکا ہو۔ اور یہ سورۃ ہجرت کے ابتدائی زمانہ میں نازل ہوئی ہو مثلاً غزوہ احد کے قریب۔

بہر حال جس وقت بھی حج فرض ہوا ہو، اس کی فرضیت اسی نص قاطع کے ذریعے ہوئی ہے۔ یعنی حج ان تمام لوگوں پر فرض ہے جو راستے کی استطاعت رکھتے ہوں۔ حج مسلمانوں کا ایک سالانہ اجتماع ہے، وہ اس گھر کے پاس جمع ہوتے ہیں، جہاں سے دعوت اسلامی کا آغاز ہوا، جہاں سے ان کے باپ حضرت ابراہیم کی ملت کا بھی آغاز ہوا، اور جسے حضرت ابراہیم نے اللہ کی عبادت کے لئے پہلا گھر قرار دیا۔ اس لئے حج ایک نہایت ہی بامقصد اجتماع ہے، اس کی کچھ خاص یادیں ہیں اور ان تمام یادوں کا محور یہ بات ہے کہ انسان کا اپنے رب کے ساتھ رابطہ خاص پیدا ہوا، انسان کی روح اللہ کی پکار پر لبیک کہے، اس لئے کہ اس روح کی وجہ سے انسان، انسان بنا ہے۔ یہ ایک ایسا مقصد ہے جس پر تمام انسانوں کو جمع ہونا چاہئے اور وہ ہر سال اس گھر میں جمع ہوں جہاں سے کبھی خالص ”انسانی روحانی اجتماع“ کی دعوت کا آغاز ہوا تھا اور یہ دعوت خالص انسانی بنیادوں پر تھی۔



قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ (۹۸) قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ مَن أَمَرَ تَبْخَوْهُنَّ عَوَجًا وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ وَمَا اللَّهُ بِعَافٍ لِّعَمَّا تَعْمَلُونَ (۹۹)

”کہو اے اہل کتاب تم کیوں اللہ کی آیات ماننے سے انکار کرتے ہو؟ جو حکمتیں تم کر رہے ہو اللہ سب کچھ دیکھ رہا ہے، کہو اے اہل کتاب یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے تم بھی اللہ

کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے، حالانکہ تم خود اس پر گواہ ہو، تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔“

یہ تہدید اور اس قسم کا ڈراوا اس سورت میں اور ایسی ہی دوسری سورتوں میں بار بار آیا ہے۔ اس کا پہلا اثر یہ مرتب ہوتا ہے کہ اہل کتاب کو اپنے موقف کی اصلیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان کی اصل حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ وہ اپنے آپ کو بڑا مومن اور بڑا دیندار ظاہر کرتے ہیں، جبکہ فی الحقیقت وہ اہل کفر میں سے ہیں، کیونکہ وہ اللہ کی نازل کردہ آیات قرآنی کا انکار کرتے ہیں۔ اس لئے جو شخص اللہ کے کسی بھی جزء کا انکار کرے گا، گویا وہ سب کتاب کا انکار کرے گا۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ اگر وہ خود ان کے پاس محفوظ کتاب پر ایمان لائے ہوتے تو وہ لازماً ہر آنے والے رسول پر نازل ہونے والی ہدایات پر ایمان لائے ہوتے۔ اس لئے کہ دین کی حقیقت ایک ہے۔ جو شخص بھی اس حقیقت کو پالے وہ ان تمام رسولوں پر ایمان لائے گا جو بعد میں آئیں اور ان سے بیعت لیں۔ یہ ایک ایسی خوفناک حقیقت ہے جس سے چاہئے کہ وہ کانپ اٹھیں اور انہیں ان کی عاقبت کے بارے میں شک لاحق ہو جائے اور وہ اپنے انجام کی فکر کریں۔

اس کا دوسرا اثر یہ ہے کہ جماعت مسلمہ میں سے بعض لوگ جو اہل کتاب سے ان کے اہل کتاب ہونے کی وجہ سے دھوکہ کھاتے تھے، ان کی آنکھیں بھی کھل جاتی ہیں کہ اللہ خود اہل کتاب کی حقیقت ان کے سامنے کھول کر بیان فرماتے ہیں اور ان پر صریحاً کفر کا فتویٰ دیتے ہیں، اس لئے اس کے بعد کسی کے لئے کسی قسم کے شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہتی کہ اہل کتاب غلط ہیں اور اہل اسلام سچے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کو اس قدر شدید الفاظ میں ڈراتے ہیں جن سے دل دہل جاتے ہیں۔ وَاللّٰهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ..... ”اللہ ان تمام حرکتوں پر نظر رکھے ہوئے ہے جو تم کر رہے ہو۔“ اور وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ..... ”تمہاری حرکتوں سے اللہ غافل نہیں ہے۔“ یہ ایک خوفناک تنبیہ ہے۔ جب ایک انسان اس بات کو محسوس کر لے کہ اس کے اعمال پر اللہ گواہ ہے اور

یہ کہ وہ اس کے اعمال سے غافل نہیں ہے اور عمل بھی کیسا؟ خالص کفر، خالص دھوکہ، خالص فساد اور خالص گمراہ کرنا تو اس کے دل میں خوف کا پیدا ہونا قدرتی امر ہے۔

اللہ تعالیٰ اس حقیقت کو ریکارڈ پر لاتے ہیں کہ وہ جس حق کا انکار کرتے ہیں درحقیقت وہ جانتے بوجھتے ایسا کرتے ہیں۔ اور سمجھتے ہوئے لوگوں کو اس حق سے دور روکتے ہیں۔ جبکہ وہ وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ..... ”حالانکہ تم اس پر گواہ ہو۔“ یعنی انہیں اس بات پر پورا یقین تھا کہ وہ جس حقیقت کو جھٹلا رہے ہیں وہ حق ہے اور وہ جس بات سے عوام الناس کو روکتے ہیں اس میں ان کی بھلائی ہے۔ اور ان کا یہ رویہ انتہائی قابل نفرت ہے۔ اس لئے ایسے کردار والے کسی شخص پر نہ تو کوئی اعتماد کرنا مناسب ہے اور نہ ایسے شخص کا ہم نشین ہونا مناسب ہے۔ ایسے شخص کا صحیح علاج یہ ہے کہ اس کے ساتھ پوری طرح نفرت کا مظاہرہ کیا جائے اور اس پر بھرپور تنقید کی جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کا تعارف ان الفاظ میں کیا ہے۔ لَعَنَ تَصَدُّوْنَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبْجُوهَئَا عَوْجًا..... ”یہ تمہاری کیا روش ہے کہ جو اللہ کی بات مانتا ہے اسے تم اللہ کے راستے سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ ٹیڑھی راہ چلے۔“ یہ ایک بامعنی جائزہ ہے۔ اور اس میں بہت بڑا راز ہے۔ یعنی اللہ کا راستہ تو بالکل سیدھا راستہ ہے اور اس کے علاوہ جو راستے ہیں وہ سب ٹیڑھے راستے ہیں۔ اور جب لوگوں کو سیدھے راستے سے روکا گیا اور جب ابھی ایمان کو اسلامی نظام حیات سے محروم کیا گیا تو تمام انسانی امور میں اقامت اور سیدھ ختم ہو جائے گی اور حسن و فتح کے پیمانے صحیح و سلامت نہ رہیں گے۔ اور اس زمین کے نظام کا ہر شعبہ ٹیڑھا ہو جائے گا۔ یہ ایک عظیم فساد ہو گا، نظام فطرت میں فساد برپا ہو گا کیونکہ نظام فطرت کے خلاف ورزی ہو گی، انسانی زندگی میں فساد اس لئے ہو گا کہ یہ زندگی ٹیڑھ پر قائم ہو گی، اور یہ عظیم فساد اس لئے رونما ہو گا کہ لوگوں کو اسلامی نظام حیات سے روک دیا گیا ہو گا۔ پھر یہ فساد انسانی تصورات میں بھی برپا ہو گا، انسانی ضمیر میں بھی فساد ہو گا، انسانی اخلاق میں بھی فساد ہو گا، انسانی طرز عمل میں فساد ہو گا، انسانی روابط میں فساد ہو گا، انسانی معاملات میں فساد ہو گا۔ غرض ان تمام روابط میں فساد ہو گا جو ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان پیدا ہوں گے۔ نیز یہ فساد ان

کے اور اس نظام کائنات میں بھی برپا ہو گا جس کائنات میں انسان رہتے ہیں۔ پس لوگ یا تو اسلامی نظام زندگی کے تحت زندگی بسر کریں گے تو اس صورت میں وہ صراطِ مستقیم اور حالتِ صالحہ میں ہوں گے اور ان کے لئے بھلائی ہوگی یا پھر وہ ٹیڑھے اور منحنی راہوں پر چلیں گے، تو اس صورت میں وہ ٹیڑھ، فساد اور شر میں مبتلا ہوں گے۔ دنیا میں یہی دو راستے ہیں اور یہی دو حالات ہیں جو بنی نوع انسان کی زندگی پر آسکتے ہیں۔ ایک حالت یہ ہے کہ وہ اسلامی نظام زندگی کی شاہراہ پر گامزن ہوں گے تو پھر ان کے لئے خیر اور بہتری ہے اور یا وہ اس شاہراہ پر گامزن ہوں تو پھر ان کے لئے خیر اور بہتری ہے اور یا وہ اس شاہراہ سے منحرف ہوں گے تو اس صورت حال میں شر اور فساد ہی ان کا مقدر ہو گا۔



یہاں آکر اہل کتاب کے ساتھ اب مناظرہ ختم ہو جاتا ہے۔ اب انہیں بھلا دیا جاتا ہے اور اب خطابِ جماعتِ مسلمہ سے ہو رہا ہے۔ اب امتِ مسلمہ کو ہدایات دی جا رہی ہیں۔ انہیں تنبیہ کی جاتی ہے اور دشمن کی چالوں سے ڈرایا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جماعتِ مسلمہ کے خصائص کیا ہیں، اس کا تصور حیات اور اس کا نظام زندگی کیا ہے، اور وہ کیا ذرائع ہیں جنہیں کام میں لا کر اس نظام زندگی کو بروئے کار لایا جاسکتا ہے؟

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ
يَرُدُّوكُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ (۱۰۰) وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُثَلِّي
عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ
مُسْتَقِيمٍ (۱۰۱)

”اے ایمان والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمہارے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقعہ باقی ہے جبکہ تم کو اللہ کی

آیات سنائی جا رہی ہیں۔ اور تمہارے درمیان اس کا رسول ہے؟ جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہ راست پالے گا۔“

اس کرۂ ارض پر اس امت کو اس لئے اٹھایا گیا تھا کہ وہ اس زمین پر صرف اسلامی نظام زندگی کے برپا کرنے کے لئے اپنے لئے راہ متعین کرے۔ یہ ایک منفرد، ممتاز اور نمایاں امت ہے۔ اس کا وجود اسلامی نظام زندگی سے پھوٹا ہے، تاکہ وہ حیات انسانی کے اندر وہ رول ادا کرے جو اس کے سوا کوئی نہیں ادا کرتا۔ یہ امت اس لئے برپا کی گئی ہے کہ وہ اسلامی نظام زندگی کا اقرار کرے اور اسے عملی طور پر نافذ کرے، اور اس نظام کا نشان منزل نظر آرہا ہو۔ اس میں قرآن و سنت کی نصوص اور احکام عملی زندگیوں میں چلتے پھرتے نظر آئیں، اسلامی نصوص انسانی شعور، انسانی اخلاق اور انسانی طرز عمل اور انسانی روابط عملاً نظر آئیں۔

امت مسلمہ کے برپا کرنے کا مقصد اس وقت تک پورا نہیں ہو سکتا، اس کی راہ اس وقت تک متعین نہیں ہو سکتی اور وہ انسانی زندگی میں یہ چمکدار اور خوبصورت اور ممتاز عملی زندگی اس وقت تک وجود میں نہیں لاسکتی جب تک وہ تمام ہدایات اللہ جل شانہ سے اخذ نہ کرے اور انسانی قیادت اپنے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کی راہنمائی کے اصول تسلیم نہ کرے۔ تمام انسانوں کی راہنمائی کا انکار نہ کر دے، تمام انسانی اطاعتوں کو ترک نہ کر دے اور تمام انسانوں کی پیروی ترک نہ کر دے۔ اسے یا تو یہ تمام امور سرانجام دینے ہوں گے اور یا پھر اسے کفر، گمراہی اور راہ راست سے انحراف قبول کرنا ہوگا۔

یہ وہ اصول ہے جس کی تاکید قرآن مجید بتکرار کرتا ہے، اور مختلف مواقع پر کرتا ہے۔ اور یہی وہ اصول ہے جس پر جماعت مسلمہ کا شعور، اس کی سوچ، اس کے اخلاق پروان چڑھے ہیں جہاں بھی اسے موقع ملے۔ اب مواقع میں سے ایک موقع یہ تھا، جس میں اہل کتاب رسول اکرم ﷺ کے ساتھ مباحثہ کر رہے تھے اور تحریک اسلامی کو مدینہ میں اہل کتاب کے مکروفریب، خفیہ سازشوں اور عداوتوں کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا۔ ہاں یہ ہدایات بہر حال مدینہ طیبہ کے ان مخصوص حالات کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ یہ ہدایات امت مسلمہ کے لئے دائمی ہدایات ہیں۔ ہر زمانے اور ہر دور اور ہر نسل

کے لئے یہی ہدایات ہیں۔ ہر زمانے اور ہر دور اور ہر نسل کے لئے یہی ہدایات ہیں۔ اس لئے کہ امت مسلمہ کا یہ اصول حیات ہے اور یہی اس کا مقصد وجود ہے۔

اس امت کو اس لئے برپا کیا گیا ہے کہ وہ پوری انسانیت کی قیادت کرے۔ اب یہ کس منطق کی رو سے جائز ہے کہ وہ جاہلیت کی پیروی کرے حالانکہ اس کا مقصد وجود ہی یہ ہے کہ وہ جاہلیت کا قلع قمع کرے اور اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکے اور انسانوں کا رشتہ اللہ سے جوڑے۔ انسانوں کی قیادت اسلامی نظام زندگی کے مطابق کرے۔ اور جب یہ امت مسلمہ قیادت کے مقام سے گر جائے تو متصور ہو گا کہ امت مسلمہ کا وجود نہیں ہے۔ اور اگر اس کا کوئی وجود ہے تو وہ بھی بے مقصد وجود ہے۔ اسے تو اس لئے برپا کیا گیا تھا کہ وہ ایک صحیح تصور حیات کے مطابق انسانیت کی قیادت کرے۔ اس کا عقیدہ بالکل درست ہو، اس کا شعور استوار ہو، اس کے اخلاق معیاری ہوں، اس کا نظام مستحکم ہو اور اس کی تنظیم مضبوط ہو۔ صرف ایسے حالات ہی میں انسانی عقل نشو و نما پاسکتی ہے اور اس کے لئے مزید راہیں میسر ہو سکتی ہیں۔ اور وہ اس پوری کائنات سے اچھی طرح متعارف ہو سکتی ہے۔ وہ اس کائنات کے بھیدوں سے آگاہ ہو سکتی ہے اور وہ اس کائنات کی بھلائی کے لئے استعمال میں لانے کا حکم دیتی ہے۔ وہ ان قوتوں، اس کے ذخیروں کو مسخر کر سکتی ہے۔ لیکن امت کی قیادت عالیہ جو تسخیر کائنات کا حکم دیتی ہے، وہ ان تمام قوتوں کو انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال میں لانے کا حکم دیتی ہے۔ وہ ان قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اس کائنات کی تباہی اور اس کائنات کی بربادی کے لئے کام میں نہیں لاتی۔ اور نہ وہ ان قدرتی قوتوں کو اس سے دریافت کرتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ لذت حاصل کرے اور شہوات حیوانیہ میں گم ہو جائے۔ تسخیر کائنات کا مقصد صرف یہ ہے کہ امت اپنے ایمان باللہ کو مضبوط کرے، یہ تمسخر اللہ کی ہدایات کے مطابق ہو، اور اس معاملے میں وہ اللہ کے سوا کسی اور منبع سے ہدایات نہ لے۔

اس سبق میں اللہ تعالیٰ امت مسلمہ کو اس بات سے ڈراتے ہیں کہ وہ غیر اللہ کی اتباع کرے۔ اور یہ بتاتے ہیں کہ وہ کس طرح صحیح حالات پیدا کر سکتی ہے۔ اور کس طرح اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔ چنانچہ

پہلا حکم یہ دیا جاتا ہے کہ امت مسلمہ اہل کتاب کی پیروی اور اطاعت نہ کرے، اگر وہ ایسا کرے گی تو اہل کتاب اسے کفر کی طرف لے جائیں گے اور اس کے سوا کوئی دوسری بات نہ ہوگی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا قَرِيبًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُم بِعَدِّ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ (۱۰۰) وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ وَمَنْ يَعْتَصِمْ بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ

”اے ایمان لانے والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات نہ مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔ تمہارے لئے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقعہ باقی ہے جبکہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں۔ اور تمہارے درمیان اس کا رسول موجود ہے؟ جو اللہ کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے گا وہ ضرور راہ راست پالے گا۔“

اہل کتاب کی اطاعت کرنا، اور ان سے ہدایات اخذ کرنا، ان کے اوضاع و اطوار کا نقل کرنا، اس بات کا ثبوت ہے کہ امت مسلمہ نے داخلی طور پر شکست قبول کر لی ہے اور اس نے اپنے اس مقام قیادت سے دست برداری کر لی ہے۔ نیز اس سے اسلامی زندگی کی یہ صلاحیت بھی مشکوک ہو جاتی ہے کہ وہ ہمارے دور میں زندگی کی راہنمائی، اس کی تنظیم، اس کی ترقی اور نشوونما کی اہلیت رکھتا ہے۔ اور یہ بات دراصل کفر، خفی ہے جو نفس انسانی کے اندر سرایت کر جاتا ہے۔ یہ کفر غیر شعوری ہوتا ہے اور انسان اس کا خطرہ بھی محسوس نہیں کرتا۔ یہ اسلام کے نقطہ نظر سے بات تھی، رہی یہ بات کہ اہل کتاب کا نقطہ نظر کیا ہے؟ تو وہ دنیا میں سب سے زیادہ جس امر کے حریص ہیں وہ یہ ہے کہ وہ امت مسلمہ کو اپنے عقیدے سے پھیر دیں۔ اس لئے امت مسلمہ کے لئے یہ عقیدہ صخرہ نجات ہے۔ وہ اس کے لئے ایک دفاعی لائن ہے اور اس کی قوت اور شوکت کا اصل منبع ہے۔ اور اس امت کے دشمنوں کو اس راز کا بخوبی علم ہے۔ اس سے قبل بھی انہیں اس کا علم تھا اور آج بھی انہیں اس کا علم ہے۔ اور وہ اس امت کو اپنے عقائد و نظریات سے دور کرنے کے لئے ہر کمر اور ہر حیلہ کام میں لاتے ہیں۔ وہ اس کام میں اپنی پوری توانائی اور اپنی پوری قوت صرف کرتے ہیں۔ اور جب وہ اس امت کا مقابلہ علی الاعلان نہیں

کر سکتے تو وہ اس کے خلاف خفیہ مکر و فریب کام میں لاتے ہیں اور جب یہ لوگ تنہا اس کام کو سرانجام دینے کے اہل نہیں رہتے تو پھر وہ اس کام میں منافقین سے امداد لیتے ہیں جو اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اور اسلام کا اظہار کرتے ہیں لیکن وہ اپنی افواج منظم کر کے اسلامی قلعے کی دیواروں میں اندر سے نقب لگاتے ہیں اور لوگوں کو اسلام سے دور کرتے ہیں۔ اور ان کی نظروں میں ان نظامہائے زندگی کو حسین بناتے ہیں جو اسلامی نظام کے خلاف ہیں۔ ان کے لئے ایسے طریقے ایجاد کرتے ہیں جو اسلام کے خلاف ہیں اور اس امت پر ایسی قیادت مسلط کرتے ہیں جو اسلامی قیادت نہیں ہوتی۔

جب اہل کتاب دیکھتے ہیں کہ اہل اسلام میں سے انہیں ایسے افراد مل رہے ہیں جو ان کے تابع، ان کے پیروکار اور ان کی بات پر اچھی طرح کان دھرنے والے ہیں تو وہ ان لوگوں کی خدمات حاصل کرتے ہیں اور انہیں ان مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں جن کے حصول کے لئے ان کی نیندیں حرام ہیں تو وہ ان کو مقام قیادت دیں گے اور لوگوں کو ان کے پیچھے لگا دیں گے تاکہ یہ ایجنٹ پوری امت کو کفر و ضلال کے راستے پر ڈال دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فیصلہ کن اور دو ٹوک بات آتی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا فَرِيقًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ يَرُدُّوكُمُ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ
كَافِرِينَ

”اے ایمان لانے والو! اگر تم نے ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ کی بات مانی تو یہ تمہیں ایمان سے پھر کفر کی طرف پھیر لے جائیں گے۔“

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اہل اسلام اس امر سے زیادہ کسی اور چیز سے نہ گھبراتے تھے کہ وہ اسلام سے پلٹ کر پھر کفر کی طرف چلے جائیں۔ اور جنت کے مستحق ہو کر پھر جہنم کی طرف چلے جائیں۔ اور یہی صفت ہر سچے مومن کی ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس صورت میں یہ ڈراوا ایسا تازیانہ ہے جس سے ضمیر گرم ہوگا۔ اس سے ڈرانے والے کی مشفق آواز سننے کے لئے سامع اچھی

طرح آمادہ ہو جائے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ ڈراوا اور یاد دہانی کے مضامین مسلسل جاری ہیں۔ کیا برا منکر حق ہے وہ شخص جو اہل ایمان کو ایمان لانے کے بعد بدراہ کرتا ہے۔ ایسے حالات میں کہ ان پر آیات الہی مسلسل پڑھی جا رہی ہیں اور رسول اللہ ان میں موجود ہیں اور وہ تمام محرکات موجود ہیں جو ایمان لانے کے باعث ہیں اور دعوت اسلامی مسلسل دی جا رہی ہو اور کفر و ایمان کے دوراے پر نور ایمان چھایا ہوا ہے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنْتُمْ تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ..... ”تمہارے لئے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقعہ باقی ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے درمیان اللہ کا رسول موجود ہے۔“

ہاں، ایسے حالات میں، ایمان لانے کے بعد کسی مومن کا کافر ہو جانا بے شک ایک عظیم امر ہے، اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا وقت پورا کر لیا اور اپنے رفیق الاعلیٰ کے ساتھ جا ملے تو اس صورت میں بھی آیات الہی موجود ہیں۔ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم باقی ہے۔ آج ہم بھی ان آیات کے اسی طرح مخاطب ہیں جس طرح قرون اولیٰ کے لوگ مخاطب تھے۔ اور آج بھی کامیابی کی راہ واضح ہے اور کامیابی کے جھنڈے بلند ہیں۔ وَمَنْ يَخْتَصِم بِاللَّهِ فَقَدْ هُدِيَ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ..... ”اور جو اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے گا وہ ضرور راہ راست پالے گا۔“

ہاں، اللہ کا دامن تھام لینے میں ہی نجات ہے۔ اللہ جل شانہ موجود ہیں۔ وہ زندہ اور قیوم ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام پر، اسلامی نظریہ حیات اسلامی عقائد اور اسلامی نظام زندگی کے سلسلے میں بہت زیادہ سختی فرماتے تھے۔ جبکہ زندگی کے خالص عملی اور تجربی امور میں آپ انہیں کھلا چھوڑتے تھے، یعنی ان امور میں جن میں حقیقت کا دار و مدار تجربے پر موقوف ہوتا ہے مثلاً طریقہائے زراعت، طریقہائے جنگ و قتال اور ایسے ہی دوسرے امور جن کا تعلق خالص علمی اور تجرباتی امور سے ہوتا ہے اور جس میدان میں اسلامی نظریہ حیات اور اسلامی عقائد کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یا جن کا تعلق

اسلامی نظام زندگی کے ساتھ نہیں ہوتا اور نہ ان کا تعلق ایک علیحدہ چیز ہے اور خالص علوم، تجرباتی امور اور دوسرے انطباقی معاملات ایک دوسری چیز ہے۔ اسلام کے نزول کا مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی کو اسلامی نظام کے مطابق چلایا جائے۔ یہ اسلام ہی ہے جس نے عقل انسانی کو ایسے کام میں لگایا اگر وہ علم معرفت کی قوت سے نئی نئی مادی ایجادات سامنے لائیں اور یہ کام اسلامی نظام زندگی کے دائرے کے اندر اندر کیا جائے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ایک حدیث نقل کرتے ہیں۔ بروایت سفیان، جابر، شعبی عبد اللہ بن ثابت رحمہم اللہ۔ وہ فرماتے ہیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فرمایا! رسول اللہ میں نے بنی قریظہ میں سے اپنے ایک یہودی بھائی کو کہا اور اس نے مجھے تورات سے بعض جامع چیزیں لکھ دیں کیا میں وہ آپ کی خدمت میں پیش نہ کر دوں؟ فرماتے ہیں کہ یہ سنتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ عبد اللہ بن ثابت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے ان سے کہا کہ تم دیکھ نہیں رہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے پر کیا آثار ہیں؟ عمر نے کہا میں اس پر راضی ہوں کہ اللہ میرا رب ہے، اسلام میرا دین ہے اور محمد میرے رسول ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے سے آثار غضب کے آثار غائب ہو گئے اور آپ نے فرمایا ”خدا کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ اگر آج تم میں موسیٰ علیہ السلام آجائے اور تم اس کی اطاعت کرو مجھے چھوڑ دو تو یقیناً تم گمراہ ہو جاؤ گے۔ تمام امتوں میں سے تم میرا حصہ ہو اور میں تمام نبیوں میں سے تمہارا حصہ ہوں۔“

حافظ ابو یعلیٰ نے حماد، شعبی کی روایت سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اہل کتاب سے کوئی مسئلہ دریافت نہ کرو اس لئے کہ جب وہ خود گمراہ ہو گئے تو تمہیں کیسے ہدایت دے سکتے ہیں۔ اگر تم نے ان سے کوئی بات دریافت کی تو پھر یا تو تم کسی غلط بات کی تصدیق کرو گے اور یا پھر کسی صحیح بات کی تکذیب کرو گے۔ اور اللہ کی قسم آج اگر تمہارے درمیان موسیٰ علیہ السلام بھی ہوتے تو ان کے لئے میری اتباع کے بغیر کوئی چارہ کار نہ ہوتا اور

بعض روایات میں ہے ”اگر موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام زندہ ہوتے تو ان دونوں کے لئے میرے اتباع کے سوا اور کوئی چارہ کار ہی نہ ہوتا۔“

یہ لوگ ہیں اہل کتاب اور یہ ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام اس امر کے بارے میں کہ ان تمام امور میں جن کا تعلق عقائد و نظریات سے ہے یا جن کا تعلق نظام زندگی اور اسلامی قانون سے ہے، ان میں اہل کتاب سے مکمل اجتناب کرنا ہے۔ ہاں جن امور کا تعلق محض سائنسی علوم سے ہے تو ان میں اسلام کی روح اور اس کی واضح ہدایات کے مطابق تمام اقوام و ملل سے استفادہ جائز ہے، لیکن ان علوم کو بھی ایمانی نظام زندگی کے ساتھ مربوط کرنا ضروری ہے۔ اس شعور کے ساتھ کہ وہ ذات باری ہی ہے جس نے انسان کو اس فطرت کی تسخیر کی قوت دی ہے۔ اس نے فطرت کا رخ تبدیل کیا اور انسانیت کی بھلائی کے لئے اسے استعمال کیا اور انسانیت کے لئے امن و سکون اور سہولیات کا انتظام کیا۔ لہذا وہ اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کائناتی قوتوں کو مسخر کرنے کی طاقت ہمیں عنایت فرمائی اور شکر کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ہر معاملے میں اس کی بندگی کی جائے اور پھر اس علم و معرفت اور تسخیر کائنات کو انسانیت کی بھلائی کے لئے استعمال کیا جائے۔

رہا ایمانی تصور حیات کا موضوع، اس کائنات کی تخلیق کی بابت نظریات، وجود انسانی کے مقاصد انسانی نظام زندگی اور اس کی تنظیمات اور قوانین، انسان کا اخلاقی نظام اور اس کا طرز عمل تو ان تمام موضوعات میں کسی غیر اسلامی منبع فکر سے کوئی بات اخذ کرنے سے رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا، جس کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہوا تھا۔ حالانکہ وہ معمولی بات تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کو اس سے بڑی سختی سے ڈرایا کہ اگر وہ ایسا کریں گے تو یہ واضح کفر کا ارتکاب ہوگا۔

یہ ہے اللہ کی ہدایت اور یہ ہے اسوۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ رہے ہم لوگ جو دعوائے اسلام کرتے چلے جا رہے ہیں تو ہمارا حال یہ ہے کہ ہم اپنے علم کے اصول یعنی قرآن و حدیث کی تعلیم بھی مستشرقین سے حاصل کرتے ہیں یا مستشرقین کے شاگردوں سے حاصل کرتے ہیں اور ذرا غور کیجئے کہ

ہم اپنے لئے فلسفہ حیات اور وجود انسانی اور حیات انسانی کے آغاز کے نظریات بھی ان لوگوں سے اخذ کرتے ہیں یا پھر یونانی، رومی اور یورپین اور مارکی فلاسفہ سے یہ نظریات اخذ کرتے ہیں اور پھر ذرا ملاحظہ کیجئے کہ ہم اپنا نظام حیات، اپنے ضوابط اور قوانین بھی ان جعلی مصادر سے اخذ کرتے ہیں۔ ہم اپنا طرز عمل، اپنے اخلاق اور اپنے آداب بھی اس گندے تالاب سے اخذ کرتے ہیں جو نہایت ہی گندہ ہے اور جس میں جدید مادی تہذیب کی گند جمع ہو چکی ہے، جو ہر قسم کے دینی تصورات سے عاری ہے۔ چاہے وہ اسلام کے سوا کوئی اور دین ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے باوجود ہم اس زعم میں مبتلا ہیں کہ ہم مسلمان ہیں۔ یہ ایک ایسا زعم ہے جس کا گناہ کفر صریح کے گناہ سے زیادہ ہے۔ اس لئے کہ ایسا زعم باطل رکھ کر گویا ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ آج کے دور میں اسلامی نظام زندگی کامیاب نہیں ہے یا اگر کامیاب ہے تو گویا ہم نے اسلام کی شکل مسخ کر کے موجودہ طرز عمل کو اسلام سمجھ رکھا ہے۔ اور ہم ان امور کی گواہی دے رہے ہیں جبکہ وہ لوگ جو اس زعم میں مبتلا نہیں ہیں وہ دراصل ایسی شہادت نہیں دے رہے۔

حقیقت یہ ہے اور اسے گرہ میں باندھنا چاہئے کہ اسلام ایک ضابطہ حیات ہے۔ وہ چند ممتاز خصوصیات کا حامل نظام ہے۔ اعتقادی تصورات کے اعتبار سے ب بھی نظام زندگی اور نظام قانون کے اعتبار سے بھی اور اپنے اخلاقی قواعد و اصول کے اعتبار سے بھی، جس پر ہمارے اجتماعی روابط قائم ہوتے ہیں اور یہ دین انہیں ترک نہیں کرنا چاہئے۔ یہ روابط سیاسی ہوں، اقتصادی ہوں یا اجتماعی ہوں۔ پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ یہ نظام پوری انسانیت کی قیادت کے منصب کا بھی مدعی ہے۔ لہذا اس کا ضروری منطقی اور لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اس کرہ ارض پر ایک ایسی انقلابی جماعت ہو جو اس نظام کے جھنڈے اٹھائے اور انسانیت کی راہنمائی کرے۔ اور جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا اسلامی نظام کے اس قائدانہ دعویٰ کے مزاج کے ساتھ یہ امر مطابقت نہیں رکھتا کہ مسلمان دوسری ملل سے کوئی استفادہ کریں یا ان سے ہدایات لیں۔

پھر یہ حقیقت بھی بروقت نظروں کے سامنے رہے کہ جب یہ دین آیا تھا تو یہ پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے آیا تھا۔ اور آج جو لوگ اس نظام کی حکمرانی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں وہ بھی

پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے دے رہے ہیں۔ کل بھی جو شخص اس دعوت کا حامل ہو وہ بھی اسی مقصد کے لئے ہو گا۔ بلکہ انسانیت جن ظالمانہ نظامہائے زندگی کے نیچے پس رہی ہے، اور جسے ہم چشم سر سے دیکھ رہے ہیں اسے اسلام کے عادلانہ زندگی کی اشد ضرورت ہے۔ اس الہی نظام زندگی کے سوا اور کوئی راہ نہیں ہے جس پر انسانیت کو نجات ملے۔ لہذا اس بات کی اشد ضرورت ہے کہ اسلامی نظام زندگی اپنی تمام خصوصیات کو محفوظ اور زندہ رکھے۔ اور پوری انسانیت کے اندر قائدانہ مقام حاصل کرے اور اسے ایک بار پھر اس دنیا میں مصائب اور مشکلات سے نجات دے۔

اس وقت انسانیت نے تسخیر کائنات کے سلسلے میں جو جدوجہد کی ہے اور مختلف میدانوں میں کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اور طب اور صنعت کے میدان میں جو حقائق فراہم کئے ہیں وہ ماضی کے مقابلے میں معجزانہ ہیں اور انسانیت ان میدانوں میں مسلسل پیش قدمی کر رہی ہے۔ اور نئی نئی فتوحات حاصل کر رہی ہے لیکن ان سب فتوحات کا اس کی زندگی پر کیا اثر ہے؟ اس کی نفسیاتی دنیا کا حال کیا ہے؟ کیا اس میدان میں بھی وہ خوشحال ہے؟ کیا اسے اطمینان قلب حاصل ہے؟ کیا اس کی زندگی پر امن ہے؟ ہر گز نہیں۔ وہ اس وقت ہمہ گیر بد بختی، بے چینی اور خوف کا شکار ہے۔ وہ اعصابی اور نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہے۔ وہ بے راہ روی اور جرائم کی وسیع دلدل میں پھنسی ہوئی ہے۔ لیکن اس نے انسانیت، حیات انسانی کے مقصد وجود اور انسان کے مقصد تخلیق کے میدان میں کوئی ترقی نہیں کی۔ اس لئے آج جب ہم جدید تہذیب کے فرزند کی ذہنی دنیا کا مطالعہ کرتے ہیں اور معلوم کرتے ہیں کہ اس کے نزدیک تخلیق انسان کا مقصد کیا ہے تو وہ اسلامی تصور حیات کے مقابلے میں اس میدان میں بالکل مفلس اور پسماندہ اور بونا نظر آتا ہے۔ بلکہ اس میدان میں یوں نظر آتا ہے کہ اسے ایک لعنت گھیرے ہوئے ہے، جس میں انسان خود اپنی ذات، اس کائنات میں اپنے مقام کو گراتا چلا جاتا ہے۔ اور اس گراؤ کے نتیجے میں انسان کی ترجیحات اور اس کی دلچسپیاں بھی گرجاتی ہیں..... یوں انسان اپنی زندگی میں ایک خلاء محسوس کرتا ہے اور یہ خلاء اس تھکے ہوئے انسان کے دل کو کھاجاتا ہے۔ حیرانی و پریشانی میں اس کی روح ہلاک ہو رہی ہے۔ یہ محض اس لئے کہ اس کی روح میں تصور الہ نہیں ہے اور تصور الہ سے شدید معاشی حالات نے اسے دور کر دیا ہے۔ اور غلط علمی تصورات نے اسے گمراہ کر دیا ہے۔ یہی

علم اگر اسلامی نظام حیات کے رنگ میں ترقی کرتا تو اس کی ہر کامرانی انسان کو قدر کے قریب تر کر دیتی، لیکن جدید انسانیت کا حال یہ ہے کہ وہ جس قدر علمی میدان میں آگے بڑھتی ہے، وہ اپنی بھی ہوئی اور شکست خوردہ روح کی وجہ معرفت خدا سے اور دور ہوتی جاتی ہے۔ وہ اس نور سے محروم ہے جس میں اسے اپنا حقیقی مقصد وجود نظر آئے، اور وہ اس مقصد کی طرف اپنی علمی قوت کے ساتھ آگے بڑھے، جو اسے خود اللہ نے عطا فرمایا ہے۔ اور جس استعداد کی وجہ سے وہ یہ علمی ترقی کر رہا ہے وہ بھی اسے اللہ کی عطا کردہ ہی تو ہے۔ چنانچہ انسانیت اس نظام حیات کو نہیں پار ہی ہے جو اس کی حرکت اور اس کائنات کی حرکت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے، اس کی فطرت اور اس کائنات کی فطرت کے درمیان تطابق پیدا کرے، اس کے قوانین اور قوانین قدرت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے، ایسا نظام جو اس کی قوتوں اور صلاحیتوں کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرے، جو اس کی دنیا اور آخرت کے درمیان جوڑ پیدا کرے، جو ایک فرد اور ایک جماعت کے حقوق کے اندر توازن پیدا کرے، جو اس کے فرائض اور واجبات کے درمیان عدل پیدا کرے اور یہ سب کام نہایت ہی ترتیب کے ساتھ قدرتی طور پر، جامعیت کے ساتھ خوشگوار انداز میں سرانجام پائیں۔

ہمارے دور میں بعض لوگ اسلامی نظام زندگی سے محروم ہو کر کام کرتے ہیں اور جو لوگ اس دور میں اسلامی نظام زندگی کی بات کرتے ہیں اور پر امید نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہیں، انہیں یہ لوگ رجعت پسندی کا طعنہ دیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام حیات کی بات کرنے والے دراصل تاریخ اسلامی کے گزشتہ ایک مختصر سنہری دور کی محض آرزو اپنے دلوں کے اندر بسائے ہوئے ہیں، لیکن وہ اسلامی نظام کے حوالے سے اپنی جہالت کی وجہ سے یا اپنی بدنیتی کی وجہ سے انسانیت کو اسلامی نظام زندگی کی قیادت سے محروم کئے ہوئے ہیں جو ان کی راہنمائی بڑی خوبی، امن و سلامتی اور سکون و اطمینان کی طرف کر سکتا ہے۔ جو ان کی راہنمائی دنیاوی ترقی اور خوشحالی کی طرف کر سکتا ہے۔

ہم جو اسلامی نظام زندگی کی طرف دعوت دیتے ہیں اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم کس چیز کی طرف انسانیت کو بلارہے ہیں۔ ہم اس انسانیت کو اس کی حقیقی تلخیوں میں دیکھ رہے ہیں۔ ہم اس گندے تالاب

کا متعفن رانجہ محسوس کر رہے ہیں، جس میں انسانیت لت پت ہے لیکن دور بلند افق پر نجات کے جھنڈے لہرا رہے ہیں جو صحراء کی تپش کی جھلنے والی تھکی ماندی انسانیت کو نجات کی چمک دکھا رہے ہیں اور یہ پاک و صاف اور روشن چوٹی، اس گندے تالاب میں انسانیت کو اپنی طرف بلا رہی ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر انسانیت کے قائدین نے اس نظام زندگی کو قبول نہ کیا تو انسانیت پوری انسانی تاریخ میں تو بین آمیز مصیبت کا شکار ہوگی اور یہ پوری انسانی تاریخ میں بدترین مصیبت ہوگی اور ہر مفہوم کے اعتبار سے بدی ہوگی۔

اس راہ میں پہلا اقدام یہ ہونا چاہئے کہ یہ نظام زندگی ممتاز اور منفرد ہو اور اس کے حاملین، اس کے ارد گرد پھیلی جاہلیت سے کوئی راہنمائی حاصل نہ کریں اور یہ نظام مسلسل پاک اور صاف موجود رہے۔ یہاں تک کہ اللہ کے اذن سے دوبارہ پوری انسانیت کی قیادت سنبھالے۔ اللہ بڑا رحیم و کریم ہے اور وہ انسانوں کو ہمیشہ کے لئے انسان کے دشمنوں کے لئے رحم و کرم پر نہ چھوڑے گا، جو جگہ جگہ انسانیت کو جاہلیت کی طرف بلاتے ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی تلقین اللہ تعالیٰ، پہلی جماعت مسلمہ کو اپنی کتاب میں کر رہے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی تعلیمات میں اس نکتے کی بار بار تلقین فرمائی۔



اس تنبیہ اور خبرداری کے بعد کہ اہل کتاب سے کوئی ہدایت اخذ نہ کی جائے، ان کی اطاعت اور اتباع نہ کیا جائے، اب جماعت مسلمہ کو یہ تلقین کی جاتی ہے کہ اس کی زندگی اور اس کی زندگی کا نظام حیات و اساسی قواعد پر مبنی ہے۔ یہ ایسے قواعد ہیں جن کو مد نظر رکھنا اس کے لئے اس بار امانت کی اٹھانے کے لئے ضروری ہے، جس کی ذمہ داری اللہ نے اس کے سپرد کی ہے اور جس کی خاطر اللہ تعالیٰ اس امت کو وجود میں لایا ہے۔ یہ دونوں اساسی قواعد ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں یعنی اخوت اور ایمان۔ یعنی اللہ پر ایمان لانا، اس سے ڈرنا اور تمام امور حیات میں ہر وقت اور ہر لحظہ اسے یاد رکھنا۔ اور ان تمام لوگوں کے ساتھ اخوت رکھنا جو اس مفہوم میں مومن باللہ ہوں۔ وہ اخوت جس کی

وجہ سے جماعت مسلمہ زندہ، قوی اور مستحکم بنیاد بن جاتی ہے اور یوں وہ اس عظیم کردار کے ادا کرنے کے قابل ہو جاتی ہے جو اسے انسانی زندگی اور انسانی تاریخ میں ادا کرنا ہے یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ اور اس دنیا کے نظام حیات کو معروف پر قائم کرنا اور منکر کی آلودگی سے اسے پاک کرنا۔ فرماتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُمْ مُسْلِمُونَ (۱۰۲) وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ (۱۰۳) وَلِتُكِنَ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (۱۰۴) وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۰۵) يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَلَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (۱۰۶) وَأَلَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۱۰۷)

”اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا ہے، تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور

اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو اس سے بچالیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے، شاید کہ ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔ تم میں کچھ لوگ ضرور ایسے رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔ کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلافات میں مبتلا ہوئے۔ جنہوں نے یہ روش اختیار کی وہ اس روز سخت سزا پائیں گے جبکہ کچھ لوگ سرخرو ہوں گے اور کچھ لوگوں کا منہ کالا ہو گا۔ جن کا منہ کالا ہو گا (ان سے کہا جائے گا کہ) نعمت ایمان پانے کے بعد بھی تم نے کفرانہ رویہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اس کفران نعمت کے صلہ میں عذاب کا مزہ چکھو۔ رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو ان کو اللہ کے دامن رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔“

یہ دو مرکزی ستون ہیں جن پر جماعت مسلمہ کا ڈھانچہ قائم ہے۔ اور ان دونوں کے ساتھ وہ اپنا گراں اور عظیم رول ادا کر رہی ہے۔ اگر ان دونوں میں ایک پلر (Pillar) بھی گر جائے تو جماعت مسلمہ کا ڈھانچہ گر جائے گا اور اس کے بعد اس جہاں میں اس کا کوئی کردار نہ رہے گا۔

پہلا ستون ایمان اور تقویٰ کا ستون ہے۔ وہ تقویٰ اور خدا خونی جو اللہ جل شانہ کے حقوق کی ادائیگی کا موجب بنے۔ دائمی اور بیدار خدا خونی، جس میں کوئی غفلت نہ ہو، جس میں کوئی وقفہ نہ ہو اور وہ پوری عمر میں تسلسل کے ساتھ قائم رہے۔ یہاں تک کہ انسان پر موت آجائے۔ یَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تَقَاتِهِ..... ”اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے۔“ اللہ سے ڈرو، جس طرح اس سے ڈرنے کا حق ہے۔ اس خدا خونی کے لئے کوئی حد مقرر نہیں کی گئی، یہ ڈرنے والے دل کا کام ہے کہ وہ خدا خونی میں کس مقام تک جا پہنچتا ہے، جس قدر وہ تصور کر سکتا ہے۔ جس قدر اس کی طاقت ہو۔ قلب مومن اس میدان میں جس قدر آگے بڑھے گا، اس کے سامنے نئے نئے آفاق کھلیں گے اور اس کا راہوار شوق اور مہمیز پائے گا۔ اور وہ اپنی خدا خونی سے جس

قدر بھی اللہ کا قرب حاصل کر گا تو اس کا شوق اس سے بھی اونچے مقام کی طرف متوجہ ہو گا۔ اور جس مقام پر وہ ہو گا اس سے اونچے مقامات کا طالب ہو جائے گا اور آخر کار وہ ایسے مقام تک پہنچ جاتا ہے جس میں اس کا دل مدام بیدار ہو جاتا ہے اور پھر وہ کبھی نہیں سوتا۔

وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ..... ”تم کو موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔“ موت ایک ایسی خفیہ اور غائبانہ گھڑی ہے جس کا علم انسان سے مخفی رکھا گیا ہے۔ پس جو شخص یہ ارادہ کر لے کہ وہ صرف اس حال میں مرنا چاہتا ہے کہ وہ صحیح مسلم ہو، تو اس کی طرف ایک ہی سبیل ہے کہ وہ فوراً مسلم بن جائے۔ اور ہر لحظہ وہ مسلم رہے۔ تقویٰ اور خدا خونی کے بعد اسلام کے ذکر سے ایک وسیع حکمت اور مفہوم کی طرف اشارہ مطلوب ہے۔ یعنی مکمل طور پر سر تسلیم خم کرنا۔ مکمل انقیاد صرف اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا۔ اس کی اطاعت کرنا، اس کے نظام زندگی کی پیروی کرنا۔ اس کی کتاب کے مطابق فیصلے کرنا۔ اور یہ وہ مفہوم ہے جسے اس سورت میں بار بار دہرایا گیا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے۔ یہ تو ہے وہ پہلا ستون جس پر جماعت مسلمہ قائم ہے تاکہ وہ اپنے وجود کو ثابت کرے، اور اس کائنات میں جو اہم رول اسے سپرد کیا گیا ہے اسے ادا کرے۔ اس لئے کہ اس ستون اور اس کی اساس کے بغیر انسانوں کا ہر اکٹھا جاہلی اکٹھا تصور ہو گا۔ اس صورت میں پھر وہ اکٹھا اسلامی منہاج پر اکٹھا نہ ہو گا، جسے امت مسلمہ کا اجتماع کہا جاسکے۔ پس جاہلیت پر مبنی سوسائٹیاں ہوں گی جن میں ہدایت یافتہ قیادت نہ ہوگی، جو صحیح معنوں میں انسانیت کی راہبر ہو، بلکہ جاہلی قیادتیں اٹھیں گی۔

دوسری اساس جس پر اسلامی سوسائٹی کی عمارت اٹھتی ہے وہ اخوت اسلامی کی اساس ہے۔ صرف اللہ کے نام پر برادری، اسلامی نظام زندگی کی رفاقت، اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے کی رفاقت۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ مِنْهَا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ

”سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو، اور تفرقہ میں نہ پڑو، اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو اس نے تم پر کیا، تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔ تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے کھڑے تھے، اللہ نے تم کو بچالیا۔ اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے روشن کرتا ہے شاید کہ تم ان علامتوں سے تمہیں اپنی فلاح کا سیدھا راستہ نظر آجائے۔“

یہ اخوت گویا خدا خونی اور ایمان سے پھوٹی ہے، یعنی اسلام کی اساس اول ہے۔ اور اخوت کی بنیاد اللہ کی رسی ہے۔ یعنی اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی اساس پر، اس کے دین کی اساس پر اور اس کے منہاج کی اساس پر۔ اس اخوت کی اساس جاہلیت کی اکٹھ کی اساس پر نہیں ہے، نہ جاہلیت کے کسی دوسرے مقصد کی اساس پر ہے، نہ کسی اور رسی پر جو اللہ کی رسی کے علاوہ ہو۔ صرف اللہ کی رسی پر

اعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا..... ”سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور تفرقہ میں نہ پڑو۔“

یہ اخوت جس کی اساس اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑنے پر ہے، اللہ تعالیٰ پہلی جماعت اسلامی پر اپنا احسان عظیم بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ یہ وہ نعمت ہے، جس سے اللہ تعالیٰ صرف ان لوگوں کو سرفراز فرماتے ہیں جن سے اللہ کو محبت ہوتی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ انہیں اپنے اس انعام کو یاد دلاتے ہیں۔ فرماتے ہیں ذرا اس حالت کو ذہن میں لائیں جس پر وہ جاہلیت کے دور میں تھے۔ یعنی وہ ”اعداء“ تھے۔ ایک ایک کا دشمن تھا۔ دیکھو مدینہ میں اوس اور خزرج کی طرح دشمنی کا نمونہ اور کوئی پیش کر سکتا ہے۔ یہ یثرب کے دو قبیلے تھے، یہ قبیلے یہودیوں کے پڑوس میں رہتے تھے اور یہ یہودی ان

کے درمیان عداوت کی آگ سلگائے رکھتے تھے، وہ ہر وقت پھونکیں مارتے تھے، اور اس آگ کو اس قدر تازہ رکھتے کہ وہ ان کے درمیان ہر قسم کے تعلقات کو جلا کر بھسم کر دیتی۔ یہودیوں کے لئے یہ ایک اچھا میدان کار تھا۔ اور وہ اسی میں رات اور دن کام کرتے رہے تھے۔ اور اسی کے ساتھ زندہ رہتے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان دو عربی قبیلوں کی تالیف قلب کا سامان کر دیا اور یہ اسلام تھا، یہ صرف اسلام ہی تھا جس نے ان نفرت کرنے والے قبائل کے دلوں کو جوڑا۔ اور یہ صرف اللہ کی رسی ہی تھی جسے سب نے مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور وہ اللہ کے اس احسان کی وجہ سے بھائی بھائی بن گئے تھے۔ یہ صرف اسلامی اخوت ہی ہے جس کی وجہ سے لوگوں میں اتحاد پیدا ہو سکتا ہے اور وہ اس کی وجہ سے اپنی تاریخی دشمنیاں بھول سکتے ہیں، یا اپنے قبائلی انتقام معاف کر سکتے ہیں، یا لوگ اپنے ذاتی مفادات اور فرقہ وارانہ روایات کو ترک کر سکتے ہیں اور پھر تمام لوگ اللہ تعالیٰ بزرگ و برتر کے سامنے ایک ہی صف میں کھڑے ہو جاتے ہیں۔

وَأَذْكُرُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا

”اور تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، اس نے تمہارے دل جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی بن گئے۔“

پھر اللہ تعالیٰ انہیں اپنا وہ احسان جتلاتے ہیں کہ وہ آگ سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے پر تھے اور قریب تھا کہ وہ اس میں گر جائیں لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے بچالیا۔ اور وہ اس سے اس طرح بچے کہ انہوں نے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور ایمان لے آئے۔ یہ تھی اسلام کی پہلی اساس۔ اور پھر ان کے دلوں میں محبت ڈال دی اور وہ بھائی بھائی بن گئے اور یہ محبت اور رفاقت اسلام کے اجتماعی نظام کی دوسری اساس تھی۔ اس لئے فرمایا وَكُنْتُمْ عَلَى شَفَا حُفْرَةٍ مِنَ النَّارِ فَأَنْقَذَكُمْ

مِنْهَا..... ”اور تم آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے تھے، اس نے تم کو اس سے بچالیا۔“

آیت میں ”تمہارے دل جوڑ دیئے“ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ دل کا لفظ اس لئے استعمال ہوا ہے کہ باہم انسانی رابطے اور شعور دلوں کی ایک گٹھڑی میں باہم ملا کر جوڑ دیا گیا، اور وہ اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد اور میثاق کی رسی کے ساتھ باندھ دیا گیا۔ اس طرح اس آیت میں مسلمانوں کی اس وقت کی تصویر کو جامہ الفاظ پہنایا گیا ہے بلکہ ان کی صورت حال ایک زندہ اور متحرک منظر میں نظر آرہی ہے کہ وہ وَكُنْتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ..... ”اور تم آگے سے بھرے ہوئے گڑھے کے کنارے پر تھے۔“ اور صورت حال یوں تھی کہ تم گرنے ہی والے تھے اچانک اللہ کے دست قدرت نے تمہیں بچالیا۔ گویا اللہ کا ہاتھ محسوس اور شاہد ہے۔ اللہ کی رسی محسوس طور پر نظر آتی ہے۔ اور انتہائی خطرے کی صورت حال سے قوم بال بال بچ جاتی ہے۔ یہ ایک زندہ، متحرک نظارہ ہے۔ اس منظر کو دیکھنے والوں کے دل دھڑک رہے ہیں اور خطرہ سامنے موجود ہے۔ صدیوں اور نسلوں کے بعد گویا آنکھیں دیکھ رہی ہیں۔

محمد بن اسحاق نے اپنی سیرت میں اس کا تذکرہ کیا ہے کہ یہ آیت اوس اور خرزج کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ ہوا یوں کہ ایک یہودی ایک ایسی محفل کے پاس سے گزرا جس میں اوس اور خرزج کے لوگ بھائیوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے، اسے یہ بات بہت ہی شاق گزری۔ اس پر اس نے ایک شخص بھیجا اور اسے کہا کہ جنگ بعثت میں ان کے درمیان جو واقعات ہوئے تھے ذرا اس محفل میں ان کا تذکرہ کرے اور یہ شخص اور ان کی محفلوں میں ان واقعات کا اپنے انداز میں تذکرہ کرتا رہا۔ اس طرح لوگ ایک دوسرے کے خلاف گرم ہو گئے۔ ایک دوسرے کو غضبناک نظروں سے دیکھنے لگے۔ ایک دوسرے کے اندر انہوں نے جذبہ انتقام بھڑکایا۔ اپنے اپنے جھنڈے اٹھائے، اسلحہ طلب ہو گیا اور مقام ”حرہ“ دوبارہ جنگ کے لئے تقریباً طے ہو گیا۔ اس بات کی اطلاع رسول ﷺ ہو گئی۔ رسول ﷺ ان کے پاس آئے، انہیں ٹھنڈا کیا اور فرمایا: ”کیا تم دوبارہ جاہلیت کی طرف دعوت دیتے

ہو اور میں تمہارے درمیان ہوں۔“ اس کے بعد آپ نے ان پر اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ اس پر انہیں سخت ندامت ہوئی۔ فوراً ان کے درمیان صلح ہو گئی۔ انہوں نے باہم معافہ کیا اور اسلحے پھینک دیئے، اللہ ان سے راضی ہو۔

جب اللہ تعالیٰ نے ان کے سامنے حقیقت واضح فرمائی تو وہ راہ ہدایت پر آ گئے۔ اور ان کے بارے میں اللہ سبحانہ و تعالیٰ کی بات سچی ہو گئی۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ..... ”اس طرح اللہ اپنی نشانیاں تم پر روشن کرتا ہے تاکہ ان نشانیوں میں سے تمہاری فلاح کا سیدھا راستہ نظر آئے۔“

مسلمان ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے، اللہ کے نظام پر قائم تھے اور تمام انسانیت کی قیادت کرنے کی راہ پر گامزن تھے اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے اور یہودی یہ سعی کر رہے تھے کہ اس رسی کو کاٹ دیں۔ یہودیوں کی ان مسلسل سازشوں کا یہ ایک نمونہ ہے، جو وہ مسلسل جماعت مسلمہ کے خلاف کرتے رہے رہتے ہیں۔ اور یہ سازشیں وہ ہمیشہ اس وقت کرنے لگتے ہیں جب مسلمان اللہ کی رسی کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلامی نظام زندگی کو اپنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور ان کی یہ کوششیں کامیاب ہی اس لئے ہوتی ہیں کہ مسلمان اہل کتاب کی پیروی شروع کر دیتے ہیں اور ان کی یہ ریشہ دوانیاں اس قدر گہری چال پر مبنی ہوتی ہیں کہ قریب تھا کہ وہ دور اول کے مسلمانوں کو بھی باہم دست گریباں کر دیں اور انہیں اسلام سے پھیر کر دوبارہ کفر کے حالات میں داخل کر دیں۔ اور ان کے درمیان رابطہ پیدا کرنے والی اللہ کی مضبوط رسی کو کاٹ دیں، جس کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے بھائی ہو گئے تھے اور متفق اور مجتمع ہو گئے تھے۔ آیت کا یہ ٹکڑا اس آیت اور اس سے قبل کی آیات کے درمیان ربط کو بھی ظاہر کرتا ہے۔

یہاں یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ اس آیت کا شان نزول یہ ہو یا نہ ہو، آیت بہر حال اس واقعہ کے مقابلہ میں ایک عام صورت حال کو بیان کر رہی ہے۔ کیونکہ اس کے سیاق اور سابق یہ بتا رہے ہیں کہ اس وقت یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کو ایک دوسرے کے ساتھ لڑانے اور ان کے اندر

تفریق پیدا کرنے میں ایک زبردست تحریک مسلسل چل رہی تھی۔ وہ اپنے تمام وسائل کو کام میں لا کر اسلامی صفوں میں فتنہ انگیزیاں اور تفرقہ برپا کرنے کی کوشش میں ہر وقت لگے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم مسلمانوں کو بار بار تنبیہ کرتا ہے کہ یہودیوں اور اہل کتاب کی سازشوں کے مقابلے میں ہوشیار رہیں، وہ ان کے درمیان شکوک و شبہات اور نفاق کے بیج بوری ہیں اور ان کے اندر فکری انتشار کے لئے ہر وقت کوشاں ہیں۔ ہر دور میں یہودیوں کا مسلمانوں کے حوالے سے یہی طرز عمل ہے۔ آج بھی وہ یہی کچھ کر رہے ہیں اور کل بھی ان کا رویہ یہی ہو گا، ہر اسلامی سوسائٹی اور ہر زمانے میں۔

سوال یہ ہے کہ ان یہودی سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ان دو آسامیوں (Bases) پر استوار ہو کر پھر امت مسلمہ کا منشور اور ہدف کیا ہے؟ اس کا فریضہ، فریضہ اقامت دین ہے۔ اس کرۂ ارض پر اسلامی نظام زندگی کا قیام ہے۔ حق کو باطل پر غالب کرنا ہے، معروف کو منکر پر غالب کرنا ہے، خیر کو پھیلانا ہے اور شر کو روکنا ہے۔ یہ ہے وہ نصب العین جس کے لئے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے اپنی نظروں کے سامنے، اپنے خاص منہاج کے مطابق اس امت کو برپا کیا ہے۔ اس نصب العین کا تعین ان الفاظ میں کیا جاتا ہے۔

وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ

”تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکیں اور جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔“ بس یہ ضروری ہوا کہ ایسی جماعت ہر وقت موجود ہو جو بھلائی کی طرف دعوت دے، معروف کا حکم دے اور منکر سے منع کرے۔ ان کے اندر ایک ایسا اقتدار، ایک ایسی قوت ضرور ہونی چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے۔ یہ بات کہ ایک ایسا اقتدار یا ایسا مقتدر اعلیٰ ضروری ہے جو یہ کام کرے، اس پر یہ آیت بصراحت دلالت کرتی ہے۔ یعنی دعوت الی الخیر ہر وقت ہو اور یہ بات ہر کوئی کر سکتا ہے، لیکن یہاں تو ساتھ ساتھ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے الفاظ بھی وارد ہیں۔ اگر دعوت

اسلامی بغیر اقتدار اعلیٰ کے ممکن العمل بھی ہے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بغیر اقتدار اعلیٰ کے حصول کے ممکن نہیں ہے۔ اس مسئلے کے حل کے لئے صحیح اسلامی تصور حیات یہی ہے کہ ایسا اقتدار اعلیٰ ضروری ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے۔ یہ اقتدار اعلیٰ دعوت الی الخیر کے نصب العین پر قائم ہوگا۔ اور اس کا مقصد دفعیہ شر ہوگا۔ یہ اقتدار اعلیٰ ایسا ہوگا جو مکمل اتحاد و اتفاق کے نتیجے میں حاصل ہوگا، یہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامنے کے نتیجے میں اور اخوت اسلامی کے قیام کے بعد ہوگا۔ یعنی یہ اقتدار اعلیٰ، یا مملکت یا سلطنت ان دو بنیادوں پر قائم ہوگی یعنی اتحاد اور اخوت اور اس کا نصب العین انسانی زندگی میں اسلامی نظام حیات کا قیام ہوگا۔ اور اس اقتدار اعلیٰ کا قیام اس طرح ہوگا کہ اس نظام کی طرف جو خیر ہی خیر ہے، عام لوگوں کو دعوت دی جائے گی۔ لوگوں کو اس سے متعارف کرایا جائے گا کہ اس کی نظام کی حقیقت کیا ہے۔ انہیں یہ بتایا جائے گا کہ اسلامی نظام اقتدار اعلیٰ کا خواہاں ہے تاکہ وہ معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے۔ اور لوگ اس کی اطاعت کریں یا وہ اپنی اطاعت کروائے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُولٍ إِلَّا لِيُطَاعَ بِإِذْنِ اللَّهِ..... ”ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے، وہ صرف اس لئے بھیجا ہے کہ اللہ کے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔“ اس لئے یہ بات ذہن میں رکھنا چاہئے کہ اس کرۂ ارض پر اسلامی نظام زندگی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ صرف وعظ وارشاد اور تبلیغ بیان جاری ہو۔ یہ تو اسلامی نظام کا ایک حصہ اور جزء ہے۔ اس کا دوسرا اہم جزء یہ ہے کہ ایک ایسا اقتدار اعلیٰ قائم کیا جائے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کرے۔ اور انسانی زندگی میں معروف کو رائج کرے۔ اور منکر کا قلع قمع کرے۔ اور اس ”جماعت ممتازہ“ کو بھی بچائے رکھے کہ ہر کس وناکس اس امت کو اپنی خواہشات، اپنی مرغوبات اور شہوات کے بھینٹ نہ چڑھا سکے۔ اور اسے اپنی ذاتی مصلحتوں کی خاطر استعمال نہ کر سکے۔ اور معاشرہ کے اندر نیکی اور بھلائی پر مبنی اخلاق کو کوئی اپنی خاص رائے اور اپنے مخصوص تصورات کے تحت تباہ نہ کر سکے، اگرچہ وہ سمجھتا ہو کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ معروف اور درست ہے۔

یہی وجہ ہے دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ کوئی آسان اور سہل کام نہیں ہے۔ خصوصاً جب اس کے مزاج پر غور کریں اور دیکھیں کہ وہ لوگوں کی خواہشات اور میلانات کے

ساتھ متصادم ہے۔ وہ بعض لوگوں کی ذاتی مصلحتوں اور مفادات کے ساتھ ٹکراتا ہے، بعض لوگوں کے غرور اور کبریا کی پر اس کی زد پڑتی ہے، بعض غاصب جابروں اور زبردستی مسلط ہونے والے حکام بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں، بعض گرے ہوئے طبقات جن میں ترقی اور بلندی کا داعیہ ہی نہیں ہے، وہ اسے مصیبت سمجھتے ہیں، بعض اس قدر کامل ہوں کہ اس کی مشقتیں برداشت کرنے کی ہمت نہ رکھتے ہوں، بعض ظالم طبقات ہوں جس کے ساتھ عدل لگانہ کھاتا ہو۔ بعض ایسے گم کردہ راہ اور کجروہوں کہ انہیں صراط مستقیم اچھا ہی نہ لگتا ہو، اور ان میں سے بعض ایسے بھی موجود ہوں جو منکر کو پسند کرتے ہوں اور معروف کے دشمن ہوں..... حالانکہ انسانیت اور امت مسلمہ صرف اس وقت فلاح پاسکتی ہے کہ اس میں خیر غالب ہو، معروف ہو معروف سمجھا جاتا ہو، منکر کو منکر سمجھا جاتا ہو، اور ان تمام امور کا منطقی تقاضا یہ ہے کہ ایک ایسا اقتدار اعلیٰ ہو جس میں خیر غالب ہو اور وہ نہی عن المنکر اور امر بالمعروف کا فریضہ ادا کرتا ہو۔ اور پھر اپنے اوامر اور نواہی کو منوانے کی قوت بھی رکھتا ہو۔

لہذا ایک ایسی جماعت کا قیام از حد ضروری ہے جس کی بنیاد پر ان دوستوں پر ہو، اللہ پر ایمان اور اخوت اسلامی تاکہ وہ اپنی قوت ایمانی، قوت خدا خونی اور باہم الفت اور محبت اور اتفاق و اتحاد کی قوت کے بل بوتے پر وہ فریضہ ادا کر سکے جس کے لئے اسے اٹھایا گیا ہو، اس لئے کہ جماعت مسلمہ کو جو نصب العین دیا گیا ہے اور جو فریضہ اس پر عائد کیا گیا ہے کہ وہ ان دو خصوصیات کے بغیر اس میں عہدہ برآ نہیں ہو سکتی اور نہ کامیاب و کامران ہو سکتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ..... ”یہی لوگ فلاح پائیں گے۔“

غرض اس قسم کی جماعت کا قیام اسلامی نظام زندگی کے قیام کے لئے ایک بنیادی ضرورت ہے۔ یہ اسلامی نظام کی ذاتی ضرورت ہے۔ یہ جماعت وہ ماحول فراہم کرے گی جس کے اندر اسلامی نظام سانس لے گا، زندہ ہو گا اور ایک حقیقت کے روپ میں نمودار ہو گا۔ یہ ماحول بھلائی کا ماحول ہو گا، باہم متعاون و متکافل ہو گا، اور اس میں دعوت الی الخیر کا چرچا ہو گا۔ اس میں بھلائی، نیکی، سچائی، انصاف معروف ہوں گے۔ شر، رذالت، باطل اور ظلم اس میں منکر تصور ہوں گے۔ اس ماحول میں بھلائی آسان ہوگی اور

برائی کا ارتکاب مشکل ہوگا۔ اس میں بھلائی پر عمل پیرا ہونے میں اس قدر مشقت نہ کرنا ہوگی جس قدر برائی پر مشقت ہوگی۔ اس میں حق باطل کے مقابلے میں طاقتور ہوگا۔ اس میں ظلم کے مقابلے میں عدل سے زیادہ نفع ہوگا، اس میں بھلائی کرنے والے کو معاونین بسہولت دستیاب ہوں گے۔ اور اس میں برائی کا ارتکاب کرنے والے مزاحمت اور مخالفت کا سامنا کرنا ہوگا، یہی وجہ ہے کہ ایسی سوسائٹی کا قیام ضروری ہے، جس میں سچائی اور بھلائی بلا جہد و نشوونما پاسکے۔ اس کے لئے اس کا پورا ماحول اور اس کا ہر فرد اس میں معاون ہوگا اور جس میں باطل اور شر کی نشوونما کی راہ میں بے حد مشکلات اور رکاوٹیں ہوں گی، اس لئے کہ پورا ماحول اس کے لئے سازگار نہ ہوگا۔

اسلام کا تصور کائنات، اس کا تصور حیات، اس کا تصور اقتدار، اس کا تصور اعمال، اس کا تصور واقعات، اس کا تصور اشیاء اور افراد تمام دوسرے جاہلی تصورات سے اپنی اساس اور نوعیت کے اعتبار سے بالکل مختلف ہے۔ اس لئے اسلام کے اس وسیع تصور حیات کے لئے ضروری ہے کہ اس کے لئے ایک ماحول ہو، جس میں یہ تصور حیات پھلے پھولے اور اس میں اس کی اپنی اقدار حیات پروان چڑھیں۔ لہذا اسلام کے جاہلی ماحول سے جدا ایک عمدہ ماحول کی ضرورت ہے اور اسے ایک جاہلی معاشرے کے سوا اس کا اپنا معاشرہ درکار ہے۔

یہ ماحول اور یہ معاشرہ اسلامی تصور حیات کے لئے ہو جس میں یہ تصور زندہ رہے اور یہ ماحول بھی اس کے لئے زندہ ہو، اس ماحول میں یہ تصور پھلے پھولے، اور آزادی کے ساتھ وہ اس ماحول میں سانس لے سکے، اس میں ذاتی ترقی کر سکے، اور اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ہو، نہ داخلی رکاوٹیں جو اس کی راہ میں مشکلات پیدا کریں اور نہ خارجی رکاوٹیں جو مزاحمت کریں۔ اور اگر ایسی رکاوٹیں کسی وقت وجود میں آجائیں تو دعوت اسلامی ان کا مقابلہ کرے، اس لئے کہ یہ دعوت الی الخیر ہے، دعوت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اور جب اس قسم کی کوئی قاہرانہ قوت دعوت اسلامی کی راہ میں رکاوٹیں ڈالے تو اس معاشرے میں اس کی مدافعت کرنے والے موجود ہوں اور یہ لوگ اسلامی نظام کے محافظین ہوں۔

یہ ماحول اسلامی جماعت کی صورت میں فراہم ہوتا ہے اور یہ جماعت دو بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔ ایمان باللہ اور اخوت اسلامی۔ ایمان باللہ اس لئے ضروری ہے تاکہ اس کا تصور کائنات، تصور حیات، اس کی اقدار، تصور اعمال اور تصور اشخاص و اشیاء میں مطابقت ہو۔ یہ تمام تصورات ایک ہی پیمانے کے مطابق ہوں اور ایک ہی منبع سے ماخوذ ہوں، انہی کے مطابق زندگی کے تمام مسائل حل کئے جائیں اور پوری زندگی کے فیصلے اللہ کی طرف سے آئی ہوئی شریعت کے مطابق ہوں۔ اور وہ جماعت محبت کے ساتھ اس قیادت کی پیروی کرے جو اسلامی نظام حیات کے مطابق قائم ہو۔ وہ اسلامی اخوت پر قائم ہو۔ اس کی تشکیل محبت اور باہم تعاون و تکافل کے اصولوں پر ہو، یہ ایسے اصول ہیں جن کے سایہ میں خود غرضی اور لالچ ختم ہو جاتی ہے اور ایثار اور قربانی کے جذبات دوچند ہو جاتے ہیں، لوگ بڑی سہولت اور آزادی سے اور بڑی گرمجوشی سے ایثار کرتے ہیں اور نہایت ہی اطمینان، خوشی اور اعتماد کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں۔

غرض مدینہ طیبہ میں پہلی اسلامی جماعت انہی دو اصولوں پر قائم ہوئی تھی، اس کا ایمان باللہ نہایت ہی پختہ تھا جو معرفت الہی پر مبنی تھا۔ معرفت الہی کی وجہ سے صفات باری کا پر تو ان کے ضمیروں پر پڑ گیا، خدا خونی، خدا کی نگرانی کا شعور، مسلسل بیداری، ذات باری کا احساس اس جماعت کے اندر اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ جس کی نظیر تاریخ انسانی میں بڑی نادر ہے۔ اور معرفت کردگار کے ساتھ ساتھ خوبصورت اور میٹھی محبت کے پیکر تھے۔ معاشی لحاظ سے باہم معاون، تکافل اور گہری اور سچی ہمدردی رکھتے تھے۔ اور وہ اس میدان میں اس قدر اونچے مقام تک پہنچے ہوئے تھے کہ اگر انہوں نے یہ معیار عملاً پیش نہ کیا ہوتا تو وہ محض خواب ہی خواب ہوتا۔ غرض مہاجرین اور انصار کے درمیان برادری اور مواخات کا قصہ تو ایک حقیقت تھا، لیکن وہ اس قدر ممتاز اور بلند معیار کا تھا کہ آج بھی وہ محض افسانہ نظر آتا ہے، حالانکہ وہ حقیقت تھی۔ اور وہ قصہ اس سرزمین پر بطور واقعہ پیش آیا تھا۔ اگرچہ وہ محیر العقول اور افسانہ نظر آتا تھا۔ غرض اس قسم کے ایمان اور اس قسم کی اخوت اور بھائی چارے پر ہر دور میں اسلامی نظام قائم ہو گا۔

یہی وجہ ہے کہ سیاق کلام میں مکرر جماعت مسلمہ کو خبردار کیا جاتا ہے کہ وہ تفرقے اور بے جا اختلاف سے باز رہیں۔ ان سے پہلے جن لوگوں کو اس امانت کے اٹھانے کے لئے منتخب کیا گیا تھا، اور جنہوں نے تفرقہ بازی کی تھی اور انجام کار وہ جس طرح تباہ و برباد ہوئے تھے، اور جس طرح اللہ تعالیٰ نے ان سے وہ اعزاز چھین لیا تھا اور جماعت مسلمہ کے سپرد کر دیا تھا، اس لئے وہ باہم جڑے ہوئے تھے۔ نیز ان لوگوں کا جو برا انجام قیامت میں ہونے والا ہے وہ مستزاد ہے کہ جس دن کچھ چہرے سیاہ ہوں گے اور کچھ سفید ہوں گے اور یہ لوگ سیاہ چہروں والے ہوں گے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۰۵) يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَتَسْوَدُّ وُجُوهٌ فَأَلَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكْفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ (۱۰۶) وَأَلَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللَّهِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۱۰۷)

”کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو فرقوں میں بٹ گئے۔ اور کھلی کھلی واضح ہدایات پانے کے بعد پھر اختلاف میں مبتلا ہوئے، جنہوں نے یہ روش اختیار کی وہ اس روز سخت سزا پائیں گے۔ جبکہ کچھ لوگ سرخ رو ہوں گے اور کچھ لوگوں کا منہ کالا ہوگا۔ جن کا منہ کالا ہوگا (ان سے کہا جائے گا) کہ نعمت ایمان پانے کے بعد بھی تم نے کافرانہ رویہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اس کفران نعمت کے صلے میں عذاب کا مزہ چکھو۔ رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو ان کو اللہ کے دامن رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔“

یہاں سیاق کلام میں قرآن اپنے مناظر میں سے ایک منظر کو پیش کرتا ہے، جو زندگی متحرک مناظر سے بھرپور ہے، ہم ایک ہولناک منظر کے سامنے ہیں، یہ اس قدر خوفناک ہے کہ جس کی نقشہ کشی بذریعہ الفاظ ممکن نہیں ہے۔ نہ اس کے خدوخال الفاظ میں بیان ہو سکتے ہیں۔

ہمارے سامنے دو قسم کے انسان کھڑے ہیں، یہ زندہ انسان ہیں، ان کے چہرے ہیں اور خدو خال ہیں۔ کچھ لوگ ہیں جن کے چہرے نورانی ہیں، خوشی ان سے ٹپک رہی ہے، اور ہشاش بشاش ہیں اور خوشی و مسرت سے چہرے سرخ و سفید ہو گئے ہیں۔ ان کے مقابلے میں بعض دوسرے چہرے ہیں جو رنج و الم کی وجہ سے بجھے بجھے ہیں، ہوائیاں اڑی ہوئی ہیں، تھکان کی وجہ سے سیاہ ہو گئے ہیں، لیکن اس حالت میں بھی وہ معاف نہیں ہیں۔ اپنے حال پر چھوڑ نہیں دیئے گئے، بلکہ انہیں مزید رلایا جاتا ہے اور ملامت کی جاتی ہے۔

”نعمت ایمان پانے کے بعد تم نے کافرانہ رویہ اختیار کیا؟ اچھا تو اب اس کفران نعمت کے صلے میں عذاب کا مزہ چکھو۔“

”رہے وہ لوگ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو ان کو اللہ کے دامن رحمت میں جگہ ملے گی اور ہمیشہ اسی حالت میں رہیں گے۔“

یوں جماعت مسلمہ کے ضمیر کی گہرائیوں میں تفرقہ اور اختلاف کے برے نتائج کا خوف بیٹھ جاتا ہے۔ اور وہ جان لیتے ہیں کہ ایمان اور محبت والفت اللہ کا کس قدر عظیم انعام و اکرام ہے۔ اور اس منظر میں جماعت مسلمہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتی ہے کہ اہل کتاب جنہوں نے تفرقہ کیا وہ کس قدر بھیانک انجام سے دوچار ہوئے، جن کی اطاعت سے جماعت مسلمہ کو ڈرایا جاتا ہے تاکہ وہ بھی اسی بھیانک انجام سے دوچار ہو کر عذاب الیم میں گرفتار نہ ہو جائے، جس دن بعض چہرے سفید اور ہشاش بشاش ہوں گے اور بعض چہرے سیاہ و کبیدہ خاطر ہوں گے۔

اور اب ان دونوں فریقوں کی تصویر کشی اور انجام بتا دینے کے بعد قرآن کریم اس پوری بحث پر اپنے مخصوص انداز میں اختتامی کلمات کہتا ہے۔ یہ کلمات انہی خطوط پر ہیں جن پر اس سورت کے مضامین جارہے ہیں۔ یعنی یہ کہ وحی الہی سچائی اور دانائی پر مبنی ہیں اور یہ کہ قیامت کے دن جزاء و سزاء ایک سنجیدہ امر ہے، اللہ کے احکام دنیا و آخرت میں عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی ہیں۔ اور یہ کہ جو

کچھ زمیں میں ہے اور آسمان میں ہے وہ سب اللہ کی ملکیت ہے۔ اور تمام امور کا فیصلہ آخر کار اس کے سامنے ہونے والا ہے۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا
لِّلْعَالَمِينَ (۱۰۸) وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ وَإِلَى اللَّهِ تُرْجَعُ
الْأُمُورُ (۱۰۹)

”یہ اللہ کے ارشادات ہیں جو ہم تمہیں ٹھیک ٹھیک سنارہے ہیں کیونکہ اللہ دنیا والوں پر ظلم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا زمین و آسمان کی ساری چیزوں کا مالک اللہ ہے اور سارے معاملات اللہ کے حضور پیش ہوتے ہیں۔“

یہ صورتیں یہ حقائق اور یہ نتائج اللہ کی یہ آیات اور اس کے یہ دلائل وبراہین یہ سب آپ پر سچائی اور صداقت کے ساتھ پڑھی جا رہی ہیں یہ آیات جو اصول اور جو اقدار طے کر رہی ہیں وہ حق ہیں اور اعمال کے جو نتائج اور جو جزاء و سزا یہ طے کر رہی ہیں وہ بھی حق ہیں اور پیش آنے والے ہیں۔ یہ آیات سچائی کے ساتھ اس ذات کی طرف سے نازل ہو رہی ہیں۔ وہ ذات اس نزول کی سزاوار ہے۔ اور ہی اس بات کی مالک ہے کہ قدار کا تعین کرے وہی مستحق ہے کہ نتائج تک پہنچائے اور وہی اس بات کا حق رکھتا ہے کہ اعمال پر جزاء دے۔ اللہ تعالیٰ کبھی اپنے بندوں پر ظلم کا ارادہ نہیں کرتا اس لئے کہ وہ حاکم عادل وہ امور سہاوت اور امور ارض کا مالک ہے اور وہ آسمانوں اور زمینوں کے اندر جو کچھ ہے اس کا بھی مالک ہے اور تمام امور کا آخری فیصلہ اسی کے ہاں ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عمل پر جزاء و سزا کا تعین اس لئے کیا ہے تاکہ سچ کا بول بالا ہو اور نظام عدل جاری ہو اور معاملات اس نہج پر چلیں جو شان جلال کے لائق ہوں اور یہ بات نہیں ہے جیسا کہ اہل کتاب کو زعم ہے کہ انہیں تو صرف معدودے چند دنوں تک آگ کی سزا دی جائے گی پھر وہ نکل آئیں گے۔



اس کے بعد امت مسلمہ کے اوصاف کا بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی حیثیت، اپنی قدر و قیمت اور اپنی حقیقت سے شناسا ہو سکے۔ اس کے بعد امت مسلمہ کے سامنے اہل کتاب کا تعارف کرایا جاتا ہے۔ اہل کتاب کے رتبہ کو کم نہیں کیا جاتا، ان کی حقیقت بیان کر کے انہیں یہ امید دلائی جاتی ہے کہ اگر وہ ایمان لے آئیں تو وہ ان کے لئے مفید ہو گا، لہذا اہل ایمان کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ ان کے دشمن انہیں کوئی نقصان نہیں دے سکتے، وہ ان کے مکرو فریب اور ان کے قتال کے باوجود مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں دے سکتے، نہ مسلمانوں پر فتح یاب ہو سکتے، اہل کفر آخرت میں دوزخ میں رہیں گے اور اس دنیا میں ایمان و تقویٰ کے بغیر انہوں نے جو کچھ بھی خرچ کیا وہ آخرت میں انہیں کوئی فائدہ نہ دے گا۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ (۱۱۰) لَنْ يَضُرُّكُمْ إِلَّا أَذًى وَابٍ يُقَاتِلُكُمْ يُوَلُّوكُمْ الْأَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ (۱۱۱) ضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةَ أَيْنَ مَا تَقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِنَ اللَّهِ وَضَرَبْتُ عَلَيْهِمُ الْمُسْكَنَةَ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ (۱۱۲) لَيْسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ (۱۱۳) يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي

الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ (۱۱۴) وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ
وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ (۱۱۵) إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُعْنِي عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا
أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا
خَالِدُونَ (۱۱۶) مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا
صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ
أَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ (۱۱۷)

”اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانیت کی ہدایت و اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو انہی کے حق میں بہتر تھا۔ اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، زیادہ سے زیادہ بس کچھ ستا سکتے ہیں۔ اگر یہ تم سے لڑیں گے تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے، پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔ یہ جہاں پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں، ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے، اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ یہ اللہ کی آیات کے ساتھ کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔ مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ناقدری نہ کی جائے گی، اللہ پر ہیز گار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔ رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا تو اللہ کے مقابلے میں ان کو نہ ان کا مال کچھ کام دے گا نہ اولاد، وہ تو آگ میں جانے والے لوگ ہیں اور آگ ہی میں ہمیشہ

رہیں گے۔ جو کچھ وہ اپنی اس دنیا کی زندگی میں خرچ کر رہے ہیں اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہو اور وہ ان لوگوں کی کھیتی پر چلے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے برباد کر کے رکھ دے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ درحقیقت یہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔“

ان آیات کے ابتدائی حصہ میں، جماعت مسلمہ کے کاندھوں پر ایک بھاری بوجھ ڈالا گیا ہے اور یہ بوجھ اس لئے ڈالا گیا ہے کہ اللہ نے اس جماعت کو مکرم اور معزز بنایا ہے اور اسے ایسا مقام و مرتبہ دیا گیا ہے، جس پر آج تک کوئی دوسری جماعت فائز نہیں ہو سکی۔

كُنْتُمْ حَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ
وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ

”اب دنیا میں وہ بہتر گروہ تم ہو، انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو، اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

یہاں اخراجت صیغہ ماضی مجہول لایا گیا ہے۔ اور یہ ایک خاص تعبیر ہے اور قابل توجہ ہے۔ اس سے اللہ جل کے لطیف دست قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔ جو اس امت کو باہر نکال رہا ہے اور غیب کے اندھیروں میں سے، اس جماعت کو دھکیل دھکیل کر منصفہ شہود پر لایا جا رہا ہے۔ اور اسے اس پر دے کے پیچھے سے ظاہر کیا جا رہا ہے جس کے پیچھے جھانکنا کسی انسان کا کام نہیں ہے اور نہ انسان اس پردہ غیب کے پیچھے کچھ جانتا ہے۔ اخراجت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک خفیہ اور نامعلوم قوت انہیں آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طور پر متحرک کر رہی ہے۔ یہ عمل یوں ہوتا ہے کہ اچانک اس کائنات کے اسٹیج پر ایک امت نمودار ہو جاتی ہے۔ اور اس نے ایک اسٹیج پر ایک خاص رول ادا کرنا ہوتا ہے۔ یہ رول نہایت اہم ہے۔ اور اس کائنات میں اس کا ایک خاص مقام متعین ہو جاتا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلْعَالَمِينَ..... ”اب دنیا میں بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت اور اصلاح کے لئے نکالا گیا ہے۔“ یہ ہے وہ بات جس کا ادراک امت مسلمہ کو اچھی طرح کر لینا چاہئے تاکہ اسے اپنی حقیقی قدر و قیمت کا احساس ہو جائے کہ اسے تو تمام انسانوں کی اصلاح کے لئے نکالا گیا ہے تاکہ وہ ہر اول دستے کا کام دے اور اس کو اس کائنات میں قیادت کا مقام حاصل ہو۔ اس لئے کہ صرف امت ہی نہیں بلکہ وہ بہترین امت ہے۔ اور اللہ کی مرضی یہ ہے کہ اس کو عارض پر خیر کی قیادت ہو، شر کی قیادت نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ یہ بات اس کی شان قیادت سے فروتر قرار دی گئی ہے کہ وہ دوسری جاہلی امتوں سے ہدایت لے۔ اس کا فرض تو یہ ہے کہ دوسری جاہلی اقوام کو اپنے خزانہ علم و اخلاق سے عطیات دے۔ اور اس کے ذخائر میں ہمیشہ ایسی اجناس موجود ہونی چاہئیں جنہیں وہ دوسری محروم اقوام و ملل کو عطا کرتی رہے۔ وہ ان اقوام و ملل کو صحیح عقائد و تصورات دے، صحیح فکر دے، صحیح نظام حیات دے، صحیح اخلاق دے، صحیح علم و معرفت عطا کرے۔ یہ وہ فریضہ ہے جو اس کی اعلیٰ حیثیت کی وجہ سے اس پر عائد ہوتا ہے اور اس پر یہ فریضہ اس کے مقصد و وجود کی وجہ سے فرض ہو جاتا ہے۔ یہ بات اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے کہ وہ ہر میدان میں دوسری امم کے لئے ہر اول دستہ رہے۔ وہ ہمیشہ قیادت کے مقام و منصب پر رہے اور ہمیشہ مرکز امم ہو۔ لہذا اس کے اس منصب کے کچھ آثار و نتائج ہیں۔ وہ منصب محض دعویٰ سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ اس امت کے سپرد کیا جاتا ہے جو اس کی اہل ہو ا کرتی ہے، وہ اپنے تصورات و افکار کی وجہ سے اور اپنے اعلیٰ نظام حیات کی وجہ سے جب اس کے اہل ہوتی ہے تب ہی یہ اسے دیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ امت کو علمی میدان میں بھی سب امم سے آگے ہونا چاہئے اور ترقی و تعمیر کے اعتبار سے بھی اسے اقوام و ملل سے آگے ہونا چاہئے، تاکہ وہ مقام خلافت فی الارض پر فائز ہو اور اپنے آپ کو اس کے لئے اہل ثابت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ امت مسلمہ جس نظام حیات کی داعی ہوگی وہ نظام اس سے بہت کچھ کمالات کا مطالبہ کرتا ہے، اور اس سے اس کا اولین مطالبہ یہ ہے کہ وہ ہر میدان میں سب سے آگے رہے اگر وہ اس منصب پر بدستور فائز رہنا چاہتی ہو اور اس کے تقاضوں اور اس کے فرائض کو پورا کرتی ہو۔

اس امت کے منصب اور مقام کا پہلا تقاضا یہ ہے کہ وہ اس زندگی کو شر اور فساد سے پاک کر دے اور اس کے پاس اس قدر قوت ہونا چاہئے کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ سرانجام دے سکے۔ اس لئے کہ وہ ایک بہترین امت ہے اور لوگوں کی اصلاح کے لئے نکالا گیا ہے۔ اور وہ خیر امت محض اللہ کی جانب سے کسی مجاہلت یا خصوصی تعلق محبوبیت کی وجہ سے نہیں بنی، نہ ہی اسے خیر امت اتفاقاً بلا مقصد و ارادہ بنادیا گیا ہے، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ حکیم ہے اور اس سے ایسے کام کی توقع نہیں کی جاسکتی، اللہ کے ہاں اعزاز اور شرف ان خام خیالیوں کی بنا پر نہیں ملتا، جن میں یہ اہل کتاب مبتلا ہو گئے تھے اور کہتے تھے نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاءُ” ہم اللہ کے بیٹے ہیں اور اس کے محبوب ہیں۔“ ہرگز نہیں، یہ ایک مثبت عمل تھا، منصوبے کے مطابق انسانیت کو برائی سے بچانا مقصود تھا، اسے معروف قائم کرنا مطلوب تھا، اور ایمانی تصور حیات کے ساتھ جو دنیا میں معروف و منکر کی حدود کو واضح کر دے۔

تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ..... ”نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔“

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دراصل اس بہترین امت کے فرائض ہیں، جن کو لے کر اسے اٹھنا ہے چاہے وہ ان فرائض کی ادائیگی میں تکالیف اٹھانی پڑیں، اس لئے کہ یہ ایک خاردار راستہ ہے۔ اس میں شر کو چیلنج کرنا ہے، لوگوں کو بھلائی کی طرف بلانا ہے اور معاشرے کو شر و فساد کے عوامل و اسباب سے بچانا ہے اور یہ سب کام تھکا دینے والے کام ہیں، لیکن یہ سب کام ایک صالح معاشرے کے قیام اور بچاؤ کے لئے ضروری ہیں نیز اس کے سوا وہ نقوش جم نہیں سکتے جن کے مطابق اللہ تعالیٰ انسانی زندگی کو استوار کرنا چاہتے ہیں۔“

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ساتھ پکا مومن ہونا بھی ضروری ہے، اس لئے اسلامی معاشرے میں حسن و فتح کے پیمانے ایمان ہی کے ترازو کے ساتھ قائم ہوتے ہیں اور معروف اور منکر کی صحیح پہچان ہو سکے۔ اس لئے کہ کسی ایک گروہ کا صالح ہو جانا ہی کافی نہیں، بعض اوقات شر و فساد اس قدر پھیل جاتا ہے کہ معاشرے کی اجتماعی اقدار بدل جاتی ہیں اور ان میں خلل پڑ جاتا ہے۔ اس لئے خیر و شر

کے لئے ایک مستحکم تصور کی ضرورت ہوتی ہے۔ جس میں فضائل اعمال اور ذائل صفات کے اندر اچھی طرح جدائی ہو، معروف منکر سے جدا ہو، اور یہ تصور حیات اصلاح کی کسی مخصوص اسکیم سے علیحدہ ایک دائمی اصول و مبادی پر مبنی ہو۔

اور ظاہر ہے کہ یہ مقاصد صرف ایمان کے نتیجے میں ظہور پذیر ہو سکتے ہیں، یعنی اس کائنات میں صحیح تصور اور اس کائنات کے خالق کے ساتھ اس کا تعلق کے بارے میں صحیح تصور، انسان اور اس کے مقصد وجود کے بارے میں صحیح تصور اور اس کائنات کے اندر انسان کے مقام اور اس کی حیثیت کے بارے میں صحیح تصور۔ پھر ان صحیح تصورات کے نتیجے میں صحیح اخلاقی اصول وجود میں آتے ہیں، جو خدا خونی اور اس کی رحمت و رضا کی امید پر مبنی ہوتے ہیں، اور ان اصولوں کی وجہ سے لوگ ان اخلاقی اصولوں کے قیام پر بخوشی مائل ہوتے ہیں، ان کے دلوں پر اللہ کی حکمرانی ہوتی ہے اور ان کے معاشرے پر اللہ کی شریعت کی حکمرانی ہوتی ہے اور یوں ان اصول و قواعد کی نگہبانی بھی ہوتی رہتی ہے۔

پھر ایمان اس لئے بھی ضروری ہے کہ داعیان خیر، امر کنندگان معروف اور مانعان منکر اس راہ پر خار پر، مشقتیں برداشت کرتے ہوئے ثابت قدمی سے، اس قوت ایمانی کے بل بوتے پر گامزن ہو سکیں۔ خصوصاً جبکہ ان کا مقابلہ شر کے طاغوتوں سے ہو اور یہ طاغوت نوجوان بھی ہو اور تنومند بھی ہو، جبکہ وہ خواہشات نفس کے طاغوت کا مقابلہ کر رہے ہوں اور یہ خواہش اپنی شدت میں ہو اور خوب جوان ہو، جبکہ وہ گری ہوئی ارواح کا مقابلہ کر رہے ہوں جن کے عزائم کند ہو چکے ہوں جن کی شمع امید بجھ چکی ہو اور ایسے حالات میں ان کا زاد راہ صرف ایمانی قوت ہو، ان کا سامان جنگ صرف ایمان ہو اور ان کا تکیہ صرف اللہ پر ہو، ان کی حالت یہ ہو کہ ایمان کے زاد راہ کے سوا تمام توشے ختم ہو چکے ہوں اور ایمان کے ساز و سامان کے سوا تمام ساز و سامان ختم ہو چکے ہیں۔ اور اللہ کے سوا تمام سہارے ایک ایک کر کے گر چکے ہوں۔

اس سے پہلے یہ حکم دیا گیا تھا کہ اے امت مسلمہ تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو سرانجام دے۔ وہاں تو امت پر فریضہ امر بالمعروف و نہی عن

المنکر عائد کیا گیا تھا۔ اب یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ تم خیر امت ہو، تمہاری صفت و خاصیت یہ ہے کہ تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتے ہو، اس میں امت کو یہ اشارہ ہے کہ اگر تمہارے اندر یہ صفت نہ پائی گئی، یا کسی وقت نہ پائی جاتی ہو تو گویا تمہارا حقیقی وجود ہی نہ ہوگا۔ اس لئے کہ انسانی معاشرے میں یہ تمہاری پہچان ہے۔ تم اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ لے اٹھو گے، تو تم موجود تصور ہو گے اور اگر تم یہ فریضہ ترک کر دو گے تو تم معدوم تصور ہو گے، اور گویا صفت ایمان اور اسلام معدوم تصور ہوگی۔

قرآن کریم میں متعدد مقامات پر امت مسلمہ کے اس فریضے کی طرف صراحت اور اشارات کے ساتھ وضاحت کی گئی ہے، جس پر بحث ہم ان مقامات پر کریں گے۔ مگر رسول اللہ ﷺ کی سنت میں بھی بار بار اس فریضہ منصبی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ چیدہ چیدہ احادیث یہاں پیش کروں:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ کہتے سنا: ”تم میں سے جو بھی منکر کو دیکھے تو اسے چاہئے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے زائل کر دے، اگر ایسا نہ کر سکے تو اپنی زبان کے ساتھ، اور اگر اس کی طاقت بھی نہ ہو تو اپنے دل کے ساتھ۔ اور یہ ضعیف ایمان ہے۔“

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جب بنی اسرائیل گناہوں میں پڑ گئے، تو انہیں ان کے علماء نے روکا، اور وہ نہ رکے، تو ان کے علماء نے ان سے ہم نشینی کی، ان کے ساتھ کھاتے پیتے، تو اللہ تعالیٰ نے ان میں سے بعض کے دلوں کو دوسروں کے دلوں کے ساتھ مارا، اور حضرت داؤد علیہ السلام، حضرت سلیمان علیہ السلام، حضرت عیسیٰ ابن مریم علیہا السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی۔“ اس کے بعد آپ ﷺ بیٹھ گئے (اور آپ ﷺ تکیہ لگائے تھے) اور پھر فرمایا: ”ہر گز نہیں! اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے

‘یہاں تک کہ تم انہیں واپس حق کی طرف اچھی طرح پلٹا کر نہ لے آؤ۔“ لفظ تاملروا تعطفوا (موڑو) اور تردوا (یعنی واپس لاؤ) ہے۔ (ابوداؤد۔ ترمذی)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں، فرمایا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ”اس اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ تمہیں معروف کا حکم دینا ہو گا اور تمہیں منکر سے روکنا ہو گا ورنہ قریب ہے کہ اللہ اپنی جانب سے تم پر کوئی عذاب بھیج دے اور پھر صورت حال یہ ہو جائے کہ تم اسے پکارو گے اور وہ تمہاری پکار کا کوئی جواب تمہیں نہ دے۔“ (ترمذی)

اور حضرت عرس بن عمیر کنندی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے فرماتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”جب زمین میں کوئی برائی ہو رہی ہو، تو جو شخص اس وقت اسے دیکھ رہا ہو، اور اس پر نکیر کر رہا ہو تو ایسا ہو گا، جس طرح وہ اس سے غائب ہو، اور جو شخص اس سے غائب ہو لیکن اس پر راضی ہو تو وہ ایسا ہو گا جیسا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہو۔ (ابوداؤد)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، فرماتے ہیں کہ فرمایا، رسول اللہ ﷺ نے حضرت حمزہ شہداء کے سردار ہیں اور وہ شخص شہداء کا سردار ہے جو ظالم بادشاہ کے سامنے کھڑا ہو گیا اسے امر بالمعروف کیا اور اسے منکر سے روکا، اور اس وجہ سے اس نے اس شخص کو قتل کر دیا۔“ (روایت حاکم)

یہ اور اس کے علاوہ دوسری بے شمار احادیث اسلامی سوسائٹی کی اس خصوصیت کو بیان کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ اسلامی معاشرے میں یہ فریضہ اور اس کی ادائیگی اشد ضروری ہے۔ اس صفت کی وجہ سے معاشرے کی راہنمائی اور تربیت کا انتظام ہوتا رہتا ہے، اور قرآنی ہدایت کے حکم ہونے کے علاوہ یہ ایک ایسا توشہ ہے جس کی افادیت سے اور اس کی قدر و قیمت سے ہم بالکل غافل ہیں۔ اس کے بعد اب ہم پہلی آیت کے حصہ آخر کی طرف آتے ہیں۔

وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ مِّنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ..... ”یہ اہل کتاب ایمان لاتے تو اس کے حق میں بہتر ہوتا اگرچہ ان میں کچھ لوگ ایماندار بھی پائے جاتے ہیں مگر ان کے بیشتر افراد نافرمان ہیں۔“

ان فکروں میں اہل کتاب کو ترغیب دی گئی ہے کہ وہ ایمان لے آئیں۔ ایمان ان کے لئے بہتر ہوگا، اس کی وجہ سے ان کو اس تفرقہ بازی اور ہلاکت سے نجات ملے گی جس میں پڑے ہوئے ہیں، وہ اعتقادی تصورات میں بھی فرقہ واریت میں مبتلا تھے اور ان کی شخصیت مجتمع نہ تھی، اس لئے ان کے اعتقادی تصورات کے اندر اس قدر صلاحیت نہ تھی کہ وہ کسی اجتماعی نظام زندگی کی اساس بن سکیں۔ اس وجہ سے کہ ان کے اجتماعی نظام، ان کے اپنے عقائد کے علاوہ دوسرے تصورات پر قائم تھے۔ چنانچہ ان کا اجتماعی نظام ہمیشہ لنگڑا، لولا اور ہوا کے اندر معلق نظام رہا۔ اس کی جڑیں کبھی بھی ان معاشرے کے اندر نہ پھیلیں، جس طرح دنیا کے وہ نظام ہوا میں معلق رہتے ہیں جو کسی مکمل اعتقادی اور نظریاتی اساس پر قائم نہیں ہوتے، جن کی تعمیر ایسے نظریہ حیات پر نہیں ہوتی جو اس کائنات کے معمہ کا مکمل حل پیش کرتا ہو، جو وجود انسانی کے مقاصد نہ متعین کرتا ہو، جو اس کائنات میں انسان کا مقام نہ متعین کرتا ہو، اور ایمان لانا ان کے لئے آخرت میں بھی مفید ہے۔ اس لئے کہ آخرت میں غیر اہل اسلام کا جو برا انجام ہونے والا ہے، اس سے وہ بچ جائیں گے۔

اس آیت میں صاف صاف اعتراف کیا جاتا ہے کہ ان اہل کتاب میں سے بعض لوگ صالح بھی ہیں۔ مِّنْهُمْ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ..... ”ان میں سے بعض اگرچہ مومن ہیں مگر اکثر فاسق ہیں۔“

اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایمان لائے تھے، اور وہ بہت ہی اچھے مسلمان تھے۔ مثلاً عبد اللہ بن سلام، ثعلبہ بن شعبہ اور کعب بن مالک وغیرہ۔ انہی لوگوں کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔ اگرچہ اس آیت میں اجمالی اشارہ ہے اور دوسری آیت میں تفصیلی اشارہ ہے۔ لیکن ان کی اکثریت دین اسلام سے منکر رہی۔ اس لئے انہوں نے اللہ کے اس عہد کو توڑا جو اللہ نے نبیوں سے لیا تھا کہ ان میں سے ہر

ایک دوسرے نبی پر ایمان لائے گا، جو اس کے بعد مبعوث ہوگا، اور اس کی نصرت کرے گا۔ وہ دین اسلام کے نافرمان اس طرح قرار پائے کہ انہوں نے نبی آخر الزمان کے بھیجنے کے سلسلے میں اللہ کے ارادہ اور حکم کے سامنے سر تسلیم خم نہ کیا، محض اس لئے کہ یہ رسول بنی اسرائیل کے قبیلے سے نہ تھا، اور انہوں نے اس رسول کی اطاعت کرتے ہوئے اللہ کی آخری شریعت کے مطابق اپنی زندگی کے فیصلے کرانے کے اعزاز سے بھی اپنے آپ کو محروم رکھا، حالانکہ اللہ کا ارادہ اور فرمان یہ تھا کہ تمام انسانیت اس شریعت کے مطابق زندگی بسر کرے۔

اہل ایمان میں سے بعض لوگ چونکہ بدستور مدینہ کے اہل یہود کے ساتھ روابط قائم کئے ہوئے تھے اور اس وقت تک مدینہ طیبہ میں یہودی ایک برتر قوت تھے، وہ ایک عسکری قوت ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اقتصادی قوت بھی تھے اور اہل اسلام میں بعض لوگ ان کی اس حیثیت کو تسلیم بھی کرتے تھے، اس لئے قرآن کریم نے یہ ضروری سمجھا کہ ان نافرمانوں کو اس حیثیت پر تنقید کر کے مسلمانوں کو ان کی موعوبیت سے نکالا جائے اور ان کے کفر، نافرمانی اور ان کے جرائم کی وجہ سے ان کی حیثیت میں جو کمی واقع ہوئی ہے، اس کا اظہار کیا جائے۔ نیز جس طرح وہ فرقوں میں بٹے ہوئے تھے اور جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان پر ذلت اور خواری مسلط کر دی تھی یہاں اسے واضح طور پر ریکارڈ کر دیا گیا۔

لَنْ يَضُرَّوْكُمْ إِلَّا أَذًى وَإِنْ يُقَاتِلُوْكُمْ يُؤَلُّوْكُمْ الْأَذْبَارُ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ (۱۱۱) ضَرَبَتْ عَلَيْهِمُ الدَّلَّةُ أَيْنَ مَا تُقْفُوا إِلَّا يَجْبِلُ مِنَ اللَّهِ وَجْبِلٌ مِنَ الثَّلَاسِ وَبَاءٌ وَابْعَصَبٌ مِنَ اللَّهِ وَضَرَبَتْ عَلَيْهِمُ الْمُسْكَنَةُ ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْأَنْبِيَاءَ بِعَدْوٍ حَقٌّ ذَلِكَ بِمَا عَصَوْا وَكَانُوا يَعْتَدُونَ

”یہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، زیادہ سے زیادہ بس ستا سکتے ہیں، اگر یہ تم سے لڑیں تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے، پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی، یہ جہاں پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر

چکے ہیں اور ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ اور یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔“

ان آیات میں اللہ مومنین کو فتح و نصرت کی ضمانت دیتے ہیں، اور آخر کار ان کی سلامتی کی بھی صریح ضمانت دیتے ہیں، جب بھی وہ اپنے دشمنوں کے ساتھ میدان جنگ میں آمناسا منا کریں گے یہ ضمانت ان کے لئے موجود ہوگی بشرطیکہ وہ اپنے دین کی رسی کو مضبوطی سے پکڑیں اور اپنے رب پر یقین کریں۔

لَنْ يَضُرَّوْكُمْ إِلَّا أَذًى وَآلٌ يُفَاتِلُوكُمْ يُؤَلُّوْكُمْ الْأَذْبَارُ ثُمَّ لَا يُنْصَرُونَ..... ”یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے زیادہ سے زیادہ بس ستا سکتے ہیں، اگر یہ تم سے لڑیں تو مقابلہ میں پیٹھ دکھائیں گے، پھر ایسے بے بس ہوں گے کہ کہیں سے ان کو مدد نہ ملے گی۔“

اس لئے وہ دعوت اسلامی کو کوئی حقیقی ضرر نہیں پہنچا سکتے، نہ وہ جماعت مسلمہ کی تشکیل میں کوئی اثر اندازی کر سکتے ہیں اور نہ وہ دعوت اسلامی کو اس کرہ ارض سے ختم کر سکتے ہیں۔ ہاں جماعت مسلمہ کے ساتھ جب ان کا تصادم ہوتا ہے تو وہ اذیت دے سکتے ہیں، وہ اس قسم کے عارضی دکھ دے سکتے ہیں جو مرور زمانہ کے ساتھ ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن جب وہ مسلمانوں کے ساتھ میدان جنگ میں مقابل ہوں گے تو ان کے لئے شکست لکھی ہوئی ہے اور آخر کار وہ شکست کھائیں گے، ان کی قسمت میں مسلمانوں کے برخلاف کوئی نصرت نہیں ہے۔ ان کو مسلمانوں کے مقابلے میں کوئی مددگار ملے گا اور نہ وہ مسلمانوں کی زد سے بچ سکیں گے۔ اور یہ اس لئے ہے کہ ان پر ذلت کی زد پڑ گئی ہے اور اس کا یہ انجام بد لکھ دیا گیا ہے، اس لئے وہ جس سر زمین میں بھی ہوں گے وہ ذلیل ہو کر رہیں گے، وہ یا تو اللہ کی ذمہ داری میں رہیں گے اور یا مسلمانوں کی ذمہ داری میں رہیں گے۔ جب وہ مسلمانوں کی ذمہ داری میں داخل ہوں گے تو ان کا مال اور ان کی جان محفوظ ہوگی ماسوائے اس کے کہ ان کے خلاف کوئی حق ثابت ہو چکا ہو، یوں انہیں امن اور اطمینان نصیب ہو گا۔ اس وقت سے لے کر آج تک یہودیوں کو صحیح امن

مسلمانوں کی ذمہ داری کے اندر نصیب ہوا ہے۔ لیکن یہود اس قدر نمک حرام ہیں کہ وہ اس کرہ ارض پر مسلمانوں سے زیادہ اور کسی کے ساتھ دشمنی نہیں رکھتے۔ ”وہ اللہ کا غضب لے کر لوئے ہیں۔ وَبَاءُوا بِعُصْبٍ مِنَ اللَّهِ یعنی گویا وہ در بدر ہوئے مارے مارے پھرتے رہے اور آخر کار اللہ کے غضب کا سامان سروں پر اٹھائے ہوئے لوٹے۔“ وَصُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ..... ”ان پر محتاجی مسلط کر دی گئی۔“ ان کے ضمیر اور شعور میں محتاجی کا احساس رچ بس گیا ہے۔

ان آیات کے نزول کے بعد یہ تمام واقعات یہودیوں کی تاریخ میں انہیں پیش آئے، اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان جو معرکے پیش ہوئے ان میں اللہ نے مسلمانوں کو فتح و نصرت سے سرفراز کیا، جب تک مسلمانوں نے اپنے دین اور اپنے نظام حیات اور اپنے نظریہ حیات کو اپنے سینے سے لگائے رکھا، اور اپنی زندگیوں میں اسلامی نظام حیات قائم رکھا، تو ان کے اعداء کی قسمت میں اللہ تعالیٰ نے ذلت اور خواری کو لکھ دیا۔ الایہ کہ مسلمانوں کے عہد و ذمہ داری کی وجہ سے انہیں چین نصیب ہوا یا یہ کہ خود مسلمانوں نے اسلامی نظام حیات کو ترک کر دیا اور اپنے دین کو چھوڑ دیا۔

قرآن کریم اس بات کا بھی انکشاف کرتا ہے کہ ان لوگوں کی قسمت میں ذلت اور خواری کیوں لکھ دی گئی؟ اس کا سبب کیا ہے؟ تو سبب دراصل ایک عام سبب ہے، جس کے آثار و نتائج ہر قوم پر منطبق ہو سکتے ہیں۔ چاہے وہ دین کے معاملے میں جس قدر اونچے دعوے کرتی ہو۔ ان کی ذلت و خواری کا سبب اللہ کی نافرمانی اور ظلم تھا۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ الْرُسُلَ بِغَيْرِ حَقِّ ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوْا
وَكَانُوا يَعْتَدُونَ

”اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام تھا۔“

لہذا اللہ کی آیات کا سرے سے انکار کر دینا اپنی زندگیوں میں انہیں نافذ نہ کرنا اور ان کے مطابق اپنا نظام عدالت نہ چلانا اور انبیاء کو ناحق قتل کرنا، اور ان لوگوں کو قتل کرنا جو لوگوں میں داعیانِ عدل ہوں جیسا کہ اس سورت کی دوسری آیت میں وارد ہے۔ یعنی صرف نافرمانی اور ظلم کی وجہ سے وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے اور شکست، ذلت اور خواری ان کے مقدر میں لکھ دی گئی۔ اور یہی وہ اسباب ہیں جو آج کل اس کرہ ارض پر مسلمانوں کی بگڑی ہوئی مخرف نسل کے اندر مکمل طور پر پائے جاتے ہیں، وہ نسل جو اپنے اوپر لفظ اسلام کا اطلاق غلط طور پر کر رہی ہے، اور یہی اسباب آج وہ اللہ کے سامنے اپنے کردار کے آئینہ میں پیش کر رہے ہیں، اس لئے اللہ کی جانب سے بھی آج ان کے ساتھ بعینہ وہی سلوک کیا جا رہا ہے جو اللہ نے ان ہی اسباب کی وجہ سے یہودیوں کے ساتھ کبھی کیا تھا، یعنی آج شکست، ذلت اور خواری ان کا مقدر بن چکی ہے۔ جب آج ان میں سے کوئی پوچھتا کہ ہم اس کرہ ارض پر غالب کیوں نہیں ہو رہے، حالانکہ ہم مسلمان ہیں؟ تو یہ سوال کرنے سے پہلے اسے معلوم ہونا چاہئے تھا کہ اسلام ہے کیا؟ اور مسلمان ہوتے کون ہیں؟ پھر وہ یہ سوال کرے۔

بہر حال رسول ﷺ کے وقت اہل کتاب میں کچھ اچھے لوگ بھی تھے۔ اگرچہ تھوڑے تھے، یہ ضروری تھا کہ ان کے ساتھ انصاف کیا جاتا۔ اس لئے آیت بالا کے بیان کردہ کلیہ میں استثناء کی گئی۔ بتایا گیا کہ وہ سب ایک جیسے نہیں ہیں، ان میں سے اچھے مومن بھی پیدا ہوئے ہیں۔ اور ان کا تعلق باللہ بعینہ ایک اچھے مسلمان اور صادق مسلمان کی طرح ہے۔ اس لئے جو اس جزا کے مستحق ہوں گے، جس کے سچے اہل ایمان مستحق ہوئے۔

لَيَسُوا سَوَاءً مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتُلوْنَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ (۱۱۳) يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ (۱۱۴) وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُكْفَرُوهُ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ

”مگر سارے اہل کتاب یکساں نہیں، ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہِ راست پر قائم ہیں، راتوں کو اللہ کی آیات پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور وہ جو نیکی بھی کریں گے اس کی نافرمانی نہ کی جائے گی، اللہ پر ہیزگار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔“

یہ اہل کتاب مومنین کی ایک روشن تصویر ہے۔ ان میں سے بعض لوگوں نے سچائی کے ساتھ ایمان قبول کیا اور یہ ایمان ان کے دلوں میں گہرائی تک اتر گیا۔ پھر یہ ایمان پوری طرح کامل اور شامل تھا۔ یہ لوگ اسلامی صفوں میں شامل ہو گئے اور دینِ اسلام کے محافظ بن گئے۔ اللہ اور روزِ قیامت پر ایمان لے آئے۔ انہوں نے ایمان کے تقاضے پورے کئے، اور جس امت کا وہ جزء بن گئے تھے، اس کی اساسی خصوصیت کے مطابق کام شروع کر دیا، یعنی یہ خصوصیت کہ وہ خیر امت ہے۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضے پر کاربند ہو گئے، اس سے پہلے بھی ان کے نفوس خیر طلب تھے، انہوں نے بھلائی کے میدان میں ایک دوسرے کی مسابقت کی۔ ایک دوسرے سے آگے بڑھے۔ اس لئے عالمِ بالا سے ان کے حق میں یہ شہادت نازل ہوئی کہ یہ لوگ یقیناً صالحین میں ہیں۔ اور ان کے ساتھ یہ سچا وعدہ کیا جاتا ہے کہ ان کا کوئی حق نہ مارا جائے گا۔ نہ ہی ان کا کوئی حق روکا جائے گا۔ اور یہ بھی کہہ دیا گیا کہ اللہ کو اچھی طرح علم ہے کہ وہ متقین میں سے ہیں۔

یہ ایک تصویر ہے جو یہاں اس لئے دکھائی جا رہی ہے کہ جن لوگوں کی یہ خواہش ہو کہ وہ اپنے حق میں یہ شہادت قلمبند کرالیں وہ اسے اس روشن افق پر دیکھیں اور اپنے اندر یہ اوصاف پیدا کریں۔

یہ تو ایک محاذ ہے، دوسری جانب کافر ہیں، وہ کافر جنہیں ان کی دولت کچھ فائدہ نہیں دے رہی ہے۔ جن کے لئے ان کی اولاد بھی مفید نہیں ہے۔ پھر دنیا میں انہوں نے جو کچھ بھی خرچ کیا وہ ان کے لئے مفید نہیں ہے۔ قیامت کے دن اس انفاق کا انہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا، کیوں؟ اس لئے کہ یہ انفاق بھلائی کے اس خطِ مستقیم کے ساتھ جڑا ہوا نہیں ہے، جو اللہ نے کھینچا ہے۔ یعنی وہ بھلائی جو ایمان اور اسلامی

نظریہ حیات پر مبنی ہو، جس کا تصور واضح ہو، جس کا ہدف مستقل ہو اور جن کی راہ اللہ تک جاری ہو، ورنہ پھر بھلائی کا ایک عارضی جذبہ کبھی کبھار پیدا ہو جائے گا مگر وہ مستقل نہ ہو گا، اور وہ ایک ایسا جھکاؤ ہو گا جس کے رخ کو معمولی آندھی پھیر سکے گی۔ وہ کسی واضح، قابل فہم اور ٹھوس بنیاد پر نہ ہو گا نہ اس کا کسی مکمل اور جامع اور سیدھے نظام حیات سے ربط ہو گا۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِي عَنْهُمْ أَهْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (۱۱۶) مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ أَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ

”رہے وہ لوگ جنہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا تو اللہ کے مقابلے میں نہ ان کا مال کچھ کام دے گا، نہ اولاد وہ تو آگ میں جانے والے لوگ ہیں۔ اور آگ ہی میں ہمیشہ رہیں گے۔ جو کچھ وہ اپنی اس دنیا کی زندگی میں خرچ کر رہے ہیں اس کی مثال اس ہوا کی سی ہے جس میں پالا ہوا اور وہ ان لوگوں کی بھتی پر چلے جنہوں نے اپنے اوپر ظلم کیا ہے اور اسے برباد کر کے رکھ دے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا درحقیقت یہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔“

یوں اس حقیقت کو ایک ایسے منظر کی صورت میں پیش کیا جاتا ہے، جس میں حرکت ہی حرکت ہے۔ اور یہ حرکت زندگی سے بھرپور ہے اور یہ قرآن کا حسین و جمیل طرزِ تعبیر ہے، جس میں ایک نظری حقیقت بھی متحرک نظر آتی ہے۔“

ان کفار کے اموال اور ان کی اولاد اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ کام نہ آئے گی، وہ اپنے جرائم کا جرمِ ادا نہ کر سکیں گے، اس لئے کہ وہاں نہ زور چلے گا اور نہ زر۔ یہ لوگ جہنمی ہیں اور وہ دنیا میں جو مال بھی خرچ کرتے ہیں وہ اکارت ہو جائے گا اور بے اثر ہو گا۔ اگرچہ انہوں نے جن کاموں میں مال خرچ کیا وہ اسے کارِ خیر سمجھتے ہیں۔ اس لئے کہ خیر وہی ہوتی ہے جس کی کو نیلیں شاخِ ایمان سے پھوٹیں اور جن کا

تعلق ایمان سے ہو، لیکن قرآن کریم اس کی تعبیر اس طرح نہیں کرتا جس طرح ہم کرتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو ایک زندہ اور متحرک منظر کی صورت میں پیش کرتا ہے، جو نبض کی طرح متحرک ہو۔

ہم ایک ایسے مقام پر کھڑے ہیں جس کے سامنے ایک ہر ابھرا کھیت ہے، اس کی فصل کٹائی کے لئے تیار ہے۔ کھیت لہلہا رہا ہے۔ اچانک تیز ہوا چلتی ہے، یہ نہایت سرد برفانی ہوا ہے، شدید سردی کی وجہ سے تیار فصل جل جاتی ہے، یہ دیکھا گیا ہے کہ شدت برودت کی وجہ سے فصل جھلس جاتی ہے۔ الفاظ اسی طرح استعمال ہوئے ہیں کہ گویا اس کھیت پر بڑی تیزی اور قوت کے ساتھ سنگ باری ہوتی ہے اور پورے پورے کھیت کو برباد اور خراب کر دیا جاتا ہے۔

چشم زدن میں یہ پورا عمل سرانجام پاتا ہے۔ آناً فاناً کھیت ملیا میٹ اور خراب ہو جاتا ہے۔ یہی مثال اس دنیا میں ان لوگوں کے انفاق کی ہے جو کافر ہیں، اگرچہ وہ بظاہر کار خیر اور اچھے مقاصد میں خرچ کرتے ہیں نیز ان لوگوں کے اموال اور اولاد بھی کچھ کام نہ دیں گے۔ قیامت میں سب کے سب بے کار ہوں گے۔ وہ وہاں نہ کوئی حقیقی دولت ہوں گے اور نہ ان پر کوئی جزاء ہوگی اور نہ مفید بن سکیں گے۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَكِنْ أَنْفُسُهُمْ يَظْلِمُونَ..... ”اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا، وہ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے ہیں۔“ خود انہوں نے اس نظام زندگی سے روگردانی کی جو تمام انفرادی بھلائیوں اور اچھائیوں کو جمع کرنے والا ہے، ان کو ایک خط مستقیم پر لاتا ہے اور مستحکم کر کے ایک مرکز تک پہنچاتا ہے۔ جس کا ایک مقرر ہدف ہے، ایک قابل فہم داعیہ ہے، اس میں نیکی کا ایک خاص طریق کار ہے، اس میں نیکی کو کسی عارضی جذبے یا کسی پوشیدہ خواہش اور یا کسی بے ربط عمل کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا جاتا بلکہ اس میں نیکی اور بھلائی ایک مستقل دائمی منہاج کے مطابق سرانجام دی جاتی ہے۔

ان لوگوں نے خود اپنے لئے گمراہی اور نافرمانی کا راستہ اختیار کیا، انہوں نے اللہ کی رسی کی حفاظت سے منہ موڑا، جس کی وجہ سے ان کے تمام اعمال اکارت گئے، یہاں تک کہ جو مال انہوں نے بظاہر

کار خیر میں صرف کئے وہ بھی ضائع ہوئے۔ جب ان کا کھیت بھی تباہ ہو گیا، تو پھر ان کا مال ان کے کس کام اور ان کی اولاد ان کے کس کام؟ یہ ظلم انہوں نے خود اپنے آپ پر کیا ہے۔ اس لئے کہ انہوں نے خود نافرمانی اور روگردانی کا راستہ اپنے لئے اختیار کیا۔

غرض یہ فیصلہ کن بات ہے کہ کوئی انفاق فی سبیل اللہ اور کوئی عمل صالح اس وقت تک مفید نہیں ہے جب اس کا رابطہ ایمانی منہاج سے نہ ہو، جب تک وہ ایمانی داعیہ پر مبنی نہ ہو۔ یہ فیصلہ اللہ کا ہے، یہ اللہ کا کہنا ہے لہذا اس میں انسان کے لئے کچھ کہنے کا کوئی موقع باقی ہی نہیں رہتا۔ اس فیصلے کو وہی لوگ چیلنج کر سکتے ہیں جو اللہ کی آیات کو چیلنج کرتے ہیں، لیکن ان کا یہ چیلنج علم و دانش پر مبنی نہیں ہوتا۔ وہ ہدایت پر مبنی ہوتا ہے، نہ کتاب الہی کے روشن دلائل پر۔



یہ سبق جس کا آغاز اہل کتاب کے طرز عمل میں انحراف اور بگاڑ سے ہوا تھا، جس میں بتایا گیا تھا کہ اہل کتاب کے جدال و مناظرے میں کیا کیا مغالطے ہیں، جس میں تفصیلاً بتایا گیا کہ یہ اہل کتاب مسلمانوں کے خلاف کیا کیا سازشیں کر رہے ہیں، جس میں جماعت مسلمہ کو بتایا گیا تھا کہ اس کرۂ ارض پر اس کے فرائض اور ذمہ داریاں کیا ہیں، قطع نظر اس سے کہ یہ فاسق، بگڑے ہوئے لوگ جو محاربہ کر رہے ہیں وہ کیا کہتے ہیں۔ اس سبق کے آخر میں جو اس پوری سورت میں طویل سبق ہے، جماعت مسلمہ کو بڑی سختی سے ڈرایا جاتا ہے کہ وہ ہر گز ان لوگوں کے ساتھ خفیہ دوستی نہ رکھے جو اس کے قدرتی دشمن ہیں۔ اس کے لئے یہ مناسب نہیں کہ وہ ان دشمنوں کو اپنا راز دان بنائے یا ان پر بھروسہ کرے، جبکہ وہ ان تمام لوگوں کے بھی پکے دشمن ہیں جو ایمان لائے ہیں۔ اللہ کی جانب سے آئی ہوئی یہ تنبیہ اور تحذیف ایک دائمی اصول ثابت ہوتی ہے اور ہم اس کا مصداق آج بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی شکل ہے جسے قرآن کریم نے ایک زندہ جاوید صورت میں قلم بند کیا ہے لیکن قرآن کے حاملین آج اس سے غافل ہیں۔ چنانچہ ان کی اس غفلت کی وجہ سے ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ رہے ہیں اور

آئندہ بھی وہ یقیناً شر و فساد سے دوچار ہوں گے اور ان سے توہین آمیز سلوک کیا جائے گا، اگر وہ نہ سمجھے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بَطَانَةً مِنْ دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا
وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ قَدْ
بَيَّنَّا لَكُمْ الْآيَاتِ إِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُونَ (۱۱۸) هَا أَنْتُمْ أَوْلَاءُ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا
يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَصَوْا
عَلَيْكُمْ الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُؤْتُوا بِغَيْظِكُمْ إِنْ أَرَادَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ بَدَاتِ
الضُّدُورِ (۱۱۹) إِنْ تَمَسَّسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ
يَفْرَحُوا بِهَا وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ اللَّهُ بِمَا
يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ (۱۲۰)

”اے ایمان لانے والو! اپنی جماعت کے لوگوں کے سوا دوسروں کو اپنا راز دار نہ بناؤ۔ وہ تمہاری خرابی کے کسی موقع سے فائدہ اٹھانے میں نہیں چوکتے۔ تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔ ہم نے تمہیں صاف صاف ہدایات دے دی ہیں، اگر تم عقل رکھتے ہو (تو ان سے تعلق رکھنے میں احتیاط برتو گے) تم ان سے محبت رکھتے ہو مگر وہ تم سے محبت نہیں رکھتے۔ حالانکہ تم تمام کتب آسمانی کو مانتے ہو۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی (تمہارے رسول اور تمہاری کتاب کو) مان لیا ہے، مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف ان کا غیض و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ اپنے غصے میں آپ جل مرو، اللہ دلوں کے چھپے ہوئے راز تک جانتا ہے۔ تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے اور تم پر کوئی مصیبت آتی

ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔ مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو۔ جو یہ کچھ کر رہے ہیں اللہ اس پر حادی ہے۔“

یہ ایک مکمل تصویر ہے، جو نفس انسانی کی اندرونی کیفیات کی مظہر ہے۔ جو انسان کے ظاہری خدوخال کو بھی پیش کرتی ہے اور اس کی باطنی کیفیات کو اچھی طرح دکھاتی ہے اور انسان کے ظاہری تاثرات کو بھی دکھاتی ہے اور انسان کی آنے اور جانے والی حرکات کا اظہار بھی اس سے ہوتا ہے۔ اس تصویر میں ایک ایسے انسان کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے جو آئے دن ہر جگہ اور ہر زمانے میں ہماری نظروں کے سامنے آتا رہتا ہے اور جماعت مسلمہ کے ارد گرد پھیلے ہوئے دشمنوں میں کل بھی یہ نمونے نظر آتے تھے اور آج بھی نظر آتے ہیں۔ یہ ایسے نمونے ہیں کہ جب مسلمانوں کا غلبہ نصیب ہو تو وہ ان کے دوست بن جاتے ہیں لیکن ان کے دل کی ہر دھڑکن ان کی تکذیب کرتی ہے اور ان کا ہر عضو ان کو جھٹلاتا ہے لیکن مسلمان ان سے دھوکہ کھاتے ہیں اور وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور ان پر اعتماد کرتے ہیں لیکن اس کے مقابلے میں وہ لوگ مسلمانوں کے لئے صرف بے چینی اور ناکامی ہی کو پسند کرتے ہیں اور وہ مسلمانوں کو نافرمان بنانے اور ان کے راستوں میں کانٹے بچھانے میں کوفرو گزاشت نہیں کرتے۔ وہ ہر وقت ان کے خلاف سازشیں کرتے ہیں جب بھی انہیں فرصت ملے چاہے رات کو ملے یا دن کو ملے۔

یہ تصویر جس کے عجیب خدوخال قرآن کریم نے بتائے ہیں، اور جس کا اطلاق سب سے پہلے ان اہل کتاب پر ہوتا تھا جو مدینہ میں مسلمانوں کے پڑوس میں رہتے تھے۔ یہ ایسی تصویر ہے جو اپنے فیچرز سے اس بات کا اظہار کر رہی ہے کہ یہ لوگ اسلام اور اہل اسلام کے خلاف جو پے پناہ کینہ اپنے دلوں میں رکھتے تھے وہ اسے چھپا رہے تھے۔ یہ رات دن مسلمانوں کے خلاف سازشیں تیار کر رہے تھے، اور مسلمانوں کی نسبت ان کی نیت میں ہر وقت کھوٹ پایا جاتا تھا۔ اور ان کے ان پوشیدہ جذبات میں ہر وقت ابال آتا رہتا تھا، اس کے برخلاف سادہ دل مسلمانوں کی یہ حالت تھی کہ ابھی تک ان میں سے بعض لوگوں کو ان کے بارے میں غلط فہمی تھی، بعض لوگ ابھی تک ان کے لئے اپنے دل میں محبت

رکھتے تھے، اور ابھی تک ان کو یہ اطمینان تھا کہ اگر ہم ان کو کوئی راز بتادیں تو وہ انہیں بطور امانت محفوظ رکھیں گے۔ اس لئے انہوں نے ان اہل کتاب میں سے بعض لوگوں کو جگری دوست، ساتھی اور رازدان بنالیا تھا اور وہ جماعت کے اندرونی راز تک انہیں بتانے سے نہ چوکتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے انہیں یہ روشنی دی گئی جس میں جماعت مسلمہ نے ان کے اندروں کو دیکھ لیا اور حقیقت سے آگاہ ہو گئے۔ اور اس روشنی کے ساتھ انہیں یہ سخت تنبیہ کی گئی اور انہیں اپنے ان قدرتی دشمنوں کے خفیہ منصوبوں اور سازشوں سے آگاہ کیا گیا، اور یہ بتایا گیا کہ وہ ایسے دشمن ہیں جو کبھی ان کے لئے مخلص نہیں ہو سکتے، مسلمانوں کی جانب سے محبت اور ہم نشینی ان کے اس دلی بغض کو صاف نہیں کر سکتی، یہ تبصرہ اور یہ تنبیہ اسلامی تاریخ کے کسی خاص دور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ یہ ایک دائمی حقیقت ہے، یہ ایک دائمی صورت حال کا مقابلہ ہے اور اس کا مصداق ہم اپنے موجودہ دور میں ایک کھلے مشاہدے کے بطور پر اپنے سامنے پاتے ہیں۔

آج مسلمان اپنے رب کریم کے اس حکم سے غافل ہیں، اس نے حکم دیا ہے کہ وہ اپنے سوا کسی کے ساتھ دوستی نہ رکھیں خصوصاً ایسے لوگوں کے ساتھ جو ان کے مقابلے میں اپنی اصلیت کے اعتبار سے بھی کم تر ہیں، نظام زندگی کے اعتبار سے بھی کم تر ہیں اور اپنے وسائل کے اعتبار سے بھی کم تر ہیں۔ اس لئے انہیں چاہئے کہ وہ ان پر اعتماد نہ کریں، ان کو رازدان نہ بنائیں اور ان سے کوئی مشورہ نہ لیں۔ لیکن مسلمانوں کی غفلت کی انتہاء ہے کہ وہ اپنے رب حکیم کا یہ مشورہ بھول چکے ہیں اور ایسے لوگوں کو انہوں نے اپنے لئے ہر معاملے میں مشیر اور مرجع بنایا ہوا ہے۔ ہر معاملے میں ہر موضوع پر اور ہر مسئلے کے بارے میں ہر سوچ میں ہر فکر میں ہر منہاج میں اور ہر طریقہ کار میں انہوں نے ان لوگوں کو اپنا استاد و مرشد بنا رکھا ہے۔

اللہ کی اس سخت تنبیہ و تحویف سے آج مسلمان غافل ہیں، وہ ان لوگوں سے دوستی کر رہے ہیں جو اللہ اور رسول کے دشمن ہیں، انہوں نے اپنے دل و دماغ کے دریچے ان دشمنوں کے لئے وا کر دیئے ہیں

‘حالانکہ اللہ تعالیٰ پہلی جماعت مسلمہ سے بھی کہتے ہیں اور آج کی جماعت مسلمہ کو بھی کہتے ہیں اور ہر دور کی جماعت مسلمہ کو بھی کہتے ہیں اور آگاہ کرتے ہیں۔

وَمَا غَنِيَتْكُمْ قَدْ بَدَتْ الْبُعْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ

”تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہی ان کو محبوب ہے۔ ان کے دل کا بغض ان کے منہ سے نکلا پڑتا ہے اور جو کچھ وہ اپنے سینوں میں چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے شدید تر ہے۔“

اور اللہ تعالیٰ مزید فرماتے ہیں:

هَآ أَنتُمْ أَوْلَىٰ تُحِبُّوهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَإِذَا خَلَوْا عَصَوْا عَيْتَكُمْ الْأُنَاثِلَ مِنَ الْغَيْظِ

”اور تم ان سے محبت رکھتے ہو؟ مگر وہ تو تم سے محبت نہیں رکھتے، حالانکہ تم تمام کتب سماوی کو ماننے ہو، جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے بھی مان لیا ہے، مگر جب جدا ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف ان کے غیظ و غضب کا یہ حال ہوتا ہے کہ اپنی انگلیاں چبانے لگتے ہیں۔

اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

إِنْ تَمَسَّسْكُمْ حَسَنَةً تَسْؤُهُمْ وَإِنْ تُبْغِكُمْ سَيِّئَةً يَفْرَحُوا بِهَا..... تمہارا بھلا ہوتا ہے تو ان کو برا معلوم ہوتا ہے اور اگر تم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو یہ خوش ہوتے ہیں۔“

بارہا ہم تجربات کے تھیٹھے کھاتے ہیں، مگر ہمیں ہوش نہیں آتی، بارہا ہم پر سازشوں اور تخریب کاریوں کا انکشاف ہوتا ہے، جو مختلف بھیس بدل کر کی جاتی ہیں، مگر ہم عبرت حاصل نہیں کرتے، بارہا ان دشمنوں کی زبان پر ایسی باتیں آ جاتی ہیں جن سے ان کے دلی کینہ کا اظہار ہوتا ہے، جسے مسلمانوں کی مسلسل محبت اور دوستی کے مساعی زائل نہ کر سکیں اور جسے مسلمانوں کی دینی رواداری بھی

صاف نہ کر سکی، لیکن ہم پھر بھی وہی کچھ کرتے ہیں اور ان کے لئے اپنے دل کھول دیتے ہیں، ان میں سے دوست چن لیتے ہیں اپنی زندگی میں بھی اور اپنے نظام زندگی میں بھی۔ اور ان لوگوں کے ساتھ ہماری رواداری اس حد تک پہنچ جاتی ہے یا ہماری روحانی شکست کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے نظریہ حیات میں بھی ان کے ساتھ مجاہلت اور مد اہنت کرتے ہیں اور اس رواداری یا روحانی شکست کی وجہ سے ان کے سامنے اپنے نظریہ حیات کے ذکر سے بھی ڈرتے ہیں، ان کے ساتھ ہم اپنے نظام حیات میں بھی رواداری کرتے ہیں اور اسلامی نظریہ حیات کی اساس پر استوار نہیں کرتے، ان کی خاطر ہم اپنی تاریخ میں بھی تحریف کرتے ہیں، اپنے نشانات راہ ان کی خاطر مٹاتے ہیں تاکہ اس تاریخ کے بیان میں ان معرکوں کا ذکر نہ آجائے جن میں ہمارے اسلاف نے ان کے خلاف کامیابیاں حاصل کیں۔ یہی ذہنی شکست ہے جس کی وجہ سے ہم پر وہ عذاب نازل ہوتا ہے، جو ہر اس قوم پر نازل ہوتا ہے جو اللہ کے امر سے سرتابی کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ذلیل و خوار ہوتے ہیں، ہم ضعیف و ناتواں ہوتے ہیں اور ہم شرمندہ اور نامراد ہوتے ہیں اور ہمیں وہ نقصان پہنچ جاتا ہے جس پر ہمارے دشمن خوش ہوتے ہیں اور ہم اس ناکامی اور خرابی سے دوچار ہوتے ہیں، جس کی سازش وہ ہماری صفوں کے اندر کرتے ہیں۔

لیکن دیکھو، ہماری یہ کتاب ہمیں وہ طریقہ بتاتی ہے کہ کس طرح ہم ان دشمنوں سے جان بچائیں، جس طرح اس کتاب نے یہ سبق پہلی جماعت اسلامی کو بھی سکھایا تھا، کس طرح ہم ان ایذا رسانیوں سے بچیں گے، کس طرح ہم اس کینہ سے محفوظ ہوں گے جو ہمارے خلاف ان کے دلوں میں چھپا ہوا ہے اور کبھی کبھار اس کی چنگاری ان کے منہ سے نکل جاتی ہے۔

وَإِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ..... ”مگر ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہیں ہو سکتی بشرطیکہ تم صبر سے کام لو اور اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو، جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ ان پر حاوی ہے۔“

تو وہ طریقہ صبر اور عزم کا طریقہ ہے اور ان کے مقابلے میں ڈٹ جانے کا طریقہ ہے۔ (اگرچہ وہ بہت ہی طاقتور ہوں) اور ان کی مکاری اور سازشوں کے مقابلے میں جم جانے کا طریقہ ہے۔ اگر وہ

سازشوں اور خفیہ ریشہ دوانیوں کا طریقہ اپنائیں تو ہمارا طریقہ صبر اور اپنے نظریہ حیات پر پختگی سے جم جانے کا طریقہ ہو گا۔ بہہ جانے، ختم ہو جانے اور دوسروں کے مقابلے میں ذلیل ہونے کا طریقہ نہیں ہو گا۔ نہ یہ کوئی صحیح پالیسی ہے کہ دشمنوں کو خوش کرنے کے لئے یا ان کے متوقع شر و فساد کی وجہ سے ہم اپنے تمام نظریات یا بعض نظریات کو ترک کر دیں۔

دشمنان اسلام کے مقابلے میں وہ دوسرا طریق کار خدا خونی کا طریق کار ہے۔ صرف ایک اللہ سے ڈرنا اور صرف اس کی نگرانی کا احساس رکھنا، تقویٰ اور اللہ خونی ہی وہ ذریعہ ہے جس سے انسانی دل اپنے رب سے مربوط ہو جاتے ہیں، ان کا تعلق صرف ان لوگوں سے ہوتا ہے جو اس اللہ کے نظام میں داخل ہوتے ہیں اور وہ صرف اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ جب ایک دل ذات باری کی معرفت حاصل کر لیتا ہے تو پھر اس کے اندر سے اللہ کے سوا تمام دوسری قوتوں کا خوف دور ہو جاتا ہے اور جس قدر عزم پختہ ہو جاتا ہے اسی قدر اللہ سے یہ رابطہ مضبوط ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے وہ کسی کے سامنے نہیں جھکتا۔ اور نہ ان لوگوں کے ساتھ دوستی کرتا ہے جو اللہ اور اس کے رسول کے دشمن ہیں۔ محض اپنی جان بچانے کے لئے یا دنیاوی عزت و ناموس کمانے کے لئے۔

مسلمانوں کے لئے یہی ایک راستہ ہے، صبر و تقویٰ کا راستہ اور اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ تھام لینے کا راستہ اور اسلامی تاریخ میں مسلمانوں نے جب بھی تاریخ اسلام میں صرف ایک اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑا اور اپنی پوری زندگیوں میں اسلامی نظام حیات اختیار کیا، تو انہوں نے عزت و وقار کا مقام پایا، وہ کامران رہے، اور اللہ نے انہیں دشمنوں کی سازشوں سے بچایا، ان کا کلمہ بلند ہوا، اور اپنی تاریخ میں مسلمانوں نے جب بھی اپنے قدرتی اعداء کی رسی کو تھاما، وہ اعداء جو ان کے نظریہ حیات کے مقابلے میں خفیہ اور اعلانیہ طور پر باغیانہ جدوجہد میں مصروف ہیں، اور جب کبھی مسلمانوں نے ان اعداء کے مشوروں پر کان دھرا اور انہوں نے خفیہ طور پر یا ظاہری طور پر دوست بنایا اور انہیں اپنا معاون، مشیر اور ماہر فن بنایا تو اللہ تعالیٰ نے ایسے مسلمانوں کی تقدیر میں شکست لکھ دی، ان کے دشمنوں کو ان کی سر زمین میں قوت دی، ایسے مسلمانوں کو ان کے مقابلے میں ذلیل کیا اور وہ نہایت ہی برے

انجام تک پہنچتے رہے۔ اسلامی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ اصول اٹل ہے۔ یہ اس کی ایسی سنت ہے جس میں کوئی تغیر ممکن نہیں ہے، اور جو شخص اس کرۃ ارض پر اللہ کی اس بار بار دہرائے جانے والی سنت کا مشاہدہ نہیں کرتا تو اس کی آنکھیں صرف ذلت، کمزوری اور توہین اور ناتوانی کے آثار ہی کا مشاہدہ کر سکیں گی۔



اس جملے پر یہ سبق اختتام پذیر ہوتا ہے اور اس سورت کا حصہ اول بھی یہاں اختتام پذیر ہو جاتا ہے۔ اہل کفر کے ساتھ معرکہ یہاں زوروں پر ہے اور اہل اسلام اور اہل کفر کے کیمپ یہاں آکر مکمل طور پر ایک دوسرے سے جدا ہو گئے ہیں۔

اس سبق کو ختم کرنے سے پہلے ایک دوسری حقیقت بھی نوٹ کر لینے کے قابل ہے۔ وہ یہ کہ اسلام اپنے خالص اور کھلے دشمنوں کے ساتھ بھی پوری رواداری برتتا ہے وہ ابھی اہل اسلام کو صرف یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ اہل کفر کے ساتھ خفیہ دوستی نہ رکھیں لیکن وہ اہل اسلام کو یہ حکم نہیں دیتا کہ وہ کفار کے ساتھ دھوکہ کریں، ان کے ساتھ کینہ رکھیں، یا ان سے نفرت کریں یا ان کے خلاف مکاری اور سازشوں کا اسلوب اختیار کریں۔ اسلام صرف انہیں یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو بچائیں اور اسلامی اتحاد کا دفاع کریں اور اسلامی تشخص کو قائم رکھنے کی تدبیریں کریں یعنی اسلام نے صرف انہیں خطرے سے آگاہ کیا، اپنے دفاع کی طرف انہیں متوجہ کیا اور وہ خطرہ انہیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے تھا۔ اور اس میں ان کے تمام دشمن شریک تھے۔

رہے اہل اسلام تو وہ اسلامی رواداری کے مطابق دوسرے لوگوں کے ساتھ معاملہ کرتے ہیں، لوگوں کے ساتھ ان کا رویہ پاکیزگی اور صفائی پر مبنی ہوتا ہے، وہ لوگوں کے ساتھ بھلائی سے اور محبت کرتے ہوئے ملتے ہیں، وہ اپنے آپ کو سازشوں سے بچاتے ہیں مگر خود کسی کے خلاف سازشیں نہیں کرتے، وہ دوسروں کے کینہ سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں لیکن خود ان کے دل میں کسی کے ساتھ کینہ

نہیں ہوتا، الا یہ کہ دوسرے ان کے دین اور نظام حیات کے خلاف بغاوت اور دشمنی کر رہے ہوں، وہ ان کے نظریہ حیات میں فتنہ انگیزی کر رہے ہوں، اور لوگوں کو اللہ کے صراطِ مستقیم پر آنے کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتے ہوں، اگر ایسے حالات ہوں تو پھر مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ ایسے جنگجو دشمنوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہوں، تاکہ فتنے کو روکا جائے اور ان رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو راہِ خدا میں کھڑی کر دی گئی ہوں۔ اور اسلامی نظام کے قیام کے لئے سدا راہ ہوں، ہاں ایسے لوگوں کے ساتھ جہاد بھی جہاد فی سبیل اللہ ہوگا۔ صرف ذاتی مقاصد یا ذاتی انتقام کے لئے نہ ہوگا، یہ جہاد پوری انسانیت کی بھلائی کے لئے ہوگا، صرف ان لوگوں کی ذات کے خلاف نہ ہوگا، جنہوں نے اسلام کی راہ کو روکا۔ اور یہ اس لئے ہوگا کہ اسلامی نظام زندگی کا پیغام جو خیر ہے لوگوں تک بے روک ٹوک پہنچ سکے۔ اس لئے جہاد و قتال نہ ہوگا کہ مجاہدین دنیا میں تغلب حاصل کریں، انہیں اس کرۂ ارض پر سر بلندی نصیب ہو اور وہ لوگوں کا استحصال کریں، بلکہ مقصد صرف یہ ہوگا کہ اسلام کا نظام زندگی قائم کیا جائے جس کے عادلانہ سایہ تلے سب لوگ انصاف کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں، یہ جہاد کسی قوم کا علم بلند کرنے کے لئے نہیں ہے اور نہ ہی دنیا میں امپر یلزم کے قیام کے لئے شروع کیا جاتا ہے۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کی تائید قرآن و سنت کی متعدد نصوص سے ہوتی ہے، پہلی جماعت اسلامی کی تاریخ اس کی ترجمان ہے۔ اور یہ جماعت تو بہر حال اس دنیا میں ان نصوص کے مطابق زندگی گزار رہی تھی۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلامی نظام زندگی، بھلائی ہی بھلائی ہے۔ جو لوگ اسلامی نظام کی راہ روکتے ہیں وہ پوری انسانیت کے دشمن ہیں، اور اسلامی نظام کا یہ فرض ہے کہ وہ ان کا پیچھا کرے اور ایسے لوگوں سے انسانیت قیادت چھین لے، اور یہی وہ فریضہ ہے جس کے لئے اسلامی جماعت اور خیر امت کو اٹھایا گیا ہے۔



درس ۲۱ ایک نظر میں

اس سے پہلے اس سورت میں ہم مناظرہ اور مباحثہ کے میدان میں تھے، بیانات اور تبصرے ہو رہے تھے، ہدایات اور تنبیہات کا ذکر تھا، لیکن اس دوسرے سبق میں ہم کلام و بیان کے میدان سے نکل کر اب سیف و سنان کے میدان جا اترے ہیں۔ سیف و سنان کا یہ معرکہ احد کے نام سے مشہور ہے۔

غزوہ احد صرف میدان جنگ میں ہی نہیں لڑا گیا اس معرکہ کا میدان بہت ہی وسیع تھا یہ انسانی ضمیر اور عقائد کے اندر بھی برپا ہوا تھا، میدان جنگ تو اس کے وسیع کارزار کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا۔ یہ معرکہ نفس انسانی کی گہرائیوں میں انسان کے تصورات اور اس کے شعور میں انسانی خواہشات اور اس کے میلانات میں اور اس کے اقدامات اور اس کی رکاوٹوں میں برپا تھا۔ اس معرکہ کے اندر قرآن کریم نے نفس انسانی کی تربیت نہایت ہی لطیف گہرے، موثر اور جامع طریقہ تربیت کے مطابق کی اور اس پر قرآن نے ان دشمنوں پر زیادہ توجہ دی جو میدان معرکہ میں اسلام کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔

اس معرکہ میں داخل ہوتے ہیں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی لیکن انجام کار یہ فتح شکست میں بدل گئی۔ آغاز فتح مبین سے ہوا اور انجام ہزیمت اور شکست و ریخت سے ہوا، لیکن اس شکست و ریخت کے نتیجے میں مسلمانوں کو علم و معرفت و واقفیت اور تجربے کے میدان میں واضح فتح نصیب ہوئی، ان کی آنکھیں کھل گئیں، انہوں نے اپنی آنکھوں سے وہ حقائق دیکھ لئے جنہیں قرآن نے بار بار بیان کیا تھا۔ ان کا شعور ان حقائق کے حوالے سے یقین کی حد تک پختہ ہو گیا، ان کے نفوس پاک ہو گئے، ان کی صفوں میں گندے عناصر چھٹ کر الگ ہو گئے، اور جماعت مسلمہ آگے بڑھنے لگی۔ وہ ان لوگوں کے بوجھ سے آزاد ہو گئی جن کے نظریات صاف ستھرے نہ تھے، جن کی اقدار حیات ناپختہ تھیں، جن کی فکر ڈانواؤں کی تھی۔ یہ مسئلہ یوں حل ہوا کہ اسلامی صفوں سے منافقین کی اکثریت چھٹ کر الگ ہو گئی، نفاق کی علامات واضح ہو کر سامنے آ گئیں اور سچائی کے اوصاف نکھر کر واضح ہو گئے۔ اقوال میں بھی اور افعال

میں بھی۔ شعور میں بھی اور طرز عمل میں بھی اس معرکے کے نتیجے میں یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ ایمان کے تقاضے کیا ہیں، دعوت ایمانی کے تقاضے کیا ہیں، اور تحریک ایمانی کو لے کر اٹھنے کے تقاضے کیا ہیں۔ نیز اس تحریک کو لے کر چلنے کے لئے کس قدر علمی استعداد کی ضرورت ہے، کس قدر یکسو ہو کر تیاری کی ضرورت ہے، اور کس قدر مستحکم تنظیم کی ضرورت ہے۔ اور اس تنظیم و انتظامات کے بعد کس قدر سنگین سمع و اطاعت کی ضرورت ہے۔ اور تنظیم اور سمع و اطاعت کے بعد کس قدر توکل علی اللہ کی ضرورت ہے۔ اس راہ کے ہر قدم پر اللہ پر مکمل بھروسے کی ضرورت ہے اور پوری جدوجہد کر کے بھی نتیجہ، نصرت کی شکل میں ہو یا شکست کی صورت میں، اللہ پر چھوڑ دینا ہے۔ زندہ رہ کر غازی ہونا یا مر کر شہید ہونا ہے، کیا کرنا ہے اور کدھر جانا ہے یہ سب امور اللہ کے ہاتھ میں دے دینا ہے۔

ان واقعات کے نتیجے میں جماعت مسلمہ کے جو بیلنس شیٹ بنی اور ان واقعات کے بعد جماعت کو قرآن کریم نے جو ہدایات دیں، اپنی قدر و قیمت کے اعتبار سے وہ اس مال غنیمت کے مقابلے میں بہت زیادہ اہم تھیں جو فتح مبین کی صورت میں مسلمانوں کو حاصل ہوتا، اس صورت میں کہ مسلمان احد کے میدان سے فتح و نصرت لے کر واپس ہوتے۔ اس لئے کہ اس دور میں مسلمانوں کو ان تجربات کی ضرورت ہزار درجے زیادہ تھی بہ نسبت اس کے کہ وہ میدان سے فتح و نصرت اور مال غنیمت لے کر لوٹتے۔ اس طرح جماعت مسلمہ کے بعد آنے والی امت کے لئے تجربات کا جو سرمایہ چھوڑا گیا وہ زیادہ اہم اور باقی رہنے والا تھا، بہ نسبت اس فتح اور مال غنیمت کے جو فتح کی صورت میں مسلمان حاصل کرتے۔ اس شکست کے پس منظر میں عالم بالا کا منصوبہ یہ تھا کہ اس واقعہ کے ذریعہ وہ نقائص ظاہر کر دیئے جائیں جو مسلمانوں کی صفوں میں پائے جاتے تھے مثلاً ان کی جسمانی کمزوریاں، اخلاقی کمزوریاں اور فکری ثولیدگی۔ اور ظاہر ہے کہ صرف شکست کھانے کی صورت ہی میں یہ کمزوریاں ظاہر ہو سکتی تھیں۔ عالم بالا کا منصوبہ یہ تھا کہ اس وقت اللہ کی سنت جاریہ کے مطابق، ٹھیک قدرتی طور پر اور سلسلہ اسباب کے اندر، مسلمانوں کو شکست ہو، اور اس وقت مسلمانوں کے لئے یہ شکست زیادہ مفید تھی، تاکہ جماعت مسلمہ ان تجربات سے دوچار ہو اور اسے عبرت حاصل ہو اور اس طرح اس کی عملی تربیت ہو، اس کی سوچ پختہ ہو جائے اور وہ واقعات کو اپنے فطری انداز میں سمجھے، نیز اس کی صفوں میں کھرے اور کھوٹے

کا امتیاز ہو جائے۔ اس کی تنظیم اور تربیت میں جو جھول پائی جاتی تھی وہ دور ہو جائے اور پھر آنے والی امت کے لئے تجربات اور واقعات کا ایک عظیم سرمایہ ریکارڈ پر آجائے، جو اس قدر قیمتی ہو کہ جس کی قیمت نہ چکائی جاسکتی ہو، یعنی اس معرکہ میں فتح و نصرت سے بھی اس کی قیمت زیادہ ہو۔

یہ معرکہ میدان کارزار میں ختم ہوا اور اب قرآن کریم کے صفحات میں اسے لیا گیا، جو میدان جنگ سے بڑا میدان ہے، پھر یہ معرکہ نفس انسانی کے میدان میں شروع ہوا اور آخر کار وہ جماعت مسلمہ کی اجتماعی زندگی کے میدان میں شروع ہوا، یوں اللہ تعالیٰ نے اپنے دست قدرت سے اس جماعت کو بنایا، علم و حکمت کی اساس پر اور تجزیہ و بصیرت کی روشنی میں اور پھر جس طرح اللہ تعالیٰ کی مرضی تھی اس کے مطابق یہ جماعت تیار ہوئی۔ اسی میں اس جماعت کی بھلائی تھی کہ اسے ضرر پہنچے، اسے اذیتیں دی جائیں، اسے مبتلائے مصیبت کیا جائے، اور اسے رنج و الم سے دوچار کیا جائے۔

اس معرکہ کے واقعات پر یہاں جو اختتامیہ دیا گیا ہے اور جو تبصرہ کیا گیا ہے اس میں جو چیز قابل التفات اور قابل تعجب ہے وہ یہ ہے کہ اس میں معرکہ کے مناظر اور واقعات کے بیان کے ساتھ ساتھ ان واقعات کے بارے میں ہدایات بھی ساتھ ساتھ موقعہ پر دی گئی ہیں اور ان ہدایات کے ساتھ ایسی ہدایات بھی دی گئیں ہیں جن سے تزکیہ نفس اور تطہیر قلب و نظر کا سامان کیا گیا ہے۔ مسلمانوں کے افکار کو گرد و غبار سے صاف کیا گیا ہے۔ ان کے افکار و تصورات کو خواہشات نفسانیہ کے قیود سے آزاد کیا گیا ہے، مسلمانوں کے کردار سے طمع و لالچ، بغض و کینہ، حرص اور بخل، پوشیدہ خواہشات اور فسق و فجور کو بڑی حکمت کے ساتھ پاک کیا گیا ہے۔

اور ان تعقیبات اور تبصروں میں خصوصاً معرکہ کارزار کے واقعات کے اندر سودی کاروبار سے بھی بحث کی گئی ہے اور سود خوری سے روکا گیا ہے جو بظاہر بے جوڑ نظر آتی ہے اور اس کے بعد یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہر اہم معاملے میں مشورہ ضرور کیا جائے، اور اس پر عمل کیا جائے، اس کے باوجود جنگ احد کے بارے میں جو شوری ہوئی اور فیصلے ہوئے، اس کے نتائج بظاہر اچھے نہ نکلے تھے اور جنگ میں شکست ہو گئی تھی۔ یہ بات بھی قابل تعجب ہے (تفصیلی بحث بعد میں آتی ہے)

پھر اس کے بعد قرآن کریم، اس موقع پر انسانی نفسیات پر بھی بحث کرتا ہے، انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو لے لیتا ہے۔ اس زندگی کے مختلف پہلوؤں اور مختلف حرکات کے مباحث کو ایک دوسرے کے اندر ملا دیا جاتا ہے۔ یہ مختلف النوع مباحث ایک دوسرے کے ساتھ متکامل نظر آتے ہیں اور بعض اوقات یہ عجیب نظر آتے ہیں۔

لیکن جو لوگ اس ربانی طریقہ کار سے واقف ہیں انہیں وسیع اور مختلف النوع مباحث کی ملاوٹ اور ایک دوسرے کے ساتھ گنڈ کرنے پر کوئی تعجب نہیں ہوتا، اس لئے تحریک اسلامی جس معرکہ میں کودی ہے، وہ صرف میدان کارزار ہی کا معرکہ نہیں ہے جس میں صرف اسلحہ، گھوڑے اور افراد کار ساز و سامان درکار ہوتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ جنگی تدابیر اور جنگی چالیں کام میں لائی جاتی ہیں۔ بلکہ یہ ایک وسیع اور ہمہ گیر معرکہ ہوتا ہے اور میدان جنگ اس کا ایک حصہ یا شعبہ ہوتا ہے۔ اصل معرکہ وہ عظیم کشمکش ہے اور تھی جو انسانی ضمیر کی دنیا میں برپا ہوتی ہے، یہ کشمکش اس وقت جماعت کی اجتماعی تنظیم کے اندر برپا تھی، اس معرکہ کا تعلق انسانی ضمیر کی پاکیزگی سے تھا، انسانی ضمیر کو خالص اور خالی کرنا مقصود تھا، اور اسے ان تمام آلودگیوں سے پاک کرنا مطلوب تھا، جن سے اس کی صفائی اور پاکیزگی متاثر ہوتی تھی۔ اور انسانی ضمیر قرب الہی سے دور بیٹھ جاتا تھا۔ نیز اس معرکہ کا تعلق ان تنظیمی امور سے بھی تھا جن پر جماعت مسلمہ کی زندگی کا دار و مدار تھا، اسلامی نظام زندگی کے مطابق، یعنی وہ شورائے نظام جس پر پوری اجتماعی زندگی کی عمارت اٹھائی گئی تھی، یعنی صرف نظام حکومت میں ہی نہیں بلکہ پورے اسلامی نظام حیات میں جو باہم تعاون کے اصول پر قائم ہے اور جس میں سود خوری جیسا ظالمانہ نظام ممنوع ہے اس لئے کہ سود خوری اور باہم تعاون دو متضاد اصول ہیں۔

اسلام، جماعت مسلمہ کی تربیت صرف ایک میدان جنگ کے بعد نقطہ نظر سے نہ کر رہا تھا، بلکہ وہ اس کی تربیت اس عظیم کشمکش کے حوالے سے کر رہا تھا جو وسیع تر میدان میں برپا تھی، انسانی نفس کے میدان میں انسان کی عملی زندگی کے میدان میں اسلام نے ربا کی طرف توجہ کی تو اسے حرام قرار دیا، وہ اتفاق کی طرف متوجہ ہوا تو وہ خوشحالی ہو یا بد حالی اس پر لوگوں کو ابھارا۔ اس نے اللہ و رسول ﷺ کی

اطاعت کو اللہ کی رحمت کے لئے ضروری قرار دیا۔ اس نے غصہ پینے اور عفو و درگزر کا حکم دیا، اس نے احسان اور استغفار کا حکم دیا۔ گناہ پر اصرار کرنے سے منع کیا اور توبہ کا حکم دیا۔ اور ان سب امور کو اللہ کی رضامندی کے اسباب قرار دیا۔ انہیں بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے لئے رحم دل کر کے بھیجا گیا۔ اس نے حکم دیا کہ مشکل سے مشکل اوقات میں شوریٰ کے اصول کو قائم رکھا جائے شوریٰ کے اصول کو قائم رکھا جائے، اس نے حکم دیا کہ معاملات میں راستی کو اختیار کیا جائے اور بددیانتی نہ کی جائے۔ دولت کو خرچ کیا جائے اور بخل و کنجوسی سے اجتناب کیا جائے۔ غرض یہ اور دوسری ہدایات غزوہ احد پر تبصرے کے دوران فرمائی گئیں۔

اسلام نے ان سب احکام کی طرف توجہ دی اس لئے کہ یہ وہ عناصر ہیں جن کے ذریعے جماعت مسلمہ کو وسیع تر معرکہ اور کشمکش کے لئے تیار کیا جا رہا تھا۔ جس میں میدان جنگ میں قتال بھی شامل تھا مگر یہ معرکہ صرف قتال تک محدود نہ تھا بلکہ یہ وسیع تر ذمہ داریوں کا معرکہ تھا تاکہ اس کے نتیجے میں ایک عظیم انقلابی فتح حاصل کی جائے۔ یہ عظیم اور مکمل فتح اپنی لپیٹ میں نفس انسانی، اس کی تمام خواہشات، اور اس کی ہر قسم کی حرص و لالچ، اس کی تمام کینہ پروری کو لے لے۔ نیز پر امن حالات میں بھی یہ جماعت مسلمہ کے لئے اقدار و اطوار کے میدان میں فتح عظیم پر مشتمل ہو۔

اسلام نے ان تمام امور پر پوری توجہ کر کے یہ فیصلہ کیا کہ پوری انسانیت کی تکوین اور اس کی تشکیل اور اس کی سرگرمیوں کا جائزہ اسلامی نظریہ حیات کے نقطہ نظر کے مطابق لیا جائے اور پوری انسانیت کو ایک ہی محور کے گرد گھمایا جائے، وہ محور کیا تھا؟ یہ کے بندگی صرف اللہ کی ہوگی، پرستش صرف اللہ کی ہوگی، انسان پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ اللہ کا خوف دل میں رکھتے ہوئے، اپنے رب کی طرف متوجہ ہوں، اور اللہ کا منہاج زندگی اس پوری کائنات پر چھا جائے اور پوری انسانیت اپنے حالات میں سے ہر حال میں اسی منہاج کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اور انسانی زندگی کے مختلف حالات اسلامی نظام زندگی کے رابطے مربوط ہوں اور انسانی تگ و دو کے تمام نتائج بھی اسلامی منہاج کے

نتائج کے مطابق ہوں اور نفس انسانی کی تمام حرکات اور تمام تنظیمات اور انسانی نظم و نسق کی تمام جزئیات ان آخری نتائج کے برآمد مد اور موثر ثابت ہوں۔

اس لئے جنگ احد پر تبصرے کے درمیان کئی دوسرے مباحث پر بھی گفتگو کی گئی جو اس معرکے کے ساتھ بے جوڑ ہرگز نہیں ہیں، اس لئے کہ نفس انسانی جب تک اپنے شعور و ادراک اور اپنی عادات اور اخلاق میں فاتح نہ ہو گا وہ معرکہ قتال میں کبھی فاتح نہیں ہو سکتا۔ اور وہ لوگ جو مقابلے کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈمگا دیئے تھے۔ (۱۵۵) اور جو لوگ نظریاتی جنگوں میں اپنے انبیاء کی قیادت میں سرخرو ہوئے تھے وہ اس لئے سرخرو ہوئے تھے کہ وہ ان معرکوں میں کودنے سے پہلے اپنے گناہوں سے توبہ کر چکے تھے اور وہ اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی التجا کے ساتھ آگے بڑھے تھے اور اللہ کے مضبوط سہارے پر بھروسہ کرتے ہوئے میدان کارزار میں کودے تھے۔ اس لئے گناہوں سے پاکیزگی، اللہ کے ساتھ جڑنا، اللہ پر بھروسہ رکھنا دراصل وہ ساز و سامان ہے جس کے نتیجے میں نصرت اور فتح نصیب ہو ا کرتی ہے۔ اس لئے ان عوامل کو میدان جنگ سے دور نہیں کیا جاسکتا، لہذا سودی نظام معیشت کو ختم کر کے باہم تعاون (Co-operation) کے نظام کو قائم کرنا بھی گویا فتح مندی کے اسباب میں سے ایک اہم سبب ہے۔ سودی معاشرے کے مقابلے میں باہمی تعاون و تکافل کا معاشرہ فتح مندی سے زیادہ قریب ہے۔ اس طرح غصے کو پی جانا اور غلطیوں کو معاف کر دینا بھی سامان جنگ میں سے اہم ہتھیار ہے، اپنے نفس امارہ کو قابو میں رکھنا بھی ایک قسم کی جنگی تربیت ہے۔ معاشرہ کا معاشی لحاظ سے باہم کفیل ہونا، باہم انس اور محبت رکھنا، ایک دوسرے کی کوتاہیاں معاف کرنا وغیرہ بھی ایک ایسی فعال قوت عامل ہے جو فتح کی ضامن ہے۔

ان عوامل کے ساتھ کچھ مزید حقائق بھی تھے جن پر اس سبق میں شروع سے آخر تک بھروسہ کیا گیا ہے، مثلاً تقدیر الہی کی اہمیت اور یہ کہ اللہ نے جن باتوں کا فیصلہ کیا ہوا ہے انہوں نے وقوع پذیر ہونا ہی ہے، اس لئے جو غلطی ہو گئی، اس سلسلے میں اپنے تصور حیات اور اپنے خیالات کو قطعیت کے ساتھ

درست کر لیا جائے کہ جو کچھ ہو اوہ سنت الہی ہے مطابق ہوا، انسانی سرگرمیوں اور اس کی مساعی، انسان کے درست طرز عمل اور اس کی غلطیوں، انسان کی اطاعت امر اور اس کی معصیت، اسلامی منہاج کو مضبوطی سے پکڑ لینا اور اس میں کوتاہی کرنا، ان سب کے نتائج سنت الہی کے مطابق مرتب ہوتے ہیں اور سنت الہی کے یہ سب مظاہر پردہ تقدیر کے پیچھے سے ٹھیک ٹھیک نمودار ہوتے ہیں اور یہ سب مشیت الہی کے نمونے ہوتے ہیں اور جو کچھ واقع ہو جائے وہ اللہ کے طے شدہ فیصلے ہوتے ہیں، اس لئے ان پر کوئی تأسف کرنے کی ضرورت نہیں۔

اسی نکتے کو آخر میں، جماعت مسلمہ کو خطاب کرتے ہوئے یوں بیان کیا جاتا ہے کہ اگر تمہیں فتح نصیب ہو تو اتراؤ نہیں، اس میں تمہارا کچھ بھی نہیں ہے، تم اللہ کی تدبیر اور اس کی تقدیر کے آلات ہو اور یوں تمہیں جہاد کے میدان میں لا کر اللہ اپنی قدرت کے نمونے دکھا رہا ہے۔ اس لئے اس تمام جدوجہد کا اجر اللہ پر ہی ہے، اس لئے کہ تم اللہ کا کام کر رہے ہو، تمہارے لئے بطور استحقاق اس دنیا میں فتح مندی کے ثمرات میں کوئی ثمرہ لازمی نہیں ہے اور نہ فتح لازم ہے۔ یہ تو اللہ ہے کہ جسے چاہے فتح دے اور وہ یہ فتح دنیاوی مقاصد کے لئے کبھی عطا نہیں کرتا، بلکہ وہ ان مقاصد عالیہ کے لئے عطا کرتا ہے، جو اس کو مطلوب ہیں، اسی طرح شکست بھی جب کسی کے حصے میں آتی ہے تو وہ بھی سنت الہیہ کے مطابق واقعہ ہوتی ہے، اور اس کے حقیقی اسباب کو جماعت مسلمہ کے اندر کمزوریوں اور کمیوں کی صورت میں موجود ہوتے ہیں اور شکست میں بھی اللہ کے علم کے مطابق کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے، مثلاً جماعت مسلمہ کا تزکیہ نفس، اس کی صفوں سے غلط لوگوں کا چھانٹ کر الگ کرنا، حقائق اور تلخ حقائق کا اظہار، اعلیٰ قدروں کا استحکام اور حسن و فتح کے پیمانوں کا قیام اور آئندہ آنے والوں کے لئے عبرت اور نصیحت آموزی کے لئے نمونوں اور مثالوں کا قیام۔

اسلام کی نظر میں عسکری کامیابی، سیاسی کامیابی یا اقتصادی کامیابی کی اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، جب تک یہ کامیابی ربانی نظام حیات کی اساس پر نہ ہو، اور اس سچائی کو غلبہ نصیب نہ ہو جسے اللہ تعالیٰ لوگوں کی زندگیوں میں قائم کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ہر فتح اللہ کی فتح ہو اور اسلامی نظام زندگی کے

لئے ہو۔ اگر یہ صورت حال نہ ہو تو پھر جو بھی فتح ہوگی وہ جاہلیت کی فتح ہوگی کسی دوسری جاہلیت کے مقابلے میں ہوگی، فتح کے نتیجے میں نہ زندگی کو کوئی فائدہ ہوگا نہ انسانیت کا کوئی بھلا ہوگا۔ بھلائی تو یہ ہوگی کہ بھلائی کے جھنڈے محض سچائی کے لئے بلند ہوں اور سچائی اپنی حقیقت کے اعتبار سے ایک ہے، اس میں تعدد ممکن نہیں ہے اور وہ اسلامی اور الہی منہج حیات ہے، جس کے علاوہ کسی اور منہاج کے لئے زندہ رہنے کیا کوئی حق نہیں ہے۔ اور اسلامی نظام حیات کی فتح اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک یہ فتح سب سے پہلے نفس انسانی کے میدان میں واقع نہ ہو، اس کے بعد انسان کی عملی زندگی میں حق کو یہ فتح نصیب نہ ہو۔ جب نفس انسانی اپنی ذات میں اپنی خودی کو گم کر دے، اپنی ذات سے لالچ اور خواہش نفس کو ختم کر دے، اسے گندگیوں اور کینہ پروری سے پاک کر دے، وہ پوری طرح نفسانی بندھن توڑ دے اور اس کی نظریں صرف ذات باری کی طرف اٹھ رہی ہوں اور وہ ان تمام بوجھوں اور بندھنوں سے آزاد ہو جائے جن میں وہ جکڑا ہوا ہے، غرض جب وہ پوری جدوجہد کر کے اور پوری تگ و دو کے بعد اپنی ظاہری مادی قوت، اپنے مادی وسائل، اپنے ظاہری اسباب سے آزاد ہو کر صرف اللہ کی ذات پر بھروسہ کرنے لگے، اور جب وہ اپنی پوری زندگی کے معاملات میں اللہ کے حکم کے مطابق فیصلے کرے اور اللہ کی اس حاکمیت کے قیام کو اپنی تمام جدوجہد اور فتح و نصرت کا مقصد اعلیٰ سمجھے، غرض جب وہ یہ تمام امور اچھی طرح مکمل کر لے تو تب میدان کارزار میں اس کی عسکری کامیابی، کسی ملک میں اس کی سیاسی کامیابی اور اقتصادی کامیابی صحیح فتح تصور ہوگی، اور تب جا کر اس کی فتح اللہ کے نزدیک فتح ہوگی ورنہ وہ دراصل وہ ایک جاہلیت کی دوسری جاہلیت پر فتح تصور ہوگی۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس قسم کی فتح کی نہ کوئی قیمت اور نہ کوئی وزن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ معرکہ بدر پر تبصرہ کے درمیان درج بالا امور پر بھی بحث کی گئی ہے جو بظاہر بے جوڑ نظر آتی ہے۔ متنوع امور کو اکٹھا کیا گیا ہے اور اس معرکہ پر اختتامیہ اور تبصرہ میں ان تمام امور کو شامل کیا گیا ہے، اور ان امور کو اس وسیع میدان جنگ میں لایا گیا ہے، جس کا ایک حصہ میدان بدر ہے، جس کے بہت سے پہلوؤں میں سے احدا ایک پہلو ہے۔



اس سے پہلے کہ ہم معرکہ احد کے واقعات پر قرآنی تبصرہ پیش کریں، یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ احد کے واقعات کو اس ترتیب کے ساتھ پیش کر دیا جائے جس کے ساتھ وہ کتب سیرۃ میں بیان ہوئے ہیں۔ تاکہ ہم ان مقامات کو اچھی طرح سمجھ سکیں جن پر اللہ کی جانب سے تبصرہ ہو اور ہم اس بات کا ادراک کر سکیں کہ اللہ تعالیٰ کا طریقہ تربیت کیا ہے، جو اللہ نے قرآن کریم میں ان واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے اختیار کیا ہے؟

حالات یہ تھے کہ مسلمانوں کو بدر میں مکمل فتح نصیب ہوئی تھی۔ اور یہ ایک ایسا واقعہ تھا اور جن ظروف و احوال میں یہ پیش آیا تھا ان میں یہ ایک بہت بڑا معجزہ نظر آتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اہل اسلام کے ہاتھوں کفر کے علم برداروں اور بڑے بڑے سرداروں کے سر قلم کر دئے۔ جو لوگ قتل ہوئے وہ قریش کے سردار تھے۔

اس کے بعد ابوسفیان بن حرب قریش کا سردار مقرر ہوا۔ سردار مقرر ہوتے ہی اس نے مسلمانوں سے بدلہ لینے کے لئے تیاریاں شروع کر دیں، ابوسفیان کا قافلہ بدر میں مسلمانوں کا ٹارگٹ تھا، جس کے پاس قریش کا کافی تجارتی مال تھا۔ اس قافلے میں وہ بچ نکلا تھا، بدر کے بعد مشرکین نے یہ فیصلہ کیا کہ اس قافلے کا تمام تجارتی سامان بطور ابتدائی سرمایہ مسلمانوں کے خلاف جنگ میں استعمال کیا جائے۔

ابوسفیان نے تین ہزار افراد پر مشتمل ایک فوج تیار کی جو قریش، اس کے حلیفوں اور حبشیوں پر مشتمل تھی۔ ماہ شوال ۳ ہجری میں وہ فوج لے کر نکلا۔ یہ لوگ اپنے ساتھ اپنی عورتیں بھی لے کر آئے تاکہ ان کے بچاؤ کے جوش میں وہ بھاگنے کی کوشش نہ کریں۔ اس نے مدینہ کا رخ کیا اور جبل احد کے قریب اس نے ڈیرے ڈالے۔

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ مشورہ کیا۔ سوال یہ تھا کہ آپ باہر جا کر مقابلہ کریں یا مدینہ میں ٹھہر جائیں۔ خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے یہ تھی کہ مسلمان باہر نہ نکلیں بلکہ مدینہ کے اندر قلعہ بند ہو جائیں۔ مرد تنگ گلیوں اور مقامات جنگ پر لڑیں اور عورتیں مکانوں کی چھتوں سے جنگ میں حصہ لیں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس رائے میں رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی بھی موافق اور ہم رائے تھا۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک بڑی تعداد آگے بڑھی اور ان میں اکثریت ان لوگوں کی تھی جو جوان تھے اور جو بدر کی جنگ میں حصہ نہ لے سکے تھے۔ ان لوگوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں باہر جا کر میدان جنگ میں لڑنا چاہئے۔ انہوں نے اپنے مشورے پر کافی اصرار بھی کیا۔ یہ بات ظاہر ہو گئی کہ جماعت میں اکثریت کی رائے یہی ہے۔ آپ اٹھے اور آپ اپنے مکان، حجرہ عائشہ رضی اللہ عنہا میں داخل ہوئے اور اپنی زرہ پہن کر واپس تشریف لائے۔ اتنی دیر میں ان لوگوں کی رائے بدل چکی تھی۔ انہوں نے سوچا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ کو باہر جا کر لڑنے پر خواہ مخواہ مجبور کر دیا۔ اب انہوں نے عرض کی یا رسول اللہ! اگر آپ مدینہ کے اندر رہنے کو پسند فرماتے ہیں تو ایسا کر لیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”نبی کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کیونکہ نبی جب اپنی زرہ پہن لیتا ہے تو وہ اسے اس وقت تک نہیں اتارتا جب تک اس کے اور دشمن کے درمیان اللہ کوئی فیصلہ نہ کر دے۔“ یوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں پیغمبرانہ سبق دیا اور وہ سبق یہ تھا کہ شوریٰ کا ایک مقررہ وقت ہوتا ہے، اور جب شوریٰ کا وقت ختم ہو جائے اور عزم و ارادہ کا وقت آجائے اور طے شدہ فیصلے پر عمل کا وقت آجائے تو اس وقت صرف اللہ پر توکل کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد پھر تردد کا کوئی موقعہ نہیں ہوتا۔ نہ دوبارہ شوریٰ کا انعقاد ہوتا ہے اور نہ آراء کے بارے میں دوبارہ سوچا جاتا ہے۔ شوریٰ کے بعد تو معاملات اپنے انتہاء کو پہنچ جاتے ہیں اور اب فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے جو وہ چاہے ظاہر کر دیتا ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب دیکھا تھا کہ آپ کی تلوار ایک جگہ سے ٹوٹ کر کند ہو گئی ہے اور ایک گائے ذبح ہو رہی ہے، اور یہ کہ انہوں نے اپنا ہاتھ ایک مضبوط زرہ میں ڈالا ہے۔ آپ نے اس خواب کی تعبیریوں کی، تلوار کند پڑنے کے معنی یہ ہیں کہ میرے خاندان میں سے کوئی شخص

فوت ہوگا، گائے ذبح ہونے کی تعبیر آپ نے یہ فرمائی کہ آپ کے کچھ رفقاء قتل ہوں گے اور زرہ کا مفہوم آپ نے مدینہ سے لیا۔ اس لئے اس خواب کے بعد معرکہ احد کا نتیجہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، لیکن اس کے باوجود آپ نے شوریٰ کے طریقہ کار اور فیصلے پر عمل فرمایا، نیز شوریٰ کے بعد اپنی تگ و دو کے ذریعہ فیصلوں پر عمل کیا۔ یہ اس لئے کہ آپ ایک امت کی تربیت فرما رہے تھے، اور اقوام کی تربیت و قعات و حوادث سے ہوا کرتی ہے۔ اور تجربات کا ایک طویل سلسلہ ہوتا ہے جس کا نچوڑ چند واقعات کی شکل میں نکلتا ہے۔ مزید برآں یہ کہ آپ کے فیصلوں کے ذریعہ تقدیر الہی کا اظہار ہونا تھا، وہ فیصلے جن پر آپ کا شعور پختہ تھا، جن پر آپ کا دل مطمئن تھا۔ اس لئے آپ تقدیر الہی کے مطابق کام کر رہے تھے۔ لیکن اس کے باوجود آپ کا دل ان واقعات کو محسوس کر رہا تھا۔

بہر حال رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار صحابہ کرام کو لے کر نکلے، مدینہ میں جو لوگ رہ گئے تھے، ان کو نماز پڑھانے کے لئے آپ نے ابن ام مکتوم کو مقرر فرمایا۔ جب آپ مدینہ اور احد پہاڑ کے درمیان پہنچے تو رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی اس لشکر سے ایک تہائی حصہ کو لے کر واپس ہو گیا، اس نے یہ کہا کہ وہ میری مخالفت کرتے ہیں اور نوجوانوں کی بات سنتے ہیں۔ حضرت جابر کے والد عبد اللہ عمر بن حرام نے ان کا پیچھا کیا، انہیں سخت و ست کہا اور باصرار انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کی کہ وہ لوٹ آئیں۔ اس نے انہیں پکارا ”آؤ اور اللہ کی راہ میں لڑو، یا کم از کم مدافعت کرو۔“ انہوں نے جواب دیا: ”اگر ہمیں یقین ہوتا کہ آپ لڑتے ہیں تو ہم واپس نہ ہوتے۔“ اس پر حضرت عبد اللہ انہیں خوب گالیاں دے کر واپس بہو گئے۔

اس کے بعد انصار میں سے بعض لوگوں نے یہ تجویز پیش کی۔ اس موقع پر یہود سے مدد لی جائے جو ہمارے حلیف ہیں۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تجویز کو بھی رد کر دیا۔ اس لئے کہ یہ یہود معرکہ دراصل کفر اور ایمان کا معرکہ تھا، یہودیوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی، اور فتح و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور یہ فتح تب آتی ہے جب اللہ پر توکل کیا جائے اور قلوب اللہ کے لئے خالص ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا: ”کون لوگ ہیں جو ہمارے ساتھ ان لوگوں کے مقابلے کے لئے ریگستان میں

اتریں۔“ اس پر آپ کے ساتھ انصار میں سے کچھ لوگ نکلے تو آپ وادی کے آخری حصہ میں اترے، آپ نے اپنی پیٹھ احد پہاڑ کی طرف کی اور لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اس وقت تک جنگ شروع نہ کریں جب تک آپ حکم نہ دیں۔

جب صبح ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات سو افراد پر مشتمل فوج کو جنگ کے لئے ترتیب دیا۔ ان میں صرف پچاس گھوڑ سوار تھے، آپ نے پچاس تیر اندازوں پر عبد اللہ بن جبیر کو کمانڈر مقرر فرمایا اور ان لوگوں کو حکم دیا کہ آپ گھاٹی میں جہاں ان کی ڈیوٹی لگا رہے ہیں وہ وہاں جے رہیں اور اس پوسٹ کو کسی حال میں خالی نہ چھوڑیں، اگرچہ وہ دیکھیں کہ پرندے لشکر اسلام کا گوشت نوچ رہے ہوں، یہ لوگ فوج کی پشت پر پہاڑ میں تھے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ مشرکین پر تیروں کی بارش کر دیں تاکہ وہ پشت پر مسلمانوں پر حملہ آور نہ ہو جائیں۔

ابن عمیر کو جھنڈا دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فوج کے ایک طرف زبیر بن العوام کو مقرر فرمایا اور دوسری طرف آپ ﷺ نے مصعب ابن عمیر کو مقرر فرمایا۔ احد کے دن نوجوانوں نے اپنے آپ کو جنگ کے لئے پیش کیا۔ آپ نے ان کا معائنہ فرمایا اور جن کو جنگ میں حصہ لینے کے ناقابل پایا انہیں مسترد کر دیا۔ ان عبد اللہ ابن عمرو، اسامہ بن زید، اسید بن ظہیر، براء بن عازب، زید بن ارقم، زید بن ثابت، عرابہ ابن اوس اور عمر ابن حزام تھے۔ اور جن لوگوں کو قابل قرار دیا گیا وہ سمرہ ابن جندب اور رافع بن خدیج تھے۔ یہ پندرہ سال کے تھے۔

قریش نے تین ہزار فوجیوں کو جنگ کے لئے تیار کیا۔ ان میں سے دو صد گھوڑ سوار تھے، انہوں نے میمنہ پر خالد ابن الولید اور میسرہ پر عکرمہ ابن ابی جہل کو مقرر کیا۔

آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار ابودجانہ سماک ابن حرب کو عطا فرمائی اور وہ ایک ایسے بہادر سوار تھے جو جنگ کے وقت نہایت شوکت اور تعلی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

مشرکین میں سے پہلے جو شخص نمودار ہوا وہ ابو عامر فاسق تھا۔ یہ ابو عامر رایب کے لقب سے مشہور تھا، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا نام ابو عامر فاسق رکھ دیا۔ یہ شخص دور جاہلیت میں قبیلہ اوس کا سردار تھا۔ جب اسلام آیا تو وہ اسلام کے خلاف ہو گیا اور اس نے علی الاعلان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عداوت شروع کر دی۔ اس نے مدینہ چھوڑ دیا اور قریش سے جا ملا اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جمع کرتا رہا اور انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ پر آمادہ کرتا رہا۔ وہ انہیں یقین دلاتا کہ اس کی قوم جب اسے دیکھے گی تو وہ اس کی بات مان کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دے گی۔ یہ سب سے پہلے مسلمانوں کے سامنے آیا۔ اس نے اپنی قوم کو پکارا، اور اس نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے جواب دیا: اے فاسق اللہ آپ کو آنکھیں نہ دے۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ میرے بعد میری قوم تباہ ہو گئی ہے۔ اس کے بعد اس نے مسلمانوں کے ساتھ شدید جنگ کی۔

اور جب لڑائی شروع ہوئی تو ابو دجانہ نے داد شجاعت دی۔ ان کے ساتھ ابو طلحہ ابن عبد اللہ حمزہ ابن عبد المطلب، علی ابن ابی طالب، نضر بن انس اور سعد ابن زبیر نے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ دن چڑھتے ہی مسلمانوں نے کفار کو شکست دے دی۔ ان میں سے انہوں نے ستر بہادر اور معتبر افراد کو قتل کر دیا اور باقی دشمنان خدا ہزیمت اٹھا کر بھاگ گئے، وہ کیمپ میں عورتوں کے پاس پہنچ گئے۔ عورتوں نے اپنے کپڑے سمیٹ لئے اور بھاگنے لگیں۔

تیر اندازوں نے جب دیکھا کہ کفار کو شکست ہو گئی ہے اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے ہیں تو انہوں نے اپنے مقامات خالی کر دیئے جہاں انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مامور فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ وہ انہیں ہر گز نہ چھوڑیں۔ ان لوگوں نے ایک دوسرے کو پکارا کہ مال غنیمت لٹ رہی ہے یارو! ان کے امیر نے انہیں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم یاد دلایا مگر انہوں نے ایک نہ سنی۔ ان کا خیال تھا کہ مشرکین اب لوٹیں گے نہیں چنانچہ یہ لوگ بھی مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے اور گھاٹی کو انہوں نے خالی کر دیا۔

خالد بن ولید کو یہ معلوم ہوا کہ گھاٹی کو تیر اندازوں نے کر دیا ہے، اس لئے وہ مشرکین کے گھوڑ
سواروں کو لے کر گھاٹی کے راستے حملہ آور ہوئے، انہوں نے دیکھا کہ راستہ خالی ہے، یوں خالد کی جنگی
چال کامیاب ہوئی اور وہ مسلمانوں پر پشت کی جانب سے ٹوٹ پڑا اور جس وقت مشرکین اور شکست
خورہ لشکر نے دیکھا کہ خالد مسلمانوں پر چڑھ رہا ہے تو انہوں نے آگے کی طرف سے انہیں گھیرے
میں لے لیا۔

اب اس معرکے کی صورت حال مکمل طور پر تبدیل ہو گئی، میدان جنگ مسلمانوں کے خلاف
ہو گیا۔ مسلمانوں کی صفوں میں افراتفری مچ گئی۔ لوگوں کے اندر اضطراب پھیل گیا اور وہ سخت خائف
ہو گئے۔ اس لئے کہ خالد کا حملہ اس قدر ہولناک اور اس قدر اچانک تھا کہ کسی کو بھی اس کی توقع نہ تھی
۔ بہت سے لوگ مارے گئے اور مسلمانوں میں سے جس کی قسمت میں شہادت لکھی ہوئی تھی وہ شہید
ہوا۔ اب مشرکین کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک راہ پانے کا موقع مل گیا۔ آپ تنہا رہ گئے تھے
، آپ کی حفاظت کے لئے اس قدر تھوڑے افراد رہ گئے تھے کہ انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ انہوں نے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دفاع کیا اور شہید ہو گئے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک
زخمی ہو گیا، آپ کے نچلے جڑے اور دانت مبارک زخمی ہوئے اور آپ کے سر پر خود ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا
، مشرکین نے آپ کو پتھروں سے مارا، یہاں تک کہ آپ ایک پہلو پر گر گئے۔

اس کے بعد آپ ایک گڑھے میں گر گئے جو ابو عامر فاسق نے کھودا تھا اور اوپر سے ڈھانپ دیا تھا
کہ مسلمان اس میں گر جائیں اور زرہ کے حلقے آپ کے چہرہ مبارک میں گھس گئے تھے۔ اس خوفناک
صورتحال کے عین درمیان کسی نے یہ آواز دی کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں
۔ چنانچہ اس خوفناک آواز نے ان کی رہی سہی قوت بھی ختم کر دی۔ چنانچہ بچے کچھے مسلمان بھاگ
کھڑے ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کی خبر سن کر وہ اس قدر مایوس ہوئے اور اس
قدر کبیدہ خاطر ہوئے کہ ان کی قوت نے جواب دے دیا۔ اب انہوں نے جنگ کا خیال ہی دل سے نکال
دیا۔

تمام لوگ بھاگ کھڑے ہوئے مگر انس بن نضر نہیں بھاگے۔ وہ حضرت عمر ابن الخطاب، طلحہ ابن عبد اللہ کے پاس پہنچے جو بعض مہاجرین اور انصار کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہوں نے ہاتھ لٹکائے ہوئے تھے، تو انہوں نے کہا: تم لوگ کیوں بیٹھے ہوئے ہو، انہوں نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے ہیں۔ تو انہوں نے کہا: ”تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد زندہ رہ کر تم لوگ کیا کرو گے؟“ اٹھو اور جس مقصد کے لئے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے جان دے دی اس کے لئے جان دے دو۔“ اس کے بعد انس ابن نضر کفار پر ٹوٹ پڑے، اس وقت انہیں سعد ابن معاذ ملے اور انہوں نے انہیں پکار کر کہا: ”سعد میں جنت کی ہوا احد کے اس پار سے محسوس کر رہا ہوں۔“ اس کے بعد انہوں نے سخت لڑائی کی یہاں تک کہ شہید ہو گئے۔ ان کے جسم پر ستر سے کچھ اوپر زخم آئے تھے، انہیں کوئی پہچان بھی نہ سکا۔ آخر کار ان کی لاش کو ان کی بہن نے ان کی انگلیوں سے پہچان لیا۔

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے انہیں خود کے نیچے سعید بن مالک نے پہچانا۔ انہوں نے با آواز بلند چیخ لگائی۔ اے گروہ مسلماناں! مبارک مبارک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہاتھ سے اشارہ کیا ”خاموش رہو“ مسلمان آپ کے پاس جمع ہو گئے۔ آپ کے ساتھ گھائی پر چڑھ گئے۔ ان میں حضرت ابو بکر۔ عمر ابن الحارث، ابن صمہ انصاری وغیرہ تھے۔ جب وہ پہاڑ پر کافی اوپر چڑھ گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ابی ابن خلف ملا۔ وہ اپنے عود نامی گھوڑے پر سوار تھا۔ وہ اس گھوڑے کو مکہ میں چارہ دیتے وقت کہتا: ”اس پر میں محمد کو قتل کروں گا۔“ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اطلاع ہوئی تو آپ نے فرمایا: ”ان شاء اللہ میں اسے قتل کروں گا“ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پایا تو حارث نیزہ لیا اور اس سے اللہ کے دشمن کے سینے کی بالائی ہڈی (Collar Bon) پر وار کیا۔ وہ اس طرح شور کرتے ہوئے بھاگا جس طرح بیل۔ اسے یقین ہو گیا کہ وہ مارا گیا ہے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشین گوئی کی تھی۔ واپس ہونے سے پہلے وہ راستے ہی میں مر گیا۔

اس موقع پر ابوسفیان پہاڑ کے اوپر آیا اور آواز دی: ”کیا تم میں محمد ہیں؟“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اسے جواب نہ دو۔ پھر اس نے کہا: کیا تم میں ابو صدیق ہیں؟ پھر بھی مسلمانوں نے جواب نہ دیا۔ ”کیا تم میں عمر ابن الخطاب ہیں؟ پھر بھی اسے کوئی جواب نہ دیا گیا۔ اس نے صرف ان تینوں کے بارے میں پوچھا۔ اس پر اس نے اپنی قوم سے کہا ”جہاں تک ان تین افراد کا تعلق ہے ان کا کام تم نے تمام کر دیا ہے۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضبط نہ کر سکے اور کہا: ”اے اللہ کے دشمن! جن کا ذکر تم نے کیا ہے وہ سب زندہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان لوگوں کو باقی رکھا ہے جنہیں تم پسند نہ کرو گے۔ اس کے بعد اس نے کہا بعض لوگوں نے شہداء کی لاشوں کو مثلہ بنایا ہے۔ میں نے تو ان کو اس بات کا حکم نہ دیا تھا، مگر ان کی اس حرکت پر میں نے برا بھی منایا۔ (اس میں اس کا اشارہ اس واقعہ کی طرف تھا جس میں اس کی بیوی ہند نے حضرت حمزہ کی لاش کے ساتھ کیا تھا۔ حبشی نے جب اسے قتل کیا، ہند نے ان کا پیٹ پھاڑا، ان کا کلیجہ نکالا، اس نے اسے چبایا اور پھر پھینک دیا۔)

اس کے بعد اس نے نعرہ لگایا اَعْلُ ہُیَل..... (ہبل سر بلند ہو) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم اسے جواب نہیں دے رہے، صحابہ نے کہا ہم کیا جواب دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا تم کہو اللہ اَعْلٰی وَاَجَلٌ..... (اللہ سر بلند ہے اور جلیل القدر ہے) پھر اس نے کہا لَنَا عُرٰی وَّلَا لَكُمْ..... (ہمارا معبود عزیٰ ہے اور تمہارا کوئی عزیٰ نہیں) اس پر پھر رسول ﷺ نے فرمایا تم لوگ اسے جواب نہیں دے رہے۔ صحابہ کرام نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا جواب دیں؟ آپ نے فرمایا تم کہو اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَّلَا مَوْلَا لَكُمْ..... (اللہ ہمارا مالک ہے اور تمہارا مالک کوئی نہیں ہے) اس پر ابوسفیان نے کہا: ”آج کا دن بدر کے بدلے میں ہے۔“ اور جنگ میں اونچ نیچ ہوتی رہتی ہے۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ”بالکل برابری نہیں ہے، ہمارے مقتول جنت میں ہیں اور تمہارے مقتول دوزخ میں ہیں۔“

جب یہ معرکہ ختم ہوا تو مشرکین لوٹے۔ اس مسلمانوں کو شک گزرا کہ شاید وہ مدینہ میں جا کر عورتوں کو غلام بنائیں گے اور لوٹ مار کریں گے۔ یہ بات ان پر بہت ہی بھاری گزری۔ اس رسول اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”علی! تم نکلو، ان کے پیچھے پیچھے جاؤ، دیکھو وہ کیا کرتے ہیں؟ ان کا ارادہ کیا ہے؟ اگر انہوں نے گھوڑوں کو ایک طرف چھوڑا اور سامان اونٹوں پر لادنا تو وہ مکہ کی طرف جارہے ہوں گے اور اگر انہوں نے اونٹوں کو چلایا اور گھوڑوں پر سوار ہوئے تو سمجھو کہ وہ مدینہ پر چڑھائی کا ارادہ کر رہے ہیں۔ اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر انہوں نے مدینہ کا ارادہ کیا تو میں ان کی طرف ضرور چلوں گا اور مدینہ میں ان سے لڑوں گا۔“

حضرت علی فرماتے ہیں میں نکلا، ان کے پیچھے چلا، دیکھوں وہ کیا کرتے ہیں؟ انہوں نے گھوڑوں کو چھوڑ دیا اور اونٹوں پر سوار ہو گئے۔ جب وہ کچھ راستہ طے کر کے آگے نکلے تو انہوں نے ایک دوسرے کو ملامت کی۔ انہوں نے کہا تم نے کچھ بھی نہ کیا۔ تم نے ان کی قوت کو تو ختم کر دیا مگر تم نے ان کو چھوڑ دیا۔ اور ان میں سے بعض سردار ایسے رہ گئے جو تمہارے لے پھر جمع ہوں گے۔ اس لئے یہیں سے لوٹ جاؤ اور ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو۔ یہ بات رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں اعلان کیا اور حکم دیا کہ نکلیں اور دشمن کو راستے ہی میں جالیں۔ ”اب ہمارے ساتھ وہی شخص جاسکتا ہے جو احد میں حاضر ہوا تھا۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عبد اللہ بن ابی نے درخواست کی کہ ”میں تمہارے ساتھ جاتا ہوں۔“ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ”نہیں۔“ مسلمانوں نے اس قدر خوفناک صورت حال میں بھی آپ کی پکار پر لبیک کہا حالانکہ وہ زخموں سے چور چور تھے۔ انہوں نے کہا: ”ہم نے سنا اور مانا۔“ حضرت جابر بن عبد اللہ نے اجازت چاہی اور کہا اللہ کے رسول میں ہر مقام پر آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں مگر احد کے دن میرے والد نے مجھے روک لیا کہ میں اپنی بہنوں کی حفاظت کے لئے رہوں۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنے ساتھ چلنے کی خصوصی اجازت دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مدینہ سے نکلے۔ حمراء الاسد تک جا پہنچے۔ یہاں آپ کو معبد ابن ابو معبد خزاعی آکر ملے۔ یہ مسلمان ہو گئے تھے لیکن ابوسفیان کو ان کے اسلام کے بارے میں علم نہ تھا۔ رسول ﷺ نے ان سے کہا کہ وہ ابوسفیان سے ملیں اور انہیں ڈرائیں۔ وہ مقام رحاء میں اسے ملے۔ ابوسفیان کو اس کے مسلمان ہونے کا علم نہ تھا۔ ”معبد تمہارے پیچھے کون آرہا ہے؟ اس سے ابوسفیان نے پوچھا۔ اس نے جواب دیا: ”محمد اور اس کے ساتھی آرہے ہیں“

تم سے وہ جلے ہوئے ہیں اور وہ اس قدر جمعیت کے ساتھ آرہے ہیں جس قدر جمعیت ان کے ساتھ کبھی نہ نکلی تھی۔ محمد کے جو ساتھی اس جنگ میں شریک نہیں ہوئے تھے وہ نادام ہو گئے ہیں۔“ اس پر ابوسفیان نے کہا: ”تمہاری رائے کیا ہے؟“ اس نے کہا کہ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ جب تک تم کوچ کرتے ہو، وہ لشکر اس پہاڑی کے پیچھے سے نمودار نہ ہو جائے۔“ اس پر ابوسفیان نے کہا کہ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اس سے ایک بار پھر پنچہ آزمائی کریں اور ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس پر معبد نے کہا: ”ایسا ہرگز نہ کرو، میں تمہارا ناصح مشفق ہوں۔ اس پر وہ مکہ کی طرف واپس لوٹے۔

راستے میں ابوسفیان کو بعض مشرکین ملے جو مدینہ جا رہے تھے۔ ابوسفیان نے کہا کیا تم محمد کو میرا یہ پیغام پہنچا دو گے؟ اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہیں اور تمہارے گھوڑوں کو اپنے ہاں ٹھہراؤں گا جب تم مکہ آؤ۔ تو ان جانے والوں نے کہاں ہاں ہم پیغام دیں گے۔ اس پر ابوسفیان نے کہا محمد کو یہ پیغام دے دو کہ ہم نے ایک بار دوبارہ جنگ لڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے تاکہ ہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو یہ بات پہنچی تو انہوں نے کہا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ..... (ہمیں اللہ کافی ہے اور وہ بہترین وکیل ہے) اور اس پیغام سے ان پر کوئی اثر نہ ہوا، مسلمان تین دن تک وہاں ٹھہرے اور ابوسفیان کا انتظار کرتے رہے، اس کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ مشرکین اپنی راہ پر بہت دور جا چکے ہیں تو مسلمان مدینہ کو لوٹ آئے۔



میں یہ کہوں گا کہ غزوہ احد کے واقعات کا یہ خلاصہ اس قدر مجمل ہے کہ اس میں اس کے تمام پہلوؤں کو نہیں سمو یا جاسکا۔ نہ اس خلاصے میں وہ تمام واقعات دیئے گئے ہیں جو اس غزوہ میں پیش آئے اور جو ہمارے لئے مثالی تھے یا جن سے ہم عبرت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس لئے ہم یہاں مناسب سمجھتے ہیں کہ غزوہ کے بعض ان انفرادی واقعات کا ذکر یہاں کر دیں جن میں ہمارے لئے کوئی ہدایت ہے تاکہ اس غزوہ کی فضا کو یہاں دوبارہ زندہ کیا جاسکے۔

عمر بن قمیئہ ان مشرکین میں سے تھا جو احد کی بھگدڑ کے دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا تھا۔ جبکہ اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے تھے۔ یہ اس وقت ہوا جب تیز اندازوں نے اپنی جگہ خالی کر دی تھی اور کفار نے مسلمانوں کو گھیرے میں لے لیا تھا اور یہ آواز پھیل گیا تھا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم مارے گئے ہیں اور اس افواہ کی وجہ سے مسلمانوں میں انتشار پیدا ہو گیا اور وہ ہمت ہار گئے۔

ایسے شدید حالات میں بڑے بڑے سوراخوں کے اوسان بھی خطا ہو جاتے ہیں لیکن ایسے حالات میں ام عمارہ نسیبہ بنت کعب المازنیہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بھرپور دفاع کیا۔ اس نے زبردست جوہر دکھائے۔ اس نے عمر ابن قمیئہ کو اپنی تلوار سے کئی ضربات پہنچانے کی کوشش کی۔ اس نے وپر تلے دوزرہ پہن رکھی تھیں، اس لئے وہ بچ گیا۔ لیکن وہ ام عمارہ کو ان کے کاندھے پر شدید زخمی کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ان حالات میں ابودجانہ اپنی خالی پیٹھ کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بچا رہے تھے۔۔ تیر، آکر ان کی پیٹھ میں لگتے لیکن وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا رہا۔ نہ حرکت کی اور نہ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تیر لگنے دیا۔

حضرت طلحہ ابن عبید اللہ بار بار رسول اللہ ﷺ کی جانب لوٹتے تھے اور صرف اکیلے آپ کے سامنے کھڑے ہو جاتے تھے یہاں تک کہ وہ مارے گئے۔ صحیح ابن حبان میں حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا، احد کے دن سب لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے چلے گئے تھے، میں پہلا آدمی تھا جو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لوٹا۔ میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک شخص کھڑا ہے اور آپ ﷺ کا دفاع کر رہا ہے اور ہر طرف سے آپ کو بچا رہا ہے۔ میں کہا ہونہ ہو طلحہ ہے، اس پر میرے ماں باپ قربان ہوں، اللہ کرے تم طلحہ ہو، تم پر میرے ماں باپ قربان ہوں، تھوڑی ہی دیر میں میرے ساتھ ابو عبیدہ ابن الجراح بھی آئے۔ وہ پرندے کی طرح دوڑ رہے تھے۔ جب ہم دونوں ملے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف دوڑے۔ ہم نے دیکھا طلحہ آپ کے سامنے شہید ہو گئے تھے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: ”دیکھو تمہارا بھائی شہید ہو گیا ہے۔“ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے رخسار مبارک شہید زخمی ہو چکے تھے۔ آپ کو تیر مارا گیا تھا۔ آپ کے زرہ کے حلقے آپ کے چہرے مبارک کے اندر گھس گئے تھے۔ میں آپ ﷺ کے پاس پہنچ گیا تاکہ زرہ کے حلقے آپ کے رخساروں سے نکالوں، اس پر ابو عبیدہ نے کہا میں آپ کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ آپ مجھے یہ کام کرنے دیں۔ آپ نے اپنے وہ تیر کو منہ کے ساتھ آہستہ آہستہ نکالتا رہا کہ رسول اللہ ﷺ کو تکلیف نہ ہو، اس سے ابو عبیدہ کا ایک دانت ختم ہو گیا۔ حضرت ابو بکر فرماتے ہیں۔ میں پھر گیا تاکہ دوسرا تیر میں نکالوں۔ اس پر ابو عبیدہ نے کہا اللہ کے لئے مجھے نکالنے دیں۔ اس کے بعد اس نے دوسرے تیر کو بھی دانتوں سے پکڑا اور آہستہ آہستہ اسے کھینچا یہاں تک کہ اسے نکال لیا، اس کے ساتھ اس کا دوسرا دانت بھی نکل گیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اپنے بھائی کو سنبھالو، وہ تو مر گیا۔ اس کے بعد ہم طلحہ کی طرف مڑے، ہم نے اس کا علاج کیا۔ اس پر تقریباً چودہ زخم تھے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ پانی لائے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زخموں کو دھویا۔ آپ زخموں پر پانی ڈالتے تھے اور حضرت فاطمہ انہیں دھو رہی تھیں، جب خون نہ رکا تو انہوں نے چٹائی کا ایک حصہ جلایا اور اس کی راکھ زخم پر رکھی اور اس طرح خون رک گیا۔

ابو سعید خدری کے والد مالک نے آپ کے زخم کو چوس کر پاک و صاف کیا۔ اس پر اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا اب اسے تھوک دیں۔ اس پر اس نے جواب دیا: ”اللہ کی قسم میں اسے ہرگز نہ تھوکوں گا۔“ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص کسی جنتی کو دیکھنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ اس شخص کو دیکھ لے۔“

صحیح مسلم میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ احد کے دن سات انصار اور دو قریشیوں کے علیحدہ رہ گئے تھے، جب کفار نے آپ پر سخت دباؤ ڈالا تو آپ نے فرمایا: ”کون ہے جو انہیں مجھ سے دور کرے اور اس کے لئے جنت اجر ہے؟“ اس پر انصار میں سے ایک شخص آگے بڑھا، اس نے کفار سے جنگ کی یہاں تک کہ وہ شہید ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے پھر رسول اللہ ﷺ پر سختی کی تو رسول اللہ ﷺ نے

پھر فرمایا انہیں مجھ سے کون دور کرے گا، اور اس کے لئے جنت ہے۔ ایسا ہی ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ سات افراد شہید ہو گئے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”ہم نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔“ اس کے بعد ان کفار کا ابو طلحہ نے سخت مقابلہ کیا یہاں تک کہ انہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دور کر دیا۔ اور جس طرح ہم نے کہا کہ حضرت ابو دجانہ نے اپنی پشت کے ساتھ رسول اللہ ﷺ پر ڈھال کا کام کیا یہاں تک کہ یہ مصیبت ٹل گئی۔ اور رسول اللہ ﷺ اس وقت اس قدر تھک گئے کہ آپ اور رسول اللہ ﷺ پہاڑ پر چڑھ رہے تھے اور مشرکین ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ آپ ایک پتھر کے اوپر چڑھنا چاہتے تھے، لیکن آپ چڑھ نہ سکے۔ طلحہ آپ کے نیچے بیٹھے یہاں تک کہ آپ چڑھ گئے۔ اس وقت نماز کا وقت ہو گیا تھا، رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ نماز پڑھی۔“

اس دن کے بعض واقعات میں سے بعض یہ ہیں۔

حفظہ انصاری، جو ”غسل دادہ فرشتگان“ کے نام سے مشہور ہے، نے ابوسفیان کو دالیا تھا جب اس نے اسے اچھی طرح قابو کر لیا شداد بن الاسود نے حملہ کر کے حضرت حفظہ کو شہید کر دیا۔ وہ جنابت کی حالت میں تھے کیونکہ انہوں نے جنگ کے لئے نکلنے کی آواز سنی تو اس وقت وہ اپنی بیوی کے ساتھ تھے، وہ فوراً ہی اٹھے اور جہاد کے لئے نکل پڑے۔ رسول اللہ ﷺ نے میدان جہاد میں صحابہ سے کہا کہ اسے فرشتے غسل دے رہے ہیں۔ اس کے بعد آپ اٹھے اور فرمایا کہ ان کے اہل و عیال سے پوچھو انہوں نے اس کی بیوی سے دریافت کیا تو اس نے ان کو حقیقت حال سے آگاہ کیا۔

حضرت زید ابن ثابت فرماتے ہیں کہ مجھے احد کے دن رسول اللہ ﷺ نے بھیجا کہ میں سعد ابن ربیع کو تلاش کروں، میں مقتولین کے درمیان انہیں تلاش کرتا رہا۔ میں ان کے پاس آیا اور وہ آخری سانس لے رہے تھے اور آپ کے جسم پر ستر کے قریب ضربات تھیں۔ نیزوں اور تلوار کے زخم، میں نے ان سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کو سلام کہتے ہیں اور آپ کو کہتے ہیں کہ تمہارا کیا حال ہے؟ آپ نے کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام ہو، سلام کے بعد ان سے کہیں کہ میں جنت کی ہوا کو محسوس کر رہا ہوں۔ اور میری قوم انصار سے کہیں ”تمہارے لئے اللہ کے ہاں کوئی عذر نہ ہو گا اگر

تمہارے ہوتے ہوئے کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچ گیا جب تک تم میں کوئی ایک شخص بھی موجود ہو۔

ایک مہاجر، ایک انصاری کے پاس سے گزرا۔ اور وہ خون میں لت پت تھا، اس نے کہا: اے فلاں! کیا آپ کو اس بات کا علم ہے کہ محمد تو قتل ہو گئے ہیں؟ تو انصاری نے کہا کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل ہو گئے تو انہوں نے دین پہنچا دیا ہے اب تمہیں چاہئے کہ تم اپنے دین کے لئے لڑو۔

حضرت عبداللہ بن عمرو ابن حرام کہتے ہیں: ”میں نے خواب میں دیکھا یعنی احد سے پہلے، کہ مبشر ابن المنذر مجھے کہتا ہے: تم چند دنوں میں ہمارے پاس آنے والے ہو، میں نے پوچھا تم کہاں ہو، تو اس نے کہا میں تو جنت میں ہوں اور جنت میں ہم جہاں چاہیں پھرتے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ کیا بدر کے دن تم قتل نہ ہو گئے تھے۔ اس نے کہا ہاں! تو میں نے یہ خواب رسول اللہ ﷺ سے بیان کیا تو رسول ﷺ نے فرمایا: ”ابو جابر یہ تو شہادت ہے۔“

حضرت حبشمہ جن کے بیٹے بدر میں شہید ہو گئے تھے، کہتے ہیں کہ میں بدر میں نہیں جاسکا۔ میں نے بدر میں جانے کے لئے بہت ہی بیتاب تھا۔ اس پر میں نے اپنے بیٹے کے ساتھ قرعہ اندازی کی تو اس کا قرعہ نکل گیا اور اسے شہادت نصیب ہوئی۔ میں کل رات اپنے بیٹے کو بہترین شکل میں دیکھا، وہ جنت کے پھلوں میں سے کھاپی رہا تھا اور نہروں میں سیر کر رہا تھا، اس نے مجھے کہا: آپ بھی آجائیں اور جنت میں ہمارے ساتھ رہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ جو وعدہ کیا تھا وہ مجھے مل گیا ہے۔“ رسول اللہ! مجھے یہ شوق دامن گیر ہے کہ میں اس کے ساتھ جنت میں رفیق بن جاؤں۔ اور حال یہ ہے کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میری ہڈیاں پتلی ہو گئی ہیں، مجھے اپنے رب کے ساتھ ملاقات کا شوق ہے۔ اے اللہ کے رسول! آپ دعا فرمائیں کہ مجھے شہادت نصیب ہو، اور میں جنت میں سعد کا رفیق بن جاؤں۔ اس کے لئے رسول اللہ ﷺ نے دعا کی یہی وجہ ہے کہ وہ احد کے دن شہید ہوئے۔

اس دن کے بارے میں عبد اللہ ابن جحش نے فرمایا: ”اے اللہ میں تمہیں قسم دے کر یہ سوال کرتا ہوں کہ میں کل دشمن سے ضرور ملوں اور وہ مجھے قتل کر دیں۔ پھر وہ میرا پیٹ چاک کریں اور وہ میری ناک کاٹ دیں اور میرے کان کاٹ دیں اور اس کے بعد اسے اللہ آپ مجھ سے پوچھیں کہ ان لوگوں نے ایسا کیوں کیا تو میں کہوں گا کہ یہ محض تیری رضا کے لئے۔“

عمر بن الجوح رضی اللہ عنہ بہت برے درجے کے لنگڑے تھے۔ ان کے چار جوان بیٹے تھے، جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ جب بھی آپ جنگ کے لئے نکلتے، جب رسول اللہ ﷺ احد کے لئے نکلتے تو انہوں نے ارادہ کیا کہ وہ خود رسول اللہ ﷺ کے ساتھ چلیں، اسے اس کے بیٹوں نے کہا: ”اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے رخصت دی ہے۔ مناسب ہے کہ آپ بیٹھے رہیں اور ہم جہاد کے لئے کافی ہیں عمر بن الجوح رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے تو کہا: یا رسول اللہ! یہ میرے بچے مجھے آپ کے ساتھ نکلنے سے روک رہے ہیں، اللہ کی قسم میری یہ خواہش ہے کہ میں شہید ہو جاؤں۔ تو میں اپنے اس لنگڑے پن کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤں۔ اسے رسول اللہ ﷺ نے کہا: ”جہاد تو اللہ تعالیٰ نے تم سے موقوف کر دیا ہے۔“ اس کے لڑکوں کو کہا کہ کیا حرج ہے اگر تم اسے چھو دو، ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے شہادت نصیب کرے، تو اس پر وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلا اور احد کے دن قتل ہو کر شہید ہوا۔

اس معرکہ کے داروگیر میں حذیفہ ابن الیمان نے، اپنے باپ کی طرف دیکھا اور مسلمان اسے قتل کرنا چاہتے تھے، وہ اسے نہ جانتے تھے اور یہ خیال کر رہے تھے کہ شاید وہ مشرکین میں سے ہے۔ حذیفہ نے کہا، اللہ کے بندو، یہ تو میرا باپ ہے، انہوں نے اس کی بات کو نہ سمجھا اور اسے قتل کر دیا۔ اس پر انہوں نے کہا اللہ تمہیں معاف کرے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارادہ کیا کہ وہ اس کی دیت ادا کریں، حضرت حذیفہ نے کہا میں نے اس کی دیت مسلمانوں کو معاف کر دی ہے، اس کی وجہ سے رسول اکرم ﷺ حذیفہ کی بہت مدد کرتے تھے۔

جبیر ابن مطعم کے غلام حبشی حضرت حمزہ کے قتل کے بارے میں یوں بیان کرتے ہیں۔ حضرت حمزہ کو سید الشہداء کا لقب ملا اور آپ جنگ احد میں شریک ہوئے۔ مجھے جبیر نے یہ پیشکش کی کہ اگر میں حضرت حمزہ کو قتل کر دوں تو میں غلامی سے آزاد ہوں۔ احد کے دن میں لوگوں کے ساتھ نکلا۔ میں ایک حبشی آدمی تھا۔ اور حبشیوں کی طرح نیزہ پھیکا کرتا تھا۔ کم ہی ایسا ہوت تھا کہ میرا نیزہ خطا جاتا۔ جب لوگوں نے ایک دوسرے کے خلاف معرکہ شروع کیا تو میں نے حضرت حمزہ کو تلاش کرنا شروع کر دیا اور اسے دیکھتا رہا۔ اچانک میری نظر ان پر پڑ گئی۔ وہ سفید اونٹ کی طرح خوش رنگ تھے اور اپنی تلوار سے لوگوں کو بھگا رہے تھے کہ کوئی ان کے سامنے ٹھہر نہ سکتا تھا میں نے اس پر وار کرنے کی تیاری شروع کر دی اور میں نے ایک درخت کی اوٹ لی یا یہ کہ میں نے ایک پتھر کی اوٹ میں انتظار کیا تاکہ وہ میرے قریب آجائے۔ مجھ سے پہلے سباع ابن عبد العزی نے اس پر وار کرنا چاہا۔ جب حمزہ نے اسے دیکھا اس پر ایسا وار کیا کہ گویا اس کا سراچک کر لے اڑا۔ میں نے اپنے نیزے کو حرکت دی۔ جب نشانہ برابر ہوا تو میں نے ان پر پھینکا۔ یہ نیزہ ان کے پیٹ میں لگا اور دونوں پاؤں کے درمیان سے نکل گیا۔ اس نے میری طرف بڑھنے کا ارادہ کیا مگر بڑھ نہ سکے۔ میں نے اسے یونہی چھوڑ دیا یہاں تک کہ وہ مر گیا۔ اس کے بعد میں اس کے پاس گیا اور اپنا نیزہ لیا اور لشکر گاہ کی طرف چلا گیا۔ اور وہاں بیٹھ گیا۔ اس لئے کہ مجھے اس کے بغیر کوئی طلب نہ تھی۔ میں نے اسے اس لئے قتل کیا کہ میں آزاد ہو جاؤں۔

ہند بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان آئی۔ اس نے حمزہ کا پیٹ پھاڑا۔ ان کا کلیجہ نکالا اور اس نے اسے چبایا مگر نکل نہ سکی۔ اس لئے اسے پھینک دیا۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد جب رسول اللہ ﷺ حضرت حمزہ کی لاش پر کھڑے ہوئے تو آپ بہت ہی متاثر ہوئے اور آپ نے فرمایا: ”آپ کے دکھ جیسا دکھ مجھے کبھی نہ ہوگا۔ میں نے آج کے منظر سے زیادہ ہولناک منظر کبھی نہیں دیکھا۔“ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”کیا اس عورت نے کوئی چیز کھالی تھی؟“ لوگوں نے کہا ”نہیں۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اللہ کو یہ منظور نہ تھا کہ حمزہ کے جسم کا کوئی حصہ جہنم میں داخل ہو۔“

رسول ﷺ نے حکم دیا کہ شہداء احد کو ان کی جائے شہادت ہی میں دفن کر دیا جائے۔ اور انہیں مدینہ کی طرف منتقل نہ کیا جائے۔ بعض صحابہ کرام نے اپنے مقتولوں کو مدینہ پہنچا دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے منادی نے آواز دی کہ رسول ﷺ کا حکم ہے کہ مقتولین کو واپس لایا جائے۔ چنانچہ سب مقتول واپس لائے گئے۔ رسول ﷺ کی نگرانی میں ایک دو یا تین تین افراد ایک ایک لحد میں دفن کئے گئے۔ تو دفن کرتے وقت آپ فرماتے ان میں سے قرآن کریم کا عالم کون زیادہ تھا، اگر کوئی بتاتا کہ فلاں زیادہ قرآن کا عالم تھا تو اسے آپ لحد میں آگے کر دیتے۔ عبد اللہ ابن عمرو ابن حرام اور عمرو بن الجموح ایک ہی قبر میں دفن ہوئے۔ اس لئے کہ ان دونوں کے درمیان گہری دوستی تھی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”دنیا میں یہ دونوں دوست تھے، اس لئے انہیں ایک ہی قبر میں دفن کر دو۔“



یہ ہیں اس معرکہ کی بعض جھلکیاں جن میں فتح و نصرت اور ہزیمت و شکست ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ فتح و ہزیمت کے درمیان وقت کا ایک مہینہ پردہ حائل تھا۔ پس صرف حکم رسول کی خلاف ورزی ہونا تھی کہ فتح شکست میں بدل گئی۔ خواہشات نفس کی ایک معمولی جنبش سے نقشہ بدل گیا۔ شہوت کی ایک جھلک نے جنگ کا رخ بدل دیا۔ ان جھلکیوں میں اعلیٰ اقدار اور گھٹیا تصورات کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ایمان کی تاریخ میں لازوال کارنامے بھی ہیں اور نفاق و شکست کے مناظر بھی ہیں۔

ان جھلکیوں سے یہ معلوم ہو گا کہ اس وقت جماعت مسلمہ میں پوری طرح ہم آہنگی پیدا نہیں ہوئی تھی، جیسا کہ ان واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں کے تصور اسلام میں بھی کچھ کمزوریاں تھیں اور یہ واقعات جو نمودار ہوئے، یا جن کمزوریوں کا اظہار ہوا، یہ خداوند قدوس کی سنت کے عین مطابق تھا۔ یہ نتائج جن سے اہل اسلام دوچار ہوئے، وہ عظیم قربانیاں جو انہیں دینا پڑیں اور جن میں سرفہرست وہ مصائب تھے جن سے خود رسول اللہ ﷺ کو دوچار ہونا پڑا۔ اور یہ بات شک و شبہ سے بالا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس وقت ان واقعات کا گہرا اور عمیق احساس بھی رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ان پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ گئے ہیں۔ اس معرکہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بہت بڑی

قیمت ادا کی لیکن اس معرکہ کے ذریعہ انہیں عظیم سبق ملا۔ اور اعلیٰ تجربات حاصل ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو خالص کر دیا، ان کی صفوں میں سے کھوٹے لوگوں کو چھانٹ کر الگ کر دیا۔ اور اس تجربے کے ذریعہ امت مسلمہ کو اس عظیم مقصد کے لئے تیار کیا جو اس کے ذمہ لگایا گیا تھا۔ وہ یہ مقصد تھا کہ اس امت نے انسانیت کی قیادت کرنی ہے اور اس دنیا میں اس نے اسلامی نظریہ حیات کے مطابق ایک مکمل اسلامی نظام زندگی قائم کر کے دنیا کے سامنے اسے بطور مثال پیش کرنا ہے۔ دیکھئے، قرآن کریم نے اس صورت حال کو اپنے مخصوص انداز میں کس خوبصورتی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

قرآن کریم کا انداز یہ نہیں ہے کہ کسی واقعہ کو بطور تاریخ بیان کرے اور لوگوں کے سامنے صرف واقعات پیش کرے۔ قرآن کریم ان واقعات کی پیش پر نفس انسانی کے اندر جو شعور کار فرما تھا اس سے بحث کرتا ہے، جو باتیں دلوں میں لہریں پیدا کرتی ہیں ان کی جھلکیاں دکھاتا ہے، اور پھر ان واقعات سے وہ امور سامنے لاتا ہے جن میں کوئی سبق ہوتا ہے، جن سے کوئی ہدایت ملتی ہے یا جن سے کسی پوشیدہ گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔

قرآن ان واقعات کو تاریخی انداز میں بیان نہیں کرتا۔ اس طرح کے واقعات میں تسلسل ہو اور مقصد یہ ہو کہ تاریخی واقعات قلمبند کر دیئے جائیں۔ واقعات کے بیان کے مقاصد یہ ہیں کہ ان سے عبرت حاصل کی جائے، مسلمانوں کی تربیت ہو، اور واقعات کے پس پردہ جو اقدار کار فرما ہوں ان کی وضاحت ہو۔ لیکن نفس انسانی کی خصوصیات ظاہر کی جائیں دلوں کی دھڑکنیں صفحہ قرطاس پر لائی جائیں اور اس فضا کی جھلکیاں دکھائی جائیں جو اس واقعہ کے اندر اہم تھیں۔ پھر قرآن کریم واقعات کے تکوینی اسباب بھی بتاتا ہے۔ پھر ان حوادث کے نتیجے میں جو اصول سامنے آتے ہیں اور ہمیشہ کے لئے اصول بن جاتے ہیں ان کا بیان ہوتا ہے۔ اس انداز بیان میں ایک واقعہ دراصل ایک محور بن جاتا ہے اور نقطہ ارتکاز بن جاتا ہے۔ اس محور کے ارد گرد شعور و احساس کا عظیم سرمایہ جمع ہو جاتا ہے۔ استدلال کے نکات اور نتائج اکٹھے ہوتے ہیں، سیاق کلام میں بات اس حادثہ سے شروع کی جاتی ہے، پھر اس محور کے گرد چلتی رہتی ہے، پھر روئے سخن واقعات کی طرف مڑ جاتا ہے، اس کے بعد اچانک انسانی نفس اور ضمیر

کی بات چھڑ جاتی ہے۔ پھر زندگی کی گہرائیوں سے حقائق سطح پر لائے جاتے ہیں اور بارہا اسی طرز واقعات پر بحث ہوتی رہتی ہے اور نتائج اخذ کئے جاتے ہیں اور پھر اس واقعہ اور حادثہ کے واقعات کو ختم کیا جاتا ہے لیکن اس واقعہ کے ذیل میں معانی، دلائل، اقدار اور اصولوں کا ایک ذخیرہ ریکارڈ کر لیا جاتا ہے۔ واقعات اور حوادث کا بیان دراصل ان نتائج اور حکمتوں کے بیان کے لئے ہوتا ہے۔ واقعات ان حکمتوں کے لئے محور کا کام دیتے ہیں۔ اس کے ارد گرد نتائج جمع ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایک واقعہ کا پس منظر بھی بیان کر دیا جاتا ہے۔ اور اس واقعہ کے نتیجے میں دلوں کے اندر جو دشمنیاں پیدا ہوتی ہیں ان کا بیان ہوتا ہے، ان دشمنیوں کو صاف کیا جاتا ہے اور واقعات منقح کر کے ہر بات کو اپنی جگہ پر لگا دیا جاتا ہے۔ واقعات اور ان کے نتائج بالکل فطری نظر آتے ہیں، کسی کو ان پر حیرت نہیں ہوتی اور کسی کو ان پر افسوس نہیں ہوتا۔ وہ محسوس نہیں کرتے کہ ان میں کوئی التباس ہے یا ان کا کوئی دخل ہے۔

انسان جب ان واقعات کی طرف نگاہ اٹھاتا ہے اور میدان جنگ کو دیکھتا ہے اور طویل اور متنوع واقعات پر نگاہ ڈالتا ہے، اور اس کے بعد جب ان واقعات پر تبصرے اور نتائج بیان کئے جاتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ تبصرے اور اخذ نتائج کا میدان اصل واقعات سے وسیع تر ہے۔ یہ نتائج ایسے ہیں جو ہمیشہ باقی رہنے والے ہیں، دلوں میں پیوست ہو جانے والے ہیں، دلوں کی گہرائیوں میں اتر جاتے ہیں، ان سے نفس انسانی کی ضروریات اچھی طرح پوری ہوتی ہیں، نیز یہ نتائج جماعت اسلامی کے لئے فکری غذا فراہم کرتے ہیں، یعنی اسلامی انقلاب کی راہ میں ہر موقف پر اور ہر دور میں اس کے لئے راہنما ہوتے ہیں۔ وہ واقعات جو پیش آتے ہیں، زائل ہو جاتے ہیں اور گزر جاتے ہیں لیکن ان واقعات پر قرآن کے تبصرے لازوال ہیں۔ انفرادی واقعات سے کلی اصول اخذ کئے جاتے ہیں اور عارضی جھلکیوں سے دائمی اقدار اخذ کی جاتی ہیں اور علم و بصیرت کا ایسا سرمایہ ریکارڈ کیا جاتا ہے جو زمان و مکان کی قید سے باہر ہوتا ہے۔

غرض یہ نتائج جو قرآن اخذ کرتا ہے اور ان کو قرآن نصوص میں ریکارڈ کرتا ہے؛ دراصل اہل ایمان کے لئے لازوال سرمایہ ہوتے ہیں۔ اور ہر دور اور ہر جگہ ان سے اہل ایمان کے دل کھلتے ہیں۔ ان تجربات اور تبصروں کو اپنی اپنی تشریح کرنے کے بعد ان شاء اللہ ہم ایک جگہ جمع بھی کریں گے۔



درس نمبر ۲۷ تشریح آیات (آیت نمبر ۱۲۲ تا ۱۷۹)

وَإِذْ عَدُوَّتُ مَنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ
(۱۲۱) إِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنْكُمْ أَنْ تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا وَعَلَى اللَّهِ
فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۱۲۲)

”اس وقت کو یاد کرو کہ جب تم صبح سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور مسلمانوں کو جنگ کے لئے
جا بجا مامور کر رہے تھے، اور اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور باخبر ہے۔ یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی
دکھانے پر آمادہ ہو گئے حالانکہ اللہ کی ان کی مدد پر موجود تھا، اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا
چاہئے۔“

اس معرکہ کا پہلا منظر سامنے آتا ہے جس میں معرکہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں، قرآن کریم کے پہلے
مخاطب صحابہ کرام تو اس منظر کے کردار تھے، وہ ان کے نفوس کے قریب تھا، سب واقعات انہیں یاد
تھے لیکن اس انداز میں بات شروع کرنا اور اس آیت کے ذریعے معرکہ کا پہلا منظر آنکھوں کے
سامنے لانا، اس واقعہ کو زندگی اور حرکت سے مالا مال کر دیتا ہے۔ یہاں اس زیر نظر منظر کے ساتھ ایسے
حقائق کا اضافہ کر دیا جاتا ہے، جو اس منظر میں نظر نہیں آتے، مثلاً یہ کہ اس متحرک منظر میں ذات باری
بھی ان کے ساتھ موجود تھی، اور وہ اس سلسلے میں جو کچھ کر رہے تھے یا جو کہہ رہے تھے، اللہ تعالیٰ اس
سے خبردار تھا اور سن رہا تھا۔ وہ حقیقت ہے جسے اسلامی نظام تربیت ہر وقت پیش نظر رکھتا ہے، اس کی
تاکید کرتا ہے، اور اسلامی تصور حیات میں سے گہرائی تک بٹھاتا ہے۔ اور یہ وہ اساسی اور عظیم حقیقت
ہے کہ اس کے اوپر اسلام نے اپنے نظام تربیت کی بنیاد رکھی ہے۔ اور یہ وہ حقیقت ہے کہ اسلامی نظام
حیات کسی کے دل میں اس وقت تک جڑ نہیں پکڑ سکتا اور قائم نہیں ہو سکتا جب تک اس میں یہ حقیقت

جاگزیں نہیں ہو جاتی اور اپنی پوری قوت اور اپنی پوری حرکت اور بھرپور زندگی کے ساتھ جاگزیں نہیں ہو جاتی۔

وَإِذْ عَدُوَّتُ مِنْ أَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِينَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ

”اے پیغمبر جب تم سویرے اپنے گھر سے نکلے تھے اور مسلمانوں کو جنگ کے لئے جا بجا مور کر رہے تھے، اور اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور نہایت باخبر ہے۔“

یہ اشارہ ہے اس امر کی طرف کہ رسول ﷺ صبح سویرے بیت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکلے اور آپ ﷺ نے زرہ اور خود پہن رکھا تھا اور یہ تیاری آپ ﷺ نے جنگ کے بارے میں مشورہ کر لینے کے بعد فرمائی تھی، جس میں یہ طے ہو گیا تھا کہ جنگ مدینہ سے باہر جا کر لڑی جائے گی اور نکلنے کے بعد رسول ﷺ نے مسلمانوں کی جس طرح صف بندی فرمائی، اور تیر اندازوں کو حکم دیا کہ وہ پشت کی جانب پہاڑی پر مورچہ سنبھالیں۔ یہ ایک ایسا منظر تھا جس سے وہ باخبر تھے، ان کی لوح حافظہ پر وہ ابھی تک منقش تھا، البتہ اس کے ساتھ جس چیز کا اضافہ فرمایا گیا وہ یہ ہے وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ..... ”اللہ ساری باتیں سنتا ہے اور نہایت باخبر ہے۔“

وہ کیا عظیم منظر ہے جس میں اللہ حاضر ہو، اور وہ کیا ہی بلند موقف ہے جس کا مشاہدہ کرنے والوں میں اللہ ہو، اس منظر پر اللہ کا خوف اور رعب چھایا ہوا ہے جو مشورہ بھی ہو رہا ہے وہ اللہ کے سامنے ہے، تمام راز اس کے سامنے کھلے ہیں، زبانوں سے جو کچھ نکلتا ہے وہ بھی اس کے علم میں ہے۔ دلوں میں جو کچھ چھپایا ہوا ہے وہ اللہ کے علم میں ہے۔

اس پہلے منظر کی دوسری اہم جھلکی یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے دو گروہ ہمت ہار بیٹھتے ہیں، ان پر کمزوری چھا جاتی ہے۔ اور یہ کمزوری اس وقت چھا جاتی ہے جب رئیس المنافقین اپنے تین سو آدمیوں کے ساتھ دغا کر جاتے ہیں اور یہ تقریباً پورے لشکر کی ایک تہائی تھی، یہ شخص رسول ﷺ سے محض

اس لئے ناراض ہو گیا کہ رسول ﷺ نے اس کی رائے کو نہ مانا اور مدینہ کی نوخیز نسل کی بات کو مانا۔ اس نے کہا کہ اگر ہمارے علم میں کوئی جنگ ہوتی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ ہو لیتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ شخص اسلامی نظریہ حیات کے قبول کرنے میں مخلص نہ تھا۔ اور اس کے دل میں ابھی تک اس کی شخصیت کا بت بیٹھا ہوا تھا اس لئے وہ اسلامی نظریہ حیات کے مقابلے میں اپنی شخصیت کو زیادہ اہمیت دے رہا تھا۔ وہ نظریہ جو اپنے ساتھ کسی دوسری شے کا وجود گوارا نہیں کرتا۔ وہ اپنے ساتھ کوئی شریک نہیں چھوڑتا۔ اسلامی نظریہ حیات کا تقاضا تو یہ ہے کہ اسے پوری طرح اپنایا جائے اور یا پھر اسے پوری طرح چھوڑ دیا جائے۔

إِذْ هَمَّتْ طَائِفَتَانِ مِنْكُمْ أَلٌ تَفْشَلَا وَاللَّهُ وَلِيَهُمَا وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ..... ”یاد کرو جب تم میں سے دو گروہ بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے حالانکہ اللہ ان کی مدد پر موجود تھا اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہئے۔“

یہ دو گروہ کون تھے؟ صحیحین میں اس بارے میں سفیان بن عیینہ کی حدیث نقل ہے۔ وہ بنو حارثہ اور بنو سلیم تھے۔ وہ عبد اللہ بن ابی کی دعا بازانہ حرکت سے متاثر ہو گئے تھے اس لئے اس حرکت نے اسلامی صفوں میں پہلے ہی قدم پر اضطراب پیدا کر دیا تھا، قریب تھا کہ یہ دو گروہ بزدلی دکھاتے اور کمزور ہو کر بیٹھ جاتے لیکن اللہ کی مدد آپہنچی اور اللہ نے ان کے قدم مضبوط کر دیئے۔ جس طرح اس آیت میں صراحت ہے وَاللَّهُ وَلِيَهُمَا..... ”اور اللہ ان کا مددگار تھا۔“

حضرت عمر فرماتے ہیں میں نے جابر بن عبد اللہ سے سنا وہ کہتے تھے یہ آیت ہمارے متعلق نازل ہوئی ہے۔ ”یاد کرو جب دو گروہ تم سے بزدلی دکھانے پر آمادہ ہو گئے تھے۔“ انہوں نے کہا یہ دو گروہ ہم تھے بنو حارثہ اور بنو سلیم اور میں ایسا نہیں چاہتا (یا مجھے یہ بات اچھی نہیں آتی) کہ آیت نازل نہ ہوتی اس لئے کہ اس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَاللَّهُ وَلِيَهُمَا..... یعنی اللہ ان کا دوست اور مددگار ہے۔“ (بخاری و مسلم)

یوں دلوں کی گہرائیوں میں خفیہ اور پوشیدہ بات کو ظاہر کر دیا جاتا ہے اور اس بات کا علم صرف اللہ ہی کو تھا کہ یہ قبائل بزدلی پر آمادہ ہیں۔ اس لئے کہ یہ کمزوری ان کے دل میں ایک لمحہ کے لئے در آئی تھی اور فوراً ہی اللہ نے انہیں گرنے سے بچا لیا۔ ان کے دل سے اس کمزوری کو دور کر دیا، اور اللہ نے اپنی دوستی کی وجہ سے ان کی تائید فرمائی۔ اور وہ پیچھے لوٹنے کے بجائے آگے بڑھے۔ اس معرکہ کے واقعات کو بیان کرنے کے دوران اللہ نے اس کو دہرایا تاکہ اس معرکہ کے واقعات اور مناظر کو زندہ و تابندہ صورت میں پیش کیا جائے۔ اور نفوس انسانی کے دلوں میں جو بات کھٹکتی ہے اسے ریکارڈ پر لایا جائے، اور لوگوں کو یہ شعور دیا جاتا ہے کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارے دلوں کی باتوں سے خبردار ہے، اسی لئے اللہ نے فرمایا **وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ**..... ”اللہ سنے والا ہے اور خبردار ہے۔“ تاکہ ان کے دلوں میں یہ حقیقت اچھی طرح بیٹھ جائے اور انہیں بتایا جائے کہ نجات کی راہ کیا ہے اور ان کے احساس میں یہ بات بٹھائی جائے کہ اللہ ان کا مددگار ہے، معاون ہے اور ان کا دوست ہے اور کسی بھی کمزوری میں ان کا ہاتھ پکڑنے والا ہے۔ جب وہ گرنے کے قریب ہوں تو وہ ان کا دستگیر ہے۔ یہ اس لئے کہا کہ انہیں معلوم ہو جائے کہ کمزوری اور ضعیفی کے وقت انہوں نے کہاں سے نصرت طلب کرنی ہے اور کہاں انہوں نے پناہ لینا ہے؟ اس لئے انہیں اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ جس جہت کے سوا مسلمانوں کے لئے اور کوئی جہت نہیں ہے۔

وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ..... ”اور اہل ایمان کو صرف اللہ ہی پر توکل کرنا چاہئے۔“

غرض یہ کہ پہلے ہی منظر کی یہ دونوں جھلکیاں نہایت ہی باموقع دکھائی گئی ہیں اور نہایت ہی موزوں فضا میں، جھلکیاں اپنی موسیقی کے زیر و بم کو یکجا کرتی ہیں اور نہایت ہی مناسب موقع پر اپنے رمزیہ شان کے ساتھ نظروں کے سامنے آتی ہیں۔ ایسے ماحول میں کہ لوگوں کے دل لبیک کہنے، اثر لینے اور ان حقائق کو قبول کرنے کے لئے تیار ہیں۔ ان دو تمہیدی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم دلوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے، ان کی تربیت کرتا ہے اور انہیں صحیح سمت پر لگاتا ہے اور اثر اندازی

ایسے واقعات کے بطور تبصرہ کی جاتی ہے کہ وہ ابھی تازہ ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ فرق معلوم ہو جاتا ہے جو روایت قصص اور بیان واقعات میں قرآن کریم اختیار کرتا ہے، اور جو طریق بیان عام انسانی مصادر تاریخ میں اختیار کیا جاتا ہے۔ حالانکہ انسانی مصادر میں واقعات کی بڑی تفصیل ہوتی ہے۔ لیکن تفصیلات کے باوجود وہ واقعات دلوں میں نہیں اترتے۔ نہ ان کا انسانی زندگی سے کوئی تعلق ہوتا ہے، نہ ان سے دلوں کو زندہ کرنا، انہیں گرمی عطا کرنا مقصود ہوتا ہے اور نہ انسانوں کی ہدایت و تربیت مطلوب ہوتی ہے جیسا کہ قرآن مجید اپنے بیان قصص میں ان امور کو پیش نظر رکھتا ہے اور نہایت ہی مستحکم اسلوب بیان ہے۔



یوں اس معرکے کے بیان کا آغاز ہوتا ہے جس میں مسلمانوں کو فتح نصیب نہ ہوئی اگرچہ وہ فتح و نصرت کے قریب پہنچ گئے تھے۔ اس معرکے کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شخص (عبداللہ بن ابی) اپنے نظریہ حیات کے مقابلے میں اپنی ذات اور شخصیت کو ترجیح دیتا ہے اور اس کی اتباع میں وہ سب لوگ اس کے پیچھے چلے جاتے ہیں جن کے ذاتی اعتبارات ان کے عقیدے کے مقابلے میں زیادہ اہم تھے۔ پھر آغاز ہی میں دو گروہ بھی حالات سے قدرے متاثر ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ صالح تھے اور اس معرکے کا انجام یوں ہوتا ہے کہ کچھ لوگ اپنی فوجی ڈیوٹی کو چھوڑ کر مال غنیمت کے لالچ میں گرفتار ہو جاتے ہیں اور ان کی وجہ سے ان لوگوں کو بھی ہزیمت اٹھانی پڑتی ہے جنہوں نے اس معرکے میں قربانی کے اعلیٰ نمونے پیش کئے۔ محض اس لئے کہ بعض لوگوں نے نظم کی خلاف ورزی کی یا ان کے نظریہ حیات میں ابھی تک کچھ کمزوریاں موجود تھیں۔

اس سے پہلے کہ اس معرکے کی تفصیلات بیان کی جائیں اور ان پر تبصرہ کیا جائے، جس میں مسلمانوں کو شکست کھانی پڑی، اس معرکے کا ذکر کیا جاتا ہے، جس میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی یعنی غزوہ بدر تاکہ اس شکست کے ساتھ اس فتح و نصرت کو بھی وہ پیش نظر رکھیں۔ اور دونوں کا موازنہ کر کے فتح و شکست کے اسباب پر غور کریں۔ اور یہ بھی یقین سے جان لیں کہ فتح و نصرت کو بھی وہ پیش

نظر رکھیں۔ اور دونوں کا موازنہ کر کے فتح و شکست کے اسباب پر غور کریں۔ اور یہ بھی یقین سے جان لیں کہ فتح و نصرت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور وہی کچھ پیش آتا ہے جو اللہ کے ہاں مقرر ہوتا ہے۔ اور تقدیر الہی جس طرح نصرت میں کار فرما ہوتی ہے، اسی طرح شکست بھی مقدر ہوتی ہے۔ فتح کی تہہ میں حکمت ہوتی ہے اور شکست کے پس پشت بھی اللہ کی حکمت کار فرما ہوتی ہے۔ اور دونوں حالات میں نتیجہ کار اللہ کے ہاتھ میں ہوتا ہے، ہر حال میں وہی ہے جو مسبب الاسباب ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُشْكُرُونَ (۱۲۳) إِذْ يَقُولُ
لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ أَنْ يُمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلاَفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ (۱۲۴) بَلَى
إِنْ تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّنْ فُورِهِمْ هَذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلاَفٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ
مُسَوِّمِينَ (۱۲۵) وَمَا جَعَلَ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ
الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ (۱۲۶) لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ (۱۲۷) لَيْسَ
لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبُهُمْ فَلَا تُهِنُّ ظَالِمُونَ (۱۲۸) وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ
وَمَا فِي الْأَرْضِ يَعْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ عَفُورٌ رَّحِيمٌ (۱۲۹)

”اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تمہاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے، لہذا تم کو چاہئے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو، امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔ یاد کرو جب تم مؤمنین سے کہہ رہے تھے ”کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے؟“ بے شک اگر تم صبر کرو اور اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے اسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ یہ بات اللہ نے تمہیں اس لئے بتادی ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دل مطمئن ہو جائیں۔ فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا اور بینا ہے تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے، یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔ اے پیغمبر فیصلے کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ اللہ کو اختیار ہے، انہیں معاف کرے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ

ظالم ہیں۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اس کا مالک ہے جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے۔ وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔“

بدر میں مسلمانوں کو جو فتح نصیب ہوئی تھی وہ معجزانہ تھی جیسا کہ ہم اوپر کہہ آئے ہیں۔ یہ فتح مادی اسباب کی نایابی کے باوجود حاصل ہوئی تھی۔ اس وقت مسلمانوں کے پاس معروف مادی اسباب نہ تھے۔ اس جنگ میں ترازو کے دو پلڑے یعنی مومنین اور مشرکین متوازن نہ تھے نہ ہی ان کی حالت ایسی تھی کہ وہ توازن کے قریب ہوں۔ مشرک ایک ہزار کی تعداد میں تھے اور وہ جنگ کی خاطر بطور عام لام بندی نکلے تھے اس لئے کہ ان سے ابوسفیان نے مدد چاہی تھی اور ان کا ہدف بھی متعین تھا وہ یہ کہ ابوسفیان کے قافلے کو بچایا جائے اور یہ ہزار آدمی ہر قسم کے ساز و سامان سے لیس تھے۔ وہ اپنی دولت کے بچاؤ کے لئے نکلے تھے۔ نیز اپنی عزت اور شرف کو بھی انہوں نے بچانا تھا۔ اس کے مقابلے میں مسلمان صرف تین فی صد تھے اور وہ اس لئے نہ نکلے تھے ساز و سامان سے لیس اس قدر عظیم فوج سے ان کا مقابلہ ہو گا وہ ایک ہلکے پھلکے پروگرام کے لئے نکلے تھے وہ ایک غیر مسلح قافلے پر ہاتھ ڈالنے کے لئے نکلے تھے اور اس پر ہاتھ ڈالنا چاہتے تھے، قلیل تعداد میں ہونے کے ساتھ ساتھ ان کے پاس ساز و سامان نہ بھی تھا اور ان کے پیچھے مدینہ میں ابھی تک مشرکین بھی موجود تھے اور وہ بھی اپنی جگہ پر قوت تھے۔ اس طرح مدینہ میں منافقین کا بھی ایک بڑا طبقہ موجود تھا اور وہ مدینہ کے معاشرے میں اونچا مقام رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ مدینہ میں یہودی بھی تھے جو ہر وقت اس تاک میں لگے رہتے تھے کہ مدینہ میں مسلمانوں پر وار کریں۔ علاوہ ازیں وہ قلیل تعداد میں مسلمانوں کا ایک گروہ تھے جو جزیرۃ العرب کفر و شرک کی ایک عظیم قوت کے درمیان گھرے ہوئے تھے اور ان سب اسباب کے علاوہ ابھی وہ مظلوم پناہ گزیں تھے جنہیں مکہ سے نکال دیا گیا تھا کچھ انصار تھے جنہوں نے ان مہاجرین کو پناہ دی ہوئی تھی، بہر حال اس معاشرے میں ان کی حیثیت ایک نوخیز پودے کی تھی۔

ان حالات کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں کہ ایسے حالات میں اس قدر عظیم فتح کا حقیقی سبب صرف اللہ تعالیٰ کی نصرت ہی ہے۔

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرِ وَأَنْتُمْ أَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ..... ”اس سے پہلے جنگ بدر میں اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کر چکا تھا حالانکہ اس وقت تم بہت کمزور تھے، لہذا تم کو چاہئے کہ اللہ کی ناشکری سے بچو۔ امید ہے کہ اب تم شکر گزار بنو گے۔“

صرف اللہ ہی نے انہیں نصرت بخشی اور انہیں اس وجہ سے نصرت بخشی جس کی حکمت کو ان آیات میں بیان کیا گیا ہے۔ ناصر و مددگار نہ وہ خود تھے نہ کوئی اور تھا، اس لئے اگر انہوں نے کسی سے ڈرنا ہے اور کسی سے خائف ہونا ہے تو چاہئے کہ صرف اللہ سے ڈریں اور اس کا خوف اپنے اندر پیدا کریں۔ اس لئے کہ فتح و شکست اس کے ہاتھ میں ہے۔ وہی اللہ ہے جو اقتدار و قوت کا سرچشمہ ہے۔ اللہ خونی ہی انہیں شکر پر آمادہ کر سکتی ہے۔ ہر حال میں ان پر اللہ کا جو انعام و اکرام ہو رہا ہے، اس پر ان کا فرج ہے کہ وہ اللہ کا پورا پورا شکر ادا کریں، جو ان انعامات و اکرامات کے لائق ہو۔

یہ ایک جھلکی ہے، جس میں انہیں یاد دلایا جاتا ہے کہ بدر میں انہیں کیونکر فتح نصیب ہوئی، اس کے بعد وہ مناظر پیش کئے جاتے ہیں جو میدان بدر میں وقوع پذیر ہوئے، ان مناظر کو ان کے پردہ دماغ پر از سر نو اس طرح یاد کیا جاتا ہے کہ گویا وہ ابھی پیش آئے۔ ذرا دیکھئے

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَنْ يَكْفِيَكُمْ آبُ يُمَدِّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِنَ الْمَلَائِكَةِ مُنْزَلِينَ..... ”یاد کرو جب تم مؤمنین سے کہہ رہے تھے، کیا تمہارے لئے یہ بات کافی نہیں کہ اللہ تین ہزار فرشتے اتار کر تمہاری مدد کرے؟“ بے شک اگر تم صبر کرو، اور اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرو، تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے اسی آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔“

یہ کلمات بدر کے دن رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا کئے تھے، اور ان مٹھی بھراہل ایمان سے کہے تھے جو آپ کے ساتھ نکلے تھے، جنہوں نے مشرکین کی فوج کو دیکھ لیا تھا، یہ مٹھی بھر مسلمان صرف قافلے کو پکڑنے کے لئے نکلے تھے، جن کے پاس سامان تجارت تھا، ان کے گمان میں بھی یہ بات

نہ تھی کہ وہ ایک ایسی فوج کے ساتھ آمنا سامنا کریں گے جو ساز و سان سے لیس تھی اور اس دن انہیں رسول اللہ ﷺ نے ان امور سے مطلع کر دیا تھا، جن امور سے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو آگاہ کر دیا تھا، تاکہ ان کے دل مضبوط ہوں اور وہ ثابت قدم رہیں۔ وہ بہر حال انسان تھے، اور انہیں ایسی امداد کی ضرورت تھی جو ان کے تصورات اور ان کے شعور کے قریب الفہم ہو، اور ایک ایسی صورت میں ہو، جس صورت میں وہ کسی معاونت کے عادی تھے، اور انہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے یہ خصوصی امداد دو شرائط کے ساتھ مشروط ہے، ایک یہ کہ تم صبر سے کام لو اور پرہیزگاری کا رویہ اختیار کرو، صبر اس لئے ضروری ہے کہ جب حملہ ہوتا ہے تو اس وقت حملے کے صدمات پر صبر کی ضرورت ہوتی ہے، اور تقویٰ وہ چیز ہے جو انسان کا رابطہ اللہ سے قائم کر دیتی ہے۔ چاہے فتح ہو یا ہزیمت ہو۔

بَلَىٰ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّنْ فَوْرِهِمْ هَذَا يُعَذِّبْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الصَّالِكَةِ مُسَوِّمِينَ

”بے شک اگر تم صبر کرو، اور اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرو تو جس آن دشمن تمہارے اوپر چڑھ آئیں گے اس آن تمہارا رب (تین ہزار نہیں) پانچ ہزار صاحب نشان فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔“

یہاں قرآن کریم انہیں سکھاتا ہے کہ آخر کار تمام امور اللہ تعالیٰ کی طرف پلٹتے ہیں، اور تمام اشیاء اور واقعات میں اصل فیکٹر اللہ کی ذات ہے، فرشتوں کا اتار جانا تو اہل ایمان کے لئے خوشخبری ہے تاکہ ان کے دل خوش ہوں، ثابت قدم ہوں اور انہیں اطمینان و سکون نصیب ہو۔ رہی نصرت تو وہ براہ راست اللہ کی جانب سے ہے، اس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کے ارادے سے ہے، بغیر کسی واسطہ، بغیر کسی وسیلہ اور بغیر کسی سبب کے۔

وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُمْ بِهِ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ..... ”اور فتح و نصرت جو کچھ بھی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے جو بڑی قوت والا اور دانا و بینا ہے۔“

قرآن کریم نے اسلامی تصور حیات میں مشیت الہی کی کار فرمائی پر بہت زور دیا ہے۔ اور اسے ہر شک و شبہ سے پاک کرنے کی کوشش کی ہے اور اس بات کا بار بار ذکر کیا ہے کہ دنیاوی اسباب کسی صورت میں موثر نہیں ہوتے۔ اللہ کی قدرت اور مومن کے دل و دماغ کے درمیان ایک خاص رابطہ ہو جاتا ہے۔ اللہ اور بندے کے درمیان حائل پر دے اٹھ جاتے ہیں۔ اللہ اور بندے کے درمیان براہ راست تعلق قائم ہو جاتا ہے اور اس میں کبھی کوئی رکاوٹ قائم نہیں ہوتی۔ جس طرح عالم موجودات میں اور عالم حقائق میں ہوتا ہے۔

قرآن کریم میں اس قسم کی ہدایات بار بار دہرائی جاتی ہیں، مختلف اسالیب میں ان کی تاکید کی جاتی ہے اور مسلمانوں کے دل میں یہ حقیقت اچھی طرح بیٹھ جاتی ہے، وہ اس حقیقت کا ایک عجیب گہرا، روشن اور سنجیدہ شعور رکھتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اللہ وحدہ ہی اس کائنات کے تمام امور میں فاعل اور مؤثر ہے، انہیں یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے مامور ہیں کہ وہ اسباب و وسائل فراہم کریں، جدوجہد کریں اور ہر کام کے سلسلے میں اپنی سی کوشش کریں، لیکن اس حقیقت کا بھی انہیں پختہ شعور ہو کہ ہو گا وہی جو اللہ کی مشیت چاہے لیکن اس پختہ یقین کے ساتھ ساتھ وہ اطاعت کرتے ہیں اور شعوری توازن کے ساتھ ہر وقت وہ متحرک رہتے ہیں۔ اس کے باوجود قرآن کریم نے یہ شعور ایک عرصہ کے بعد مسلمانوں کی فکر میں بٹھایا۔ کچھ واقعات پیش آئے، ان واقعات نے مسلمانوں کی تربیت کی، ان واقعات سے نتائج اخذ کئے گئے اور اس سورت میں ایسی تربیت کی کئی مثالیں موجود ہیں۔

ان آیات میں بدر کا منظر نظروں کے سامنے ہے۔ اس منظر میں رسول اکرم ﷺ اہل ایمان کے ساتھ وعدہ فرماتے ہیں کہ اللہ کی جانب سے خصوصی امداد نازل ہوگی بشرطیکہ وہ صبر و ثبات سے کام لیں اور معرکہ میں انسانوں سے ڈرنے کے بجائے صرف تقویٰ اور اللہ خوفی کی راہ اختیار کریں۔ عین اس

وقت جب ان کا کفار کے ساتھ آمناسا منا ہو، اس کے بعد یہاں قرآن کریم نزول ملا نیکہ کے بھی پس منظر میں جا کر یہ باور کراتا ہے کہ اصل قوت فاعلہ ذات باری ہے۔ تمام امور اس کے ہاتھ میں ہیں اور اس کے ارادے کے تابع ہیں اور صرف اس کے اذن اور اس کے ارادے سے فتح و نصرت نصیب ہوگی۔ وَلِلّٰهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ..... ”اور اللہ ہی بڑی قوت والا اور بینا ہے۔“ وہ بڑی قوت والا ہے، صاحب اقتدار ہے اور اس بات پر قادر ہے کہ نصرت اور فتح عطا کرے اور اس کے ساتھ وہ حکیم بھی ہے اور اس کی قدرت دانائی کے مطابق جاری و ساری ہے۔ اور وہ فتح اس لئے عطا کرتا ہے کہ اس میں اس کی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے۔

اس کے بعد اس نصرت کی حکمت بھی یہاں بیان کر دی جاتی ہے، کیسی فتح؟ وہ فتح جس کے مقاصد میں سے کوئی مقصد بھی انسان کی ذات سے وابستہ نہیں ہے۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ (۱۲۷) لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ (۱۲۸)

”تا کہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے، یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔ فیصلہ کے اختیارات میں تمہارا کوئی حصہ نہیں، اللہ کو اختیار ہے چاہے انہیں معاف کرے، چاہے سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔“

یہ حقیقت ہے کہ فتح اللہ کی جانب سے آتی ہے۔ وہ اللہ کی تقدیر کو ظاہر کرتی ہے۔ کسی رسول اور اس کے ساتھیوں کو فتح کی صورت میں کوئی ذاتی مفاد نہیں ملتا۔ نہ اس میں ان کی کوئی ذاتی غرض ہوتی ہے۔ نیز حصول فتح میں نہ رسول کا دخل ہوتا ہے نہ اس کے ساتھ اس میں دخیل ہوتے ہیں۔ وہ تو تقدیر الہی کے ظہور کے لئے ایک مظہر ہوتے ہیں۔ قدرت انہیں جس طرح چاہتی ہے، استعمال کرتی ہے۔ وہ اس فتح و نصرت کا نہ سبب حقیقی ہوتے ہیں نہ اس کے صانع ہوتے ہیں۔ وہ نہ فاتح ہوتے ہیں اور نہ ہی اس فتح کے نتیجے میں مفادات حاصل کرتے ہیں۔ دست قدرت اپنے بعض اشخاص کو حرکت میں لاتا ہے

۔ پھر خود ان کی تائید کرتا ہے تاکہ اللہ کے پیش نظر جو حکمتیں ہوں ان کا ظہور ہو اور جو مقاصد ہوں وہ بروئے کار لائے جائیں۔

لَيَقْطَعَنَّ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا..... ”تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک بازو کاٹ دے۔“ وہ قتل ہوں اور ان کی افرادی قوت کم ہو، ان کی اراضی ان ہاتھوں سے نکلے اور ان کا رقبہ کم ہوتا جائے۔ یا ان کی جابرانہ حکومت کا دائرہ تنگ ہو جائے۔ ان کی دولت میں بوجہ مال غنیمت کمی آجائے اور ہزیمت اور شکست کے نتیجے میں ان کی سرگرمیوں میں کمی آجائے۔

أَوْ يَكْبِتُهُمْ فَيَنْقَلِبُوا خَائِبِينَ..... ”یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ وہ نامرادی کے ساتھ پسپا ہو جائیں۔“ یعنی ذلیل ہو کر ہزیمت اٹھائیں اور اپنے مقاصد میں ناکام ہو کر لوٹیں جبکہ وہ دبے ہوئے ہوں۔

أَوْ يُثَوِّبَ عَلَيْهِمْ..... ”یا انہیں معاف کر دے۔“ اس لئے کہ بعض اوقات اہل اسلام کی فتح کے نتیجے میں کفار کو عبرت حاصل ہوتی ہے اور وہ سبق حاصل کر لیتے ہیں اور اس فتح کے نتیجے میں وہ اسلام قبول کر لیتے ہیں، نتیجتاً اللہ انہیں معاف کر دیتا ہے۔ ان سے صفت کفر چلی جاتی ہے اور وہ راہ ہدایت پا کر اسلام پر جم جاتے ہیں۔

أَوْ يُعَذِّبُهُمْ فَأَهُمُّوْا ظَالِمُوْنَ..... ”چاہے انہیں سزا دے کیونکہ وہ ظالم ہیں۔“ عذاب کی ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ اہل اسلام ان پر غالب آجاتے ہیں، دوسری صورت قید ہونے کی

صورت میں وہ عذاب پاتے ہیں یا ان کا خاتمہ کفر پر ہو جاتا ہے اور انجام کار وہ سزائے جہنم کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ یہ سزا ان کو اس لئے دی جاتی ہے کہ وہ کفر کر کے ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں، مسلمانوں کو فتنے میں ڈالتے ہیں اور فساد فی الارض کے مرتکب ہوتے ہیں۔ نیز وہ اس اصلاحی نظام

حیات کے مقابلے میں اتر کر ظلم کا ارتکاب کرتے ہیں جو اسلامی نظام حیات اور اسلامی شریعت کی صورت میں دنیا میں نافذ ہونے کے لئے آیا ہے۔ غرض وہ سب مظالم اس میں شامل ہیں جو کفر کی وجہ سے وجود میں آتے ہیں اور جن کی وجہ سے اللہ کی راہ کو مسدود کیا جاتا ہے۔

بہر حال یہ سب پروگرام حکمت الہی کے تحت ہوتا ہے اور اس میں انسانی ارادے کا کوئی دخل نہیں ہوتا یہاں تک کہ اس آیت کی رو سے خود رسول اللہ ﷺ کی ذات کو بھی اس پروگرام میں دخل انداز ہونے سے خارج کیا جاتا ہے۔ اور ان امور میں فیصلے کا اختیار صرف اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ ایسے فیصلے ذات باری کے شایان شان ہیں۔ ان میں ذات باری منفرد ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔

یوں اہل ایمان کی ذات فتح و کامرانی کے ساتھ اس منظر سے باہر آ جاتی ہے۔ وہ خود فتح و کامرانی کے اسباب کے دائرے سے نکل جاتے ہیں اور اس کے نتائج میں ان کا کوئی دخل نہیں رہتا۔ یوں وہ اس کبر و غرور سے محفوظ رہتے ہیں جو فاختین کے دلوں میں بالعموم پیدا ہو جاتا ہے، نیز وہ سخت گیری، غرور اور احساس برتری سے بھی مامون ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے اکثر فاختین پھولے نہیں سماتے اور ان کے روح اور طرز عمل غیر متوازن ہوتے ہیں۔ چنانچہ اہل ایمان محسوس کرتے ہیں کہ فیصلے کے اختیارات ان کے پاس نہیں ہیں۔ اختیارات تو سب کے سب اللہ کے پاس ہیں۔

غرض لوگ مطیع فرمان ہوں یا نافرمان ہوں ان سب کے امور کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ یہ کہ لوگوں کی قسمت کے فیصلے، خواہ وہ اچھے لوگ ہوں یا برے، اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھے ہیں۔ یہ ہے تحریک اسلامی کی حقیقت اور یہ ہے اس میں لوگوں کا مقام چاہے وہ اچھے ہوں یا برے ہوں۔ اس میدان میں خود رسول اکرم ﷺ اور اہل ایمان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اچھے طریقے سے اپنے فرائض سرانجام دیں۔ اور نتائج اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ اپنے کئے پر صرف اللہ سے اجر کے طلب گار ہوں، وہ انہیں پورا پورا اجر دے گا اور ان کا والی اور مددگار ہو گا۔

یہ آیت کہ ”فیصلے کے اختیارات میں تمہارا کوئی دخل نہیں ہے“ اس لئے بھی یہاں لائی گئی ہے کہ آنے والی آیت میں بعض لوگوں کی یہ بات نقل ہونے والی ہے۔ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ..... ”اس کام کو چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے۔“ (۱۵۴:۳) اور یہ کہ لَوْ كُنَّا لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا..... ”اگر اختیارات میں ہمارا کوئی حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔“ (۱۵۷:۳) اور یہ آیت دراصل ان مزعومات کا بیٹھنگی جواب ہے کہ جی ہاں اختیارات الہیہ میں کوئی شریک نہیں ہے، نہ فتح کسی کے اختیار میں ہے نہ شکست۔ تمہارا کام صرف اطاعت امر ہے، ادائے فرض ہے اور مکمل وفاداری ہے۔ یہی امور تم سے مطلوب ہیں۔ ان کے بعد نتائج کیا نکلتے ہیں تو بس یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ ان میں کسی کا دخل نہیں ہے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ کا بھی دخل نہیں ہے۔ یہ وہ اصلی حقیقت جو اسلامی تصور حیات کے پیش نظر ہے اور اسے نفس انسانی کی گہرائیوں میں جاگزیں ہونا چاہئے اور اسے واقعات، حالات اور افراد کار سے بھی برتر اور بلند ہونا چاہئے۔

واقعہ بدر کی یہ یاد دہانی اور اسلامی تصور حیات کے ان اساسی حقائق کا اختتامیہ اس عام حقیقت کے اظہار سے ہوتا ہے کہ آخر کار فتح و ہزیمت دونوں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکیمانہ پالیسی کے تابع ہوتی ہیں اور یہاں آکر اس بیان کے خاتمہ پر، اس سے بھی زیادہ عمومی حقیقت کو سامنے لایا جاتا ہے کہ اس پوری کائنات میں اللہ کا امر جاری و ساری ہے۔ اس لئے جسے وہ چاہتا ہے بخش دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ يَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ عَفُوٌّ
رَحِيمٌ..... ”زمین و آسمان میں جو کچھ ہے اس کا مالک اللہ ہے، جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے عذاب دے، وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔“

غرض یہ امور اللہ کی مشیت کے تابع ہیں جو بے قید ہے اور جو اس کی بے قید شہنشاہیت کے ساتھ وابستہ ہے۔ وہ اپنے بندوں کے معاملات میں بے قید متصرف ہے۔ جس طرح کہ وہ آسمانوں اور زمینوں کا مالک لاشریک ہے۔ وہ اپنے بندوں پر نہ ظلم کرتا ہے اور نہ ان میں سے کسی کی جانب داری کرتا ہے نہ مغفرت میں اور نہ سزا دہی میں۔ بندوں کے درمیان وہ فیصلے حکمت اور عدل کے ساتھ کرتا ہے اور حکمت اور عدالت کے ساتھ ساتھ اس کی صفات رحمت اور عفو بھی اپنا کام کرتی ہیں، اس لئے کہ عفو و درگزر ہی اس کے شایان شان ہے۔

وَاللَّهُ عَفُوٌّ رَحِيمٌ..... ”وہ معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔“ بندوں کے لئے اس کے دروازے کھلے ہیں، وہ ہر وقت اس کی رحمت اور مغفرت سے فیض یاب ہو سکتے ہیں، ہر وقت لوٹ سکتے ہیں، باز آ سکتے ہیں، اس لئے کہ تمام معاملات اس کے ہاتھ میں ہیں۔ فرائض جو اس نے عائد کئے ہیں ان کی ادائیگی اور فرائض سے آگے کے معاملات کو ترک کرنا، یہ اس کی حکمت اور مشیت کی وجہ سے ہے، جس پر کوئی قید و بند نہیں ہے۔ اور اس کی حکمت اور مشیت اسباب و وسائل کے پیچھے کام کرتی ہے۔



اس سے قبل کہ سیاق کلام معرکہ احد کے مرکزی واقعات کے بیان کا آغاز کرے، ان واقعات کے نتائج ریکارڈ کرے، اور واقعات کی تفصیلات کا ذکر کرے۔ یہاں اس عظیم معرکہ کے بارے میں ہدایات دی جا رہی ہیں، جس کا ذکر ہم نے اس بحث کے آغاز میں کیا ہے۔ وہ عظیم معرکہ وہ ہے جو انسانی نفسیات کے میدان میں برپا تھا اور ہے جو پوری انسانی زندگی کی سطح پر جاری و ساری ہے۔ اس سلسلے میں یہاں سود خوری اور سودی کاروبار کے بارے میں بات کی جاتی ہے۔ یہاں اللہ خوفی، اللہ کی اطاعت اور اس کے رسول کی فرمانبرداری سے متعلق بات کی جاتی ہے۔ یہ حکم دیا جاتا ہے کہ سہولت اور مشکلات کے ہر دور میں انفاق فی سبیل اللہ پر عمل کیا جائے۔ اسلامی نظام معیشت کے کریمانہ نظام معاونت اور اس کے مقابلے میں سود کی ملعون نظام معیشت کا ذکر، غصہ پی جانا، لوگوں سے عفو و درگزر کرنا اور

جماعت مسلمہ کے اندر بھلائی کی اشاعت مگناہوں سے معافی کی طلب گاری اور غلطیوں اور کوتاہیوں پر عدم اصرار کے مباحث کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُّضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۱۳۰) وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (۱۳۱) وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (۱۳۲) وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ (۱۳۳) الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاطِمِينَ الْغَيْظِ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۳۴) وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۱۳۵) أُولَٰئِكَ جَزَاءُ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتُ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ (۱۳۶)

”اے ایمان لانے والو! یہ بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اس آگ سے بچو جو کافروں کے لئے مہیا کی گئی ہے اور اللہ اور رسول کا حکم مان لو، توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے۔ دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے، اور وہ ان اللہ ترس لوگوں کے لئے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں مال خرچ کرتے ہیں، خواہ بد حال ہوں یا خوش حال، جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں، ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں، کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا

ہو۔ اور وہ دیدہ دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی جزاء ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغوں میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لئے۔“

یہ تمام ہدایات یہاں عین اس وقت جاری ہیں کہ سیاق کلام میں جنگی معرکہ پر بحث شروع ہونے والی ہے۔ اور ان سے یہاں اسلامی نظریہ حیات کی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت کی طرف اشارہ مطلوب ہے۔ اسلامی نظریہ حیات انسانی شخصیت اور اس کی سرگرمیوں کو ایک جامع نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ اور انسان اور اس کی تگ و دو کو ایک ہی محور کے گرد گھماتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ انسان کو اپنی پوری زندگی میں اللہ وحدہ لا شریک کی اطاعت اور پرستش کرنی ہے۔ ہر معاملے میں صرف اس کی طرف متوجہ ہونا ہے۔ اور صرف اسلامی نظام حیات ہی پوری زندگی پر حاوی کرنا ہے اور انسانی شخصیت کے تمام احوال اور تمام حالات پر اسلامی نظام حیات کو غالب کرنا ہے اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں اسے رائج کرنا ہے۔ اس کے بعد یہ ہدایات انسانی زندگی کی بوقلمونیوں کے درمیان اس ربط کی طرف اشارہ کرتی ہیں اور سعی انسانی کے آخری نتائج میں اس ربط کے اثرات بھی بیان کئے جاتے ہیں جیسا کہ اس سے قبل ہم بیان کر آئے ہیں۔

اسلامی نظام زندگی نفس انسانی کے ہر پہلو کو اپنی گرفت میں لیتا ہے، وہ جماعت مسلمہ کی زندگی کو پوری طرح منظم کرتا ہے۔ وہ اس کے درمیان بخرے بخرے کر کے کوئی فیصلہ نہیں کرتا۔ اس لئے وہ میدان کارزار کے لئے ساز و سامان بھی تیار کرتا ہے اور افراد کار کے اندر صلاحیت جنگ بھی پیدا کرتا ہے۔ وہ اہل ایمان کے دلوں کو بھی پاک کرتا ہے۔ ان کے ذہنوں کی تطہیر کرتا ہے، انسان کے اندر ایسی اخلاقی قوت پیدا کرتا ہے کہ وہ ہوائے نفس اور جسمانی خواہشات پر قابو پاسکیں۔ جماعت مسلمہ کے اندر محبت، ملنساری پیدا کی جاتی ہے اور یہ تمام اوصاف ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔ جب ہم ان تمام خصوصیات پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے اور ان ہدایات میں سے ہر ایک کی تفسیر کریں گے تو

معلوم ہو گا کہ تمام اوصاف و ہدایات کا جماعت مسلمہ کی عملی زندگی کے ساتھ گہرا ربط ہے۔ اور یہ اوصاف میدان جنگ اور میدان حیات دونوں میں جماعت مسلمہ کی تقدیر کے ساتھ مربوط ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ
(۱۰) وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ (۱۳۱) وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ
(۱۳۲)

”اے ایمان لانے والو! بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو اور اللہ سے ڈرو، امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔ اس آگے سے بچو جو کافروں کے لئے مہیا کی گئی ہے اور اللہ اور رسول کا حکم مان لو، توقع ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔“

سود اور سودی نظام معیشت پر بحث فی ظلال القرآن پارہ سوئم میں تفصیل کے بیان ہو چکی ہے۔ اس لئے یہاں ہم اس پوری بحث کو دہرانا مناسب نہیں سمجھتے۔ لیکن یہاں اضعاف مضاعفہ کے الفاظ پر غور کرنا مناسب ہو گا۔ اس لئے کہ ہمارے زمانے کے بعض لوگ ان الفاظ کی آڑ لے کر یہ مفہوم بیان کرتے ہیں کہ جو چیز حرام کی گئی ہے وہ اضعاف مضاعفہ ہے۔ رہا وہ سود جو چار فیصد ہو، پانچ فیصد ہو، سات فی صد ہو، نو فی صد ہو تو وہ اضعاف مضاعفہ نہیں ہے، لہذا وہ حرام نہیں ہے۔

اس کی تردید میں صرف یہی کہنا کافی ہے کہ اضعاف مضاعفہ کی قید دراصل نزول قرآن کے وقت موجود واقعی صورتحال کا اظہار کرتی ہے، یہ قید اس حکم کو محدود اور مشروط نہیں کرتی۔ سورہ بقرہ میں جو آیت وارد ہے وہ قطعی ہے۔ اور رہا کی ہر صورت کو حرام قرار دیتی ہے۔ اس لئے اس میں کوئی قید وحد نہیں ہے۔ وہاں یہ الفاظ نہیں وَذُرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا..... ”سود میں سے جو کچھ باقی ہے اسے چھوڑ دو۔“ چاہے وہ سود جس شرح سے بھی ہو۔“

اس اصولی بحث کے بعد اب ہم بتائیں گے کہ ربا کے ساتھ اس صفت اضعاف مضاعفہ کی قید کیوں عائد کی گئی ہے؟ صرف یہ کہ یہ صفت سودی نظام کی تاریخ کی طرف اشارہ کر رہی ہے جس میں سودی کاروبار دوچند چہار چند شرح سے کیا جاتا تھا۔ بلکہ یہ بتاتی ہے کہ سود کی شرح جو بھی ہو سود کے تباہ کن نظام کے ساتھ یہ صفت اضعاف مضاعفہ ایک لازم صفت ہے۔

سودی نظام کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی سوسائٹی میں پوری دولت کی گردش اس نظام کے مطابق شروع ہوتی ہے، اس لئے سودی کاروبار میں سرگرمیاں سود مفرد کی طرح سادہ سرگرمیاں نہیں ہوتیں۔ اس گردش کا ایک پہلو یہ ہے کہ اس نظام میں مال کی منتقلی بار بار ہوتی رہتی، اس لئے وہ سود مرکب میں تبدیل ہو جاتا ہے، اس لئے بار بار سودی چارج کی وجہ سے بالآخر سود کی رقم کئی گنا ہو جاتی ہے۔ اور وہ بلا جہد اضعافاً مضاعفہ بن جاتی ہے۔ اس لئے اپنے مزاج کے اعتبار سے سودی نظام میں دولت دوگنی چوگنی بنتی جاتی ہے۔ اس لئے اضعاف مضاعفہ کا اطلاق اس صورت حال کے اندر منحصر نہ ہو گا جو نزول قرآن کے وقت عرب سوسائٹی میں مروج تھی بلکہ ہر دور میں ہر قسم کے سودی نظام کی یہ خاصیت ہوتی ہے کہ وہ دوگنا چوگنا ہو تارہتا ہے۔

اور جیسا کہ ہم نے تیسرے پارے میں تفصیلات دی ہیں، اس نظام کی خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ یہ لوگوں کی نفسیات اور اخلاق پوری طرح بگاڑ دیتا ہے۔ نیز یہ نظام ملک کی اقتصادی اور سیاسی صورت حال کو بھی پوری طرح خراب کر دیتا ہے۔ اس لئے اس سودی نظام کے اثرات امت کی اجتماعی زندگی پر پڑتے ہیں اور امت کے انجام پر اس کے اثرات ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے تیسرے پارے میں ذکر کیا ہے۔

اسلام جس وقت امت مسلمہ کی تخلیق کر رہا تھا، وہ اس امت کے لئے ایک اخلاقی اور نفسیاتی نظام حیات کی بنیاد بھی رکھ رہا تھا، وہ اس نئی امت کی سیاسی اور اقتصادی زندگی کو بھی صحت مند انہ اصولوں پر استوار کر رہا تھا، اس سلسلے میں اس نئی امت کو معرکے درپیش ہوئے اور ان کے جو اثرات مرتب ہوئے وہ تاریخ اسلام کے معروف و مشہور واقعات ہیں، اس لئے جنگی واقعات کے درمیان میں اچانک حرمت

ربا کا ذکر بھی قابل فہم ہے اس لئے کہ اسلامی نظام حیات ایک جامع اور حکیمانہ نظام ہے۔ نیز ربا کی ممانعت کے بعد یہ کہنا کہ اللہ سے ڈرو اور یہ امید رکھو کہ تم پر رحم کیا جائے گا اور پھر یہ کہنا کہ اس آگ سے اپنے آپ کو بچاؤ جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے، یہ دونوں باتیں بھی اس نقطہ نظر سے قابل فہم ہو جاتی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی اللہ سے ڈرتا ہو اور اس کے دل میں اللہ کا خوف ہو وہ ہر گز سود نہیں کھا سکتا، نیز جس شخص کے دل میں عذاب جہنم کا خوف ہو، وہ بھی ہر گز سود خور نہیں ہو سکتا۔ بالفاظ دیگر جو شخص بھی ایمان رکھتا ہو اور اپنے آپ کو کافروں کی لائن سے نکالنا پسند کرتا ہو وہ کبھی سود خور نہیں ہو سکتا۔ ایمان صرف خالی خولی باتوں کا نام نہیں ہے بلکہ اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ اسلامی نظام حیات کے قیام اور پوری زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگنے کے لئے ایمان کو ہر اول دستہ قرار دیا گیا ہے۔

یہ بات محال ہے کہ ایمان اور سودی نظام ایک جگہ جمع ہو جائیں جہاں سودی نظام قائم ہو گا، وہ سوسائٹی پوری کی پوری دین اسلام سے خارج تصور ہو گی اور اس کا انجام اس آگ میں ہو گا جسے فی الحقیقت کافروں کے لئے تیار کیا گیا ہے۔ اس مسئلے میں جو بھی بحث کی جائے وہ غیر ضروری بحث ہو گی، اس لئے کہ اس آیت میں پہلے سودی کاروبار کی ممانعت کی گئی ہے۔ اس کے بعد اہل ایمان کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ کا خوف کریں اور اس حکم پر عمل کریں اور اس آگ سے بچیں جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔ یہ مضمون اس نہج پر بے مقصد نہیں لایا گیا نہ اتفاقہ طور پر اس طرح بیان کر دیا گیا ہے۔ یہ سب ہدایات با مقصد ہیں، بطور تاکید لائی گئی ہیں اور مسلمانوں کے ذہن میں اس حقیقت کو اسی مفہوم میں بٹھانا مقصود ہے۔

انہیں یہ امید دلائی گئی ہے کہ اگر وہ سودی کاروبار ترک کر دیں گے تو وہ امید کر سکتے ہیں کہ وہ کامیاب ہوں گے، اس لئے کہ کامیابی صرف اللہ کے تقویٰ کے نتیجے میں مل سکتی ہے۔ تقویٰ کا طبعی انجام فلاح ہے۔ اور فلاح اس لئے کہ انسانوں کی زندگی میں اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ پارہ سوئم میں ہم تفصیل سے بیان کر آئے ہیں کہ اس منحوس سودی نظام نے انسانی معاشروں کو کس طرح تباہ کیا ہے

۔ اور پوری انسانیت کو اس نظام نے کن کن مصائب میں مبتلا کئے رکھا ہے۔ مناسب ہے کہ پارہ سوئم میں دی گئی مباحث کو ایک بار پھر ذہن نشین کر لیا جائے تاکہ ہمیں معلوم ہو جائے کہ اسلامی نقطہ نظر سے فلاح کا تصور کیا ہے اور یہ کہ کس طرح فلاح اس بات پر موقوف ہے کہ ہم اس خبیث سودی نظام کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔

اس کے بعد یہ آخری تاکید کی جاتی ہے وَأَطِيعُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ..... ”اور اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کی امید ہو سکے۔“ یہ اللہ اور رسول کی اطاعت کا عام حکم ہے، اور اس طاعت عامہ پر اللہ کے رحم کو موقوف کیا گیا ہے لیکن سودی کاروبار کی ممانعت کے بعد بطور نتیجہ اس رحمت خداوندی کا ذکر خالی از حکمت نہیں ہے۔ اس میں ایک خاص مفہوم اور اشارہ بھی مطلوب ہے۔ وہ یہ ہے کہ کسی ایسے معاشرے میں جس کی اقتصادیات سودی نظام پر استوار ہوں قطعاً اللہ اور رسول کی اطاعت ممکن نہیں رہتی۔ نیز اس دل میں اطاعت الہی اور اطاعت رسول کا جذبہ ہی نہیں رہتا جو سود کھاتا ہو، چاہے وہ کسی بھی شکل اور کسی بھی صورت میں ہو، اس طرح نبی عن الربا کا یہ نتیجہ اور تعقیب بھی ایک طرح کی مزید تاکید مزید ہے کہ اس منحوس نظام کو ختم کر دیا جائے۔

یہاں اطاعت اللہ اور اطاعت رسول ﷺ کی اس تاکید کا تعلق کاروبار ربا کے علاوہ جنگ احد کے ان واقعات کے ساتھ بھی ہے جن میں رسول ﷺ کے واضح احکام کی خلاف ورزی کی گئی تھی۔ اشارہ یہ مقصود ہے کہ فلاح صرف اس صورت میں نصیب ہو سکتی ہے کہ تم لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، صرف یہی جائے امید ہے اور یہی راہ نجات ہے۔

اس سے قبل سورہ بقرہ پارہ سوئم میں جہاں ہم نے سودی نظام پر بحث کی تھی ہم نے بتایا تھا کہ ذکر ربا کے ساتھ ساتھ وہ انفاق فی سبیل اللہ اور فضیلت صدقہ کا بیان اس لئے کیا گیا ہے کہ اجتماعی نظام میں یہ دونوں باہم مقابل سمتیں ہیں، جن سے دو علیحدہ علیحدہ نظامہائے اقتصاد کی طرف اشارہ مطلوب ہے۔ ایک سودی اقتصادی نظام ہے اور دوسرا باہم تعاون پر مبنی نظام اقتصاد ہے۔ چنانچہ یہاں بھی جب ربا

سے بحث کی گئی تو اس کے ساتھ ہی ہر حال میں اتفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب بھی دی گئی۔ چنانچہ ربا کی ممانعت اور اس آگ سے ڈرانے کے بعد جو اہل کفر کے لئے تیار کی گئی ہے اور لوگوں کو اللہ خوفی کی دعوت دینے اور انہیں ہر وقت رحمت خداوندی کے امیدوار رہنے کے ساتھ ساتھ انہیں دعوت دی گئی ہے کہ وہ اللہ کی مغفرت کی طرف دوڑ کر چلیں۔ وہ بھاگے بھاگے ان جنتوں میں داخل ہوں جو آسمانوں اور زمینوں کی وسعتوں سے بھی زیادہ وسیع ہیں اور جنہیں اہل تقویٰ کے لئے تیار کیا گیا ہے اور متقین کے اوصاف میں سے پہلی صفت یہ بیان کی گئی ہے الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالصَّرَّاءِ..... ”وہ لوگ جو خوشحالی اور بدحالی دونوں حالتوں میں مال خرچ کرتے ہیں۔“ اس لئے یہ لوگ ان لوگوں کے فریق مخالف ہیں جو سودی نظام کھاتے ہیں اور اس کے ذریعہ دوچند چہارچند رقم بٹورتے ہیں۔ اس کے بعد پھر متقین کی اور صفات بیان کی جاتی ہیں۔ پوری آیت یہ ہے:

وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِّلْمُتَّقِينَ (۱۳۳) الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالصَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۳۴) وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرِ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ (۱۳۵)

”دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس جنت کی طرف لے جاتی ہے جس کی وسعت زمین و آسمانوں جیسی ہے اور وہ ان خدا ترس لوگوں کے لئے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بد حال ہوں یا خوشحال جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔ اور جن کا حال یہ ہے کہ اگر کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں..... کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے..... اور وہ دیدہ دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔“

اس آیت کا انداز تعبیر ایسا ہے کہ اس میں ان عبادات کو بالکل محسوس طور پر بیان کیا گیا ہے۔ گویا کچھ لوگ ہیں جو کسی انعامی مقابلے میں ایک مقررہ ہدف کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَعْفَرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ..... ”دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی مغفرت کی طرف جاتی ہے“ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ..... ”دوڑ کر چلو اس جنت کی طرف جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے۔“ دوڑو! وہ ہے جنت وہاں ہے مغفرت! أُعِدَّتْ لِّلْمُتَّقِينَ..... ”جو ان لوگوں کے لئے تیار کی گئی ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔“

اس کے بعد متقین کی صفات بیان کی جاتی ہیں الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّاءِ وَالصَّرَّاءِ..... ”وہ لوگ جو بد حالی اور خوشحالی دونوں میں خرچ کرتے ہیں۔“

یعنی وہ انفاق پر ہر وقت ثابت قدمی سے عمل پیرا ہیں، وہ اپنی روش پر رواں دواں ہیں، نہ خوشحالی میں آپے سے باہر ہوتے ہیں اور نہ بد حالی میں نہج سے پیچھے ہٹتے ہیں۔ خوشحالی انہیں مغرور کر کے غافل نہیں بنادیتی اور بد حالی ان کی گوشمالی کر کے انہیں ان کا نصب العین بھلا نہیں دیتی۔ انہیں اپنی ذمہ داریوں کا شعور ہر وقت دامن گیر رہتا ہے۔ وہ حرص وہ آذ سے آزاد ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نگرانی کا شعور رکھتے ہیں اور ان کے دل میں اللہ کا خوف ہر وقت زندہ رہتا ہے۔ نفس انسانی جو اپنے مزاج کے اعتبار سے بخیل ہوتا ہے اور جس کے اندر دولت کی طبعی محبت ہوتی ہے، اسے ہر وقت انفاق فی سبیل اللہ پر قائم رکھنے کے لئے ایک قوی تر جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ جذبہ مال کی محبت سے قوی تر ہونا چاہئے۔ تاکہ وہ حرص و آرز کے فطری بندھن کو توڑ سکے۔ اور یہ جذبہ صرف اللہ خوف کا جذبہ ہی ہو سکتا ہے۔ اور یہ کیا ہوتا ہے؟ یہ ایک نہایت ہی لطیف اور گہرا شعور ہوتا جس کے ساتھ روح اونچی پرواز کرتی ہے۔ وہ خالص ہو جاتی ہے اور قید و بند سے آزاد ہو جاتی ہے۔

معمر کہ حق و باطل کی اس فضا میں اس صفت کی طرف یہاں اشارہ ایک خاص مناسبت سے کیا گیا ہے۔ اس معمر کے دوران بار بار انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید کی جاتی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ان

سرمایہ داروں پر بھی تنقید کی جاتی ہے جو انفاق فی سبیل اللہ سے کئی کتراتے ہیں۔ اس نکتہ کی تفصیلات نصوص کی تفسیر کے دوران بیان ہوں گی۔ معرکہ حق و باطل کی اس فضا میں انفاق کی ایک خاص اہمیت ہے۔ اور یہاں اس کا بار بار ذکر اس لئے ہوا کہ انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں دعوت اسلامی کے بعض کارکنوں کا موقف اس کا متقاضی تھا۔

وَالْكَاطِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ..... ”جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔“ غرض اللہ خوفی اس میدان میں بھی اپنے ثرات دکھاتی ہے۔ بعینہ وہی اسباب اور وہی اثرات جو انفاق کے لئے تھے، غصہ ایک ایسا بطعی انفعال ہے جس کے انسانی خون میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ گویا وہ انسان کے عام فطری رد عمل کی ایک قسم ہے بلکہ وہ انسان کی ایک طبعی ضرورت ہے۔ اور اس فطری رد عمل کو انسان صرف اس روحانی قوت کے ذریعہ ہی قابو میں لاسکتا ہے جو نور تقویٰ کے نتیجے میں انسان کو حاصل ہوتی ہے۔ یہ قوت غضبی اس وقت رام ہوتی ہے جب انسان روحانی قوت سے مسلح ہو اور اس کی نظریں ذاتی ضروریات اور ذاتی دفاع سے بلند ہو کر ایک اعلیٰ انسانی افق پر مرکوز ہوں۔

ہاں غصہ پی جانا تو پہلا مرحلہ ہے اور یہ کافی نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات انسان غصہ تو پی جاتا ہے لیکن اس کے بعد اس کے دل میں کینہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں جوش انتقام ولولہ پیدا کرتا ہے۔ ظاہری غصہ ٹھنڈا ہو کر خفیہ حسد کو جنم لیتا ہے۔ اور گہری دشمنی پیدا ہو جاتی ہے اور اس صورت میں یہ غیض و غضب جو ظاہری رد عمل ہوتے ہیں، بمقابلہ کینہ اور بغض نسبتاً زیادہ اچھے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بعد میں فرماتے ہیں کہ غیظ و غضب کے نتیجے میں حس اور بغض پیدا نہ ہونا چاہئے بلکہ اس کے بعد عفو و درگزر سے کام لینا چاہئے اور غلطیوں کو معاف کر دینا چاہئے۔ غصہ کو اگر دل میں چھپا لیا جائے تو اس سے دلوں میں پردے پڑ جاتے ہیں بلکہ دلوں کے اندر کینہ کی آگ سلگنے لگتی ہے۔ انسانی ضمیر دھان آلود ہو جاتا ہے۔ جب انسان دل و جان سے معاف کر دیتا ہے اور درگزر کر دیتا ہے تو یہ پردہ دلوں سے

ہٹ جاتا ہے اور انسان کی روح نور کی فضاؤں میں پرواز کرتی ہے۔ دل ٹھنڈک محسوس کرتے ہیں اور انسانی ضمیر کو امن و سکون نصیب ہوتا ہے۔

وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ..... ”ایسے نیک لوگ اللہ کو بہت پسند ہیں۔“ کیسے نیک لوگ، وہ جو بد حالی اور خوشحالی میں اپنی دولت اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، وہ نیک ہیں۔ جو لوگ غصہ پی جانے کے بعد لوگوں کو معاف کر دیتے اور درگزر کرتے ہیں وہ نیک لوگ ہیں۔ ایسے لوگوں کو اللہ محبوب رکھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لئے لفظ محبت کا استعمال نہایت ہی خوبصورت، دل لگتا اور ضو پاش ہے۔ اور اس شریفانہ اور منور ماحول کے ساتھ خوب ہم آہنگ ہے۔

نیکی اور نیکو کاروں کے ساتھ اس اعلان محبت سے، اہل ایمان کے دلوں میں نیکی سے سرچشمے پھوٹتے ہیں، اور یہ سوتے مومن سے مومن تک منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں اور ان دلوں میں نیکی کے لئے جوش و خروش پیدا ہو جاتا ہے۔ غرض یہ صرف پر تاثیر ادا ہی نہیں ہے بلکہ یہ زور دار انداز تعمیر اپنے پیچھے ایک عظیم حقیقت بھی رکھتی ہے۔

وہ جماعت جسے اللہ محبوب رکھتا ہے اور وہ اللہ کو محبوب رکھتی ہے جس کے اندر عفو و درگزر عام ہے۔ جس کے اندر کینہ اور حسد نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی جماعت ہے جو دوسرے سے پیوستہ اور وابستہ ہے۔ اس کے افراد بھائی بھائی ہیں۔ یہ قوی اور متین جماعت ہے۔ اس لئے وہ اپنی اندرونی زندگی میں بھی متحد اور یکجا ہے اور میدان کارزار میں بھی بنیان مرصوص ہے۔ اس لئے عفو و درگزر کا یہ مضمون بعنوان کارزار سے بھی ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔

اسی مناسبت سے اہل ایمان کی ایک دوسری صفت کو بھی لیا جاتا ہے۔

وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرِ
الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ

”جن کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں..... کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہو..... اور دیدہ و دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت کس قدر کشادہ دل ہے، اللہ لوگوں کو صرف اس وقت کشادہ دلی اور باہم برداشت کی دعوت دیتا ہے جب وہ خود ان کے ساتھ نہایت ہی فیاضی کا سلوک کرتا ہے اور اس کی انہیں اطلاع بھی دے دیتا ہے، تاکہ وہ اپنے اندر فیاضی کا ذوق پیدا کریں اور نور خدا سے شمع روشن کریں اور اونچے اخلاق سیکھیں۔ متقین اہل ایمان میں سے بلند مرتبت لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن دین اسلام کی بے مثال فیاضی ہے یہ دین ان لوگوں کو بھی متقین شمار کرتا ہے ”جن کا حال یہ ہے کہ اگر ان سے کوئی فحش کام سرزد ہو جاتا ہے یا گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً انہیں اللہ یاد آ جاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔“ اور گناہوں سے ”فحش“ کام اسلامی نقطہ نظر سے بدترین گناہ اور بڑے گناہوں میں سے ہے لیکن یہ اس دین کی کشادہ دلی اور فیاضی ہے کہ وہ فحاشی جیسے گھناؤنے گناہ کے ارتکاب کرنے والے کو بھی راندہ درگاہ نہیں بناتا۔ اور اس پر رحمت کے دروازے بند نہیں کئے جاتے۔ نہ یہ دین ایسے لوگوں کو دوسرے درجے کے مسلمان قرار دیتا ہے، بلکہ ان کو بھی متقین کے اعلیٰ مرتبے پر فائز کرتا ہے۔ ہاں اس مرتبے پر فائز کرنے کے لئے صرف ایک شرط ان پر عائد کی جاتی ہے اور اس شرط سے بھی اس دین کا مزاج اور اس کا رجحان اچھی طرح معلوم ہوتا ہے۔ وہ شرط یہ ہے کہ ارتکاب معصیت کے بعد معاً وہ اللہ کو یاد کر لیں اور اپنے گناہوں کی مغفرت مانگ لیں اور یہ کہ وہ اس گناہ پر اصرار نہ کریں حالانکہ وہ جانتے ہوں کہ وہ جو چھ کر رہے ہیں وہ ایک معصیت ہے۔ اور یہ کہ وہ معصیت میں بے شرمی اور بے باکی کے ساتھ غرق نہ ہو جائیں بالفاظ دیگر وہ اللہ کی بندگی کے دائرے کے اندر رہیں اور آخر کار اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہوں۔ یوں وہ اللہ کی پناہ میں رہیں۔ وہ اس کے عفو و درگزر اور فضل و کرم کے دائرے کے اندر ہی رہیں۔

دین اسلام کو معلوم تھا کہ انسان کمزوریوں کا پتلا ہے، بعض اوقات ان بشری کمزوریوں کی وجہ اس سے فحاشی کا ارتکاب بھی ہو جاتا ہے۔ بعض اوقات گوشت و پوست کے جسمانی میلانات جوش میں آتے ہیں اور وہ حیوانی تقاضوں کے تحت جسمانی خواہشات اور میلانات کی سطح تک اتر آتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ جسمانی میلانات، خواہشات اور رجحانات کی گرمی اور دباؤ میں اللہ جل شانہ کے احکامات کی خلاف ورزی پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ دین اسلام انسان کی اس فطری کمزوری کو مد نظر رکھتا ہے، اس لئے اس کے ساتھ سخت رویہ اختیار نہیں کرتا۔ اور جب انسان ان خطاؤں کا ارتکاب کر کے اپنے اوپر ظلم کا ارتکاب کرے تو یہ دین اسے فوراً ہی رحمت خداوندی سے مار نہیں بھگاتا، خصوصاً جبکہ وہ فحاشی کا ارتکاب کرے یا کسی گناہ کبیرہ میں پڑ جائے۔ اس کے دل میں شمع ایمان روشن ہے تو وہ اس کی دستگیری کے لئے کافی ہے۔ اگر اس کے دل میں ایمان کے سوتے خشک نہیں ہوئے اور اس کا رشتہ تعلق باللہ بالکل کٹ نہیں گیا تو اس کے دل میں یہ احساس زندہ رہتا ہے کہ وہ انسان ہے غلطی کا پتلا ہے اور اس کا رب غفور و رحیم ہے۔ اس لئے یہ انسان ضعیف اور خطاکار پر امید رہتا ہے اور بخیر و عافیت رہتا ہے اور اس دنیا میں اس کا سفر بند نہیں ہوتا۔ وہ ایک مضبوط رسی تھا مے ہوئے ہوتا ہے اور اس کا سرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ نہیں جاتا۔ اس کی انسانی کمزوریاں اسے چاہے کس قدر گرائیں، جب تک شمع ایمان اس کے دل میں روشن ہے، وہ منزل مقصود پالے گا۔ جب تک وہ اس مضبوط رسی کو تھا مے ہوئے ہے وہ راہ راست پر آہی جائے گا۔ جب تک وہ اللہ کو یاد رکھتا ہے اور اس کے دل میں خوف اللہ پایا جاتا ہے، جب تک وہ اپنے گناہوں کی معافی مانگتا ہے اور اللہ کی بندگی کا اقرار کرتا ہے اور اس کی نافرمانی اکڑ کر نہیں کرتا تو وہ راہ راست پر آسکتا ہے۔

یہ دین اس مخلوق کے لئے توبہ کا دروازہ بند نہیں کرتا اگرچہ یہ ضعیف مخلوق وقتی طور پر گمراہی کے گڑھے میں کیوں نہ گر جائے۔ یہ دین اس خطاؤں کے پتلے انسان کو کسی غیر آباد صحراء میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑتا۔ وہ اسے اپنے انجام کے بارے میں مایوس و پریشان بھی نہیں چھوڑتا۔ اسے ہر وقت مغفرت کی امید دلائی جاتی ہے۔ اس کی راہنمائی کی جاتی ہے۔ اس کے کانپتے ہاتھوں کو ہاتھ میں لیا جاتا ہے۔ اس کے ڈمگاتے قدم مستحکم اور ثابت ہو جاتے ہیں۔ اسے شمع امید عطا کی جاتی جس میں وہ اپنی

راہ پالیتا ہے اور یوں وہ محفوظ اور ماموں جائے قرار تک پہنچ جاتا ہے۔ اور پر امن سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔

اس دین کا مطالبہ انسان سے صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ اس کے قلب سے ایمان کے سوتے خشک نہ ہو گئے ہوں۔ اس کی روحانی دنیا تاریک نہ ہو گئی ہو اور اس نے اپنے خالق حقیقی کو بھلا نہ دیا ہو۔ وہ اللہ کو یاد کر رہا ہو اور اس کی روح میں وہ راہنما بینار نور موجود ہو اور اس کے دل میں اس کے ضمیر کی آواز حدی خواں ہو اور اس کی زمین میں ایمان کا نم باقی ہو تو امید کی جاسکتی ہے کہ اس کے دل میں شمع ایمان دوبارہ روشن ہو، امید کی جاسکتی ہے کہ وہ دوبارہ امن و سکون کے خطیرہ میں لوٹ آئے اور امید کی جاسکتی ہے کہ اس کے کشت زار دل میں دوبارہ ایمان کی تخم ریزی ہو سکے۔

ایک واضح مثال آپ کو بھی درپیش ہوگی۔ تمہارا خطا کار بچہ اگر یہ یقین رکھتا ہو کہ جس غلطی کا ارتکاب اس سے ہو چکا ہے اس پر اب گھر میں ڈنڈے کے سوا اور کچھ نہیں ہے تو وہ پیچھے نہیں دیکھے گا اور بھاگتا ہی رہے گا اور مزید بے راہ روی اختیار کرے گا۔ اور کبھی گھر کو واپس نہ آئے گا۔ لیکن اگر ڈنڈے کے ساتھ ساتھ گھر میں اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے والا پر شفقت ہاتھ بھی ہو جو معذرت پر اس کی اس کمزوری سے صرف نظر کرتا ہو اور اسے تھپکی دیتا ہو اور جب وہ معافی مانگے تو اس کی معافی قبول ہوتی ہو تو اس صورت میں اس بات کا امکان ہے کہ وہ واپس گھر آجائے۔

اسلام اس ضعیف اور خطا کار انسان کے ساتھ ایسا ہی رویہ اختیار کرتا ہے۔ خالق کو معلوم ہے کہ انسان کی شخصیت میں اگر ایک طرف ضعف اور کمزوری ہے تو دوسری جانب اس میں کچھ صلاحیت بھی ہے۔ ایک جانب اگر اس پر مادیت کا بوجھ لدا ہوا ہے تو دوسری جانب اس کے اندر روحانیت کی سبک رفتاری بھی ہے۔ ایک طرف اس کی ذات میں اگر نفوس حیوانی کے میلانات ہیں تو دوسری جانب اس کے اندر ربانی رجحانات بھی ودیعت کئے گئے ہیں۔ اس جب بھی وہ حیوانی گندگیوں میں مبتلا ہو کر نیچے گرتا ہے تو دست قدرت اس کی دستگیری کرتا ہے اور اسے اوپر کی جانب اٹھاتا ہے اور پھسلنے پر اس کو تھپکی دے کر دوبارہ اسے کھڑا کرتا ہے کہ وہ راہ راست پر رواں ہو، بشرطیکہ اس کے دل میں اللہ کی یاد ہو اور

وہ اپنے خالق کو بالکل بھول نہ چکا ہو۔ اور وہ جان بوجھ کر غلطی پر نہ اڑ جائے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ”جو شخص استغفار کرے تو یہ سمجھا جائے گا کہ وہ غلطی پر مصر نہیں ہے اگرچہ وہ دن میں ستر مرتبہ ایسا کرے۔ (روایت ابو داؤد، ترمذی اور بزار۔ اس نے اپنی سند میں عثمان ابن واقد کی روایت سے نقل کیا ہے۔ اگرچہ اس کی سند میں ایک نامعلوم صحابی ہیں لیکن ابن کثیر نے اسے صحیح قرار دیا ہے اور کہا ہے ”حدیث حسن“)

ہاں توبہ کو دروازہ کھلا رکھ کر اسلام بہر حال بے راہ روی میں لوگوں کو آزاد نہیں چھوڑتا۔ اور نہ غلط کار اور گمراہیوں کے گڑھے میں گرنے والوں کو قابل تعریف سمجھتا ہے۔ اور نہ اس گندگی کو حسن سے تعبیر کرتا ہے، جس طرح نام نہاد ”واقعیت پسندی“ کے پیروکار کرتے ہیں، ہاں اسلام صرف لغزش اور انسان کی فطری کمزوریوں کو تسلیم کرتا ہے تاکہ انسان کے اندر مایوسی پیدا نہ ہو اور شمع امید روشن رہے۔ اس طرح اسلام شرم و حیاء کے انفعالات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور انسانی کوتاہیوں پر اللہ کی جانب سے مغفرت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو مغفرت کر سکے۔ اسلام گناہ کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا البتہ اگر کوئی شر مندہ ہوتا ہے تو اس کی حوصلہ افزائی کرتا ہے۔ وہ استغفار کے لئے آمادہ تو کرتا ہے لیکن وہ گناہوں کے ارتکاب میں لاپرواہی کی اجازت بھی نہیں دیتا۔ نہ مسلسل خطا کاری کرنے اور اسے شعار بنانے کی اجازت دیتا ہے، اس لئے کہ جو لوگ ارتکاب جرم کو اہمیت ہی نہیں دیتے اور مسلسل گناہ پر گناہ کئے جا رہے ہیں تو وہ حدود سے نکل گئے ہیں۔ اس کے سامنے دیواریں حائل ہو گئی ہیں۔

یوں اسلام، اس انسانیت کو پکارتا ہے کہ وہ بلند افق کو نصب العین بنائے، لیکن اس دعوت کی پکار کے ساتھ اس پر رحمت اور شفقت کے لئے بھی ہر وقت تیار رہتا ہے۔ اس لئے کہ اسلام کو یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ انسان کی طاقت حدود کیا ہیں۔ اس لئے اسلام، انسان کے لئے، امید کا دروازہ ہمیشہ کھلا رکھتا ہے۔ اور انسان کی طاقت جہاں تک ساتھ دیتی ہے وہ اسے آگے بڑھاتا ہے۔ (تفصیلات کے لئے دیکھئے میری کتاب ”اسلام اور عالمی سلامتی“ کی فصل ”ضمیمہ کی سلامتی“)

أُولَئِكَ جَزَاؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَنَعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ

”ایسے لوگوں کی جزاء ان کے رب کے پاس یہ ہے کہ وہ ان کو معاف کر دے گا اور ایسے باغات میں انہیں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور وہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کے لئے۔“

ارتکاب معصیت سے استغفار کر کے وہ محض منفی کام نہیں کر رہے، اور نہ وہ خوشحالی اور بد حالی میں انفاق کر کے محض منفی کام کر رہے ہیں یا غصہ پی کر اور لوگوں سے عفو و درگزر کر کے وہ محض منفی کام کر رہے ہیں، بلکہ وہ مثبت کام بھی کرتے ہیں اور نیک عمل کرنے والے ہیں، اس لئے ان کے لئے ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور وہ ایسے باغات میں رہیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور مغفرت کے بعد ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے محبت کا اعزاز بھی حاصل ہو گا۔ یہاں ان کے نفس کی گہرائیوں میں بھی عمل ہے اور ظاہری زندگی میں بھی عمل ہے۔ دونوں عمل ہیں، دونوں میں حرکت ہے اور دونوں میں ترقی ہے۔

یہ تمام صفات جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اور سیاق کلام میں آگے جس معرکہ کارزار کا ذکر ہونے والا ہے، ان دونوں کے درمیان ایک خاص مناسبت ہے۔ جس طرح سودی معیشت یا باہمی تعاون کے اسلامی نظام معیشت کا تعلق میدان جہاد کے معرکے سے تھا اور اسلامی جماعت کے شب و روز اس سے متاثر ہوئے تھے، اسی طرح ان نفسیاتی خصوصیات اور اجتماعی اوصاف کے اثرات بھی جماعت مسلمہ پر پڑتے تھے۔ ہم نے اس موضوع پر بات کا آغاز کرتے وقت اس طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً کنجوسی پر فتح یاب ہونا، غصے پر قابو پانا، ارتکاب معصیت کے مقابلے میں ضبط کرنا، اللہ کی طرف رجوع کرنا، اس کی جانب مغفرت کا طلب گار ہونا اور اس کی رضامندی کو نصب العین بنالینا ایسی فتوحات ہیں جو معرکہ کارزار میں دشمن پر فتح حاصل کرنے کے لئے اشد ضروری ہیں۔ یہ لوگ دشمنان اسلام اس لئے تو تھے کیونکہ وہ بخل کے نمائندے تھے۔ وہ اپنی خواہشات نفس کے پیروکار تھے، وہ خطاکار اور بے حیا تھے اور

وہ اسلام کے دشمن اس لئے تو تھے کہ وہ بخل کے نمائندے تھے۔ وہ اپنی خواہشات نفس کے پیروکار تھے، وہ خطاکار اور بے حیاء تھے اور وہ اسلام کے دشمن اس لئے تھے کہ وہ اپنی ذات، اپنی خواہشات اور اپنے نظام زندگی میں اللہ تعالیٰ کے احکام، اس کی شریعت اور اس کے پسندیدہ نظام زندگی کے تابع نہ تھے۔ یہی تو ان کے ساتھ عداوت کی وجہ تھی اور یہی تو میدان کشمکش تھا۔ اور اسی وجہ سے ان کے خلاف جہاد شروع کیا گیا تھا۔ ان اسباب کے علاوہ مسلمانوں کی معرکہ آرائی اور عمل جہاد کے کوئی اسباب نہ تھے اور نہ اب ہیں۔ ایک مسلم کی عداوت بھی اللہ کے لئے ہے، اس کی معرکہ آرائی بھی فی سبیل اللہ ہے، اس کا جہاد بھی اللہ کے لئے ہے، اس کی درج بالا تمام ہدایات اور ان کے بعد آنے والے معرکہ کارزار کے بیان کے درمیان مکمل مناسبت ہے۔ نیز ان باتوں کا ان حالات سے بھی تعلق تھا جن میں یہ معرکہ درپیش ہوا۔ مثلاً یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی حکم عدولی، مال غنیمت جمع کرنے کا لالچ، اور اس کی وجہ سے رسول ﷺ کی واضح ہدایات کو نظر انداز کرنا۔ عبد اللہ ابن ابی اور اس کے ساتھیوں کی جانب سے محض ان کی خاطر لشکر اسلام سے علیحدہ ہو جانا۔ اور جیسا کہ سیاق کلام میں یہ بات واضح ہوگی کہ بعض لوگوں نے بڑی بری غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ نیز ان لوگوں کے نظریات اور تصورات میں بھی جھول اس لئے تھی کہ وہ ہر امر کو اللہ اور رسول کی طرف نہ لوٹاتے تھے اور بعض لوگ مایوس ہو کر یہ سوالات کرتے تھے کہ آیا ہماری اس تحریک کا کوئی نتیجہ برآمد ہوگا؟ اور بعض لوگوں کے یہ خیالات تھے کہ ہماری کوئی حیثیت ہوتی تو یہاں یوں نہ مارے جاتے وغیرہ۔

قرآن کریم ان تمام حالات سے بحث کرتا ہے۔ ایک ایک کر کے، بعض امور کی وضاحت کی جاتی ہے، بعض امور کے بارے میں وہ آخری فیصلے کر دیتا ہے۔ ان حقائق کے بارے میں وہ نفس انسانی کو چٹکی بھر کر جگاتا ہے، اس کے اندر جوش پیدا کرتا ہے اور ان حقائق کو حیات انسانی کے اندر زندہ کر دیتا ہے۔ اور یہ کام قرآن کریم اپنے منفرد طریقہ کار کے مطابق کرتا ہے جس کے نمونے سیاق کلام کے اندر جا بجا ملیں گے۔



غرض اس مضمون کے تیسرے فقرے میں اب معرکہ کے واقعات کا آغاز ہو جاتا ہے لیکن ان واقعات کے اندر بھی اسلامی تصور حیات کے بنیادی حقائق ذہن نشین کرائے گئے ہیں۔ رہے واقعات معرکہ تو انہیں محض محور اور مدار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور یہ حقائق ان واقعات کے ارد گرد گھومتے ہیں۔

اس پیراگراف کے آغاز میں اس طرف اشارہ کیا جاتا ہے کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی ایک سنت جاریہ ہے اور اس سنت کا تعلق ان اقوام سے ہے جو حق کو جھٹلاتی ہیں۔ اس اصول اور سنت کے ذکر کا مقصد یہ بات مسلمانوں کے گوش گزار کرنا ہے کہ اس معرکہ میں انہیں جو شکست ہوگی یہ ایک عارضی بات ہے اور یہ اس کائنات میں اللہ کی مستقل سنت نہیں ہے۔ یہ عارضی شکست بھی ایک خاص حکمت پر مبنی تھی۔ اس کے بعد انہیں تلقین کی جاتی ہے کہ وہ صبر سے کام لیں اور اس سر زمین پر بذریعہ قوت ایمان اپنے آپ کو سر بلند رکھیں۔ اگر اس معرکہ میں انہیں شکست ہوئی ہے اور انہوں نے زخم کھائے ہیں تو اس سے قبل ایسے معرکہ میں اہل شرک نے زخم کھائے تھے اور انہیں شکست ہوئی تھی لیکن اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی گہری حکمت کار فرما تھی اور جس کا بیان ان کے سامنے کھل کر آجائے گا۔ یہ حکمت کہ اہل اسلام کی صفوں میں سے کھوئے لوگوں کو علیحدہ کر دیا جائے، ان کے دلوں سے کھوٹ نکال دیا جائے، اور شہداء اسلام کی ایک ایسی مثال تیار کی جائے جو اپنے نظریہ حیات کے لئے جان دینے والے ہوں اور مسلمان موت کا مقابلہ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کریں۔ جبکہ اس سے قبل وہ راہ حق میں تمنائے موت اپنے دلوں میں لئے ہوئے تھے تاکہ وہ اپنے وعدوں اور اپنی آرزوؤں کو حقیقت کے ترازو میں تول کر دیکھیں۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ کفر کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں اور کافروں کے مقابلے میں ایک منظم اسلامی جماعت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کریں۔ چنانچہ ان پورے واقعات کی تہہ میں ایک بلند حکمت پوشیدہ تھی چاہے یہ واقعات فتح ہوں یا حادثات شکست ہوں۔ فرماتے ہیں

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ (۱۳۷) هَذَا بَيَانٌ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ

لِّلْمُتَّقِينَ (۱۳۸) وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۱۳۹) إِنْ يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ (۱۴۰) وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ (۱۴۱) أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخَلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ (۱۴۲) وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ (۱۴۳)

”تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا، جنہوں نے (اللہ کے احکام وہ ہدایات) کو جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لئے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کے لئے ہدایت اور نصیحت..... دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے اگر تم مومن ہو۔ اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا ہے کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں، ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی راستی کو گواہ ہوں..... کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں..... اور وہ اس آزمائش کے ذریعہ مومنوں کا الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کرنا چاہتا تھا۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تو یہ دیکھا ہی نہیں کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم موت کی تمنا کر رہے تھے، مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی، لو اب وہ تمہارے سامنے آگئی ہے اور تم نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔“

اس غزوہ میں مسلمانوں نے سخت چوٹ کھائی تھی۔ وہ ایک بڑی تعداد میں قتل ہوئے تھے اور انہیں ہزیمت اٹھانی پڑی تھی۔ انہیں عظیم روحانی اور جسمانی اذیت سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ ان میں سے ستر صحابی قتل ہو گئے تھے، رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دانت مبارک شہید ہو گئے تھے۔ آپ ﷺ کا چہرہ مبارک زخمی ہوا تھا۔ آپ ﷺ کو مشرکین نے گھیرے میں لے کر تنگ کیا اور صحابہ کرام کو گہرے زخم آئے۔ اس شکست کی وجہ سے اہل اسلام سخت جھنجھوڑ دیئے گئے۔ اس لئے یہ ایک ایسا صدمہ تھا جو جنگ بدر کی عجیب فتح کے بعد شاید بالکل ہی غیر متوقع تھا۔ یہاں تک کہ جب اہل اسلام کو یہ حادثہ پیش آیا تو وہ بے ساختہ کہنے لگے، 'یہ سب کچھ کیسے ہوا، ہم مسلمان ہوتے ہوئے بھی ایسے حالات سے دوچار ہو سکتے ہیں؟'

یہاں قرآن کریم اہل ایمان کو اس کرۂ ارض پر سنت الہی کی طرف متوجہ کرتا ہے، یہاں انہیں وہ اصول یاد دلایا جاتا ہے جس کے مطابق اس کرۂ ارض پر واقعات کے فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ واقعات بالکل انوکھے نہیں ہیں۔ اس لئے کہ اس کائنات میں انسانی زندگی کے لئے جو نوا میس فطرت وضع کئے گئے ہیں، یہاں زندگی ان کے مطابق چل رہی ہے۔ ان سے تخلف بالکل ممکن نہیں ہے اور نہ یہاں واقعات اتفاقیہ بغیر کسی اصول کے وقوع پذیر ہوتے ہیں جبکہ یہ واقعات نوا میس فطرت کے عین مطابق ہوتے ہیں، اگر وہ ان نوا میس فطرت کو پڑھیں، ان کے مغز تک پہنچیں تو انہیں باسانی وہ حکمت معلوم ہو جائے گی جو ان واقعات کی پیش پر تھی، اور پھر انہیں وہ مقاصد بھی واضح طور پر نظر آجائیں جو ان واقعات کی تہہ میں پنہاں تھے۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ وہ نظام کس قدر پختہ ہے جس کے مطابق یہ واقعات واحداث ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ نیز ان کی تہہ میں جو حکمت پوشیدہ تھی اس کے بارے میں بھی انہیں اچھی طرح اطمینان ہو جائے اور وہ اچھی طرح معلوم کر لیں کہ گزشتہ واقعات کی روشنی میں ان کے لئے آئندہ لائن کیا ہے۔ اب اس روشنی کے آجانے کے بعد وہ یہ توقع کریں گے کہ چونکہ وہ مسلمان ہیں اس لئے ایسے واقعات ہونے چاہئیں اور انہیں فتح اور نصرت حاصل ہونی چاہئے۔ بغیر اس کے کہ وہ فتح و نصرت کا سامان مہیا کریں، جن میں سے پہلا سبب اللہ اور رسول اللہ اطاعت امر ہے۔

وہ سنت الہیہ کیا ہے جس کی طرف سیاق کلام انہیں یہاں متوجہ کر رہا ہے؟ وہ ان لوگوں کا انجام ہے جنہوں نے پوری انسانی تاریخ میں حق کو جھٹلایا ہے اور یہ کہ دنیا میں لوگوں کے شب و روز بدلتے رہتے ہیں۔ لوگوں کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے تاکہ ان کی روح خالص ہو جائے۔ ان کی قوت صبر کو آزمایا جاتا ہے اور یہ آزمائش مصائب و شدائد کے پہاڑ توڑ کر کی جاتی ہے۔ اور یہ کہ جو لوگ صبر سے کام لیتے ہیں آخر کار انہیں فتح نصیب ہوتی ہے اور جو لوگ کفر کا رویہ اختیار کرتے ہیں انہیں صفحہ ہستی سے مٹا دیا جاتا ہے۔

ان آیات میں سنن الہیہ کے بیان کے درمیان اہل ایمان کو آمادہ کیا جاتا ہے کہ وہ مشکلات کو انگیز کریں، شدید حالات میں ایک دوسرے کے غم خوار ہوں اور انہیں جو چوٹ لگی ہے، اس پر صبر کریں، اس لئے کہ چوٹ صرف انہیں نہیں آئی بلکہ ان کے دشمنوں نے بھی تو ان کے برابر چوٹ کھائی، حالانکہ مومنین ان کے مقابلے میں بلند نظریات کے حاملین ہیں۔ وہ ان کے مقابلے میں راہ ہدایت پر ہیں اور ان کے مقابلے میں ان کا نظام زندگی زیادہ بہتر ہے۔ اور ان مشکلات کے بعد انجام کار فتح و کامرانی بھی اہل ایمان کو نصیب ہونے والی ہے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكْذِبِينَ
(۱۳۷) هَذَآ بَيِّنَاتٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ

”تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں، زمین میں چل پھر کر دیکھ لو ان لوگوں کا کیا انجام ہوا جنہوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات کو) جھٹلایا۔ یہ لوگوں کے لئے ایک صاف اور صریح تنبیہ ہے اور جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کے لئے ہدایت و نصیحت۔“

قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ انسانیت کے حاضر کو اس کے ماضی کے ساتھ جوڑ دیتا ہے۔ اور ماضی اور حال کو باہم مربوط کر کے انسانیت کے مستقبل کی فکر کرتا ہے۔ عرب معاشرہ جو قرآن کے مخاطبین اول تھے ان کی زندگی کوئی زندگی نہ تھی، ان کے ہاں کوئی علمی ذخیرہ نہ تھا اور اسلام سے پہلے

ان کے ہاں سرمایہ تجربات بھی نہ تھا، تاکہ تحریک اسلامی ان کے سامنے خود ان کے ذخیرہ ثقافت سے کوئی مکمل نمونہ پیش کرتا۔ یہ تو اسلام اور اسلام کی کتاب قرآن تھی جس نے یہ کارنامہ انجام دیا کہ اس نے عربوں کو حیات جدید سے نوازا اور ان کو ایک ایسی امت کی شکل دی جس نے ادوار مابعد میں پوری دنیا کی قیادت کی۔

وہ قبائلی نظام معاشرت جس کے سایہ میں عرب زندگی گزار رہے تھے، یہ اس قابل ہی نہ تھا کہ وہ ان کی فکر کو اس قدر وسعت دے دیتا کہ وہ جزیرۃ العرب کی زندگی کے واقعات کو کوئی منطقی ربط دے دیتے چہ جائیکہ وہ اس کرۂ ارض میں بسنے والی تمام انسانیت اور اس کے حادثات اور واقعات کے درمیان کوئی منطقی ربط تلاش کرتے اور پورے کرۂ ارض کے اندر پیش آنے والے عالمی واقعات اور اس کائنات کے اندر جاری نوا میں فطرت اور ان کے مطابق جاری و ساری انسانی زندگی کے اندر ربط کی تلاش کی بارے میں تو وہ سوچ بھی نہ سکتے تھے۔

قرآن کریم اور اسلام کے نتیجے میں عربوں کے اندر جو علمی اور ثقافتی انقلاب رونما ہوا، وہ ایک دور رس انقلاب ہے، یہ کوئی ایسا انقلاب نہ تھا کہ کسی معاشرے کے اندر تدریج کے ساتھ علمی و ثقافتی ترقی کی وجہ سے رونما ہوا اور نہ یہ انقلاب اس وقت کی رائج اور چلتی ہوئی زندگی کے تقاضوں اور صلاحیتوں کی وجہ سے رونما ہوا۔ بلکہ یہ عظیم انقلاب خالص اسلامی نظریہ حیات کے نتیجے میں رونما ہوا بلکہ یہ عقیدہ ان کے لئے یہ تحفہ لایا اور انہیں اٹھا کر اسلامی نظریہ حیات کی سطح تک بلند کیا۔ اور یہ سب کام اس نظریہ حیات نے صرف ربع صدی کے قلیل عرصہ میں سرانجام دیا۔ جبکہ عربوں کے ارد گرد بسنے والی ترقی یافتہ اور علمی سرمایہ سے مسلح اقوام افکار عالیہ کے اس مقام تک صدیوں بعد پہنچ پائیں اور کئی نسلیں گزرنے کے بعد ان اقوام نے معلوم کیا کہ اس کائنات کے اندر کچھ قوانین فطرت عمل پیرا ہیں اور یہ ان اٹل فطری نوا میں کے تحت چل رہی ہیں اور جب انہوں نے ان قوانین قدرت اور نوا میں فطرت کو دریافت کر لیا تو وہ اس حقیقت تک پھر بھی نہ پہنچ سکیں کہ ان اٹل قوانین کے اوپر ایک اٹل مشیت الہیہ بھی ہے جو ان قوانین فطرت کی قید میں بھی مقید نہیں ہے۔ اور قوانین فطرت کے بعد بھی تمام

امور کے اندر اختیار اللہ تعالیٰ کا ہے۔ رہی امت مسلمہ تو اس نے روز اول سے اس کا یقین حاصل کر لیا تھا۔ اس کائنات کے بارے میں اس کا تصور بہت وسیع ہو گیا تھا، اور اس کے احساس اور شعور کے اندر قوانین فطرت کے ثبات اور اللہ تعالیٰ کی بے قید مشیت کے اندر ایک توازن قائم ہو چکا تھا۔ اس لئے کہ اس کی عملی زندگی تو قوانین فطرت کے اٹل اصولوں پر قائم تھی لیکن اس کے بعد اسے یہ اطمینان بھی حاصل تھا کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت بھی بے قید ہے۔ فرماتے ہیں:

قَدْ خَلَّكَ مِنْ قَبْلُكَ سُنَنٌ..... ”تم سے پہلے بہت سے دور گزر چکے ہیں“ ان ادوار میں نوا میس فطرت کے مطابق رونما ہوئے تو تمہارے دور میں بھی ایسے ہی واقعات رونما ہوں گے۔ اس لئے اُمم سابقہ کی تاریخ میں تمہاری جیسی صورت حال سے جو اقوام دوچار تھیں اور ان کے سامنے کچھ حقائق رونما ہوئے تو ایسے ہی نتائج کے لئے تم بھی تیار رہو۔

فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ..... ”زمین میں چل پھر کر دیکھ لو“ اس لئے کہ پورا کرۃ ارض ایک سیارہ ہے۔ اس سیارے میں انسانی زندگی رواں دواں ہے۔ یہ کرۃ ارض اور اس کے اندر زندگی ایک کھلی کتاب ہے۔ بصارت اور بصیرت دونوں کے لئے اس میں وافر سامان موجود ہے۔

فَانظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ..... ”دیکھ لو کہ ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جنہوں نے (اللہ کے احکام و ہدایات کو) جھٹلایا۔“ یہ وہ انجام ہے جس کے آثار کرۃ ارض پر ہر جگہ قابل مشاہد ہیں۔ نیز ان کی تاریخ میں وہ آثار و شواہد بعد میں آنے والوں نے ریکارڈ کر دیئے ہیں۔ قرآن کریم نے ان سنن و سیر کی ایک بڑی تعداد کو اپنے ہاں نقل کیا ہے۔ قرآن کریم کے متعدد مقامات پر ان کا ذکر ہے اور بعض جگہ واقعات کی جگہ ان کا زمانہ اور واقعات کے اشخاص اور کرداروں کا تذکرہ بھی تفصیل سے کیا ہے۔ جبکہ بعض جگہ صرف اشارات سے کام لیا گیا ہے اور زمان و مکان کو چھوڑ دیا گیا ہے۔ مجملاً واقعہ بیان ہوا ہے۔ یہاں بھی ایک اجمالی اشارہ اس انسانی تاریخ کی طرف کیا گیا ہے اور اس سے ایک مجمل اور مجرد طریقہ نکالا گیا ہے، وہ یہ کہ پیغمبروں کی تکذیب کرنے والوں کا جو انجام کل ہوا تھا وہی انجام آج بھی مکذبین کے لئے طے ہو چکا ہے۔ اور کل بھی ان کا یہی انجام ہو گا۔ یہ اشارہ اس

لئے کیا گیا ہے کہ جماعت مسلمہ اپنے انجام کے بارے میں مطمئن اور یکسو ہو جائے اور اس بات سے متنبہ ہو جائے کہ وہ مکذبین کے ساتھ پھسل نہ جائے۔ اس لئے کہ اس وقت ایسے حالات موجود تھے جن میں اس یقین دہانی کی ضرورت تھی نیز ایسے حالات بھی موجود تھے جن میں مسلمانوں کو لغزش کھانے سے ہوشیار کرنے کی ضرورت تھی۔ اور آنے والے سیاق کلام میں ان حالات پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔

نوامیس فطرت اور انسانی تاریخ میں سنت الہیہ کی طرف اشارے کے بعد لوگوں کو پکارا جاتا ہے کہ وہ انسانی تاریخ کے ان واقعات سے عبرت اور نصیحت حاصل کریں۔ هَذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى وَمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ..... ”یہ لوگوں کے لئے ایک صرف اور صریح تنبیہ ہے۔ جو اللہ سے ڈرتے ہوں ان کے لئے ہدایت و نصیحت۔“ یہ تمام انسانوں کے لئے ایک بیان ہے۔ پس یہ انسانیت کے لئے ایک دور رس انقلاب ہے اور لوگ اس انقلاب سے اس وقت تک بہرہ ور نہیں ہو سکتے جب تک یہ بیان نہ کیا جائے۔ لیکن اس بیان سے استفادہ صرف ایک خاص گروہ ہی کر سکے گا۔ صرف یہی لوگ عبرت و نصیحت حاصل کر سکیں گے۔ صرف یہی لوگ بہرہ ور ہوں گے۔ کون المتقون۔

یہ حقیقت ہے کہ کلمہ ہدایت کو شرف قبولیت صرف دل مومن بخشا ہے۔ اس لئے کہ وہ ہدایت کے لئے ہر وقت کھلا ہوتا ہے اور فصیح و بلیغ نصیحت سے استفادہ متقی دل ہی کر سکتا ہے جو ہر وقت کلمہ ہدایت سنتے ہی دھڑکنے لگتا ہے اور قبولیت کے لئے آمادہ ہوتا ہے۔ کم ہی ایسا ہوتا ہے کہ صرف حق و باطل کا علم کسی کو فائدہ دے یا ہدایت و ضلالت کا صرف علم مفید ہو۔ سچائی اپنی فطرت کے اعتبار سے اس قدر واضح ہوتی ہے کہ اس کے لئے وہ کسی طویل کلام و بیان کی محتاج ہی نہیں ہوتی۔ دراصل جس چیز کی کمی ہوتی ہے وہ قبول حق کا داعیہ ہوتا ہے اور لوگوں کو حق کے قبول کرنے کا راستہ معلوم نہیں ہوتا۔ سچائی کی رغبت اور اس کے قبول کرنے کے راستے صرف اس صورت میں مل سکتے ہیں جب کوئی دل ایمان و یقین سے بھر جائے اور ایمان اس وقت محفوظ رہتا ہے جب اس کی پشت پر تقویٰ اور اللہ خونی موجود ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں بار بار اس قسم کی تاکیدیں کی گئی ہیں کہ اس کتاب میں

جو سچائی، جو ہدایت، جو روشنی، جو وعظ اور جو عبرت آموز باتیں بیان کی گئی ہیں وہ مومنین اور متقین ہی کے مفید مطلب ہیں۔ اس لئے کہ ایمان اور تقویٰ دل کے درپے ہدایت، روشنی اور عبرت و نصیحت کے لئے کھول دیتے ہیں۔ صرف ایمان و تقویٰ کے بل بوتے پر ہی ایک انسان راہ حق کی تکالیف برداشت کر سکتا ہے۔ یہ اصلی بات ہے اور اس مسئلے کی یہی حقیقت ہے۔ صرف علم اور معلومات کے ساتھ مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ کئی ایسے لوگ دیکھے جاسکتے ہیں کہ وہ حق کے علم و معرفت کی ایک بڑی تعداد رکھتے ہوئے بھی باطل کے پرستار ہوتے ہیں اور اس میں گم گشتہ ہوتے ہیں۔ محض اس لئے کہ ان کی نفسانی خواہشات ان پر قابو پائے ہوئے ہوتی ہیں جن کے مقابلے میں علم و معرفت بے بس ہوتی ہے اور یا اس لئے کہ وہ ان مشکلات کو دیکھ کر گھبرا جاتے ہیں جو حاملین حق اور داعیان حق کا ہمیشہ استقبال کرتی ہیں۔

اس کے بعد روئے سخن مسلمانوں کی طرف پھر جاتا ہے۔ ان کی دلجوئی کی جاتی ہے، تسلی دی جاتی ہے اور ثابت قدمی کی تلقین کی جاتی ہے۔ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ..... ”دل شکستہ نہ ہو، غم نہ کرو، تم ہی غالب رہو گے، اگر تم مومن ہو۔“ وَلَا تَهِنُوا..... یہ لفظ وہن سے نکلا ہے، جس کے معنی ضعیفی کے ہیں اور غم نہ کرو، یعنی ان مصائب پر جو تمہیں پیش آرہے ہیں یا ان مفادات کے لئے جو تم سے چھوٹ گئے۔ تم غالب اور برتر ہو، اس لئے کہ تمہارا نظریہ حیات برتر ہے۔ تم صرف اللہ وحدہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہو اور وہ لوگ اللہ کی مخلوقات میں سے کسی مخلوق کے سامنے جھکتے ہیں یا کسی چیز کو اللہ کے ساتھ شریک کر کے اس کے سامنے جھکتے ہیں۔ اور تمہارا نظام حیات ان کے نظام حیات کے مقابلے میں افضل و برتر ہے۔ تم اس نظام کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہو جسے اللہ نے بنایا ہے۔ اور وہ اس نظام زندگی کے پیروکار ہیں جو انسانوں نے بنایا ہے۔ تمہارا رول ان کے مقابلے میں برتر ہے۔ تم پوری انسانیت کے لئے حاملین وصیت ہو، اس پوری انسانیت کے لئے ہادی اور راہبر ہو جبکہ وہ اللہ کے اس نظام سے دھتکارے ہوئے ہیں، گمراہ ہو چکے ہیں۔ اس کرۂ ارض پر تمہارا مقام بلند مقام ہے۔ تم اس وراثت کے حاملین میں سے ہو جس کا تمہارے ساتھ اللہ نے عہد کر رکھا ہے۔ اور ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ وہ عدم اور فنا کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ اس لئے اگر تم سچے مومن بن جاؤ تو تم ہی اس دنیا میں اعلیٰ اور سر بلند رہو گے۔ اور اگر تم سچے مومن نہ ہو تو نہ

ڈرو اور نہ غم کرو اور نہ دل شکستہ ہو، اس لئے کہ یہ اللہ کی سنت ہے کہ کبھی تم پر مصیبت آئے گی اور کبھی تم کامران ہو گے اور جہاد، ابتلا اور کھرے کھوٹے کے درمیان تمیز ہو جانے کے بعد تمہاری عاقبت اچھی ہوگی۔

”اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا ہے کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی (راستی کے) کے گواہ ہیں۔ کیونکہ ظالم لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں۔ اور وہ اس آزمائش کے ذریعہ سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کو سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔“

یہاں اس چوٹ کا ذکر کیا گیا جو اہل اسلام کو لگی اور اس کا بھی ذکر کیا جو جھٹلانے والوں کو لگی تھی۔ مکذبین کے چوٹ سے مراد غزوہ بدر ہے۔ اس لئے کہ اس موقع پر مشرکین کو چوٹ لگی تھی اور اہل اسلام صحیح و سالم بچ گئے تھے لیکن جھٹلانے والوں کی چوٹ سے مراد غزوہ احد بھی ہو سکتا ہے جس میں ابتداءً گو مسلمانوں کو فتح ہوئی تھی۔ اہل کفر کو شکست ہوئی تھی اور ان میں سے ستر آدمی قتل ہو گئے تھے۔ اس کے بعد مشرکین بھاگ نکلے اور مسلمان ان کے تعاقب میں نکلے اور کھوپڑیوں پر ضربات لگاتے رہے۔ مشرکین کا علم تک گر گیا اور کوئی ایسا شخص نہ رہا جو آگے بڑھ کر علم اٹھاتا۔ آخر کار ایک عورت نے علم اٹھایا۔ اس پر انہیں جرات ہوئی اور اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ اس کے بعد مشرکین کی باری آئی جب تیر اندازوں سے رسول ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کی۔ آپس میں اختلاف کیا اور اس معرکے کے آخری دور میں مسلمانوں پر وہ مصیبت آئی جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اور یہ پوری پوری سزا تھی اس بات کی کہ انہوں نے رسول ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کی اور آپس میں اختلاف کیا۔ یوں اللہ تعالیٰ کی وہ سنت ظاہر ہوئی جسے اس نے اس کائنات کے لئے مقدر فرمایا ہے۔ اس لئے تیر اندازوں کی جانب سے رسول ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی اور مشورہ کے باوجود آپس میں اختلاف اس وجہ سے پیدا ہوئے تھے کہ ان کے دلوں میں مال غنیمت کا لالچ پیدا ہو گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے جہاد

و قتال میں مسلمانوں کے لئے نصرت تو بہر حال لکھ دی ہے لیکن ان لوگوں کے لئے جو صرف جہاد فی سبیل اللہ کرتے ہیں۔ اور ان کا مٹح نظر اس دنیائے دنی کو کوئی بے وقعت فائدہ نہیں ہوتا۔ اس واقعہ کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی ایک دوسری سنت کا ظہور بھی ہوا۔ وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ فتح و نصرت کو لوگوں کے درمیان پھرتے رہتے ہیں۔ کبھی اہل حق کو فتح ہوتی ہے تو کبھی کبھار اہل باطل کو فتح ہوتی ہے۔ ان کے اعمال اور ان کی نیتوں کے مطابق۔ ان ایام کی وجہ سے اہل ایمان اور اہل نفاق کو چھانٹ کر رکھ دیا جاتا ہے۔ نیز غلطیوں کا ارتکاب ہوتا ہے اور لوگوں کے دلوں سے نظریاتی کھوٹ نکل جاتا ہے۔

إِنْ يَمْسَسْكُمُ فَتْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ فَتْحٌ مِثْلُهُ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا

”اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے مخالف فریق کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا تھا کہ اللہ دیکھنا چاہتا تھا کہ تم میں سے سچے مومن کون ہیں۔“

کشادگی کے بعد سختی اور سختی کے بعد کشادگی، وہ حالات ہیں جو نفس انسانی کی خفیہ صلاحیتوں کو ابھارتے ہیں، اس سے لوگوں کے مزاج معلوم ہو جاتے ہیں اور یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ کون نظریاتی لحاظ سے پاک ہو چکا ہے اور کس میں نظریاتی میل کچیل موجود ہے۔ کون ہے جو جلد باز ہے اور کون ہے جو ثابت قدم ہے۔ کون ہے جو مایوسی کا شکار ہوتا ہے اور کون ہے جسے اللہ پر مکمل بھروسہ ہے۔ کون ہے جو تن بتقدیر سپرد کرتا ہے اور کون ہے جو راضی برضا ہوتا ہے، یا خود سری اختیار کرتا ہے؟

یہاں آکر اسلامی جماعت کی تطہیر ہو جاتی ہے اور ظاہر ہو جاتا ہے کہ کون مومن ہے اور کون منافق ہے۔ دونوں فریقوں کی حقیقت واضح ہو کر سامنے آتی ہے۔ اور لوگوں کی دلی کیفیات اس دنیا کے لوگوں پر بھی منکشف ہو جاتی ہیں۔ اس طرح اسلامی صفوں سے ہر قسم کی وہ کمزوریاں دور ہو جاتی ہیں جو

لوگوں کے درمیان اخلاقی اور نظریاتی ہم آہنگی نہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہو جاتی ہیں جبکہ جمعیت میں مختلف الخیال اور مبہم قسم کے لوگ ہوں۔

اللہ تعالیٰ مومنین کو بھی جانتے ہیں اور منافقین کو بھی جانتے ہیں۔ اللہ علیم بذات الصدور ہیں۔ لیکن واقعات زندگی، فتح و شکست کے نتیجے میں چھپے لوگ سامنے آ جاتے ہیں، چھپے لوگ سامنے آ جاتے ہیں، چھپے ہوئے اوصاف واقعات زندگی کی صورت میں بر ملا ہو جاتے ہیں۔ اب ایمان ایک ظاہری عمل کی صورت میں سامنے آ جاتا ہے۔ اور نفاق بھی مشکل اور متجسم ہو جاتا ہے۔ اس لئے ان امور پر حساب و کتاب ہو گا اور ان پر انعام و سزا بھی ہو گی۔ اللہ ان امور پر حساب و کتاب نہیں لیتے جنہیں وہ جانتے ہیں بلکہ جزا و سزا کا دار و مدار ان امور پر ہوتا ہے جو عمل میں آ جاتے ہیں۔

اور زندگی کے نشیب و فراز اور سختی و نرمی کا یکے بعد دیگرے آنا ایک ایسی کسوٹی ہے جس کا نتیجہ غلط نہیں ہوتا، یہ ایک ایسا ترازو ہے جس میں کوئی کمی بیشی نہیں رہتی۔ اس میزان میں مشکلات اور امن دونوں برابر ہیں۔ کئی ایسی شخصیات ہوتی ہیں جو مشکلات کا مقابلہ کرتی ہیں، صبر اور مصابرت کرتی ہیں لیکن جب سہولت آتی ہے تو تن آسان ہو جاتی ہیں لیکن اہل ایمان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ وہ مشکلات میں جم جاتے ہیں اور صبر کرتے ہیں لیکن جب عیش و آرام کا وقت آتا ہے تو پھر بھی آپے سے باہر نہیں ہوتے۔ ان دونوں حالتوں میں ان کی توبہ اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ ان کا یقین اس بات پر پختہ ہوتا ہے۔ خوشحالی اور بد حالی دونوں میں عمل دخل ذات باری کا ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کی تربیت فرما رہے تھے اور یہ تربیت اس دور میں ہو رہی تھی جب جماعت مسلمہ پوری دنیا کی قیادت کا چارج لینے ہی والی تھی تو اللہ تعالیٰ نے بدر کی کامیابی اور خوشحالی کے بعد احد کی ناکامی اور برے حالات سے دوچار کر کے اسے آزمایا اور اس کی تربیت کی۔ حیرت انگیز کامیابی اور فتح و کامرانی کے بعد اسے اچانک غیر متوقع شکست سے دوچار کر کے اسے آزمایا اور اس کی تربیت کی۔ حیرت انگیز کامیابی اور فتح و کامرانی کے بعد اسے اچانک غیر متوقع شکست سے دوچار کر دیا۔ اگرچہ یہ دونوں واقعات بے سبب نہ تھے اور دونوں اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سنت جاریہ کے عین مطابق

تحت الاسباب تھے، جو فتح و ہزیمت کے اسباب کیا ہوتے ہیں؟ تاکہ وہ اللہ اور رسول کی اطاعت میں اور پختہ ہو جائے۔ اللہ پر اس کا توکل اور بھروسہ اور زیادہ ہو جائے۔ وہ ذات باری کے ساتھ مزید جڑ جائے اور اسلامی نظام زندگی کے مزاج اور اس کے فرائض سے حق الیقین کی طرح واقف ہو جائے۔

اب بات ذرا اور آگے بڑھتی ہے۔ امت مسلمہ کو حکمت الہیہ کے کچھ اور پہلو دکھائے جاتے ہیں۔ یہ حکمتیں اس معرکے کے واقعات کے بیان کے دوران اور زندگی کے نشیب و فراز کے آئینہ میں دکھائی جاتی ہیں یعنی مسلمانوں کی صفوں کی تطہیر اور اہل ایمان کو اہل نفاق سے چھانٹ دینے کے بعد بعض دوسری حکمتیں؟ وَيَتَّخِذُ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ”اور تم میں سے بعض کو شہید کر دے۔“

یہ عجیب طرز ادا ہے جس میں گہرے معانی پوشیدہ ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ خود شہداء کا انتخاب فرماتے ہیں۔ مجاہدین میں سے مقام شہادت کے لئے انتخاب ہوتا ہے اور یہ انتخاب اللہ تعالیٰ خود اپنے لئے کرتے ہیں۔ پس یہ گویا کوئی مصیبت اور خسارہ نہیں ہے کہ کوئی اللہ کے راستے میں شہید ہو جائے بلکہ اسے اللہ تعالیٰ اپنے لئے اختیار کر لیتے ہیں، چھانٹ لیتے ہیں۔ یہ گویا ان کے لئے خاص اعزاز ہوتا ہے۔ ان کو اللہ نے چھانٹ لیا اور ان کو مقام شہادت اور مرتبہ شہادت حق پر فائز کر دیا تاکہ وہ خالصتاً اللہ کے ہو جائیں اور اس کی مقرب کاہنہ میں شامل ہو جائیں۔ وَيَتَّخِذُ مِنْهُمْ..... ”اللہ ان سے چن لے گا۔“

پھر ایک مفہوم کے مطابق یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے گواہ ہیں اور یہ اپنی جان دے کر اس سچائی پر شہادت دیتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ پر اتارا ہے۔ یہ لوگ گواہی دیتے ہیں کہ یہ پیغام، پیغام حق ہے اور یہ شہادت وہ اس انداز میں اور اس اسلوب میں دیتے ہیں کہ پھر اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا اور جرح کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور اس کے بعد بات کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے کہ وہ یہ شہادت اس مسلسل جدوجہد کے ساتھ دیتے ہیں جس کا انجام جان کا نذرانہ پیش کرنے پر ہوتا ہے اس طرح وہ اپنے خون سے اس سچائی کو تسلیم کرتے ہیں اور دنیا کے سامنے اسے فیصلہ کن شکل میں پیش کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان مختار لوگوں سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ یہ شہادت دیں کہ اللہ کی جانب سے جو نظریہ حیات نازل ہوا ہے وہ حق ہے۔ وہ اس پر ایمان لائے ہیں۔ وہ اس کے لئے خالص ہو گئے ہیں۔ وہ ان کو اس قدر

عزیز ہو گیا ہے کہ عزیز تر از جان ہے اور یہ کہ لوگوں کی زندگی اس وقت تک درست نہیں ہو سکتی جب تک وہ اس سچائی کے مطابق نہ ہو جائے۔ یہ کہ وہ اس پر پختہ یقین کر چکے ہیں۔ اس لئے وہ اس امر میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے کہ وہ لوگوں کی زندگیوں سے باطل کو ختم کر دیں، نکال دیں اور یہ حق پوری دنیا میں استوار ہو جائے اور لوگوں کے نظام حکومت میں بھی وہ رائج ہو جائے۔ غرض یہ شہداء ان سب امور کے شہداء ہیں اور ان کی شہادت عبارت ہے جہاد اور موت فی سبیل اللہ سے اور یہ ایک ایسی شہادت ہے جس میں کسی قیل و قال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اب ذرا دوسرا پہلو دیکھیں، جب کوئی اپنی زبان سے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت ادا کرتا ہے، یہ شہادت اس وقت تک شہادت نہیں ہوتی جب تک یہ مقرر اس شہادت کے مفہوم اور تقاضوں کو پورا نہیں کرتا۔ اور مفہوم یہ ہے کہ وہ اللہ کے سوا کسی کو الہ نہ سمجھے، باہمی مفہوم کو وہ اللہ کے سوا کسی اور مآخذ شریعت اور مآخذ قانون نہ بنائے، اس لئے کہ الہ کی خصوصیات میں یہ سے مخصوص ترین خصوصیت یہ ہے کہ وہ لوگوں کے لئے قانون سازی کرے۔ اور بندوں کے حوالے سے مخصوص ترین بندگی یہ ہے کہ بندہ اپنا نظام حیات اور نظام قانون اللہ تعالیٰ سے اخذ کرے۔ اور جس کی عملی شکل یہ ہے کہ وہ قانون رسول اللہ ﷺ سے اخذ کرے جو اللہ کے رسول اور اس کی جانب سے شارع ہیں۔ اور ان دو مصادر کے علاوہ ان کے نزدیک قانون کا کوئی اور مصدر مآخذ نہ ہو۔

پھر اس کلمہ شہادت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان وہ جدوجہد شروع کر دے جس کے نتیجے میں اس کرۂ ارض پر الوہیت اور حاکمیت صرف اللہ کی ہو جائے۔ جس طرح اس کی تبلیغ حضرت محمد ﷺ نے فرمائی۔ اور یہ شریعت اسلامی نظام حیات بن جائے۔ یہ نظام غالب ہو اور اس کی پیروی ہونے لگے اور یہ نظام لوگوں کی پوری زندگی میں متصرف ہو اور اس کے تصرف سے زندگی کا کوئی پہلو مستثنیٰ نہ ہو۔

اس مفہوم کے اعتبار سے، اس نظریہ حیات نے یہ تقاضا کیا کہ یہ شخص اس کی راہ میں جان دے دے تو شہید نے جان دے دی۔ اس لئے وہ ایک ایسا گواہ بن گیا جس سے اللہ نے یہ مطالبہ کیا کہ وہ یہ

شہادت ادا کرے۔ اس لئے کہ اسے اللہ نے گواہی کے مقام پر فائز کیا ہے۔ اس وجہ سے وہ شہید بن گیا ہے۔

یہ ہے اس عجیب انداز کلام کا گہرا فہم یعنی وَيَسْخِذُ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ..... اور یہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی شہادت کا مفہوم اور مقتضاء ہے۔ اس شہادت کا وہ مفہوم نہیں ہے۔ جس کے مطابق یہ شہادت ایک مذاق بن جائے، محض وقت کا ضیاع ہو اور اس سے رخصتیں برآمد ہوتی ہوں۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِيْنَ..... ”بے شرک ایک عظیم ظلم ہے۔“ صحیحین میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں۔ میں نے سوال کیا کیا رسول اللہ ﷺ کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہ تم اللہ کے ساتھ کسی کو شریک بناؤ حالانکہ صرف اللہ ہی نے تمہیں پیدا کیا ہے۔“

اس سے پہلے سیاق کلام میں جھٹلانے والوں کے بارے میں اللہ کی سنت کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔ اور اب یہ فیصلہ سنایا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ظالموں سے محبت نہیں رکھتا۔ اس لئے بالواسطہ اس بات کی تاکید ہے کہ جھٹلانے والے اپنے منطقی انجام کو ضرور پہنچیں گے، اس لئے اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ محبت نہیں کرتا۔ اس انداز تعبیر کے یہ اثرات بھی سامنے آتے ہیں کہ ایک مومن ظلم اور ظالم سے نفرت کرنے لگتا ہے۔ اور ظلم اور ظالمین کے خلاف یہ فضا پیدا کرنا حدیث جہاد اور حصول شہادت کے لئے آمادہ کرنے کے اس موقع کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے۔ اس لئے مومن اس بات کے خلاف جہاد کرتا ہے جسے اللہ مٹانا چاہتا ہے اور ان لوگوں کے خلاف جہاد کرتا ہے جو اللہ کو سخت ناپسند ہیں۔ اور یہ شہادت گاہ مومن ہے۔ اس جگہ وہ نذرانہ جان پیش کرتا ہے اور ایسے ہی لوگوں سے اللہ شہداء کا انتخاب فرماتے ہیں۔

اس کے بعد اب مضمون اس طرف جاتا ہے کہاں حادثات فاجعہ کے پس پشت کیا حکمت پوشیدہ ہے؟ بتایا جاتا ہے کہ ان کے ذریعہ امت کی تربیت مقصود تھی، اسے پاک کر کے اس کے اعلیٰ کردار کے

لئے تیار کرنا مقصود تھا، تاکہ وہ اللہ کی تقدیر اور ہتھیار بن کر کافروں کو نیست و نابود کرے اور مکذبین کو سزا دینے کے لئے دست قدرت کے لئے پردہ بن جائے۔ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ..... ”اور وہ آزمائش کے ذریعہ سے مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کر دینا چاہتا تھا۔“ تحصیل علیحدہ اور ممتاز کرنے کے بعد کا درجہ ہے۔ اور یہ وہ کاروائی ہے جو انسان کے اندر پایہ تکمیل کو پہنچتی ہے۔ ضمیر کے اندر اس کی تکمیل ہوتی ہے۔ یہ ایک ایسا تجربہ ہوتا ہے جس سے شخصیت کے خفیہ گوشے کھل کر سامنے آجائیں۔ ان خفیہ گوشوں پر لائٹ فوکس ہو جاتی ہے تاکہ ان گوشوں سے میل، کھوٹ اور ملاوٹ دور ہو جائے۔ وہ واضح اور صاف نظر آجائیں اور یہ شخصیت سچائی پر خوبی کے ساتھ جم جائے۔

بارہا ایسا ہوتا ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی شخصیت کے بارے میں صحیح جائزہ نہیں لے سکتا۔ وہ اپنی خفی کمزوریوں اور اپنے نفس کے نشیب و فراز سے واقف نہیں ہوتا۔ اور یوں اسے نہ اپنی قوت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے اور نہ اپنی کمزوریوں کا صحیح پتہ ہوتا ہے۔ اس کی بعض ایسی خفیہ کمزوریاں ہوتی ہیں جن کا اظہار اس وقت ہوتا ہے جب ان کو ابھارا جائے۔

چھانٹی کے اس عمل کا انتظام اللہ جل شانہ نے اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ اور یہ چھانٹی اسی طرح کی جارہی تھی کہ مسلمانوں کو زندگی کے نشیب و فراز سے دوچار کیا جائے، انہیں فتح بھی ہو اور شکست بھی ہو، سختی بھی آئے اور اچھے حالات بھی درپیش ہوں۔ انہیں خوب رگڑا دیا جائے۔ اور اس تلخ رگڑ کے بعد اہل ایمان اپنے بارے میں وہ کچھ جان لیں جو اس سے قبل وہ جانتے تھے۔ حادثات، تجربے اور مختلف عملی مواقف سے دوچار کر کے ان کی یہ چھانٹی ہوئی۔

بعض اوقات انسان اس غرے میں مبتلا ہوتا ہے کہ وہ قوی و شجاع ہے اور حرص و آزار کے پنچے سے آزاد ہے اور جب وہ عملی تجربات کی کسوٹی پر چڑھتا ہے اور جب وہ واقعی حالات سے دوچار ہوتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ اس کی شخصیت میں تو ابھی بڑی بڑی کمزوریاں ہیں، جو ابھی تک دور نہیں ہو سکیں۔ اور یہ کہ وہ ابھی تک مشکلات کے اس قدر دباؤ کے برداشت کرنے کی قوت نہیں رکھتا اس لئے یہ بات

خود اس کے مفاد میں ہوتی ہے کہ اسے قبل از وقت اپنی کمزوریوں کا علم ہو جائے تاکہ وہ اپنی شخصیت کو از سر نو ڈھالنے کی کوشش کرے۔ اور وہ ان مشکلات کے برداشت کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کر لے جو اس کی دعوت کی راہ میں لازماً درپیش آنے والی ہیں۔ اور اس نظریہ حیات کی وجہ سے وہ لابدی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی اسکیم یہ تھی کہ وہ اس پہلی جماعت اسلامی کی اچھی طرح تربیت کر دے۔ جسے اس نے پوری انسانیت کی قیادت کے لئے تیار کرنا تھا۔ اس اسکیم کے مطابق اس جماعت نے اس کرہ ارض پر ایک عظیم کاسرانجام دینا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو اسی طرح چھانٹا اور احد میں اسے ایسے حالات سے دوچار کیا جو غیر متوقع تھے تاکہ یہ جماعت اپنی سطح ذرا بلند کرے اور اپنے آپ کو اس رول کے لئے تیار کرے جو اللہ نے طے کر دیا تھا کہ اس نے ادا کرنا ہے اور وہ یہ تھا کہ وَيَصْحَقُ الْكَافِرِينَ..... ”اور تاکہ وہ کافروں کی سرکوبی کرے۔“ اور یہ اس لئے کہ حق کے ذریعہ باطل کی سرکوبی کرنا سنت الہیہ میں سے ایک سنت ہے۔ لیکن یہ سرکوبی اس وقت ممکن ہوتی ہے جب حق ظاہر ہو جائے اور سخت تربیت اور چھانٹی کے ذریعہ اس کی کمزوریاں دور کر دی جائیں۔

اب اگلی حکیمانہ بات بصورت استفہام انکاری آتی ہے۔ دعوت اسلامی کے بارے میں مسلمانوں کی سوچ کو درست کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ اس سلسلے میں سنت الہی کیا ہے؟ بتایا جاتا ہے کہ فتح و شکست، اعمال اور انکے نتائج کے بارے میں اللہ کا ایک اٹل قانون ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جنت کی راہ میں تو کانٹے بھی بچھے ہوئے ہوتے ہیں، مشکلات بھی ہوتی ہیں، اور اس راہ میں مشکلات کو صبر و ثبات کے ذریعہ حل کیا جاسکتا ہے۔ محض خالی خولی تمنائوں اور نیک خواہشات کے ذریعہ یہ گھاٹی عبور نہیں کی جاسکتی۔ تمہیں اس راہ میں مشکلات انگیز کرنی ہوں گی اور اپنی صفوں کو کمزور لوگوں سے صاف کرنا ہو گا۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تُدْخِلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ
(۱۴۲) وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ

”کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یوں ہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں وہ کون لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔ تم موت کی تمنائیں کر رہے تھے مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی، اب وہ تمہارے سامنے آگئی ہے اور تم نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا۔“

صیغہ استفہام انکاری اس مقام پر استعمال ہوتا ہے جہاں مخاطب کو ایک نہایت ہی خطرناک فکری غلطی پر متنبہ کرنا مطلوب ہوتا ہے۔ یہاں فکری غلطی یہ تھی کہ لوگوں نے سمجھا کہ بس زبان سے اس قسم کا اعلان ہی کافی ہے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں اور میں موت کے لئے تیار ہوں، اسلام کی راہ میں مر مٹنے کے لئے۔ صرف اس اعلان ہی سے گویا انہوں نے دعوت اسلامی کی راہ کی تمام مشکلات برداشت کر لیں اور اب وہ اللہ کی رضامندی اور جنت دونوں کے مستحق ہو گئے ہیں۔

یہاں انہیں سختی کے ساتھ بتایا گیا کہ تمہاری یہ سوچ درست نہیں ہے۔ تمہیں مشکلات کے واقعی تجربے سے گزرنا ہو گا، عملی امتحان ہو گا، جہاد میں شرکت کرنی ہو گی اور مصائب کو گلے لگانا ہو گا۔ اور اس کے بعد یہ کہ ان مشکلات کی حالت میں جزع و فزع نہیں بلکہ صبر کرنا ہو گا اور ان کو برداشت کرنا ہو گا۔

یہاں اس آیت کے بعض الفاظ چونکا دینے والے ہیں وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنْكُمْ ”حالانکہ ابھی یہ تو اللہ نے دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے ہیں وَيَعْلَمَ الصَّابِرِينَ“ اور کون ہیں جو اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں۔“

اس لئے اس راہ میں صرف جہاد کر لینا ہی کافی نہیں ہے، بلکہ مشکلات راہ پر صبر کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ مشکلات تو مسلسل ہوتی ہیں، مختلف نوعیت کی ہوا کرتی ہیں اور یہ اس وقت تک ختم نہیں ہو جاتیں جب میدان جنگ میں جہاد ختم ہو جاتا ہے، بلکہ بارہا ایسا ہوتا ہے کہ میدان جنگ میں مشکلات جہاد بہت ہی کم ہوتی ہیں بمقابلہ اس کے جو جہاد کے بعد آتی ہیں اور جن کی خاطر صبر کا تقاضا کیا گیا ہے اور جن میں ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں نہ ختم ہونے والی مشکلات ہوتی ہیں، افق ایمان پر مسلسل جے رہنا، شعور اور عمل دونوں میں ایمان کے تقاضے پورے کرتے رہنا، زندگی کی راہوں میں انسانی کمزوریوں پر بذریعہ صبر قابو پاتے رہنا، روزمرہ زندگی میں ان تمام لوگوں کے ساتھ یومیہ معاملات میں اور اپنے نفس کے ساتھ تمام معاملات میں اسلام پر جے رہنا اور خصوصاً ان مقامات پر صبر و ثبات کا مظاہرہ کرنا جن میں باطل قوتوں کو بظاہر کامیابی حاصل ہوتی ہے اور وہ یوں نظر آتی ہیں گویا بس فتح اب ان کے لئے مقدر ہے۔ پھر بعض اوقات جدوجہد طویل ہوتی ہے اور راستہ طویل اور کٹھن نظر آتا ہے اور مشکلات سے پر نظر آتا ہے، ایسے حالات میں صبر کرتے رہنا، جہاد اور مشکلات اور جنگ میں آرام طلبی کی تمنا، وسوسے اور نفس کی اکتاہٹ کے مقابلے میں صبر و ثبات کا مظاہرہ کرتے چلے جانا، غرض اس راہ میں جو نامعلوم اور پوشیدہ مشکلات ہوتی ہیں، اور ان میں سے میدان جنگ صرف ایک مشکل ہے، ان سب کو انگیز کرنے کا حوصلہ پیدا کرنا وغیرہ یہ سب اس آیت کے تقاضے ہیں اور جنت کی راہ کی مشکلات ہیں۔ غرض ان مقاصد کا حصول صرف الفاظ اور تمناؤں سے نہیں ہوتا۔

وَلَقَدْ كُنتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْتَضِرُوْنَ..... ”تم موت کی تمنائیں کر رہے تھے، مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی، لو اب وہ تمہارے سامنے آگئی ہے اور تم نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا۔“

یہاں قرآن مجید ان کو ایک بار پھر موت کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے، جس کی وہ تمنائیں کیا کرتے تھے۔ اور پھر جس کا معائنہ وہ معرکہ احد کے میدان میں کر چکے تھے اور اس منظر کے سامنے انہیں اس لئے کھڑا کیا گیا ہے کہ وہ ذرا ان حقائق کے ساتھ جو عملی میدان میں درپیش آئے ہیں، ان

الفاظ و کلمات کا مقابلہ کریں جو ان کی زبان پر ہوتے ہیں اور ان تمناؤں کا موازنہ کریں جو ان کے دلوں میں ہوتی ہیں تاکہ وہ انہیں سکھائے کہ وہ ہر اس کلمے اور لفظ کا جائزہ لیں جو ان کی زبانوں سے نکلتا ہے اور یہ دیکھیں کہ ان کلمات کے پیچھے مفہومات کا کس قدر سرمایہ موجود ہے اور یہ جائزہ وہ ان حقائق کی روشنی میں لیں جو معرکہ احد کے اندر پیش آئے۔ اس طرح انہیں معلوم ہو گا کہ ان کلمات کی قدر و قیمت کیا ہے جو وہ اپنے منہ سے ادا کرتے ہیں اور ان تمناؤں کی حیثیت کیا ہے جو وہ اپنے دلوں میں بسائے ہوئے ہیں اور ان بھاری حقائق کے مقابلے میں ان وعدوں کا کیا مقام ہے جو انہوں نے کئے تھے۔ پھر انہیں یہاں یہ بھی سکھایا جاتا ہے کہ صرف ہوا میں تحلیل ہونے والے الفاظ یا دل میں ابھرنے والی تمنائیں ہیں انہیں جنت میں داخل نہیں کر سکتیں، بلکہ جب جنت میں وہ تب داخل ہو سکیں گے جب وہ ان کلمات کو حقیقت کا جامہ پہنائیں اور ان تمناؤں کو میدان عمل میں لائیں تاکہ وہ حقیقی جہاد کا روپ دھاریں اور اس راہ کی مشکلات میں وہ صبر کرتے ہوئے نظر آئیں اور اللہ کی راہ میں ان حقائق کو لوگوں کی واقعی اور عملی دنیا میں دیکھ لیں۔

اللہ تعالیٰ کے لئے یہ کام کوئی مشکل نہ تھا کہ وہ مومنین کو مشکلات میں ڈالے بغیر اور تکالیف دیئے بغیر ہی پہلے ہی دن اپنے نبیؐ اپنے اس پیغام ہدایت اور اپنے اس تجویز کردہ نظام حیات کو کامیابی سے ہمکنار کر دیتا۔ وہ اس بات پر قادر تھا کہ وہ فرشتے اتار تا اور وہ ان کے ساتھ لڑتے یا وہ اکیلے ہی مشرکین کو تباہ کر دیتے، جس طرح ان فرشتوں نے قوم عاد، قوم ثمود اور قوم لوط علیہم السلام کو تباہ کیا تھا۔

لیکن جو اہداف مقرر ہوئے تھے، وہ صرف فتح و نصرت نہ تھے۔ اہداف میں یہ امر بھی تھا کہ جماعت مسلمہ کی تربیت بھی کی جائے، اس لئے کہ اس جماعت نے پوری انسانیت کی قیادت کا فریضہ سر انجام دینا تھا۔ اس وقت انسانیت ضعیف و نحیف تھی، خواہشات نفسانی اور میلانات جسمانی کی غلام تھی، اور وہ عملاً جاہلیت اور فکر انحراف کا شکار تھی اور اس مقصد کے لئے ایسی قیادت درکار تھی جو ذہین ہو، اور وہ قائدین سے اعلیٰ صلاحیتوں کا تقاضا کرتی ہو، اور ان تقاضوں میں سب سے پہلا تقاضا یہ ہو کہ وہ حق اور صداقت پر پختگی سے جمنے والے ہوں۔ وہ مشکلات پر صبر کرنے والے ہوں اور انہیں معلوم

ہو کہ ان کی صفوں میں کہاں کمزوری ہے اور کیاں قوت ہے۔ اور اسے یہ بھی معلوم ہو کہ انسانی نفس کہاں ٹھوکر کھاتا ہے، کہاں راہ راست سے انحراف کا خطرہ ہوتا ہے اور یہ کہ پھر ان سب کمزوریوں کا علاج کیا ہے؟ پھر اگر اچھے حالات اور کامرانی ہو تو پھر بھی صبر کرنے والی ہو اور شدید حالات ہوں تو پھر بھی صبر ہو، اور حقیقت یہ ہے کہ کامیابی کے بعد ناکامی دیکھنا اور اس پر صبر کرنا ان حالات میں بہت ہی کڑوی اور ناخوشگوار صورت حال تھی۔

جماعت مسلمہ کو عالمی قیادت کے منصب پر فائز کرنے کے احکام دینے سے قبل اللہ تعالیٰ نے جماعت مسلمہ کو ایسی سخت تربیت سے گزارا۔ یہ اس لئے کہ وہ اس عظیم اور خوفناک کام کرنے کے لئے تیار ہو جائے، جو اس نے کرۂ ارض پر سرانجام دینا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ وہ اس عظیم مشن پر اس انسان کو بھیجے گا جس کے لئے اس نے اسے چھانٹ لیا اور منتخب کر لیا ہے۔

اور مشیت الہیہ جماعت مسلمہ کی تیاری اور تربیت میں اب مختلف وسائل کو کام میں لاتی ہے۔ مختلف حالات اور واقعات سے اسے گزارا جاتا ہے۔ کبھی تو اس جماعت کو ایک فیصلہ کن فتح عطا کی جاتی ہے، تو پھر یہ خوش ہو جاتی ہے، اپنے اوپر اس کا اعتماد بحال ہو جاتا ہے، اور یہ کام اللہ تعالیٰ کی معاونت خاصہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اسے فتح و کامرانی کا تجربہ بھی کرایا جاتا ہے۔ تو وہ کامرانی کے اس نشے میں صبر اور سنجیدگی کا مظاہرہ کرتی ہے، وہ اس میں کبر و غرور بد مستی اور علو کے مقابلے میں بھی کامیاب ہوتی ہے۔ تواضع اور اللہ کے شکر کا دامن نہیں چھوڑتی۔ اور بعض اوقات اسے شکست شدت اور درد سے گزارا جاتا ہے، تو وہ اللہ کے جناب میں پناہ لیتی ہے۔ اسے اپنی ذاتی قوت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اور اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب وہ اسلامی نظام زندگی سے معمولی انحراف بھی کرے گی تو اس کے لئے اس کے نتائج کس قدر خطرناک ہوں گے۔ یوں وہ شکست کی کڑواہٹ بھی چکھ لے گی اور اس کے ساتھ وہ باطل پر بھی غالب ہو گی اس لئے کہ وہ حق پر ہے۔ اسے اپنی صفوں کے اندر کمزوریاں اور نقائص معلوم ہو جائیں گے کہ کہاں سے خواہشات نفس در آتی ہیں، کہاں جا کر قدم پھسلتے ہیں تاکہ اگلے مرحلے میں وہ ان تمام کمزوریوں کو دور کر سکے۔ اور وہ فتح اور شکست دونوں سے تجربات کا ایک وسیع سرمایہ لے کر

آگے بڑھے۔ یہ تھی سنت الہیہ اور اس کے مطابق قضا و قدر کا نظام چل رہی تھا۔ اس میں سر مو انحراف ممکن نہ تھا اور نہ اب ہے۔

یہ معرکہ احد کے حاصلات تجربہ میں سے ایک قلیل زاد راہ تھا، تجربات کا ایک حصہ تھا جسے جماعت مسلمہ کے لئے، ہر اسلامی انقلابی جماعت مسلمہ کے لئے، ہر دور، ہر زمان اور ہر مکان میں اٹھنے والی جماعت کے لئے یہاں آیات قرآنی میں قلم بند کیا گیا ہے۔

اس کے بعد قرآن کریم اپنی خاص نہج کے مطابق، جماعت اسلامی کی تربیت کے لئے یہاں بعض عظیم اور اہم واقعات کو اپنے مخصوص انداز میں پیش کرتی ہیں ملاحظہ ہو:

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ
انْفَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْفَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَسَيَجْزِي
اللَّهُ الشَّاكِرِينَ (۱۴۲) وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا
مُؤَجَّلًا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا
وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ (۱۴۵) وَكَأَيُّنَ مِنْ نَبِيِّ قَاتَلَ مَعَهُ رَبِّيُوثَ كَثِيرٍ فَمَا
وَهْنُوا لَمَّا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ
الصَّابِرِينَ (۱۴۶) وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا
وَأَسْرَفَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبَّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ
الْكَافِرِينَ (۱۴۷) فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ
يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۴۸)

”محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ اٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو! جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔ کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔ جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا میں سے دیں گے، اور جو ثواب آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔ اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ باطل کے آگے سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی ”اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہو گیا ہو اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد کر۔“ آخر کار اللہ نے ان کو دنیا میں بھی ثواب دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت میں بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک لوگ پسند ہیں۔“

اس ٹکڑے کی پہلی آیت ایک متعین واقعہ کی طرف اشارہ کر رہی ہے اور یہ واقعہ غزوہ احد میں پیش آیا۔ جب تیر اندازوں نے پہاڑ پر اپنا متعین مقام چھوڑ دیا، اور مشرکین وہاں سے ان پر چڑھ دوڑے، مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے، مسلمانوں کو شکست ہوئی اور رسول ﷺ کے دانت مبارک شہید ہو گئے اور آپ کے چہرے پر زخم آئے اور چہرہ مبارک سے خون بہنے لگا، فریقین باہم گتھا ہو گئے، مسلمان منتشر ہو گئے، کسی کو کسی کا پتہ نہ رہا۔ ان حالات میں کسی پکارنے والے نے یہ آواز دے دی۔ لوگو! محمد ﷺ قتل ہو گئے۔ اس چیخ کا مسلمانوں پر بہت ہی اثر ہوا۔ ان میں سے بہت سے لوٹ کر مدینہ آ گئے۔ پہاڑ کے اوپر چڑھ گئے، شکست کھا گئے اور مایوس ہو کر میدان جنگ کو چھوڑ گئے۔ رسول ﷺ کے پاس چند افراد رہ گئے اور ان حالات میں آپ ﷺ ان چند افراد کے ساتھ جم گئے۔ اور مسلمانوں کو یہ آواز دینے لگے کہ واپس آؤ، چنانچہ وہ پھر سے مجتمع ہوئے۔ ان کے دل تھم گئے

۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ایک محسوس انداز میں ان پر اونگھ طاری کر کے انہیں طمانیت قلب اور امن و سکون عطا کر دیا جب کہ تفصیلات بعد میں آرہی ہیں۔

یہ واقعہ جس نے ان لوگوں کو مکمل طور پر مدہوش کر دیا تھا، قرآن کریم اسے نکتہ توجہ بناتا ہے اور اس مناسبت سے وہ یہاں اسلامی تصور حیات کے اہم حقائق کو سامنے لاتا ہے۔ اس کو موضوع بنا کر یہاں حقیقت موت و حیات کے بارے میں اہم اشارے دیئے جاتے ہیں اور تاریخ ایمانی اور حالات قافلہ ایمانی پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَصُرَ اللَّهُ شَيْئًا وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ

”محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں، ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں، پھر کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے یاد رکھو، جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔“

بے شک محمد ﷺ صرف رسول ہیں، ان سے پہلے بھی رسول گزرے ہیں، یہ سب رسل فوت ہوئے ہیں اور محمد ﷺ بھی اس طرح فوت ہوں گے جس طرح وہ رسول فوت ہوئے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ جب اس معرکہ میں یہ حقیقت (اگرچہ جھوٹی افواہ کے طور پر) تمہارے سامنے آئی تو کیوں تمہاری نظروں سے اوجھل رہی۔ یہ نہایت ہی حیرت انگیز بات ہے۔

محمد ﷺ اللہ کی طرف سے پیغام لانے والے ہیں۔ وہ اس لئے آئے ہیں کہ اللہ کا پیغام پہنچا دیں۔ اللہ اپنی جگہ زندہ لایموت ہے۔ اس کا پیغام زندہ جاوید ہے۔ اس لئے یہ کس طرح مناسب ہو گا کہ اگر پیغام لانے والے فوت ہو جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم اپنے نظریہ حیات کو چھوڑ کر الٹے پاؤں پھر جاؤ۔ یہ بھی ایک واضح حقیقت تھی جو اس معرکہ کی افراتفری میں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تھی حالانکہ

مناسب تھا کہ یہ اہل ایمان کی نظروں سے اوجھل ہو جائے کیونکہ یہ نہایت ہی سیدھی سادھی بات تھی۔

انسان فانی ہے اور نظریہ حیات باقی ہے۔ اسلامی نظام زندگی ایک علیحدہ حقیقت ہے جو ان لوگوں سے بالکل مستقل حقیقت رکھتا ہے جو اس کے حاملین ہیں اور جو اسے لوگوں تک پہنچاتے ہیں، وہ رسول ہوں یا رسولوں کے بعد امت کے داعی اور مبلغین ہوں۔ وہ مسلمان جو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت رکھتا ہے اور یہ محبت ایسی ہے جس کی پوری تاریخ انسانی میں کوئی نظیر نہیں ملتی، اس کا فرض ہے کہ وہ ذات رسول اور اس نظریہ حیات کے اندر فرق و امتیاز کرے جسے اس ذات نے لوگوں تک پھیلا یا۔ اس لئے کہ جو نظریہ حیات آپ ﷺ نے دیا وہ حَقٌّ لَا یَمُوتُ..... ہے۔ اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے جو حَقٌّ لَا یَمُوتُ..... ہے۔ یہ فرق کرنا ان کا فرض اس لئے بنتا ہے کہ وہ محب رسول ہیں۔ یہ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ رسول ﷺ کو کائنات تک بھی چھوے۔ ابودجانہ کو دیکھو وہ اپنی پیٹھ کے ذریعہ رسول اللہ ﷺ کے ڈھال بنے ہوئے ہیں۔ ان پر تیروں کی بارش ہو رہی ہے اور وہ وہیں ہیں جو جے ہوئے ہیں اور یہ دیکھو کہ آپ صرف ۹ آدمیوں کے ساتھ رہ گئے اور ان سے ایک کے بعد ایک شہید ہو رہا ہے، سب ختم ہو جاتے ہیں لیکن آپ ﷺ کو گزند نہ پہنچے نہیں دیتے۔ اور آج ہر جگہ اور ہر زمانے میں آپ کا نام سنتے ہی لوگ بوجہ محبت وجد میں آ جاتے ہیں اور ٹوٹ کر آپ سے محبت کرتے ہیں، اپنے پورے پورے وجود کے ساتھ اور اپنے پورے جذبات کے ساتھ۔

اے مہمان رسول! داعی سے دعوت کی قدر و قیمت زیادہ ہے۔ وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ..... ”محمد اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور رسول بھی گزر چکے ہیں۔“ وہ سابق رسول بھی اسی دعوت کے حاملین تھے جس کی جڑیں زمانہ قدیم تک دور تک پھیلی ہوئی ہیں، تاریخ کے بڑے بڑے میدانوں میں بارہا یہ دعوت سرسبز ہوتی رہی ہے۔ اس کا آغاز آغاز انسانیت کے ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ اور یہ رسول زندگی کی گزر گاہوں میں اس کے حدی خواں رہے ہیں۔ قائدانہ انداز میں امن و سلامتی کے ساتھ۔

اس لئے یہ پیغام اور یہ نظام داعی سے بڑا ہے اور داعی سے زیادہ زندہ رہنے والا ہے۔ داعی تو آتے جاتے رہتے ہیں لیکن یہ پیغام زمانوں اور نسلوں سے جاری و ساری ہے۔ اس کے ماننے والے اس کے منبع اول کے ساتھ مربوط اور جڑے رہتے ہیں۔ وہ منبع اور مصدر جس نے خود ان رسولوں کو بھیجا وہ منبع باقی ہے۔ اس کی طرف مومنین کا رخ ہے۔ وہ نصب العین ہے اور اہل ایمان کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ الٹے پاؤں پھریں اور اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر مرتد ہو جائیں حالانکہ اللہ زندہ جاوید ہے۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں ان کے رویے پر سخت نکیر کی گئی۔ فرماتے ہیں

أَفَأَمَّ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَصُرَ اللَّهُ شَيْئًا
وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ

”کیا اگر وہ مرجائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو تم لوگ الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ یاد رکھو جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا، البتہ جو اللہ کے شکر گزار بن رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔“

تعبیر ایسی ہے کہ اس میں ارتداد کی زندہ تصویر سامنے آ جاتی ہے۔ ”تم لوگ الٹے پھر جاؤ گے۔“ انْقَلَبْتُمْ عَلَى أَعْقَابِكُمْ..... اور وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ..... ”جو الٹا پھرے۔“ یہ ایک حسی اور دیکھے جانے والی حرکت ہے، ایک زندہ شخص الٹے پاؤں مڑتا ہے۔ یہ انقلاب ارتداد کی ایک مجسم شکل ہے۔ اسلامی نظریہ حیات چھوڑنا بعینہ اسی طرح ہے جس طرح ایک شخص اچانک واپس الٹے پاؤں مڑ جائے۔ حالانکہ یہاں اس انقلاب سے مراد یہ حسی حرکت نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد وہ نفسیاتی حالت ہے جس میں ایک شخص نظریاتی پسپائی اختیار کرتا ہے۔ ایک شخص نے یہ آواز دی کہ محمد ﷺ قتل ہو گئے ہیں، یہ سنتے ہی بعض مسلمانوں کے ذہن میں یہ تصور اور یہ سوال آ گیا کہ اب مشرکین کے ساتھ جنگ کا فائدہ یہ کیا ہے؟ غرض اس طرح ذہنی حرکت اور اس ذہنی انقلاب کا اظہار حسی حرکت سے کیا گیا۔ یعنی ان کے ذہن اس طرح واپس ہو گئے جو طرح وہ معرکہ احد میں جسمانی طور پر پسپائی اختیار کر رہے تھے۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی

طرف نضر بن انس رضی اللہ عنہ نے اشارہ کیا تھا۔ لوگوں نے ہتھیار چھوڑ دیئے اور ان سے کہا گیا کہ رسول اکرم ﷺ تو مارے گئے۔ اس پر انہوں نے ان سے کہا: ”پھر محمد ﷺ کے بعد تم زندہ رہ کر کیا کرو گے۔ اٹھو اور اس مقصد کے لئے شہید ہو جاؤ جس کے لئے آپ ﷺ شہید ہوئے۔“

وَمَنْ يَنْقَلِبْ عَلَى عَقْبَيْهِ فَلَكَ يُضَاعَفُ اللَّهُ شَيْئًا..... ”یاد رکھو جو الٹا پھرے گا وہ اللہ کا کچھ نقصان نہ کرے گا۔“ وہ تو خود خسارہ اٹھائے گا۔ وہ خود اپنے آپ کو ایذا شددیتا ہے کہ وہ الٹا پھرتا ہے اور اس کے اس انقلاب موقف سے اللہ کو کوئی نقصان نہ ہو گا۔ اللہ تو لوگوں سے بے نیاز ہے۔ وہ ان کے ایمان کا محتاج نہیں ہے۔ یہ تو اس کی مہربانی ہے کہ اس نے لوگوں کے لئے یہ نظام تجویز کیا جس میں خود ان کی سعادت اور ان کا فائدہ ہے۔ اور جو شخص اس نظام سے روگردانی کرے گا وہ خود برے انجام سے اس دنیا میں دوچار ہو گا۔ وہ اپنی ذات میں حیران و پریشان ہو گا اور اپنی سوسائٹی میں بھی۔ اس کے اس فعل کی وجہ سے یہ نظام خراب ہو گا، حیات انسانی خراب ہو گی اور پوری انسانی آبادی خراب ہو گی۔ تمام معاملات بے ترتیب ہو جائیں گے، لوگ خود اپنے ہاتھوں گرفتار مصیبت ہوں گے۔ محض اس لئے کہ انہوں نے اس نظام سے روگردانی کی کہ صرف اس کے اندر پوری انسانی نظام زندگی کا نظام درست طور پر چل سکتا ہے۔ انسان مطمئن ہو سکتا ہے اور صرف اس نظام کے زیر سایہ نفس انسانی اپنی فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکتا ہے۔ اور اس پوری کائنات کے ساتھ چل سکتا ہے جس کے اندر وہ زندہ رہ رہا ہے۔

وَسَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ..... ”اور جو اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے انہیں وہ اس کی جزا دے گا۔“ یہ شکر گزار وہی ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کی قدر و قیمت جانتے ہیں جو اس نے انہیں اسلامی نظام زندگی دے کر ان پر کی۔ وہ شکر اس طرح ادا کرتے ہیں کہ وہ اس نظام کی اطاعت کرتے ہیں، وہ اس طرح بھی شکر کرتے ہیں کہ اللہ کی ثناء خوانی کریں، اور اس کو قائم کر کے اس دنیا کی سعادت حاصل کریں اور یہی ان کی جزا اس دنیا میں ہے۔ ان کی شکر گزاری کی بہترین جزا اور اس

کے بعد آخرت میں ان کو جزادی جائے گی اور یہ اخروی سعادت ہوگی جو اس دنیاوی سعادت مندی سے بہت بڑی ہوگی اور جو ابد ہی ہوگی۔

گویا اس واقعہ پر اس تبصرے کے ذریعہ، اللہ تعالیٰ، مسلمانوں کی اس ذاتی دلچسپی کو، جو رسول اکرم ﷺ کی ذات کے ساتھ تھی، ہٹا کر اسے براہ راست ذات باری کے ساتھ جوڑتے ہیں جو اس دعوت کا اصل سرچشمہ ہے۔ اس لئے کہ دعوت اسلامی کا یہ چشمہ صافی رسول ﷺ نے نہیں جاری فرمایا تھا۔ آپ نے تو لوگوں راہنمائی اس طرف فرمائی اور لوگوں کو بلایا کہ وہ اس ٹھاٹھیں مارتے ہوئے دریا کے فیض سے فیض یاب ہوں، جس طرح آپ ﷺ سے پہلے دوسرے رسول بھی یہی راہنمائی کرتے رہے تھے۔ اور وہ مخلوق کے پیاسے قافلوں کو دعوت دیتے رہے کہ اس چشمہ صافی سے سیراب ہوں اور پیاس بجھائیں۔

گویا اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ لوگوں کا ہاتھ پکڑ کر ان کے ہاتھ میں وہ مضبوط رسی تھمادیں، جسے حضرت محمد ﷺ نے نہیں باندھا، بلکہ آپ تو اس لئے تشریف لائے تھے کہ لوگوں کو اس پختہ رسی میں باندھ دیں۔ ان کو اسی حالت میں چھوڑ دیں اور وہ اس دنیا سے اس حالت میں چلے جائیں کہ لوگ اس رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہوں۔

گویا اللہ تعالیٰ یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کا رابطہ براہ راست اسلام سے ہو جائے اور ان کا عہد براہ راست اللہ کے ساتھ ہو جائے اور اللہ تعالیٰ کے سامنے، اس عہد کے بارے میں ان کی شمولیت بلا واسطہ ہو جائے۔ براہ راست اللہ کے سامنے وہ جو ابدہ ہوں تاکہ وہ اپنی ذمہ داریوں کا احساس کر سکیں، ایسی ذمہ داریاں جو رسول اکرم ﷺ کے فوت ہونے سے ختم نہیں ہو جاتیں۔ گویا انہوں نے براہ راست اللہ سے بیعت اور براہ راست اللہ کے سامنے وہ اس کے بارے میں جو ابدہ ہیں۔

گویا اللہ کی مشیت یہ تھی کہ امت مسلمہ اس صدمے سے دوچار ہو جائے جس سے ایک دن اس نے دوچار ہونا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو معلوم تھا کہ جب یہ صدمہ ہو گا تو ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گا۔ لہذا

اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر انہیں اس صدمے کی ریہہ رسل کرادی۔ وہ انہیں عملاً پہنچا دیا یعنی رسول کی وفات کے بارے میں بھی انہیں یہ صدمہ پہنچا دیا، قبل اس کے کہ یہ صدمہ جب فی الواقعہ ہو تو انہیں بالکل ہی نڈھال نہ کر دے۔

اور جب رسول ﷺ کی وفات کے وقت وہ اس صدمے سے دوچار ہوئے تو وہ فی الواقعہ اسے برداشت نہ کر سکے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی تربیت یافتہ شخصیت اٹھ کھڑی ہوئی، تلوار سونت لی اور پکارا کہ کوئی یہ لفظ منہ تک نہ لائے کہ محمد ﷺ فوت ہو گئے ہیں۔

یہ ابو بکر رضی اللہ عنہ ہی تھے جو فوراً اٹھے، جو خدا رسیدہ تھے، جن کا تعلق تقدیر الہی سے براہ راست مضبوط تھا، انہوں اسی آیت کو پڑھا اور ان لوگوں کو یاد دلایا جو نڈھال ہو کر حواس کھو بیٹھے تھے۔ جب انہوں نے اس خدائی پکار کو سنا تو ان کے حواس بحال ہوئے اور وہ ہوش میں آئے۔

اس کے بعد نفس انسانی کے اندر پائے جانے والے فطری خوف کو ایک ٹچ دیتے ہیں یہ ایک نہایت ہی الہامی مس ہے۔ وہ یکدم اس خوف کو دور کر دیتا ہے اور موت و حیات کے بارے میں ایک اٹل حقیقت بیان کر دی جاتی ہے۔ نیز موت کے بعد لوگوں کے ساتھ اللہ کا سلوک اور جزاء و سزا کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كِتَابًا مُّؤَجَّلًا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ

”کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت تو لکھا ہوا ہے۔ جو شخص دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں سے دے دیں گے اور جو ثواب آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔“

ہر شخص کی موت کے لئے ایک لکھا ہوا وقت مقرر ہے اور کوئی شخص اس لکھے ہوئے وقت تک زندگی گزارنے سے پہلے ہر گز مر نہیں سکتا۔ اس لئے ڈر، خوف، ہراس اور جزع و فزع ایک پل بھر زندگی کی میعاد کو آگے نہیں بڑھا سکتا۔ شجاعت، ثنابت، قدمی، اقدام اور وفاداری سے عمر کم نہیں ہوتی۔ ناس ہو بزدلی کا! بزدلوں کی آنکھ نیند کو ترسے! جس کے لئے جو دن مقرر ہے، اس میں نہ ایک دن کی کمی ہو سکتی ہے اور نہ اضافہ!

اس حقیقت کے بیان سے نفس انسانی میں تقدیر اور اجل کی حقیقت بیٹھ جاتی ہے۔ اس لئے نفس انسانی اس کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیتا ہے۔ اس کی کوئی پرواہ ہی نہیں کرتا۔ اس کی سوچ تمام تر ادائے فرض، وفائے عہد اور ایمانی تقاضوں کو پورا کرنے میں صرف ہوتی ہے۔ اس کی وجہ سے وہ حرص اور کنجوسی کے بندھنوں سے بھی آزاد ہو جاتا ہے اور خوف اور جزع و فزع پر بھی قابو پالیتا ہے۔ اب وہ راہ حق کی تمام مشکلات کو انگیز کرتے ہوئے اور راہ حق کے فرائض پورے کرتے ہوئے بڑے صبر و سکون کے ساتھ اور توکل علی اللہ کرتے ہوئے آگے بڑھتا ہے۔ کیونکہ اب کی اس نئی سوچ کے مطابق، موت کا وقت اللہ کے ہاتھ میں ہے اور لکھا ہوا ہے۔

ذرا ایک قدم اور آگے جائیں۔ اس بات کا فیصلہ ہو گیا کہ عمر لکھی ہوئی ہے اور موت کا وقت متعین اور مقرر ہے تو بتایا جاتا ہے کہ اصل سوچ یہ ہے کہ تم اپنی کمائی کو دیکھو کہ اس وقت، آنے والے وقت کے لئے تم نے کیا تیاری کی ہے اور کس مزید کمائی کا ارادہ ہے۔ اس نفس سے پوچھا جاتا ہے کہ تم اپنی کمائی کو دیکھو کہ اس وقت، آنے والے وقت کے لئے تم نے کیا تیاری کی ہے اور کس مزید کمائی کا ارادہ ہے۔ اس نفس سے پوچھا جاتا ہے کہ اے نفس! کیا تم ایمان کے تقاضوں کو پس پشت ڈالنا چاہتے ہو اور کامیابی اور ناکامی کو اسی دنیا کے اندر محدود اور بند کر دینا چاہتے ہو اور صرف اس دنیا کے لئے زندہ رہنا چاہتے ہو یا کہ تمہاری نظریں افق اعلیٰ پر بھی ہیں؟ کیا اس محدود دنیا کے مقابلے میں بہت بڑی دنیا کی فکر بھی تمہیں ہے۔ اس دنیا کی محدود عمر کے غم اور اہتمام کے ساتھ ساتھ کیا آخرت کا ارادہ بھی ہے؟

وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَنْ يُرِدْ ثَوَابَ الْآخِرَةِ نُؤْتِهِ مِنْهَا

”جو شخص ثواب دنیا کے ارادے سے کام کرے گا اس کو ہم دنیا ہی میں دے دیں گے اور جو شخص آخرت کے ارادے سے کام کرے گا وہ آخرت کا ثواب پائے گا۔“

اور ان دونوں زندگیوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اور ان دونوں ارادوں میں بہت بڑا امتیاز ہے جبکہ دونوں صورتوں میں موت کا وقت وہی ہے جو مقرر ہے۔ فرق یہ ہے کہ جو شخص صرف اس دنیا کے لئے زندہ ہے اور صرف اس دنیا کا عوضانہ چاہتا ہے اس کی زندگی اور کیڑوں مکوڑوں اور ڈھور ڈنگروں کی زندگیوں میں کیا فرق ہے۔ دونوں کا وقت مقرر ہے۔ اور جس شخص کی نظریں دار آخرت پر لگی ہوئی ہیں وہ انسانوں جیسی شریفانہ اور کریمانہ زندگی بسر کرتا ہے اسے اللہ تعالیٰ نے چن لیا ہے۔ وہ اس کرۂ ارض پر اللہ کا خلیفہ ہے اور یہ بھی وقت مقرر پر اس دنیا سے رخصت ہو گا۔ وَمَا كَانُ لِنَفْسٍ أَنْ تَمُوتَ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ كَتَبْنَا مُوَجَّلًا..... ”کوئی ذی روح اللہ کے اذن کے بغیر نہیں مر سکتا۔ موت کا وقت لکھا ہوا ہے۔“

وَسَنَجْزِي الشَّاكِرِينَ..... ”اور شکر کرنے والوں کو ہم ان کی جزا ضرور عطا کریں گے۔“ یہ کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو مقام انسانیت کو پالیتے ہیں اور اللہ نے انسان کو جو شرف عطا کیا ہے اس کی قدر کرتے ہیں۔ اس لئے وہ اپنے آپ کو حیوانی سطح سے ذرا اوپر رکھتے ہیں۔ اور اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور اس شکر یہ کی صورت یہ ہے کہ وہ ایمان کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔

غرض اس انداز میں حیات و ممات کی حقیقت ذہن نشین کرنے اور زندگی کے ان مقاصد اور ترجیحات کے حوالے سے اپنے لئے چن لیتے ہیں، قرآن کریم انسانوں کے سامنے دو راستے رکھتا ہے، ان کو دعوت فکر دی جاتی ہے کہ وہ اپنے لئے کون سا راستہ منتخب کرتے ہیں۔ وہ اپنے لئے محض کیڑے مکوڑوں کی زندگی پسند کرتے ہیں یا انسان مکرم کی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ یوں نفس انسانی خوف موت اور دنیا کی تکالیف پر جزع و فزع ترک کر کے ایک زیادہ مفید کام کی طرف منتقل ہونا پسند کرتا ہے اور یہ انتخاب وہ اپنے اختیار تمیزی سے کرتا ہے کیونکہ وہ دونوں میں سے ہر راستہ وہ اختیار کر سکتا ہے۔ چاہے تو

دنیا کا راستہ اختیار کرے اور چاہے تو آخرت کا راستہ اختیار کرے۔ جو راہ بھی وہ اختیار کرے، اس کا صلہ پائے گا۔

اس کے بعد قرآن کریم بطور مثال زمانہ ماقبل کے اہل ایمان کی مثال بیان کرتا ہے۔ اس لئے کہ انسانیت کی طویل تاریخ میں زندگی کی گزر گاہوں میں قافلہ ایمان ہمیشہ رواں دواں رہا ہے۔ یہ مثال ان لوگوں کی ہے جو اپنے وعدے ایمان پر سچے رہے۔ انہوں نے اپنے نبیوں کے ساتھ داد شجاعت دی۔ جب وہ مصیبت میں مبتلا ہوئے تو جزع و فزع نہیں کی۔ اور اس مقام جہاد میں انہوں نے ایمانی آداب کی سخت پاسداری کی۔ وہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے رہے۔ اور ان کے منہ سے اف تک نہ سنی گئی صرف اللہ سے استغفار کرتے رہے وہ اپنی معمولی غلطیوں کو بھی برا تصور کرتے اور اسے ”اسراف“ سے تعبیر کرتے۔ وہ اپنے رب سے صرف صبر و ثبات کے ذریعہ کفار کے مقابلے میں نصرت طلب کرتے۔ اور ان کا یہی رویہ تھا جس کی وجہ سے وہ ثواب دارین حاصل کر پائے۔ یہ ثواب انہیں اس لئے دیا گیا کہ وہ نہایت ہی عاجزی سے دست بدعا ہوتے اور جہاد کے موافق پر احسان اور حسن نیت سے قائم رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے مثال بن گئے۔

وَكَايَ مِنْ نَبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِيثِيُونَ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ (۱۳۶) وَمَا كَانَ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَمْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبَّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (۱۳۷) فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحَسَّنَ ثَوَابَ الْآخِرَةِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ (۱۳۸)

”اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے۔ انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی، وہ سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی لوگوں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی کہ ”اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز

ہو گیا ہو اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔“ آخر کار اللہ نے انہیں دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر آخرت کا ثواب بھی دیا۔ اللہ کو ایسے نیک عمل لوگ پسند ہیں۔“

احد میں مسلمانوں کو ہر میت کا جو صدمہ ہوا، وہ اس قسم کا پہلا صدمہ تھا۔ اس سے قبل بدر میں اللہ نے انہیں فتح مندی عطا کی تھی، حالانکہ وہ مخالفین سے کئی گنا کم تھے۔ اس فتح کے بعد ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ گویا یہ فتح شاید ان کے حق میں ایک تکوینی سنت الہی ہے، لیکن احد کا تجربہ ان کے لئے اچانک تھا۔ وہ غیر متوقع ابتلا سے دوچار ہو گئے۔

یہی وجہ ہے کہ واقعہ احد پر قرآن کریم نے طویل ترین تبصرہ کیا ہے۔ اس میں کبھی تو اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے اور کبھی ان پر سخت نکیر کی گئی ہے، کبھی ان کی بات کی تائید کی گئی اور کسی جگہ انہیں تمثیلات سے سمجھایا گیا ہے۔ یوں ان کے نفوس کی تربیت کی گئی ہے، ان کے تصور حیات کی تصحیح کی گئی ہے اور انہیں آنے والے معرکوں کے لئے تیار کیا گیا ہے، اس لئے کہ ان کی راہ طویل تھی، اور ان کے سامنے مشکل مراحل تھے، بھاری فرائض ان پر عائد ہوتے تھے اور وہ جس عظیم انقلاب کے نمائندے تھے وہ ایک عظیم الشان امر تھا۔

یہاں ان کی جو مثال پیش کی گئی ہے وہ ایک عام مثال ہے۔ اس مثال میں کسی ایک نبی کی بات نہیں کی گئی۔ کسی ایک قوم کی بات بھی نہیں کی گئی، بلکہ قافہ ایمان کی بات کی گئی ہے۔ آداب مؤمنین کی بات کی گئی ہے۔ بتایا گیا ہے کہ ابتلا ایک ایسا مرحلہ ہے جو ہر دعوت اور ہر دین میں پیش آتا رہتا ہے۔ تمام انبیاء کے متبعین تمہارے اسلاف ہیں۔ اس لئے قافلہ ایمان دراصل ایک ہے اور ایک ہی تسلسل ہے۔ یہ بات ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ نظریہ حیات ایک ہی ہے اور یہ سب کے سب ایک ہی ایمانی فوج کے رجمنٹ ہیں۔

وَكَايْنِ مِنْ نَبِيِّ قَاتَل مَعَهُ رِثْيُونٌ كَثِيرٌ فَمَا وَهَنُوا لِمَا أَصَابَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَمَا ضَعُفُوا
وَمَا اسْتَكَانُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ

”اس سے پہلے کتنے ہی نبی گزرے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی اور نہ وہ باطل کے آگے سرنگوں ہوئے۔“

کتنے ہی نبی گزر چکے ہیں جن کے ساتھ اسلامی جماعتیں لڑ چکی ہیں۔ انہوں نے تو کمزوری نہیں دکھائی۔ ان پر جو مشکلات پڑیں جو مصائب و شدائد پیش آئے، وہ جس درد و الم میں مبتلا ہوئے وہ تم سے کچھ کم نہ تھا لیکن انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی۔ انہوں نے اس جدوجہد کا سلسلہ ختم نہیں کر دیا۔ نہ وہ ان مشکلات کے سامنے جھکے اور نہ دشمنوں کے سامنے جھکے۔ مومنین کی شان تو ایسی ہوتی ہے، اس لئے کہ وہ ایمان اور نظریہ حیات کے لئے جدوجہد کر رہے ہوتے ہیں۔ وَاللَّهُ يُحِبُّ الصَّابِرِينَ ”ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔“ جن کے نفوس ضعف نہیں دکھاتے، ان کی قوتیں مضحمل نہیں ہوتیں، ان کے عزائم نرم نہیں پڑتے۔ وہ نہ جھکتے ہیں اور نہ سرنگوں ہوتے ہیں۔ یہ تعبیر کہ اللہ صابریں کو محبوب رکھتے ہیں نہایت ہی مؤثر تعبیر ہے۔ اس میں خاص اشارہ پایا جاتا ہے۔ یہ محبت اور پیغام محبت تمام دردوں اور دکھوں کے لئے مرہم ہے، اس سے تمام زخم مندمل ہو جاتے ہیں اور تمام تلخیاں اور تمام تھکاوٹیں ختم ہو جاتی ہیں۔

یہاں تو ان سابق اہل ایمان کے ظاہری موقف کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ ظاہری مشکلات کے مقابلے میں یہ ثابت قدمی اختیار کرتے ہیں، لیکن آنے والی آیت ان کی داخلی کیفیات اور ان کے ایمان و شعور کی تصویر کسی بھی کرتی ہے۔ دکھایا جاتا ہے کہ وہ جناب باری میں کتنے مودب ہیں۔ وہ اس خوف کا مقابلہ کس طرح کرتے ہیں جو ان کے نفس پر طاری ہوتا ہے اور جو مدہوش کرنے والا ہوتا ہے، نہایت ہی دہشت ناک ہوتا ہے اور جو نفس انسانی کو پوری طرح گرفت میں لے لیتا ہے، کیونکہ یہ خطرہ اٹل ہوتا ہے لیکن ایسا خوف و خطر بھی ان اہل ایمان کی توجہ الی اللہ پر اثر انداز نہیں ہو سکتا، وہ ایسے حالات میں

بھی اللہ سے لو لگائے رکھتے ہیں۔ اور ایسے حالات میں بادی النظر میں کسی انسان کا یہی مطالبہ ہو سکتا ہے کہ اے اللہ ہمیں فتح نصیب کر لیکن وہ صرف عفو و درگزر کا سوال یوں کرتے ہیں، یوں وہ گویا ادائیگی فرض میں اپنی کوتاہیوں اور خطا کار یوں کا اعتراف کرتے ہیں اور کے بعد وہ ثابت قدمی اور دشمنوں پر فتح مندی کی دعا کرتے ہیں۔

وَمَا كَانَتْ قَوْلُهُمْ إِلَّا أَنْبَاءٌ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا
وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ (۱۴۷)

”ان کی دعا بس یہ تھی کہ ”اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو تجاوز ہو گیا ہے، اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔“

ان کا سوال کسی دولت و نعمت کے لئے نہ تھا، بلکہ انہوں نے اجر و ثواب و جزا کا مطالبہ بھی نہیں کیا نہ انہوں نے ثواب دنیا کا مطالبہ کیا اور نہ ہی ثواب آخرت کا۔ وہ تو جناب باری میں بڑے ادب سے کھڑے تھے۔ وہ ذات باری کی طرف متوجہ تھے، حالانکہ وہ حالت قتال میں تھے، انہوں نے اس حال میں بھی صرف اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کی اور صرف ثابت قدمی کی دعا کی۔ کفار کے مقابلے میں کامیابی کی دعا کی۔ یہاں تک کہ وہ یہ نصرت و کامرانی بھی اپنے لئے طلب نہیں کرتے۔ وہ اس میں بھی کفر کی شکست اور کفار کے لئے مناسب سزا کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ ہے جناب باری تعالیٰ کی درگاہ میں احترام و ادب جس کے وہ لائق ہے اور جو اہل ایمان کا شیوہ ہے۔

یہ مثال کہ اہل ایمان اپنے لئے کچھ نہیں مانگتے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انہیں وہ سب کچھ دے دیا۔ انہیں وہ کچھ دے دیا جس کی طالب دنیا کبھی تمنا کر سکتا ہے۔ نیز انہیں وہ سب کچھ بھی دے دیا جس کی تمنا کوئی طالب آخرت کر سکتا ہے۔ فَاتَّكَلُوهُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ

..... ”آخر کار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر آخرت کا ثواب بھی دیا۔“

اب اللہ تعالیٰ شہادت دیتے ہیں کہ یہ لوگ محسنین میں سے تھے، انہوں نے بارگاہ الہی میں بہترین ادب کا مظاہرہ کیا اور انہوں نے بہترین مظاہرہ دوران جہاد کیا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اعلان کر دیا کہ وہ ان سے محبت کرتے ہیں اور یہ وہ نعمت ہے جو ہر قسم کے ثواب سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ واللہ یحبُّ الْمُحْسِنِينَ..... ”اللہ کو ایسے ہی نیک لوگ پسند ہیں۔“

اس انداز میں پیرا گراف ختم ہوتا ہے، جس میں اسلامی تصور حیات کے نہایت ہی اساسی حقائق کو پیش کیا گیا ہے، جن کی وجہ سے پہلی اسلامی جماعت کی بہترین تربیت ہوئی اور جو ہر نسل اور ہر دور میں اٹھنے والی تحریک اور ہر دور کی امت کے لئے سرمایہ بصیرت ہے۔



اب یہ تبصرہ آگے ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے۔ اس معرکہ کے کچھ اور واقعات سامنے رکھے جاتے ہیں تاکہ ان سے بصیرت افروز نتائج اخذ کئے جاسکیں۔ اہل ایمان کی نظریاتی تصحیح ہو، ان کے نفوس کی تربیت ہو انہیں آگاہ کیا جائے کہ اس راہ میں کہاں کہاں پھسلنے کا خطرہ ہے، انہیں بتایا جائے کہ ان کے ارد گرد سازشوں کے جال بچھے ہوئے ہیں، اور دشمن گھات میں بیٹھے ہوئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ احد میں شکست کی وجہ سے مدینہ کے کفار، منافقین اور یہود کو از سر نو سازشیں کرنے کا موقع مل گیا تھا، اس لئے کہ اس وقت تک اہل مدینہ اہل اسلام کے لئے نیک نیت نہ ہوئے تھے۔ اس شہر میں ابھی تک مسلمان اجنبی تھے۔ اس اجنبی تحریک اور اس نئے پودے کے ارد گرد جنگ بدر نے رعب اور دبدبے کی ایک باڑ قائم کر دی تھی۔ کیونکہ بدر میں اہل اسلام کو نہایت ہی فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تھی اور جب احد میں شکست ہوئی تو یہ صورت حال بدل گئی۔ اسلام کے ان خفیہ دشمنوں کو موقع مل گیا کہ وہ اپنے دلی کینہ اور بغض و عناد کا اظہار کر سکیں۔ اور معاشرے کے اندر زہر آلود

پروپیگنڈا کر سکیں۔ اور جن گھرانوں میں لوگ شہید ہو گئے تھے، یا جن میں لوگ شدید زخمی تھے اور ایک کھرام مچا ہوا تھا ان میں اس کے زہر آلود پروپیگنڈے اور سازشوں کے لئے راہ ہموار ہو گئی تھی چنانچہ ان لوگوں نے اب کھل کر ریشہ دوانیاں شروع کر دی تھیں۔

آنے والے پیراگرافوں میں اس معرکہ کے اہم واقعات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور اس کے بڑے بڑے واقعات قلم بند کئے گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب سے پہلے مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہیں کہ کافروں کی پیروی مت کرو، تمہیں فتح حاصل ہوگی اور کافروں کے دلوں میں تمہارا رعب از سر نو پیدا ہوگا، انہیں بتایا جاتا ہے کہ ابتدائے معرکہ میں تو تمہیں فتح ہوئی اور یہ میرے وعدے کے مطابق تھی جسے تم نے کمزوری دکھا کر ضائع کیا، آپس میں نزاع اور خلاف کیا، رسول اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی، اس کے بعد انہیں اس معرکہ کے دونوں رخ زندہ اور متحرک صورت میں بتائے جاتے ہیں۔ ہزیمت کے بعد افراتفری، پھر اہل ایمان کے لئے تسلی و اطمینان کا سامان اور اہل نفاق کے دلوں میں حسرت و یاس، جن کے خیالات اللہ کے بارے میں اچھے نہ تھے۔ نیز انہیں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس معرکہ میں واقعات کا رخ شکست کی جانب پھرنے میں بھی اللہ تعالیٰ کی لطیف حکمت کار فرما تھی، نیز یہ کہ موت کا ایک دن متعین ہے اور اس سلسلے میں اہل کفر اپنے گمراہ کن پروپیگنڈے کے ذریعہ جو گمراہی پھیلا رہے ہیں ان سے بچ کر رہو اور آخر کار تمہیں بہر حال اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے وہ اپنی موت مرے یا شہید ہوں جانا تو ادھر ہی ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يُرْذِلْكُمُ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ
فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ (۱۴۹) بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ (۱۵۰)
سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا
وَمَا وَاهُمُ النَّارُ وَبُئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ (۱۵۱) وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ
تَحْسَبُوهُمْ بِأَذْنِهِ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَارَعَ الْغَمُّ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا

أَرَأَيْتُمْ مَا يُحِبُّونَ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ
صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى
الْمُؤْمِنِينَ (١٥٢) إِذْ تَضَعُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَى أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ
فِي أُحْرَاكُمْ فَأَتَابَكُمْ عَمَّا بَغِمْتِكُمْ لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ
وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (١٥٣) ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنَةً نَاعَسًا
يَعْمَى طَائِفَةٌ مِنْكُمْ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ
الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنْ الْأَمْرُ
كَلَّهُ لِلَّهِ يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ يَقُولُونَ لَوْ كَانِ لَنَا
مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ
عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحَّصَ مَا فِي
قُلُوبِكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (١٥٤) إِنْ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ
التَّقْيِ الْجُمُعَاتِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ
عَنْهُمْ إِنْ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ (١٥٥) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ
كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُرًى لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا
مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ
وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (١٥٦) وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ

مَنْ اللَّهُ وَرَحْمَةُ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ (۱۵۷) وَلَئِنْ مُثِمُّ أَوْ قَتَلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ
تُخْشَرُونَ (۱۵۸)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اگر تم ان لوگوں کے اشارے پر چلو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو الٹا پھیر لے جائیں گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔ (ان کی باتیں غلط ہیں) حقیقت یہ ہے کہ اللہ تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔ عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھادیں گے، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے، جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ ان کا آخری ٹھکانہ جہنم ہے اور بہت ہی بری ہے وہ قیام گاہ جو ان ظالموں کو نصیب ہوگی۔

اللہ نے (تائید و نصرت) جو وعدہ تم سے کیا تھا، وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں (اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جو نبی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مال غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے..... اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا اور رسول تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔ مگر ایک دوسرا گروہ جس کے لئے ساری اہمیت بس اپنی ذات ہی کی تھی، اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ ”اس کام کو چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟“ ان سے کہو ”(کسی کا حصہ نہیں) اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔“ دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں، اسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ اس کا اصل مطلب یہ ہے کہ ”اگر (قیادت) کے اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔“ ان سے کہہ دو کہ ”اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔“ اور یہ معاملہ جو پیش آیا، یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزمائے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے، اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔

تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیئے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا، اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مکافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے، ورنہ دراصل مارنے اور جلانے والا تو اللہ ہی ہے اور تمہاری تمام حرکات پر وہی نگران ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمہارے حصہ میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ بہر حال تم سب کو جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔“

آیات کے اس مجموعے کو اگر گہری نظر سے دیکھا جائے تو یہ اپنے اندر زندگی سے بھرپور مناظر کی ایک بڑی مقدار کو لئے ہوئے ہے اور ان مناظر کے علاوہ انسانی زندگی اور اسلامی تصور حیات دونوں کے نہایت ہی اساسی حقائق اس میں ثبت کئے گئے ہیں۔ نیز اس میں کائنات کے بعض اہل اصول بھی بیان کئے گئے ہیں۔ جہاں تک اس معرکہ کا تعلق ہے، اس کی جھلکیاں زندگی سے بھرپور، بڑی تیزی کے ساتھ اور بڑی گہرائی کے ساتھ پیش کی گئی ہیں، اس معرکہ کا کوئی اہم پہلو نہیں چھوڑا گیا اور وہ اس انداز میں فلم بند ہوا ہے کہ اسے پڑھ کر شعور اور جذبات میں ایک تلاطم برپا ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری طرح زندہ، جزئیات پر مشتمل فضائے جنگ اور اس کے حالات و واقعات ان میں ریکارڈ کئے گئے ہیں۔ اس کے اندر انسانی ضمیر میں پیدا ہونے والے خلجان اور شعوری اور لاشعوری حرکات کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں۔ جن کی وجہ سے سیرت النبی کی مفصل کتابوں میں بیان کردہ تمام واقعات مستحضر ہو جاتے ہیں اور اس تبصرے کے نتیجے میں اسلامی تصور حیات کے اصلی حقائق، زندہ شکل میں، حرکت کرتے ہوئے اور مسلمانوں کے لئے صحیح تصور حیات تعمیر کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

اس میں شک نہیں ہے کہ اس معرکہ کے تمام مشاہدات اور پورے حقائق کو الفاظ و فقرات کی اس مختصر مقدار میں، زندگی سے بھرپور انداز میں، حرکات اور اشارات کے اس مخصوص انداز میں ثبت کر دینا، کسی انسانی تعبیر کے لئے نہ ممکن ہے اور نہ ہی تاریخ آداب انسانی میں اس کی کوئی مثال ہے اور اس کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے جسے اسلوب ادا کے اسرار اور انسان کی قوت ادا کی حدود کا علم ہوتا ہے، خصوصاً وہ لوگ جن کو مشکل تعبیرات سے واسطہ پڑتا ہے اور جو فن تعبیر میں درک رکھتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يُزْذِقُوا عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا
خَاسِرِينَ (۱۴۹) بَلِ اللَّهُ مُؤَلِّمُكُمْ وَهُوَ خَيْرُ الْمُنَاصِرِينَ

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم ان لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو الٹا پھیر لے جائیں گے تو تم نامراد ہو جاؤ گے۔ حقیقت یہ ہے اللہ ہی تمہارا حامی و مددگار ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔“

جنگ احد میں مسلمانوں کو جو شکست ہوئی، ایک بڑی تعداد ماری گئی ایک بڑی تعداد زخمی ہوئی۔ اس سے مدینہ کے کفار، منافقین اور یہودیوں کو یہ موقع مل گیا کہ وہ از سر نو اٹھیں اور مسلمانوں کو حضرت محمد ﷺ کا ساتھ دینے کے نتائج سے ڈرائیں۔ انہیں جنگ کی ہولناکیوں سے آگاہ کریں اور خصوصاً مکہ کے مشرکین اور قریش کے حلفاء کے ساتھ مزید معرکہ آرائی کے نتائج سے انہیں خائف کریں۔ ظاہر ہے کہ شکست و ریخت کی یہ فضاء دلوں و متزلزل کرنے، اسلامی صفوں کو منتشر کرنے اور اسلامی قیادت کے خلاف بد اعتمادی پیدا کرنے اور اپنے مقابلے میں زیادہ طاقتور قوتوں کے ساتھ ٹکرانے پر اصرار کرنے کی پالیسی کو جاری رکھنے کے فوائد کو مشکوک بنانے اور اس پالیسی سے نکل آنے کی افادیت ظاہر کرنے، اور کامیاب ہونے والوں کے ساتھ مصالحت کی احادیث ظاہر کرنے اور اس سلسلے میں انفرادی درد و غم کو برا بیختہ کرنے کے لئے بہت زیادہ موزوں تھی۔ یہ لوگ چاہتے تھے کہ اس فضا سے فائدہ اٹھا کر اسے جماعت مسلمہ کی بیخ کنی کے لئے استعمال کیا جائے۔ اس کے بعد اسلامی نظریہ حیات کی بیخ کنی تک اسے پہنچایا جائے اور اہل اسلام کو اس پر آمادہ کر لیا جائے کہ وہ اپنے سے قوی لوگوں کے سامنے جھک جائیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس امر سے سخت الفاظ سے ڈرا کر منع فرمایا کہ وہ پالیسی کے معاملات میں اہل کفر کی اطاعت نہ کریں۔ اس معاملہ میں اگر وہ ان کی پیروی کریں گے تو اس کا نتیجہ لازماً خسارے کی شکل میں سامنے آئے گا۔ اس میں کوئی نفع اور کوئی فائدہ نہ ہو گا۔ البتہ یہ ہو گا کہ وہ الٹے پاؤں پھر دوبارہ کفر میں داخل ہو جائیں گے۔ مومن کے لئے دو ہی راستے ہیں، یا تو وہ کفر اور اہل کفر کے ساتھ مسلسل برسر جنگ رہے گا، باطل اور اہل باطل کے ساتھ برسر پیکار رہے گا اور یا پھر الٹے پاؤں پھر کر مرتد ہو جائے گا۔ نعوذ باللہ منھا۔ ان دونوں راستوں کے سوا کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے کہ وہ علیحدہ ہو کر غیر جانبدار کھڑا ہو جائے، بین بین رہے اور اپنے موقف پر بھی جمار ہے اور اپنے دین کی حفاظت کر رہا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی سوچ میں یہ بات آتی ہو خصوصاً اس معرکہ میں شکست کی فضا میں، چوٹ اور زخم کھا کر وہ یہ سوچ رہا ہو کہ مومن کے لئے ممکن ہے کہ وہ غالب قوتوں کے ساتھ اس

معمر کہ آرائی سے نکل آئے، ان کے ساتھ مصالحت کرے، ان کی پیروی کرے اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے دین کی حفاظت بھی کرتا ہو، اس کا عقیدہ اپنی جگہ درست ہو، اس کا ایمان قائم ہو، اس کا وجود بھی قائم رہے لیکن یہ سوچ ایک خطرناک واہمہ ہے اس لئے کہ وہ حق و باطل کے اس معرکے میں جو آگے نہیں بڑھتا وہ لازماً پیچھے کو پلٹتا ہے۔ اور جو شخص کفر، شر، باطل، گمراہی اور نافرمانی کے خلاف جدوجہد نہیں کرتا وہ لازماً ذلیل و خوار ہوگا، الٹے پاؤں پھرے گا اور کفر، شر، گمراہی، باطل اور نافرمانی میں داخل ہو جائے گا۔ جسے اس کا ایمان نہ بچا سکے گا، اس کا نظریہ حیات نہ بچا سکے گا، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ کفار کی پیروی کر رہا ہو، ان کی بات سن رہا ہو اور ان پر اعتماد کر رہا ہو تو درحقیقت اس شخص نے اپنے ایمان اور نظریہ حیات کا موقف چھوڑ دیا ہے۔ وہ روحانی طور پر شکست کھا چکا ہے کیونکہ جب ایک نظریاتی شخص اپنے مخالفین کے سامنے جھکتا ہے تو وہ روحانی طور پر ٹوٹ چکا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اب وہ ان کی وسوسہ اندازی سے متاثر ہوتا ہے۔ ان سے ہدایت لیتا ہے۔ یہی تو ہے شکست۔ اب کسی بھی وقت دوبارہ عقیدہ کفر کی طرف پلٹ سکتا ہے۔ اسے اس آخری شکست سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ اگرچہ ابتدا میں اسے احساس نہیں ہوتا کہ وہ ایک ایسی راہ پر پڑ گیا ہے جس کا انجام حسرتناک ہوگا۔ صحیح موومن تو وہ ہوتا ہے جو اپنے عقیدے اور اپنی قیادت کی وجہ سے اپنے نظریاتی دشمنوں اور اپنی قیادت کے دشمنوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور جب بھی وہ ان دشمنوں کی طرف کان دھرے گا گویا اس نے الٹے پاؤں سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ یہ ایک فطری حقیقت اور عملی حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے اہل ایمان کو آگاہ فرماتے ہیں، متنبہ کرتے ہیں اور پکارتے ہیں **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يُزِيدُواكُمْ عَلَىٰ أَخْطَائِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ.....**

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اگر تم ان لوگوں کے اشاروں پر چلو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو وہ تم کو الٹا پھیر لے جائیں گے اور تم نامراد ہو جاؤ گے۔“

اس سے بڑا خسارہ کیا ہو سکتا ہے کہ انسان الٹے پاؤں پھرے اور ایمان کے بعد کفر کی راہ کو از سر نو اختیار کرے۔ اگر ایمان چلا جائے تو پھر کون فائدہ اس کی کمی کو پورا کر سکتا ہے؟

سوال یہ ہے کہ تم کفار کی طرف مائل اس لئے ہو سکتے ہو کہ تم ان سے حمایت کی امید رکھتے ہو گے اور یہ کہ ان کو اس وقت فتح حاصل ہے۔ یہ بہت بڑا وہم ہے جس میں تم مبتلا ہو، اس لئے اس وہم کو رد کرنے کے لئے اچانک روئے سخن اس طرف مڑتا ہے کہ منع نصرت و حمایت کہاں ہے بَلِ اللّٰهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ..... ”حقیقت یہ ہے کہ تمہارا حامی و مددگار صرف اللہ ہے اور وہ بہترین مدد کرنے والا ہے۔“

مسلمانوں کی ولایت کا مرجع اللہ ہے۔ وہ اسی سے نصرت طلب کر سکتے ہیں اور جس کا مددگار اللہ ہو تو اسے کسی دوسرے مددگار کی ضرورت کیا رہتی ہے؟ جس کا ناصر اللہ ہو اسے بندوں کی جانب سے کسی نصرت کی ضرورت ہی کیا ہے؟

اس کے بعد مومنین کو تسلی دی جاتی ہے اور انہیں یہ خوش خبری دی جاتی ہے کہ جلد ہی وہ کفار کے دلوں میں تحریک اسلامی کا رعب ڈال دیں گے اور یہ اس لئے کہ وہ اللہ کی ذات میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں اور یہ نظریہ شرک کی پشت پر اس دنیا میں نہ قوت ہے نہ قوت دلیل ہے اور آخرت میں تو ان کے لئے بہت ہی برا ٹھکانہ تیار کیا گیا ہے۔

سَلِّقُوا فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللّٰهِ مَا لَهُمْ يَنْزِلُ بِهِ سُلْطَانًا وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ وَيَنْسُو الظَّالِمِينَ

”عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھادیں گے، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے جس کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ ان کا آخری ٹھکانہ جہنم ہے اور بہت ہی بری ہے وہ قیام گاہ جو ان ظالموں کو نصیب ہوگی۔“

یہ وعدہ اللہ جل شانہ کی جانب سے ہے، جو غالب ہے اور قادر مطلق ہے۔ وہ اہل کفر کے دلوں میں رعب بٹھا سکتا ہے۔ وہ اس بات کا ذمہ دار ہے کہ اس معرکے کا انجام کیا ہوگا، وہ ضمانت دیتا ہے کہ اس کے دوست فاتح ہوں گے اور اس کے دشمنوں کو شکست ہوگی۔

اللہ کا یہ وعدہ ہر اس معرکے کے لئے اب بھی قائم ہے جس میں فریقین معرکہ اہل کفر اور اہل ایمان ہوں۔ جب بھی اہل کفر اہل سے دوچار ہو جاتے ہیں، ان کے دل میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا رعب بٹھا دیتے ہیں۔ لیکن اہم بات اور اہم شرط یہ ہے کہ اہل ایمان کے دل میں ایمان کی حقیقت موجود ہو۔ ان کو اللہ کی نصرت کا حقیقی شعور ہو، انہیں پورا پورا یقین ہو کہ اللہ ان کا مددگار ہے اور ان کے دل میں ذرہ برابر شک اس بارے میں نہ ہو کہ اللہ کا لشکر ہی غالب رہتا ہے اور یہ کہ اللہ اپنے معاملات پر پورا کنٹرول رکھتے ہی اور یہ کہ اہل کفر اللہ کو شکست نہیں دے سکتے اور نہ وہ اللہ سے آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اور ان کا معاملہ اللہ کے اس وعدے کے ساتھ ہو کہ وہ روئے عمل ہو کر رہے گا چاہے ظاہری حالات اس کے خلاف نظر آئیں، اس لئے کہ اللہ کا وعدہ بہر حال سچا ہوتا ہے اگرچہ ہماری آنکھیں الٹ دیکھ رہی ہوں۔

اہل کفر رعب میں اس لئے آ جاتے ہیں کہ ان کا تکیہ صحیح نہیں ہے۔ ان کا بھروسہ نہ قوت پر ہے اور نہ صاحب قوت پر۔ انہوں نے اللہ کے ساتھ ایسے خداؤں کو شریک کیا ہوا ہے جن کے ہاتھ میں کوئی قوت نہیں ہے کیونکہ اللہ نے ان شریکوں کو کوئی قوت دے کر اپنے ساتھ شریک نہیں کر لیا۔

یہ انداز تعبیر کہ اللہ نے ان پر کوئی ”سلطان“ نہیں اتاری، اپنے اندر گہرا مفہوم رکھتی ہے۔ قرآن میں اس انداز تعبیر کو بار بار اپنایا گیا ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ جھوٹے الہوں کے پاس سلطان نہیں ہے۔ کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ غلط عقائد پر کوئی سلطان نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی تصور، کوئی عقیدہ، کوئی نظریہ، کوئی شخصیت اور کوئی بھی تنظیم، اس قدر موثر ہوتی ہے جس قدر اس کے اندر پوشیدہ قوت اور غلبے کا داعیہ ہوتا ہے۔ اس اندرونی قوت کی مقدار کے مطابق ہی اس کی جدوجہد قائم اور دائم رہتی ہے۔ اور اس اندرونی قوت کا دار و مدار اس کی اس سچائی

کی اس مقدار پر ہوتا ہے جو اس کے اندر موجود ہوتی ہے اور یہ کہ اس قوت اور اس قوت کے اندر کی قدر ہم آہنگی ہے جس قوت اور سچائی پر اللہ نے اس پوری کائنات کو قائم کیا ہے۔ نیز یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس کائنات کے سنن اور نوامیس کے ساتھ اس کی ہم آہنگی کی قدر ہے۔ کسی شخص یا ادارے کو اللہ اسی قدر قوت اور سلطان دیتا ہے جس قدر وہ ان نوامیس فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہوتا ہے، جو اس کائنات میں مؤثر ہیں اور کار فرما ہیں۔ اگر یہ ہم آہنگی نہیں ہے تو وہ شخص، نظریہ اور ادارہ، بوجس، کھوٹا اور ضعیف اور ختم ہونے والا ہے، چاہے بظاہر وہ بہت ہی قوی نظر آئے، بظاہر وہ جس قدر مزین کیا گیا ہو اور بظاہر وہ پھولا ہوا نظر آتا ہو۔

مشرکین کی حالت یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسرے الہوں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔ یہ شرک مختلف الاقسام ہوتی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ پہلے اللہ کی خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت غیر اللہ کو عطا کرتے ہیں، یا اللہ کے مظاہر میں سے کوئی مظہر غیر اللہ کو دیتے ہیں۔ ان خصائص میں سے اہم خاصہ خدا اس کا حق قانون سازی ہے، جو وہ اپنے بندوں کی زندگی کے مختلف حالات کے لئے کرتا ہے اور ان اقدار کے تعین کا حق ہے جن کے مطابق لوگوں کو اپنی زندگی کے معاملات، انفرادی اور اجتماعی فیصلے کرنے ہوتے ہیں اور یہ کہ بندوں پر حق حکمرانی صرف اللہ کو ہے اور یہ صرف اس کا حق ہے کہ وہ اپنے قوانین اور اپنے طے کئے ہوئے حسن و قبح کے معیارات اور پیمانوں کی اطاعت کرائے۔ اس کے بعد شرک پھر ان شعائر تعبیدیہ کے اندر ہوتا ہے جو اللہ کے لئے مخصوص ہوتے ہیں یعنی عبادات۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ خدا جن کو مشرکین اللہ کے ساتھ شریک کرتے ہیں اس کے ہاں اس سچائی کی کیا مقدار ہوتی جس پر اللہ نے اس کائنات کو قائم کیا ہے؟ یہ صرف اللہ ہے جس نے اس کائنات کو حق پر قائم کیا ہے اور تمام مخلوق کو پیدا کیا ہے کہ وہ صرف اس کی بندگی کا اقرار کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ اور وہ شریعت اور حسن و قبح کے پیمانے صرف اس سے لیں۔ اور صرف اس کی عبادت اس طرح کریں جس طرح اس کی عبادت کرنے کا حق ہے۔ بغیر کسی شرک کے

‘بغیر کسی شراکت کے۔ اس لئے جو نظریہ اصول توحید کے خلاف ہو جس پر یہ کائنات اپنی اساس سے قائم ہے وہ کھوٹا، باطل اور حق کے مخالف ہے۔ اور یہی راز ہے کہ اس کے کمزور اور واہیات ہونے کی اور یہی وجہ ہے کہ اس کے اندر نہ قوت ہوتی ہے اور نہ اس کے اندر سلطان ہوتی ہے اور وہ زندگی کے دھارے کو متاثر نہیں کر سکتا۔ بلکہ اس کے اندر سرے سے زندگی کے بنیادی عناصر (Potentials) نہیں ہوتے۔

جب تک مشرکین شرک میں مبتلا ہیں (اور شرک ایسا نظریہ ہے جس اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی سلطان نہیں ہے) یہ شرک وہ چاہے الہوں کی صورت میں کر رہے ہوں یا وہ عقائد و تصورات میں کر رہے ہوں، تو وہ گویا کمزوری خلا اور وہم پر بھروسہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ ہمیشہ ذلیل وہ خوار اور ضعیف و ناتواں رہیں گے اور وہ ہمیشہ مرعوب رہیں گے، جب بھی ان کا سامنا اہل ایمان کے ساتھ ہوا۔ اس لئے کہ اہل ایمان کا بھروسہ ایسی سچائی پہ ہوتا ہے جو پر شوکت اور پر قوت ہوتی ہے۔

اس وعدے کا مصداق ہمیں ہر وقت نظر آ سکتا ہے جب بھی حق و باطل کا آپس میں ٹکراؤ ہو، بارہا ایسا ہوا ہے کہ باطل زاد و عتاد اور کثر سامان جنگ کے ساتھ حق کے مقابلے میں آیا ہے، جبکہ حق غیر مسلح تھا لیکن اس صورت حال کے باوجود باطل خوفزدہ اور مرعوب ہو کر کانپنے لگتا ہے۔ وہ ہر حرکت اور ہر نعرہ تکبیر کے مقابلے میں تھرتھرتا رہتا ہے حالانکہ اس کے ساتھ عظیم مسلح لشکر رہے ہیں۔ لیکن جو نہی ان عظیم لشکروں پر حق جھپٹا ہے باطل دبا گیا ہے، جزع و فزع کرتے ہوئے منتشر ہو گیا ہے۔ اس کی صفوں میں اضطراب پھیل گیا ہے۔ اگرچہ وہ تعداد اور زاد و عتاد میں بہت زیادہ تھا اور حق اس کے مقابلے میں قلت قلیل تھا۔ یوں اس فرمان کی سچائی بار بار ثابت ہوئی ہے۔ سُنُّلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا..... ”عنقریب وہ وقت آنے والا ہے جب ہم منکرین حق کے دلوں میں رعب بٹھادیں گے، اس لئے کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو خدائی میں شریک ٹھہرایا ہے، جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی سدا نازل نہیں کی۔“

یہ بات تو دنیا سے متعلق تھی۔ آخرت میں کیا ہوگا، تو وہاں ان کا انجام نہایت ہی پریشان کن اور برا ہوگا اور ان ظالموں کے لائق حال ہوگا وَمَا وَاهُمُ النَّارُ وَبُئْسَ مَثْوًى
الظَّالِمِينَ..... ”ان کا آخری ٹھکانہ جہنم ہے اور بہت ہی بری ہے وہ قیام گاہ جو ان ظالموں
کے نصیب ہوگی۔“

یہاں اللہ تعالیٰ انہیں اس اصول کا مصداق خود جنگ احد بتاتے ہیں۔ اس جنگ کی ابتدائی جھڑپ
ہی میں مسلمانوں و فیصلہ کن فتح ہو گئی تھی۔ مشرکین مارے جارہے، یہاں تک کہ وہ بھاگ کھڑے
ہوئے۔ انہوں نے اپنا مال غنیمت بھی چھوڑ دیا۔ ان کا علم گر گیا اور کوئی اسے اٹھانے والا نہ رہا۔ صرف
ایک عورت کو ہمت ہوئی اور اس نے اس علم اٹھالیا۔ یہ فتح شکست میں صرف اس وقت تبدیل ہوئی
جب تیر اندازوں کے دلوں میں ضعف پیدا ہو گیا۔ وہ مال غنیمت سمیٹنے کے لئے چڑھ دوڑے۔ آپس
میں تنازعہ بھی ہوا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے احکام کی خلاف ورزی کی جو نبی وقت بھی تھے اور
ان کے قائد بھی تھے۔ چنانچہ قرآن کریم اس معرکہ کے عروج پر جو واقعات پیش آئے، جو حادثات
ہوئے۔ جن حالات میں ہوئے اور جس طرح ہوتے ہوئے نظر آئے، ان کی توجہ نہایت ہی عجیب اور
زندگی اور حرکت سے بھرپور انداز میں، ان واقعات کی طرف مبذول کراتا ہے ذرا غور سے پڑھئے:

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَخُسُّوهُمُ بِإِذْنِهِ حَتَّى إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَارَ غَمُّمِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ
مَنْ بَعْدَ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ثُمَّ صَرَفَكُمْ
عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ (۱۵۲) إِذْ تَضَعُدُونَ وَلَا
تَلْوُونَ عَلَى أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُحْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا
فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۵۳) ثُمَّ أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً
نُعَاسًا يَغْشَى طَائِفَةً مِنْكُمْ وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ
الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ يُخْفُونَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا
لَا يُبْذَرُونَ لَكَ يَقُولُونَ لَوْ كَانِ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي

بَيِّنَتْكُمْ لِكَبِيرِ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۱۵۴) اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ اِنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ حَلِيمٌ (۱۵۵)

”اللہ نے (تائید و نصرت کا) جو وعدہ تم سے کیا تھا، وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتدا میں (اس کے حکم سے تم ہی ان کو قتل کر رہے تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا، اور جو نہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مال غنیمت) تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے..... اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔ تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا کیونکہ مومنوں پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔

یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے، کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے کا ہوش تمہیں نہ تھا اور رسول تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔ اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔

اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم میں سے کچھ لوگوں پر ایسی اطمینان کی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔ مگر ایک دوسرا گروہ، جس کے لئے ساری اہمیت بس اپنی ذات کی تھی، اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں ”اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے؟“ ان سے کہو ”کسی کا کوئی حصہ نہیں) اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔“ دراصل یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں، اسے تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا اصل مطلب یہ ہے کہ ”اگر (قیادت کے) اختیارات میں ہمارا کچھ حصہ ہو تا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔“ ان سے کہہ دو کہ ”اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی

تھی وہ خود اپنے قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔“ اور یہ معاملہ پیش آیا، یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزمائے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے، اللہ دلوں کا حال کو ب جانتا ہے۔

تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈگمگادیئے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا، اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔“

یہاں قرآن مجید نے جنگ کی اسٹیج کے تمام مناظر کو پوری طرح الفاظ کے ذریعہ منقش کر دیا۔ اس میں فتح اور شکست دونوں کے مناظر دکھائے گئے ہیں، الفاظ کی صورت میں ایک ریل چلتی نظر آتی ہے، جس میں میدان جنگ کے تمام مناظر یکے بعد دیگرے سامنے آتے چلے جاتے ہیں، بلکہ دلی خیانت، جسموں کے انداز اور ضمیر کی کھٹک تک صاف نظر آتے ہیں۔ عبارات کے معانی کو اس طرح منتقل کرتی ہیں گویا ریل ہے جو مناظر دکھا رہی ہے۔ ہر حرکت میں جدید تصویر، متحرک اور زندہ نظر آتی ہے خصوصاً وہ منظر جب لوگ پہاڑ پر چڑھتے ہوئے بھاگ رہے ہیں اور رسول اللہ ﷺ انہیں پکار رہے ہیں، لیکن وہ ایک نہیں سنتے۔ دہشت زدہ ہیں، پریشان ہیں، جنگ چھوڑ کر پیٹھ موڑ کر بھاگنے کے لئے اوپر ہی کی طرف جا رہے ہیں۔ ان تصاویر کے ساتھ ساتھ دلی وساوس، قلبی کیفیات، تاثرات اور خلجان بھی صاف نظر آتا ہے۔ اتنی بڑی مقدار میں زندہ، متحرک اور چلتی پھرتی تصاویر اور پھر ان کے اندر کے فیصلے، ہدایات اور بہترین تبصرے اور یہ سب کچھ اسی مختصر سی عبارت میں۔ یہ ہے قرآن کریم کا منفرد اسلوب بیان اور یہ ہے قرآن کریم کی منفرد طرز تربیت۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّوهُمُ بِأُذُنِهِ..... ”اللہ نے نصرت کا جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اس نے پورا کر دیا۔ ابتداء میں اس کے حکم سے تم انہیں قتل کر رہے تھے۔“ یہ معرکہ کی ابتدائی تصویر ہے جب مسلمانوں نے مشرکین کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا۔ تَحُسُّوهُمُ سے مراد تَحْمِدُوهُمْ جِسْمُهُمْ..... (تم اس کے احساس کو بجھا رہے تھے) یا تم ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینک رہے

تھے۔ اس سے پہلے کہ مال غنیمت کا لالچ انہیں بے راہ کر دے۔ اور رسول اللہ ﷺ نے انہیں کہہ دیا تھا ”تمہیں فتح نصیب ہوگی لیکن اس وقت تک جب تک تم نے صبر کیا۔“ چنانچہ یہی بات سچی نکلی۔

حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأُمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِمَّنْ بَعْدَ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ مِمَّنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِمَّنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ

مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جو نبی وہ چیز تمہیں اللہ نے دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے، تم نے اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کی۔ اس لئے کہ تم میں سے بعض لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔“

یہ تیر اندازوں کے حالات کا جائزہ ہے۔ ان میں سے بعض لوگ مال غنیمت کے دھوکے میں آ گئے۔ ان کے اور ان میں سے ان لوگوں کے درمیان نزاع ہو گیا جو رسول اللہ ﷺ کی مکمل اطاعت کرنا چاہتے تھے۔ بات یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے معصیت اور نافرمانی کا فیصلہ کیا خصوصاً اس وقت جب انہوں نے اپنی آنکھوں سے فتح مندی کے آثار دیکھ لئے۔ ان میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ نے مال غنیمت کا ارادہ کر لیا اور دوسرے نے ثواب آخرت کو ترجیح دی۔ ان کے دلوں کے اندر اختلاف پیدا ہو گیا۔ اور اسلامی صفوں میں وحدت نہ رہی۔ اور نہ ہی ہدف ایک رہا۔ لالچ نے اخلاص کو مکدر کر دیا حالانکہ نظریاتی جنگوں میں خلوص شرط اول ہوتی ہے۔ اس لئے کہ نظریاتی جنگ دوسروں سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ جنگ ایک طرف میدان جنگ میں لڑی جاتی ہے اور دوسری طرف خود انسانی ضمیر کے اندر بھی لڑی جاتی ہے اور جب تک ضمیر کے میدان میں فتح حاصل نہ ہو، جنگ کے میدان میں فتح ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہوتی ہے جو صرف اللہ کے لئے ہوتی ہے، اس لئے اس میں کامیابی سے ہمکنار وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے دل اللہ کے لئے خالص ہو جائیں۔ جب وہ اللہ کا جھنڈا بلند کرتے ہیں تو اللہ انہیں تب ہی نصرت عطا کرتے ہیں۔ جب اللہ ان کو چھانٹ کر خالص کر دیں اور وہ صرف اسی کے معرکوں میں کامیاب رہتے ہیں حالانکہ وہ باطل کے جھنڈے اٹھا رہے ہوتے ہیں۔ اس میں بھی حکمت ہوتی ہے، جس کا علم اللہ ہی کو ہوتا ہے۔ لیکن جو لوگ حق کا علم بلند کرتے ہیں اور پھر حق کے لئے

یکسو نہیں ہوتے، مخلص نہیں ہوتے، تو ایسے لوگوں کو اللہ کبھی بھی نصرت عطا نہیں کرتے۔ ان کو آزمائش میں ڈالا جاتا ہے، یہاں تک کہ ان کی چھانٹی ہو جاتی ہے اور وہ لوگ بالکل ستھرے ہو جاتے ہیں جو اللہ کے لئے کام کرتے ہیں۔ یہ ہے وہ بات جسے قرآن مجید جماعت مسلمہ پر ان کے موقف کی روشنی میں واضح کرنا چاہتا ہے۔ یہ ہے وہ حقیقت جس کی تلقین پہلی جماعت اسلامی کو اس وقت کی جارہی ہے جب کہ وہ ہزیمت کے تلخ حقائق سے دوچار تھی، اسے دردناک چوٹ لگی ہوئی تھی اور یہ چوٹ اس کے اپنے ڈانواں ڈول موقف کی وجہ سے لگی تھی۔ مَنكُم مَّن يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمَنكُم مَّن يُرِيدُ الْآخِرَةَ..... (ابن کثیر) یوں اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کا حال کھول کر ان کے سامنے رکھ دیتے ہیں، ان کے دلوں کی بات ظاہر کر دی جاتی ہے اور انہیں معلوم ہو جاتا ہے کہ شکست کیوں ہوئی تاکہ آئندہ اس سے بچیں۔

اس کے ساتھ ساتھ اللہ اپنی حکمت اور تدبیر کا ایک پہلو بھی ان پر واضح فرماتے ہیں۔ یہ کہ انہیں جو تکالیف اٹھانی پڑیں اور یہ واقعات جو بالکل ظاہری اسباب کی وجہ سے پیش آئے لیکن اللہ کی قدرت دیکھئے ثُمَّ صَرَّفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ..... ”تب اللہ نے تمہیں کافروں کے مقابلے میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔“ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام افعال کی پشت پر تقدیر کار فرما ہوتی ہے۔ جب انہوں نے کمزوری دکھائی، آپس میں تنازع کیا، حکم عدولی کی، اللہ تعالیٰ نے ان کی قوت کو پھیر دیا، ان کی طاقت ختم ہو گئی، وہ مشرکین کی آمد کو معلوم نہ کر سکے، تیر اندازوں کو گھاٹی سے ہٹا دیا۔ میدان میں لڑنے والوں کو بھی پیچھے ہٹا دیا۔ وہ بھاگنے لگے، یہ سب واقعات اس طرح پیش آئے کہ خود ان کے کئے کا نتیجہ تھے۔ لیکن ان ظاہری واقعات کے پیچھے بھی حکمت و تدبیر تھی، وہ یہ کہ اللہ اہل ایمان کو آزمائش میں ڈالنا چاہتے تھے تاکہ سخت ترین حالات، خوف و ہراس، قتل و جراح اور ہزیمت و شکست سے دوچار کر کے انہیں آزمایا جائے۔ اور ان مشکلات کے نتیجے میں ان دلوں کے خفیہ گوشے بھی سامنے آجائیں۔ دل صاف ہو جائیں اور صفوں سے کمزور لوگ دور ہو جائیں جیسا کہ آئندہ بیان ہو گا۔ ہوتا تو یہ ہے واقعات بظاہر اپنے ظاہری اسباب کے نتیجے میں سامنے آتے ہیں لیکن ان ظاہری اسباب کے ہوتے ہوئے بھی ان کے پیچھے تدبیر کام کر رہی ہوتی ہے۔ اس لئے ان دونوں کے درمیان

کوئی تعارض نہیں ہے۔ ہر واقعہ کے پیچھے سبب ظاہری بھی ہوتا ہے اور اس سبب ظاہری کے پیچھے اللہ کی حکمت و تدبیر بھی کام کر رہی ہوتی ہے اور یہ تدبیر لطیف و خبیر کی طرف سے ہوتی ہے۔

وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ..... ”اور حق یہ ہے کہ اللہ نے پھر بھی تمہیں معاف ہی کر دیا۔“ یعنی اللہ نے تمہاری کمزوری، باہم نزاع اور حکم عدولی کو معاف کر دیا۔ اس طرح تم جو بھاگ نکلے، لٹے پاؤں پھرے۔ یہ سب کچھ اللہ نے معاف کر دیا۔ اور یہ معافی صرف اس کا فضل و کرم ہے۔ تمہاری بشری کمزوریوں کو اس نے معاف کر دیا، نظر انداز کر دیا کیونکہ تمہاری نیت بری نہ تھی، تم غلطی پر اصرار نہیں کر رہے تھے۔ کیونکہ تمہاری یہ کمزوری اور یہ غلطی دائرہ ایمان کے اندر ہے۔ تم اللہ کے سامنے بھی جھکتے ہو اور اپنی قیادت کے احکام کے سامنے بھی سر تسلیم خم کرتے ہو۔ وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ..... ”کیونکہ مومنین پر اللہ بڑی نظر عنایت رکھتا ہے۔“

اس کا پہلا فضل تو یہ ہے کہ اس نے انہیں معاف کر دیا۔ جب تک وہ اسلامی نظام پر قائم ہیں اس کی بندگی کا اقرار کرتے ہیں۔ وہ اللہ کے خصائص الوہیت و حاکمیت کے مدعی خود نہیں ہوتے۔ وہ اپنے لئے منہاج حیات، نظام قانون، اقدار حیات اور حسن و قبح کے پیمانے خود وضع نہیں کرتے بلکہ صرف اللہ سے لیتے ہیں۔ یہ اصول تسلیم کرتے ہوئے اگر ان سے بتقاضائے بشریت، بوجہ کمزوری، بوجہ عارضی جوش اور عارضی خواہشات کوئی غلطی ہو جائے تو وہ معاف ہو سکتی ہے لیکن غلطیوں پر ابتلا کی سزا ضرور دی جاتی ہے تاکہ وہ کھوٹ دور ہو اور وہ کمزوری دور ہو۔

اس کے بعد اس شکست کے ایک منظر کو یوں پیش کیا جاتا ہے۔ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْهُوْۤا۟ عَلٰی اَۡحَدٍ وَالتَّرْسُوْلُ یَدْعُوْکُمْ فِیْ اٰخِرَ اٰیٰتِہُمْ..... ”یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے کا ہوش تک تمہیں نہ تھا، اور رسول تمہارے پیچھے سے تمہیں پکار رہا تھا۔“ یہ اس لئے یاد دلایا جاتا ہے کہ ان کے پردہ احساس پر یہ نقش گہرائی کے ساتھ منقش ہو جائے۔ وہ اپنی جگہ

‘شرمندگی، حیا اور پشیمانی محسوس کریں۔ اس کے اسباب پر غور کریں جو کمزوری، باہم تنازع اور حکم عدولی کی وجہ سے ان سے سرزد ہوئی۔

یہ آیت ان کی جسمانی حرکات اور ان کی نفسیاتی کیفیات کی اس قدر مختصر الفاظ میں نقشہ کشی کرتی ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس تصویر میں صاف نظر آتا ہے کہ وہ پہاڑ پر اوپر کی طرف بھاگتے ہوئے چڑھتے ہیں، مرعوب ہو گئے ہیں، دہشت زدہ ہیں اور سخت اضطراب میں ہیں۔ کوئی کسی کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ کوئی کسی کی پکار کا جواب نہیں دیتا۔ رسول ﷺ پکار رہے ہیں تاکہ انہیں مطمئن کر دیں کہ آپ زندہ ہیں لیکن وہ نہیں سنتے، کیونکہ کسی نے یہ پکار دیا تھا کہ محمد ﷺ قتل ہو گئے ہیں اور اس وجہ سے ان کے دل متزلزل ہو گئے تھے۔ ان کے قدم اکھڑ گئے تھے۔ غرض ایک مکمل تصویر کشی ہے لیکن چند الفاظ میں۔

ان کی اس روش کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اللہ سے بھاگ کر اور رسول اللہ ﷺ کو اکیلا چھوڑ کر آپ ﷺ کو جو دکھ دیا، اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی بہت دکھ دیئے۔ وہ اپنے کئے پر پچھتا رہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اکیلا چھوڑ دیا۔ آپ ﷺ کو زخم آئے، لیکن پھر بھی آپ ثابت قدم رہے جبکہ وہ بھاگ گئے تھے، تاکہ تم اس چیز پر حسرت نہ کرو جو چلی گئی ہے اور نہ اس اذیت پر حزن و ملال کا اظہار کرو جو اس وجہ سے تمہیں پہنچی۔ کیونکہ یہ تجربہ جس سے وہ گزرے اور یہ ضربات جو نبی ﷺ کو لگیں وہ ان کے لئے ناقابل برداشت تھیں۔ ان کو دیکھتے ہوئے وہ خود اپنی تکالیف بھول گئے۔ اور وہ مصائب ان کی نظروں میں کم ہو گئے فَأَتَابُكُمْ عَمَّا بَعَثَكُمْ لَكِيْلًا تَخَزُنُوْا عَلٰی مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ..... ”اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔“

اور اللہ تو خفیہ باتوں کا بھی علم رکھتا ہے۔ تمہارے اعمال کی حقیقت اسے اچھی طرح معلوم ہے اور تمہاری تمام حرکات کے پیچھے جو داعیہ ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے۔ وَاللّٰهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ..... ”اللہ تمہارے سب اعمال سے باخبر ہے۔“

جب اس ہزیمت کا خوف و ہراس فرو ہو گیا، اس کی افراتفری ختم ہو گئی تو اہل ایمان پر ایک عجیب سکون طاری ہو گیا۔ اہل ایمان جو اپنے رب کی طرف دوبارہ پلٹ آئے اور نبی ﷺ کے ارد گرد جمع ہوئے تو ان پر ایک عجیب اونگھ طاری کر دی گئی۔ انہیں ایک ناقابل فہم سکون حاصل ہو گیا اور وہ مطمئن ہو گئے۔ اس نئی معجزانہ فضائے امن و سکون کی تعبیر نہایت ہی تعجب انگیز ہے۔ وہ نہایت شفاف، نرم اور خوشگوار فضا ہے اور اس کے زمزمہ اور خوشگوار چھاؤں کی تصویر کشی ان الفاظ میں ہے۔ ثُمَّ أُنْزِلَ عَلَيْكُمْ مِنْ بَعْدِ الْغَمِّ أَمْنٌ نُّعَاسًا يَخْشَى طَائِفَةٌ مِنْكُمْ..... ”اس غم کے بعد پھر اللہ نے تم پر ایسی اطمینان کی سی حالت طاری کر دی کہ وہ اونگھنے لگے۔“ یہ ایک ایسی فضا تھی جس سے رحمت الہی کا اظہار ہو رہا تھا اور اللہ کے خاص مومن بندوں پر یہ خاص رحمت نازل ہوا کرتی ہے۔ یہ ایک اونگھ تھی اور خوفزدہ اور پریشان حال مجاہدین پر جب اونگھ آجائے، اگرچہ ایک لمحہ کے لئے کیوں نہ ہو تو وہ ان کے جسم کے اندر ساحرانہ اثر کرتی ہے، اونگھ دور ہوتے ہی وہ تروتازگی محسوس کرتے ہیں، گویا وہ ایک نئی مخلوق ہیں، دلوں پر اطمینان کی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ جسم آرام محسوس کرتا ہے۔ اس اونگھ کی کیا حقیقت ہے، اس کی حقیقت اور ماہیت اور کیفیت کا ادراک ہم نہیں کر سکتے۔ میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے شدید پریشانی کے عالم میں ایسی حالت کو محسوس کیا ہے۔ میں نے واضح طور پر محسوس کیا کہ اس میں اللہ اللہ کی رحمت کی شبنم ہے۔ اور اس قدر معجزانہ کہ ہمارے الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔

ترمذی، نسائی، حاکم نے حماد ابن سلمہ کے واسطے سے ثابت کی روایت حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ابو طلحہ سے نقل کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں ”میں نے احد کے دن اپنا سر اٹھایا اور دیکھنے لگا، ہر شخص کا سر ہو دوج پر جھکا ہوا ہے۔ اور ایک دوسری روایت ابو طلحہ سے یہ ہے ”ہم احد کے دن میدان جنگ میں تھے

’کہ ہم پر ایک خاص اونگھ طاری ہوگئی۔ میری تلوار گرتی اور میں اسے اٹھاتا، گرتی اور میں دوبارہ اٹھاتا۔“

ایک گروہ کا حال تو یہ تھا اور دوسرے گروہ کا حال یہ تھا کہ وہ مترزل الایمان تھا۔ یہ لوگ تھے جنہیں صرف اپنی جان کی فکر تھی، اسی کو اہمیت دیتے تھے۔ یہ لوگ ابھی تک جاہلیت کے تصورات سے نکل کر باہر نہیں آئے تھے۔ نہ انہوں نے پوری طرح اپنے آپ کو اس تحریک کے سپرد کر دیا تھا نہ وہ پوری طرح تن بتقدیر الہی ہو گئے تھے۔ وہ اس بات پر مطمئن نہ تھے کہ انہیں جو چوٹ لگی ہے وہ ان میں چھانٹی کے لئے لگی ہے، آزمائش کے لئے یہ سب کچھ ہوا ہے۔ یہ اس لئے نہیں ہوا کہ اللہ نے اپنے دوستوں اور حامیوں کو دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے اور نہ کہیں اللہ نے یہ آخری فیصلہ کر دیا ہے کفر، شر اور باطل کو اب آخری غلبہ حاصل ہو گیا ہے۔ اور انہیں اب پورا کنٹرول حاصل ہو گیا ہے۔

وَطَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ

”مگر ایک دوسرا گروہ جس کے لئے ساری اہمیت بس اپنے مفاد ہی کی تھی، اللہ کے متعلق طرح طرح کے جاہلانہ گمان کرنے لگا جو سراسر خلاف حق تھے۔ یہ لوگ اب کہتے ہیں کہ ”اس کام کے چلانے میں ہمارا بھی کوئی حصہ ہے۔“

اسلامی نظریہ حیات، اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ ان کی جان میں ان کا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ تو سب کے سب اللہ کے ہیں اور جب وہ جہاد فی سبیل اللہ کے نکلتے ہیں تو وہ اللہ کے لئے نکلتے ہیں، وہ اللہ کے لئے حرکت میں آتے ہیں اور اللہ ہی کے لئے جنگ کرتے ہیں۔ جہاد کے اس عمل میں ان کی ذات کے لئے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس میں پھر وہ اپنے آپ کو اللہ کی تقدیر کے سپرد کر دیتے ہیں اور اللہ کی تقدیر ان پر جو حالات بھی لاتی ہے وہ اسے قبول کرتے ہیں، مکمل تسلیم و رضا کے ساتھ جو بھی ہو سو ہو۔

رہے وہ لوگ جو اپنی ذات کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ان کی سوچ اور ان کے اندازے ان کی اپنی ذات ارد گرد گھومتے ہیں، ان کی سرگرمی اور ان کے تمام اہتمام صرف اپنی ذات کے لئے ہوتے ہیں، یہ وہ لوگ ہوتے ہیں کہ ان کے دل میں ایمان کی حقیقت ابھی تک جاگزیں ہی نہیں ہوتی۔ یہ دوسرا طائفہ جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے وہ ایسے لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہاں قرآن کریم نے ان پر تبصرہ کرنا ضروری سمجھا۔ اس گروہ کے نزدیک ساری اہمیت ان کی ذات کے لئے تھی۔ وہ نہایت کرب اور پریشانی میں مبتلا تھے۔ انہیں یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو اور اپنی صلاحیتوں کو ایسے کام میں ضائع کر رہے ہیں، جو ان کے ذہن میں واضح نہیں ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ بغیر ان کی مرضی کے اس معرکہ میں شریک ہونے پر مجبور ہو گئے، انہیں اس میں خواہ مخواہ جھونک دیا گیا اس کے باوجود ان کو یہ تلخ چوٹ لگی اور وہ خواہ مخواہ اس قدر بھاری قیمت ادا کر رہے ہیں، قتل ہو رہے ہیں، زخمی ہو گئے ہیں اور پریشان کا تو حال نہ پوچھو۔ یہ لوگ اللہ کی صحیح معرفت سے محروم ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں ایسی بدگمانیاں کرتے ہیں جس طرح جاہل لوگ کیا کرتے تھے اور سب سے بڑی بدگمانی یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس معرکہ میں ضائع کر رہا ہے، جس کے انتظام میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے بس انہیں تو یہاں دھکیل کر لایا گیا ہے تاکہ وہ مریں، زخمی ہوں۔ اللہ تو نہ انہیں بچاتا ہے اور نہ ان کی مدد کرتا ہے۔ اللہ نے انہیں دشمنوں کے لئے لقمہ تر بنا دیا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ”اس کام میں ہمارا بھی حصہ ہے۔“

ان کے اس اعتراض میں یہ بات بھی شامل تھی کہ اس معرکہ کے لئے قیادت نے جو منصوبہ بنایا اس میں ان کی ایک نہ سنی گئی۔ شاید اس گروہ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ کے اندر لڑا جائے اور باہر جا کر لڑنے سے پرہیز کیا جائے لیکن اس کے باوجود وہ عبد اللہ ابن ابی کے ساتھ لوٹ نہ گئے تھے۔ لیکن ان کے دل اس منصوبے پر مطمئن نہ تھے۔

اس سے قبل کہ اس سیاق کلام میں ان کی بدگمانیوں کی بات ختم کی جائے، درمیان میں مختصر سا جواب دیا جاتا ہے اور اس میں ان کے اس اعتراض کو رد کر دیا جاتا ہے۔ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ

یَلَّهِ..... ”کہہ دو کہ اس کام کے سارے اختیارات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔“ کسی کے لئے کوئی اختیار نہیں ہے، نہ ان کا کوئی اختیار اور کسی کا کوئی اختیار ہے۔ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے نبی کو یہ حکم دے دیا لَئْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ..... ”اس کام میں کوئی اختیار تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔“ لہذا اس دین کے تمام معاملات، اس کی خاطر جہاد، اس کے نظام کا قیام، لوگوں کے دلوں کے اندر ہدایت داخل کرنا وغیرہ یہ سب کام اللہ کے لئے ہیں۔ ان اختیارات میں کوئی انسان شریک نہیں ہے۔ بشر کا کام تو صرف یہ ہے کہ وہ اپنے فرائض سرانجام دے۔ وہ اپنے وعدہ ایمان کے تقاضے پورے کرے۔ یہ اب صرف اللہ کا کام ہے کہ اس جدوجہد کے کیا نتائج نکلتے ہیں۔ اور وہ کیا نکالتا ہے۔ اس موقع پر اللہ ان کے دل کے اندر ایک چھپی ہوئی کمزوری کو بھی طشت ازبام کر دیتے ہیں یُخْفَوْنَ فِي أَنْفُسِهِمْ مَا لَا يُبْدُونَ لَكَ..... ”یہ لوگ اپنے دلوں میں جو بات چھپائے ہوئے ہیں تم پر ظاہر نہیں کرتے۔“ ان کا یہ سوال کہ ”کیا ان کے لئے بھی اس معاملے میں کوئی اختیار ہے؟“ اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ان کے شعور اور لاشعور میں یہ بات تھی کہ انہیں ایک ایسے کام میں ڈال دیا گیا ہے جس میں وہ از خود نہیں آئے۔ یہ کہ قیادت کی غلطیوں کی وجہ سے وہ قربانی کا بکرا بن گئے ہیں۔ اگر وہ خود اس معرکے کا نقشہ تیار کرتے تو اس کا یہ انجام نہ ہوتا یَقُولُونَ لَوْ كُنَّا لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ ۖ مَا قُتِلْنَا هَاهُنَا..... ”ان کی اصل بات یہ ہے کہ اگر قیادت کے اختیارات میں ہمارا کوئی حصہ ہوتا تو یہاں ہم نہ مارے جاتے۔“

یہ ایک وسوسہ ہے، جو اس وقت تک دلوں میں پیدا ہوتا ہے، جب تک وہ نظریہ کے لئے خالص اور یکسو نہیں ہو جاتے۔ جب ایسے لوگوں کو کسی موقع پر شکست سے دوچار ہونا پڑتا ہے، جب ان پر مصائب آتے ہیں، جب انہیں ان کے تصور اور توقع سے زیادہ قیمت ادا کرنی پڑتی ہے، جب انہیں ناقابل تصور ناگوار نتائج کا سامنا ہوتا ہے، جب ان کے دل و دماغ میں وہ نظریہ حیات اچھی طرح جاگزیں نہیں ہو جاتا اور جب یہ لوگ یہ سوچتے ہیں کہ ان پر یہ مصائب محض قیادت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ٹوٹ پڑے ہیں اور اگر وہ خود منصوبہ بندی کرتے تو بڑی کامیابی ہوتی۔ غرض جب لوگوں کی

ذہنی صورت حال یہ ہوتی تو اس گدلے تصور کے ہوتے ہوئے ایسا شخص یہ نہیں سوچ سکتا کہ تمام واقعات کے پیچھے حکمت خداوندی کار فرما ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچ سکتا کہ تمام واقعات کے پیچھے حکمت خداوندی کار فرما ہوتی ہے۔ وہ یہ نہیں سوچ سکتے کہ اللہ کی طرف سے یہ آزمائش ہے۔ ان کے خیال میں ایسی صورت حال میں خسارہ ہی خسارہ ہوتا ہے۔ ہر طرح کا ضیاع ہی ضیاع ہے۔

ایسے تصورات اور وسوسے رکھنے والوں کے خیالات کی درستی کے لئے اللہ تعالیٰ ایک نہایت ہی گہری سچائی ان کے سامنے رکھتے ہیں۔ وہ سچائی موت کی سچائی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ابتلا کے اندر جو حکمت پوشیدہ ہوتی ہے اس کے بارے میں بھی وضاحت ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

قُلْ لَوْ كُنْتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَى مَضَاجِعِهِمْ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ وَلِيُمَحَّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ (۱۵۴)

”ان سے کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی، وہ خود اپنی قتل گاہوں کی طرف نکل آتے۔ اور یہ معاملہ جو پیش آیا، یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے۔ اللہ اسے آزمالے۔ اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے، اللہ دلوں کا حال خوب جانتا ہے۔“

اگر تم گھروں میں بھی ہوتے اور اسلامی قیادت کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے، اس معرکے میں نہ کود پڑتے، اور تمام معاملات تم خود اپنی مرضی سے طے کرتے، تو تم میں سے بعض لوگوں کی موت لکھی ہوئی تھی وہ خود اپنے مقتل کی طرف دوڑے آتے۔ اس لئے کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ وہ اس سے نہ آگے بڑھ سکتی ہے نہ پیچھے رہ سکتی ہے۔ ہر شخص کی موت کے لئے ایک جگہ بھی مقرر ہے اور ہر شخص لازماً اس جگہ کی طرف کھنچا آئے گا اور وہاں دم توڑ دے گا۔ جب موت کا وقت قریب ہو گا تو وہ شخص اپنے پاؤں پر چل کر وہاں پہنچے گا۔ دوڑتا ہوا آئے گا۔ کوئی اسے کھینچ کر نہ لائے گا۔ نہ کوئی اسے اس طرف دھکیلنے والا ہو گا۔

یہ کیا ہی طرز ادا ہے؟ ”اپنی جائے آرام کی طرف“ گویا اس کا مقتل نرم بستر ہے، جس پر اس نے آرام کرنا ہے۔ اس کے قدم وہاں آرام سے لمبے ہو جائیں گے۔ تمام لوگ، اس دنیا میں اپنی قتل گاہوں اور اپنی آخری آرام کی جگہ کی طرف کھینچے چلے آتے ہیں اور وہ ان مقامات کی طرف بعض اوقات ایسے محرکات کی وجہ سے آتے ہیں جو ان کے لئے ناقابل فہم ہوتے ہیں بلکہ یہ محرکات ان کے لئے ناقابل کنٹرول ہوتے ہیں۔ یہ محرکات صرف اللہ کے کنٹرول میں ہوتے ہیں اور وہی ان کے نتائج کو جانتا ہے۔ اور اس کا خاص تصرف ہوتا ہے، جس طرح چاہتا ہے وہ سرانجام دیتا ہے۔ اس لئے اگر ہم اللہ کے مقرر کردہ جائے قرار پر راضی ہو جائیں تو یہ ہمارے لئے روحانی سکون اور نفسیاتی اطمینان اور ہمارے ضمیر کے مفاد میں ہو گا۔

یہ اللہ کی تقدیر ہے اور اس کے پس پشت جو حکمت کام کر رہی ہے وہ یہ ہے لِيُتْلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُورِكُمْ وَلِيَمْحُصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ..... ”اور یہ معاملہ جو پیش آیا، یہ تو اس لئے تھا کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں پوشیدہ ہے اللہ اسے آزمائے اور جو کھوٹ تمہارے دلوں میں ہے اسے چھانٹ دے۔“

اس سے بڑی آزمائش اور کوئی نہیں کہ دلوں کی بات کو ظاہر کر دیا جائے، اور جو دلوں کی تہہ میں ہے وہ اوپر آجائے۔ اس سے کھوٹ اور ریاکاری کو علیحدہ کر دیا جائے اور بغیر کسی ملمع کاری اور بغیر کسی کور کے اصل حقیقت سامنے آجائے۔ یہ بہت بڑی آزمائش ہے، ان باتوں کے لئے جو دل کے خزانے میں پوشیدہ رکھی ہوتی ہیں۔ حقیقت سامنے آجاتی ہے۔ یہ ہے تطہیر القلوب اور تصفیہ القلوب، اس طرح کہ ان میں کوئی ملاوٹ اور کھوٹ نہ رہے۔ اس طرح نظریات صحیح ہو کر صاف صورت میں سامنے آجاتے ہیں اور ان میں کوئی نقص اور ملاوٹ نہیں رہتی۔

وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ..... ”اللہ دلوں کے حال خوب جانتا ہے۔“ ذات الصدور سے مراد وہ خفیہ راز ہیں جو دلوں کی تہہ میں ہوتے ہیں اور ہر وقت دل میں ہوتے ہیں جو دل سے جدا نہیں ہوتے اور نہ روشنی میں آتے ہیں۔ اللہ ان بھیدوں کو بھی خوب جانتا ہے۔ ان بھیدوں کو اللہ

لوگوں پر اس لئے ظاہر کرتا ہے کہ لوگ خود بھی بعض اوقات ان خفیہ باتوں سے بے خبر ہوتے ہیں یعنی یہ ان کے لاشعور میں ہوتے ہیں، بعض واقعات ایسے ہوتے ہیں جو انہیں سطح پر لے آتے ہیں۔

اللہ کو ان باتوں کا علم ہے جو ذہن کے اندر تھیں۔ انہوں نے شکست کھائی اور جب اس غزوہ میں انہیں دشمن کے ساتھ آنا سامنا ہوا تو وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ کمزوری دکھائی، پیٹھ دکھائی، کیوں اس لئے کہ انہوں نے اپنے کمانڈر کی نافرمانی کی تھی۔ اس کی وجہ سے ان کے نفوس متزلزل ہو گئے۔ اس راہ سے شیطان ان کے دلوں میں داخل ہو گیا اور انہیں لغزش میں ڈال دیا اور یہ لوگ پھسل پڑے۔ فرماتے ہیں۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ

”تم میں سے جو لوگ مقابلہ کے دن پیٹھ پھیر گئے تھے ان کی اس لغزش کا سبب یہ تھا کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈمگ دئیے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا، اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بردبار ہے۔“

اس سے مراد وہ تیر انداز ہو سکتے ہیں جن کے دل میں مال غنیمت کی لالچ نے جوش مارا تھا۔ جس طرح ان کے دلوں میں یہ بات بھی آگئی تھی کہ شاید رسول اللہ ﷺ انہیں ان کا حصہ نہ دیں گے۔ یہ وہ بات تھی جو انہوں نے اپنی کمزوریوں کی وجہ سے کمائی تھی۔ اور اسی وجہ سے شیطان نے انہیں لغزش میں مبتلا کر دیا تھا۔

لیکن اپنے عموم کے اعتبار سے وہ نفس انسانی کی اس حالت کی تصویر ہے جب اس سے کسی غلطی کا ظہور اور ارتکاب ہوتا ہے۔ اسے اپنے اوپر قابو نہیں ہوتا۔ اللہ کے ساتھ اس کا رابطہ کمزور پڑ جاتا ہے۔ اس کی شخصیت کا توازن ختم ہو جاتا ہے، اسے اپنے اوپر کنٹرول نہیں رہتا۔ اور وہ خلجان اور وسوسوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ اس کا تعلق اللہ سے ختم ہو جاتا ہے اور اسے اللہ کی

رضامندی کا بھروسہ نہیں رہتا۔ یہ مقام ہوتا جہاں شیطان حملہ آور ہوتا ہے۔ وہ انسان کے نفس کے اندر داخل ہو جاتا ہے۔ اب یہ ایسے شخص کی تکمیل اپنے ہاتھ میں لیتا ہے اور اس سے لغزشوں پر لغزشیں کرواتا ہے اور یہ نفس اللہ کی پر امن اور مضبوط بارگاہ سے دور چلا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جن اللہ پرستوں نے نبیوں کے ساتھ مل کر جنگ کی انہوں نے کفار کے مقابلے میں سب سے پہلے جس ہتھیار کی توجہ کی وہ استغفار تھا۔ کیونکہ استغفار کے ذریعہ ان کی توجہ اللہ تعالیٰ کی طرف مڑ جاتی تھی۔ اللہ کے ساتھ ان کا تعلق اس کی وجہ سے مضبوط ہو جاتا۔ ان کے دلوں میں سے تمام خلیجان اور غیر یقینی حالت ختم ہو جاتی۔ تمام وساوس دور ہو جاتے اور وہ دروازہ بند ہو جاتا جس میں سے شیطان در آتا۔ اور یہ دروازہ ہمیشہ تب کھلتا ہے جب اللہ سے رابطہ ٹوٹ جاتا ہے۔ انسان کی اس کی حمایت اور پناہ گاہ سے باہر نکل آتا ہے اور اس سو رخن سے جب شیطان داخل ہوتا ہے تو وہ ان کے پاؤں کو متزلزل کر دیتا ہے۔ وہ بار بار ڈگمگاتے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ انہیں اللہ کی پناہ گاہ سے بہت دور لے جا کر بے آب و گیاہ صحراء میں سرگرداں کر دیتا ہے۔

اللہ بتاتے ہیں کہ میری رحمت ان کے شامل ہو گئی ہے۔ اس لئے شیطان انہیں مجھ سے کاٹ نہ سکا۔ لہذا وہ معاف کر دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ ان کے سامنے اپنا ذاتی تعارف بھی کراتے ہیں کہ وہ غفور ہیں، بخشنے والے ہیں اور بردبار ہیں۔ غلط کاروں کو راندہ درگاہ نہیں کرتے اور نہ ہی سزا دہی میں جلدی کرتے ہیں۔ جب اللہ نے جان لیا کہ ان کے اندر اللہ کی تلاش کا داعیہ موجود ہے اور وہ اس سے جڑنا چاہتے ہیں اور اس نے جان لیا کہ وہ سرکشی نہیں چاہتے اور نہ ہی وہ جان چھڑانا چاہتے ہیں اور نہ ہی اللہ کی غلامی سے فرار چاہتے ہیں تو وہ پھر اپنی مغفرت سے نوازتا ہے۔

اب اس مضمون کا خاتمہ موت و حیات کی حقیقت کے بیان کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ اس بارے میں کفار اور منافقین کے خیالات کس قدر کھوٹے ہیں۔ اہل ایمان کو پکار کر کہا جاتا ہے کہ وہ اس سلسلے میں اپنا تصور حیات، ان کے تصور حیات سے بالکل جدا کر لیں۔ آخر میں مشکلات اور قربانیوں کی ایک مختلف قدر و قیمت بتائی جاتی ہے۔ فرماتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا صَرُّوا فِي الْأَرْضِ أَوْ
كَانُوا عُرَىٰ لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ يُخَيِّبُ
وَيُيَسِّتُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (١٥٦) وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللَّهِ
وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ () وَلَئِنْ مُتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ (١٥٨)

”اے لوگو! جو ایمان لائے ہو کافروں کی سی باتیں نہ کرو جن کے عزیز و اقارب اگر کبھی سفر پر
جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ اگر
وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے) اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں کی
حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے، ورنہ دراصل مارنے اور جلانے والا تو اللہ ہی ہے اور تمہاری تمام حرکات
پر وہی نگران ہے۔ اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی جو رحمت اور بخشش تمہارے حصے
میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور خواہ تم مرو یا مارے
جاؤ بہر حال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔“

اس معرکے کے حالات کے بیان کے دوران آیات کی مناسبت ظاہر ہے۔ یہ منافقین مدینہ کے
اقوال تھے۔ یہ لوگ اس معرکہ کے آغاز ہی میں لشکر اسلام سے جدا ہو گئے تھے۔ نیز مدینہ کے
مشرکین بھی ایسی ہی باتیں کرتے تھے۔ یہ لوگ ابھی اسلام میں داخل نہ ہوئے تھے لیکن ان لوگوں اور
مسلمانوں کے درمیان قرابت کے تعلقات قائم تھے۔ جنگ احد میں جو لوگ مارے گئے ان کے منافق
رشتہ داروں اور مشرک رشتہ داروں کے لئے یہ ایک موضوع بن گیا، ان کو اپنے مسلم رشتہ داروں کے
دلوں میں حسرت اور مایوسی پیدا کرنے کا موقع مل گیا۔ اور اس معرکہ میں ان لوگوں کے چلے جانے اور
قتل ہو جانے کو یہ مشرک اور منافق ان کے رشتہ داروں میں از سر نو زخم تازہ کرنے کے لئے بار بار
استعمال کرتے تھے۔ اس بات میں شک نہیں ہے کہ اسلامی صفوں پر اس قسم کی باتوں اور پروپیگنڈے
سے بہت گہرے اثرات پڑتے تھے اور ان لوگوں نے اس طرح مایوسی اور ہيجان کی فضا پیدا کر دی تھی

۔ چنانچہ قرآن کریم کو ان کی غلط باتوں ان کے غلط عقائد اور ان کے غلط تصورات کو درست کرنے کے لئے یہاں ان کی تردید کرنا پڑی۔ اس طرح کہ ان کی وہ باتیں خود ان کے گلے پڑ گئیں۔

ایک بات کا فریہ کرتے تھے کہ اگر ہمارے ساتھ رہتے یا واپس آجاتے تو وہ نہ مرتے۔ ان کی اس بات سے یہ بات اچھی طرح سامنے آجاتی ہے کہ ایک شخص جو کسی نظریے کا علم بردار ہوتا ہے اور وہ شخص جس کا کوئی عقیدہ نہیں ہوتا ان دونوں میں کس قدر فرق ہوتا ہے۔ دونوں کا تصور ان اصولوں کے بارے میں جن پر زندگی رواں دواں ہے، جس میں مشکلات بھی ہیں اور آسانیاں بھی ہیں، بہت مختلف ہوتا ہے۔ ایک نظریاتی شخص اس کائنات میں اللہ کے مکتوبی اصولوں کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی قضا اور قدر پر مطمئن ہوتا ہے۔ وہ اچھی طرح جانتا اور مانتا ہے کہ اسے وہی کچھ پیش آسکتا ہے جو اللہ نے لکھ دیا ہے۔ اور یہ کہ جس دکھ نے اسے پہنچنا ہے وہ ٹل نہیں سکتا اور جو مصیبت اس پر نہیں آئی ہے وہ آنہیں سکتی۔ اس لئے وہ مصیبت پر جزع و فزع نہیں کرتا اور نہ ہی مسرت اور خوشی میں آپے سے باہر ہوتا ہے۔ اس کے نفس پر نہ اس کا اثر ہوتا ہے اور نہ اس کا۔ وہ اس بات پر حسرت نہیں کرتا کہ اس نے یہ نہیں کہا اور وہ نہیں کیا تاکہ وہ فلاں مصیبت سے بچ جاتا یا فلاں فلاں مفاد حاصل کر لیتا۔ جبکہ کام ہو چکا ہوتا ہے اور وقت چلا گیا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ تدبیر و تقدیر اور تجاویز و آراء کا موقع و محل وہ ہوتا ہے جب کوئی واقعہ ابھی تک وقوع پذیر نہیں ہوا ہو تاکہ کوئی اقدام اور کوئی حرکت ابھی ہونا ہوتی ہے۔ جب تدبیر اور مشورہ کے بعد وہ حرکت میں آجاتا ہے تو اس کے جو نتائج بھی نکلتے ہیں وہ بڑے تسلیم و رضا اور اطمینان کے ساتھ انہیں قبول کرتا ہے۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ اس کی یہ حرکت اللہ تعالیٰ کے اوامر اور مناہی کے مطابق ضروری ہیں۔ اس کو یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور اس کی تدبیر کے مطابق ہوا ہے۔ عین اس کی حکمت کے مطابق ہوا ہے۔ اور یہ کہ جس طرح ہوا اسی طرح ہونا تھا۔ اگرچہ اس نے اپنی حرکت اور فعل سے اس کے اسباب فراہم کئے۔ یوں نظریہ عمل اور اس کے نتائج تسلیم کرنے کے درمیان ایک توازن ہوتا ہے۔ وہ توکل اور مثبت سوچ کے درمیان بھی توازن پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے انسان کا ہر اقدام درست ہوتا ہے اور ضمیر مطمئن ہوتا ہے۔ رہے وہ لوگ جن کا دل و دماغ نظریہ اور اس نظریہ کے تحت مثبت تصور حیات سے خالی ہوتا

ہے تو وہ ہمیشہ ہوا میں ہوتا ہے، ہمیشہ قلق و پریشانی میں مبتلا ہوتا ہے۔ اس کی زندگی ”اگر مگر“ اے کاش“ اور ”اے افسوس“ جیسے الفاظ میں گزرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ، جماعت مسلمہ کی تربیت کرتے ہوئے، واقعات احد کی روشنی میں، جن میں مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے، انہیں اس امر سے شدید الفاظ میں ڈراتے ہیں کہ ان کا رویہ کہیں ان بے عقیدہ اور بے نظریہ کافروں کی طرح نہ ہو جائے، جو ہر وقت حسرتوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ جب بھی ان کا کوئی رشتہ دار، کسی سفر پر برائے تجارت اور کاروبار بن جاتا ہے اور وہاں بقضائے الہی فوت ہو جاتا ہے یا کبھی کسی معرکے میں شریک ہوتا ہے اور قتل ہو جاتا ہے تو وہ یہ کہتے ہیں:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ
كَانُوا غُرًى لَوْ كَانُوا عِنْدَنَا مَا مَاتُوا وَمَا قُتِلُوا

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو کافروں کی سی باتیں نہ کرو، جن کے عزیز واقارب اگر سفر پر جاتے ہیں یا جنگ میں شریک ہوتے ہیں (اور وہاں کسی حادثہ سے دوچار ہو جاتے ہیں) تو وہ کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔“ یہ باتیں وہ اس لئے کرتے ہیں کہ اس کائنات کے بارے میں ان کی سوچ غلط ہے۔ وہ یہ بات نہیں سمجھتے کہ اس کائنات کے واقعات کے پیچھے دست قدرت کام کر رہا ہے۔ وہ صرف اس قدر دیکھ سکتے ہیں جس قدر ظاہری اسباب نظر آتے ہیں۔ وہ صرف ان سطحی حالات کو دیکھ سکتے ہیں جن میں کوئی واقعہ رونما ہوا، یہ محض اس لئے کہ ان کا تعلق اللہ کے ساتھ نہیں ہے، اور وہ اس دست قدرت کو نہیں دیکھ سکتے جو اس کائنات میں جاری و ساری ہے۔

لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَلِكْ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ..... ”اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنادیتا ہے۔“ ان کا احساس یہ ہے کہ جو شخص تجارتی مقاصد کے لئے نکلتا ہے اور کسی حادثہ کا شکار ہو جاتا ہے یا کسی معرکے کے لئے نکلتا ہے اور وہاں قتل ہو جاتا ہے، اس کا اصلی سبب گویا اس شخص کا خروج ہے اور یہی غلط احساس ہے۔ جس کی وجہ سے وہ حسرت و اندوہ میں ہر وقت ڈوبے

رہتے ہیں کہ کیوں نہ انہوں نے انہیں اس سفر، اس معرکے کے لئے نکلنے سے منع کیا؟ اگر انہیں معلوم ہوتا کہ اس کی حقیقی علت اور اصلی سبب تو یہ ہے کہ اس شخص کا وقت آپہنچا تھا، اسے اس کی قتل تک جانا تھا، تقدیر اسے بلا رہی تھی، موت و حیات کے بارے میں سنت الہیہ نے اپنا کام شروع کر دیا تھا، تو وہ اس طرح حسرت و اندوہ میں نہ ڈوبتے۔ وہ اس ابتلا میں صبر و سکون سے رہتے، وہ اس میں راضی برضا اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتے اور کہتے وَاللّٰهُ يُحْيِي وَيُمِيتُ..... ”اور تمہاری تمام حرکات پر وہ نگرہاں ہے۔“

اب ایک دوسری حقیقت پر غور ہوتا ہے۔ موت اور قتل سے کیا زندگی ختم ہو جاتی ہے، کیا زندگی اس انعام سے بہتر ہے جو اللہ دے گا؟ نہیں۔ کچھ اور اقدار حیات بھی تو ہیں۔ کچھ پہلو بھی ہیں جو اللہ کے ترازو میں قابل غور ہیں:

وَلَيْسَ فُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (۱) وَلَيْسَ مُتُّمْ اَوْ فُتِلْتُمْ لِّاِلٰى اللّٰهِ تُخْشَرُونَ

”اگر تم اللہ کی راہ میں مارے جاؤ یا مر جاؤ تو اللہ کی رحمت اور بخشش جو تمہارے حصے میں آئے گی وہ ان ساری چیزوں سے زیادہ بہتر ہے جنہیں یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور خواہ تم مرو یا مارے جاؤ۔ بہر حال تم سب کو سمٹ کر جانا اللہ ہی کی طرف ہے۔“

غرض اللہ کی راہ میں موت اور قتل ہونا، ان شرائط و قیود کے ساتھ زندگی سے بدرجہا بہتر ہے۔ ان تمام دنیوی مفادات اور مال و منال سے بہتر ہے جسے رات دن لوگ جمع کر رہے ہیں۔ اس عزت و احترام سے بہتر ہے جس کے لئے لوگ کوشاں ہیں۔ یہ موت اس لئے بہتر ہے کہ اس کے نتیجے میں اللہ کی رحمت اور مغفرت نصیب ہوتی ہے۔ اللہ کے میزان حقیقت نما میں یہ بہتر ہے، ان تمام چیزوں سے جو وہ جمع کرتے ہیں۔ یہ مغفرت اور یہ رحمت ہی مطلوب مومن ہوتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ موت و حیات کے اس مقام میں لوگوں کو شخصی برتری اور انسانی مقاصد اور سر بلندیوں کے حوالے نہیں کرتے، بلکہ

انہیں وہ کچھ دکھایا جاتا ہے جو اللہ کے ہاں ہے، ان کے دلوں کو رحمت خداوندی سے جوڑا جاتا ہے، اور رحمت خداوندی کو یونہی دنیا مال و منال سے زیادہ خیر اور قیمتی قرار دیا جاتا ہے۔ دنیا کے تمام ممکنہ مقاصد سے، اسے برتر اور قیمتی قرار دیا جاتا ہے۔

سب لوگ لوٹ کر اللہ کی طرف جائیں گے، سب لوگ حشر کے دن اٹھا کر اس کے سامنے حاضر کئے جائیں گے۔ چاہے وہ اپنے بستر پر مریں، چاہے وہ کرۂ ارض پر کسی تجارتی سفر میں مریں اور چاہے وہ جہاد فی سبیل اللہ کے دوران شہید ہوں۔ جانا انہوں نے بہر حال اللہ کی طرف ہے۔ انجام کار انہوں نے وہاں حاضر ہونا ہے۔ فرق اگر کوئی ہے تو وہ صرف لوگوں کے نقطہ نظر، ان کے مطمح نظر اور طرز عمل میں ہے۔ رہا واقعی عملی انجام تو اس میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ایک مقررہ وقت میں، ایک مقررہ مقام پر، تحریر شدہ تقدیر کے مطابق جو اٹل ہے، ہر شخص کی موت واقع ہوگی۔ یوں وہ اللہ کی طرف لوٹ جائے گا، اور پھر ایک مقررہ وقت قیامت میں وہ حشر کے میدان میں اٹھے گا۔ وہاں یا وہ اللہ کی رحمت اور مغفرت پانے والوں میں ہو گا یا وہ غضب الہی اور عذاب الہی کے چنگل میں جائے گا۔ اس لئے وہ شخص احمق الحقاء ہے، جو اپنے لئے برا انجام پسند کرتا ہے، جبکہ اسے ہر حال میں مرنا تو ہے۔

یوں دلوں میں حقیقت موت و حیات بیٹھ جاتی ہے۔ اللہ کی تقدیر کا درس دیا جاتا ہے اور یوں قلوب مومنہ تقدیر کے رواں دواں واقعات کو دیکھتے ہوئے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ تقدیر کے پردے کے پیچھے جو حکمت کار فرما ہوتی ہے اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ابتلا میں جو ثواب آخرت ہے اسے پسند کرتے ہیں۔ اس پر غزوۂ احد کے اہم واقعات یہاں ختم ہو جاتے ہیں اور ان کی جو متعلقہ باتیں تھیں ان پر کلام ختم ہو جاتا ہے۔



اب سیاق کلام ایک نئے مضمون کو جنم لیتا ہے۔ اس مضمون کا موضوع قائد انقلاب کی شخصیت ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ذاتی صفات کے بارے میں، حقیقت نبوت کے بارے میں اور امت مسلمہ کی

زندگی ذات نبوی اور حقیقت نبوت کے اہم کردار کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ذات باری تعالیٰ اس امت کے ساتھ کس قدر رحیم و کریم ہیں۔ اس موضوع کے ساتھ کچھ اور تاریخیں بھی ملی ہوئی ہیں کہ جماعت مسلمہ کی تنظیم کے سلسلے میں ربانی طریق کار کیا ہے۔ اور یہ کہ اس تنظیم کی اساس کیا ہے۔ یعنی کن نظریات پر اسے قائم کیا گیا ہے اور کن حقائق پر وہ استوار ہے۔ نیز اس تصور حیات کی اہمیت کیا ہے اور تنظیم کے لئے اس ربانی منہاج کی اہمیت کیا ہے اور پھر اس منہاج کا اثر پوری انسانیت پر کیا ہوگا؟

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ (۱۵۹) إِنَّ يَنْصُرُكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِنَّ يَجْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۱۶۰) وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُلَّ وَمَنْ يَكُلَّ يَأْتِ بِمَا عَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۱۶۱) أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانِ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطِ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبُئْسَ الْمَصِيرُ (۱۶۲) هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ وَاللَّهُ بِصِيرٍ بِمَا يَعْمَلُونَ (۱۶۳) لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ (۱۶۴)

”(اے پیغمبر) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بڑے نرم مزاج واقعہ ہوئے ہو۔ ورنہ اگر تم کہیں تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، اور دین کے کام میں ان کو بھی شریک مشورہ رکھو، پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔ اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں، اور وہ تمہیں چھوڑ دے، تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔

کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے..... اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا، پھر ہر تنفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر کچھ ظلم نہ ہو گا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو وہ اس شخص کے سے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانہ جہنم ہو اور جو بدترین ٹھکانہ ہے؟ اللہ کے نزدیک دونوں قسم کے آدمیوں میں بدرجہا فرق ہے اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔ درحقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے یہ بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔“

اس پیرا گراف کا موضوع اور محور حقیقت نبوت اور ذات نبوی ہے۔ اور اس محور کے متعلقہ حقائق کو اس میں لیا گیا ہے۔ اس میں نظر آتا ہے کہ بڑے بڑے اصول چھوٹی چھوٹی عبارتوں میں بیان کئے گئے ہیں۔ اللہ کی رحمت کو مجسم کر کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق اور طرز عمل کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ آپ کی ذات کریمہ نہایت ہی مہربان نہایت ہی رحم دل نہایت ہی نرم اور نہایت ہی سہل شکل میں پیش کی گئی ہے۔ نظر آتا ہے کہ لوگ پروانوں کی طرح ان کے ارد گرد جمع ہوتے ہیں

۔ آپ کے ارد گرد ہر وقت ایک بڑی تعداد جمع رہتی ہے۔ پھر اس محفل میں صاف صاف نظر آتا ہے کہ اس جماعت کا قیام جس کے نظام کے تحت ہے وہ اصول شوریٰ پر قائم ہے۔

حکم دیا جاتا ہے کہ یہ جماعت باہم مشورہ کر کے فیصلے کرے، اگرچہ اس مشورے کے تحت ہونے والے فیصلوں کے نتائج تلخ ہوں۔ پھر شوریٰ کے اصول کے ساتھ ساتھ یہ بھی نظر آتا ہے کہ دانشمندی اور شوریٰ کے ذریعے فیصلے کئے جائیں اور پھر ان پر عمل کیا جائے۔ اور یہ عمل فیصلہ کن ہو۔ اور شوریٰ اور عزم کے بعد پھر توکل کر کے کام کیا جائے۔ جب منصوبہ تیار ہو جائے، اس پر شوریٰ ہو جائے اور پھر اس فیصلہ کن عمل اور اس کا اجراء (Execution) شروع ہو جائے اور اس کے لئے ہر قسم کا انتظام ہو جائے، تو پھر توکل علی اللہ کا مرحلہ آتا ہے اور پھر قدرت الہیہ اپنا کام شروع کر دیتی ہے۔ پھر مسلمان اپنا کام اللہ کے سپرد کر دیتے ہیں۔ اس لئے کہ تمام امور میں حقیقی فاعل اور حقیقی متصرف تو صرف اللہ کی ذات ہے۔ حقیقی تصرف اس کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا۔ تمام نتائج اس کے ہاتھ میں ہیں۔ ان امور کے ساتھ ساتھ پھر یہ حکم بھی دیا جاتا ہے کہ مال غنیمت میں خیانت بہت ہی بڑا جرم ہے۔ اس سے طمع اور لالچ کا اظہار ہوتا ہے۔ جماعت کے اندر افراتفری پیدا ہوتی ہے۔ اس پیرا گراف میں بتایا جاتا ہے جو شخص اللہ کی رضامندی کے لئے کام کرتا ہے اور جو اللہ کی نافرمانی اور غضب کی راہ پر ہے ان دونوں میں بڑا فرق امتیاز ہے۔ دونوں کی اقدار اور ترجیحات میں فرق ہوتا ہے۔ دونوں کے پیمانہ نفع و نقصان میں فرق ہوتا ہے۔ آخر میں اہل اسلام اور اہل دنیا کو یہ بتایا جاتا ہے کہ نبی ﷺ کی رسالت تمہارے لئے بڑی نعمت ہے اور تم پر ایک عظیم احسان ہے اور معمولی اموال غنیمت جس کے لئے تم دوڑتے ہو اس قیمتی اثاثہ کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔ نیز اس عظیم خزانے کے حصول کے لئے وہ مصائب کچھ نہیں جو تم پر آئے ہیں۔ یہ عظیم دولت تو عظیم قربانی کا تقاضا کرتی ہے۔

ہدایات و معانی کی یہ فوج ہے جو چند فقروں اور آیات میں دریا کو کوزے میں بند کر کے پیش کر دی گئی ہے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ

”اے پیغمبر یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بڑے نرم مزاج واقعہ ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے تصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو۔ اور اہم امور میں ان سے مشورہ کیا کرو۔ پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔“

یہاں روئے سخن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے۔ لیکن یہ بات رسول کی قوم کی کچھ کمزوریوں کو سامنے رکھ کر کی جا رہی ہے کہ پہلے وہ مدینہ سے باہر نکلنے میں بڑے پر جوش تھے۔ اس کے بعد ان کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ پورے لشکر کا ایک تہائی حصہ تو جنگ سے پہلے ہی واپس ہو گیا۔ اس کے بعد تیر اندازوں نے رسول ﷺ کے حکم کی مخالفت کی۔ انہوں نے مال غنیمت دیکھ کر کمزوری کا مظاہرہ کیا۔ پھر جب رسول ﷺ کے قتل کی جھوٹی خبر عام ہو گئی تو یہ لوگ کمزور پڑ گئے اور اٹے پاؤں پھر گئے۔ اور ہزیمت قبول کر لی۔ رسول ﷺ ایک قلیل تعداد کے ساتھ جم گئے، زخم پر زخم آتے رہے اور ساتھی چھوڑ گئے۔ پھر آپ نیچے سے پکارتے ہیں لیکن وہ بھاگے چلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف ان کی توجہ ہی نہ ہو رہی تھی۔ اس صورت حال میں روئے سخن آپ ﷺ کی طرف ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو تسلی دیتا ہے اور مسلمانوں کو یہ شعور و احساس دیا جاتا ہے کہ ان پر اللہ کا کس قدر عظیم انعام ہے۔ رسول ﷺ اور مسلمانوں دونوں کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔ یہ مجسم خلق کریم اللہ کی ایک عظیم نعمت ہے کہ وہ اس کے محور کے ارد گرد جمع ہو رہے ہیں۔ اس طرح رسول ﷺ کے دل میں پوشیدہ جذبات رحمت کو جوش میں لایا جاتا ہے اور آپ صبر کر کے ان کی وہ تمام لغزشیں معاف فرماتے ہیں اور دوسری طرف ان کو یہ احساس ہو جاتا ہے کہ اس رؤف رحیم نبی کی

صورت میں ان پر کس قدر انعام ہوا ہے۔ اور رسول ﷺ کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ بھی ان کے لئے عفو و درگزر کا سوال کریں۔ اور یہ کہ حسب سابق ان کے ساتھ مشورہ کرتے رہیں اور یہ نہ ہو کہ احد میں مشورے کے نتیجے میں جو معرکہ ہوا اور اس میں جو نامطلوب نتائج نکلے، اس کی وجہ سے باہم شوریٰ جیسے اہم کام کو بند کر دیں۔

فَمِمَّا رَحِمَهُ مِنَ اللَّهِ لَئِنَّ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتُمْ فَطَّا غَلِيظَ الْقُلُوبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكُمْ..... ”اے پیغمبر یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لئے بہت نرم مزاج واقعہ ہوئے ہو۔ ورنہ اگر تم تنگ خوار و سنگدل ہوتے تو یہ سب تمہارے گرد و پیش سے چھٹ جاتے۔“

یہ اللہ کی رحمت تھی جو رسول ﷺ کے بھی شامل حال تھی اور آپ کو ان کے لئے رحیم و شفیق اور نرم و خونا دیا اور خود ان کے لئے بھی رحمت تھی کہ آپ نے بوجہ نرمی مزاج ان سے باز پرس نہ کی۔ اگر آپ سنگ دل ہوتے، تنگ مزاج ہوتے تو یہ جمعیت منتشر ہو جاتی، لوگوں کے خیالات آپ کے ساتھ ہم آہنگ نہ ہوتے۔ عوام الناس کو تو ایک پر شفقت بارگاہ درکار ہوتی ہے، جہاں ان کے ساتھ نہایت رعایتی برتاؤ کیا جاتا ہو، جہاں خندہ پیشانی سے ان کا استقبال کیا جاتا ہو، جہاں سے انہیں محبت ملتی ہو، جہاں ان کی غلطیوں، کمزوریوں اور نقائص سے درگزر کیا جاتا ہو۔ جہاں قائد اتنے بڑے دل کا مالک ہو کہ وہ انہیں سب کچھ دے رہا ہو، لیکن ان سے کچھ نہ لے رہا ہو، جہاں قائد اپنے پیروکاروں کی مشکلات اپنے سر لیتا ہو لیکن ان پر زیادہ بوجھ نہ ڈالتا ہو، اور جہاں پیروکاروں کو ہمیشہ رعایت، اہمیت، خندہ پیشانی، نرمی اور محبت اور رضامندی ملتی ہو اور رسول اکرم کا دل ایسا ہی دل تھا اور آپ کا برتاؤ لوگوں کے ساتھ بعینہ ایسا تھا۔ کبھی وہ اپنی ذات کے حوالے سے کسی پہ غصہ نہیں ہوئے، کبھی بھی انسانی کمزوری کی وجہ سے آپ نے تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ کبھی آپ نے اس دنیا کے مفادات میں سے کسی مفاد کو اپنی ذات کے لئے مخصوص نہیں کیا۔ بلکہ آپ کو جو کچھ بھی ملا آپ نے کھلے ہاتھوں سب کچھ ان پر تقسیم کر دیا۔ غرض آپ کے صبر، حلم، ہمدردی، محبت اور شرافت نے ہمیشہ انہیں ڈھانپنے رکھا۔ اور ان میں

سے جس نے بھی رسول ﷺ کے ساتھ یکجا زندگی کے کچھ ایام بسر کئے یا آپ کو محض ایک نظر ہی دیکھ لیا وہ آپ ﷺ کا گرویدہ ہو گیا۔ اس لئے ذات باری نے آپ کو ایک عظیم اور رحیم و کریم شخصیت عطا فرمائی تھی۔ اور یہ سب کچھ آپ ﷺ پر بھی اللہ کی رحمت تھی اور دوسرے پہلو سے آپ کی امت پر بھی کرم تھا۔

اس کرم کو یاد دلا کر اللہ تعالیٰ آپ ﷺ کو وہ اصولی بات بتاتے ہیں جس پر آئندہ جماعت مسلمہ کی تنظیم ہونا مطلوب تھی وہ یہ کہ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ..... ”اور ان کے ساتھ الامر میں مشورہ کرو۔“ یہ ایک قطعی نص ہے اور تاکید ہے۔ ”ان کے ساتھ الامر میں مشورہ کرو۔“ اسلام یہ اصول نظام حکومت میں لازم قرار دیتا ہے۔ اگرچہ اس نظام حکومت میں ہیڈ آف اسٹیٹ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں۔ یہ قطعی نص اس بارے میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتی کہ اسلامی نظام مملکت میں شوریٰ ایک اساسی اصول (Principle) ہے۔ اس کے سوا اسلام کا نظام مملکت قائم ہی نہیں ہو سکتا۔ رہی یہ کہ شوریٰ کی شکل و صورت کیا ہو، شوریٰ کا مقصد کس طرح حاصل کیا جائے، تو یہ ایسے امور ہیں جن کی صورت اور شکل مختلف ہو سکتی ہے۔ ہر علاقے کے حالات کے مطابق مختلف شکل و صورت میں شوریٰ قائم کی جاسکتی ہے۔ ہر وہ شکل و صورت جس کے ذریعہ شوریٰ کے مقاصد پورے ہو سکیں۔ یہ نہ ہو کہ محض ایک دکھاوا ہو۔ جس صورت اور جس شکل میں صحیح اغراض پورے ہوں وہی اسلامی ہوگی۔

یہ بات نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ جب یہ آیت اتری تھی تو اس سے پہلے مجلس شوریٰ کا انعقاد ہو گیا تھا اور شوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کو تسلیم کرتے ہوئے احد کی جنگ لڑی گئی اور جس کے تلخ نتائج برآمد ہوئے۔ اس شوریٰ کے انعقاد کی وجہ سے پہلا نقصان تو یہ ہوا کہ اسلامی صفوں میں اختلاف پیدا ہو گیا، آراء مختلف ہوئیں۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ مسلمان مدینہ میں پناہ لیتے ہوئے لڑیں۔ جب دشمن حملہ کرے تو تنگ گلیوں کے اندر اسے آلیا جائے لیکن اس کے مقابلے میں ایک پر جوش گروہ کی رائے یہ تھی کہ مدینہ سے باہر نکل کر میدان میں معرکہ آرائی کی جائے۔ ان اختلافی آراء ہی کی وجہ سے لشکر

اسلام میں تفرقہ ہو گیا اور عبد اللہ بن ابی بن السلول کو موقع مل گیا کہ وہ ایک تہائی لشکر کو لے کر واپس ہو جائے۔ یہ اس وقت ہوا جب دشمن دروازے پر کھڑا تھا۔ یہ ایک بڑا حادثہ تھا اور اسلامی صفوں میں بظاہر بڑی دراڑ تھی۔ پھر اس شوریٰ کے نتیجے میں جو فوجی منصوبہ تیار ہوا وہ عملاً ظاہر ہو گیا کہ وہ کوئی محفوظ جنگی اسکیم نہ تھی۔ خود جنگی نقطہ نظر سے۔ اس لئے کہ مدینہ کی دفاعی تاریخ سے یہ منصوبہ مختلف تھا جیسا کہ عبد اللہ ابن ابی ابن السلول نے اس مجلس میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یہ تاریخی حقیقت بتائی تھی کہ وہ جب بھی مدینہ کے اندر لڑے ہیں کامیاب رہے ہیں اور غزوہٴ احزاب میں خود مسلمانوں نے بھی جنگ احد کی اسکیم کی تصحیح کرتے ہوئے مدینہ کے اندر لڑنے کا فیصلہ کیا اور وہ کامیاب بھی رہے۔ انہوں نے خندق کھودی۔ دشمن کے مقابلے میں باہر نہ نکلے۔ اس لئے کہ جنگ احد میں انہوں نے جو تجربہ حاصل کیا تھا اس کا یہی تقاضا تھا۔

خود رسول اللہ ﷺ کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کے نتائج خطرناک ہوں گے۔ آپ کے پاس روئے صادقہ کے ذریعے بھی کچھ اشارات آچکے تھے۔ آپ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آپ کے خواب بالکل سچے ہوتے ہیں۔ آپ نے اس کی یہ تاویل پہلے سے کر دی تھی کہ آپ کے خاندان میں سے کوئی شہید ہونے والا ہے اور آپ کے ساتھی بھی شہادت پانے والے ہیں۔ نیز آپ کے خوابوں کی تعبیر کرتے ہوئے مدینہ کو محفوظ ڈھال قرار دیا تھا۔ ان حالات میں آپ کو یہ حق حاصل تھا کہ آپ مجلس شوریٰ کے فیصلے کو ویٹو کر دیتے لیکن آپ نے بادل ناخواستہ اس فیصلے کو نافذ (Execute) کیا۔ حالانکہ اس کے پیچھے جو مشکلات جو قربانیاں اور جو نقصانات پوشیدہ تھے انہیں آپ کی پیغمبرانہ بصیرت دیکھ رہی تھی۔ اس لئے کہ اصول شوریٰ کی بنیاد رکھی جا رہی تھی، جماعت کو تعلیم دی جا رہی تھی، اور یہ امور ان وقتی خساروں سے زیادہ اہم تھے۔

حق تو یہ تھا کہ کم از کم معرکہ احد کے بعد اصول شوریٰ کو ترک کر دیا جاتا۔ کیونکہ اس شوریٰ کی وجہ سے اختلاف ہوئے، اسلامی صفوں میں انتشار پیدا ہوا۔ اور یہ انتشار مشکل حالات میں ہوا۔ اور معرکے کے بعد خوفناک نتائج سامنے آ گئے۔ لیکن اسلام نے ایک امت کو برپا کرنا تھا، اس کی تربیت کرنی تھی

’اسے پوری انسانیت کی قیادت کے لئے تیار کرنا تھا‘ اور اللہ تعالیٰ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی قوم کی بہترین تربیت اور اس کو ایک ہدایت یافتہ بنانے کے لئے صرف اصول شوریٰ پر تیار کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ کہ اسے شوریٰ کے نتائج برداشت کرنے کے لئے بھی تیار کرنا تھا۔ اس سے غلطیاں سرزد کرانی تھیں، چاہے وہ جس قدر عظیم ہوں تاکہ آئندہ وہ اپنے تجربات کی روشنی میں آگے بڑھے، چاہے یہ نتائج کتنے ہی تلخ ہوں، وہ اپنی تصحیح کر سکے۔ اور اپنی آراء کے نتائج، اچھے یا برے بھگت سکے۔ اس لئے کہ جب تک اس سے غلطی سرزد نہ ہوگی، وہ درست کر ہی نہیں سکتی۔ اگر کسی نقصان کے نتیجے میں ایک ایسی امت وجود میں آتی ہے، جو تجربہ کار، فہیم اور نتائج کو برداشت کرنے والی ہو تو ان نقصانات کی کوئی اہمیت نہیں رہتی۔ اور اگر کسی قوم کے نقصانات غلطیوں اور لغزشوں کو محدود کر دیا جائے لیکن اسے تجربات سے بھی محروم کر دیا جائے تو یہ امت اسی طرح نا تجربہ کار رہے گی جس طرح بچہ نا تجربہ کار رہتا ہے۔ وہ ایک ایک قدم پر نگران کے تحت ہوتا ہے۔ اس حالت میں بچے کی طرح اس قوم کو مادی نقصانات سے بچایا جاسکتا ہے لیکن اور مادی مفادات بھی اسے دستیاب نہیں ہو سکتے، نفسیاتی لحاظ سے اس قوم کو خسارہ ہوتا ہے، اس کے باوجود کی تکمیل نہیں ہوتی۔ اس کی تربیت ناقص ہوتی ہے اور عملی زندگی کا اسے کوئی تجربہ نہیں ہوتا۔ اور اس کی مثال اس بچے کی سی ہوتی ہے جسے کوئی چیز ہاتھ میں نہیں دی جاتی۔

اسلام کی پالیسی یہ تھی کہ وہ ایک ایسی قوم تیار کرے جو ایک تجربہ کار قوم ہو۔ اور اس کا منصوبہ یہ تھا کہ اسے بشریت کی ہدایت یافتہ قیادت کے لئے تیار کیا جائے۔ اس لئے یہ ضروری تھا کہ یہ امت ایک بالغ امت ہو اور اس کی عملی زندگی میں اسے گرنے پڑنے سے بچانے کے لئے کوئی مددگار نہ دیا جائے تاکہ وہ تجربہ کار ہو۔ اور یہ تجربہ اسے رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں حاصل ہو۔ اور آپ کی نگرانی میں ہو۔ اگر ایک بالغ النظر قیادت کی وجہ سے یہ مناسب ہو تا تو کہ اب شوریٰ کی ضرورت نہیں ہے، اور امت کی تربیت ضروری نہ ہوتی اور خطرناک واقعات میں اس کے ساتھ مشورے اور اس کی آراء پر چلنے کی ضرورت نہ ہوتی مثلاً معرکہ احد جیسے مراحل میں، کیونکہ یہ ایک فیصلہ کن مرحلہ تھا، اس وقت امت مسلمہ ایک نوخیز امت تھی، ہر طرف سے خطرات میں گھری ہوئی تھی، دشمن چار سو گھات میں تھے۔ اس لئے ایسے حالات میں اگر مناسب ہو تا کہ بالغ نظر قیادت سب فیصلے خود کرتی اور اسے

حق بھی تھا اور ایسے حالات میں شوریٰ کی ضرورت نہ ہوتی کیونکہ حالات خطرناک تھے، اور پھر اس وقت حضرت محمد ﷺ بھی موجود تھے اور وحی بھی آرہی تھی تو ایسے حالات میں امت کو حق شوریٰ سے محروم کیا جاسکتا تھا۔ اور خصوصاً ان حالات میں جبکہ احد میں تمام تر تلخ واقعات شوریٰ ہی کی وجہ سے ظاہر ہوئے، حالانکہ اس وقت یہ امت نہایت ہی خطرناک اور ہنگامی حالات سے گزر رہی تھی لیکن رسول ﷺ کے وجود مبارک کے باوجود، وحی الہی کے آنے اور آتے رہنے کے باوجود، اور اس قسم کے تلخ نتائج شوریٰ ظہور پذیر ہونے کے باوجود اور خطرناک اور ہنگامی حالات موجود ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے حق شوریٰ کو ختم نہ فرمایا۔ چاہے جس قدر نقصان ہو جائے، چاہے اسلامی افواج میں جس قدر اختلاف وافتراق پیدا ہو جائے، چاہے اس کے جس قدر تلخ نتائج ظہور پذیر کیوں نہ ہوں، چاہے مدینہ کے ارد گرد کے حالات اس نوخیز امت کے لئے بہت خطرناک اور ہنگامی کیوں نہ ہوں۔ اس لئے کہ یہ تمام امور ایک بالغ اور تجربہ کار امت کے بروئے کار لانے کے مقصد عظیم کے مقابلے میں ضروری واقعات ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ عملاً امت تجربہ کار ہو، اچھی یا غلط رائے کے نتائج ہضم کرنے کے اہل ہو۔ کسی رائے اور عمل کے نتائج کا ادراک کر سکتی ہو۔ یہی وجہ ہے اور یہی وجوہات ہیں کہ ایسے حالات میں یہ آیت نازل ہوئی: فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ..... ”ان کے قصور معاف کر دو، ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو، ان کو شریک مشورہ رکھو۔“

فیصلہ یہ کیا گیا کہ خطرناک ترین حالات میں بھی اس اصول، اصول مشورہ کا بحال رکھنا ضروری ہے۔ اور احد جیسے حالات میں اور ان کے بعد جیسے حالات میں بھی اس پر عمل ضروری ہو گا۔ اور مقصود یہ تھا کہ آئندہ کے لئے کوئی بہانہ نہ بنائے کہ چونکہ مشورہ کے بعد بعض برے نتائج ظاہر ہو سکتے ہیں اس لئے ہم اس اصول کو ساقط کرتے ہیں۔ مثلاً احد کے حالات اس کی بہترین مثال ہیں۔ کہ دشمن دروازے پر دستک دے رہا تھا لیکن مشورہ بھی جاری تھا۔ اس لئے ایک بالغ النظر امت تب ہی پیدا ہو سکتی ہے جب اصول مشورہ لازمی ہو، اور پوری قوم کی بالغ النظری وہ قیمتی مقصد ہے جس کے لئے چھوٹے بڑے خسارے برداشت کئے جاسکتے ہیں۔

لیکن اسلامی نظام کی سیاسی تصویر اور تشکیل اس وقت تک پوری نہیں ہو سکتی جب تک ہم اس آیت کے اگلے حصے پر غور نہ کریں۔ یہ بات عیاں ہے کہ یہ ضروری نہیں کہ مجلس شوریٰ کے نتیجے ہمیشہ قابل ترجیح اور دانشمندانہ فیصلہ ہو جائے۔ آخر کار فیصلہ یہی ہو گا کہ کسی ایک بات پر توکل علی اللہ کر کے عمل شروع کر دیا جائے۔ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ..... ”اور جب کوئی آخری فیصلہ ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو، اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اس کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔“

شوریٰ کا خلاصہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف آراء سامنے آجائیں اور مجلس میں جو آراء پیش ہوں ان سے ایک کو قبول کر لیا جائے۔ جب کوئی فیصلہ ہو جائے تو اس وقت شوریٰ کا کام ختم ہو جاتا ہے اور اب فیصلے کے نفاذ (Execution) کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ اور اس تنقیدی مرحلے کے لئے بڑے پختہ عزم اور فیصلہ کن اقدام کی ضرورت ہے۔ اس مرحلے پر اللہ پر بھروسے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور معاملہ اب اللہ کے ہاں چلا جاتا ہے۔ اللہ کی تقدیر کے سپرد ہو جاتا ہے۔ اب یہ اللہ کی مشیت کا کام ہوتا ہے کہ وہ کیا فیصلہ اور نتائج ظاہر کرتی ہے۔ جس طرح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ربانی انداز میں شوریٰ کا سبق پڑھایا۔ امت کو دکھایا کہ اظہار رائے کا انداز کیا ہوتا ہے اور فیصلے کے بعد اس کے نتائج کو کس طرح برداشت کیا جاتا ہے خصوصاً خطرناک حالات میں۔ اسی طرح رسول ﷺ نے امت کے فیصلے، کسی شورائی فیصلے کی تنفیذ کے سلسلے میں بھی سبق دیا۔ اور توکل علی اللہ کا انداز بھی سکھایا۔ اور اپنے آپ کو تن بتقدیر اللہ کے حوالے کرنے کا طریقہ بھی سکھایا۔ حالانکہ واقعات کے رونما ہونے کا آپ کو اچھی طرح اندازہ تھا۔ واقعات کا رخ آپ کے علم میں تھا لیکن آپ نے مدینہ سے باہر نکل کر لڑنے کے فیصلے کی تنفیذ فرمادی۔ آپ گھر میں داخل ہوئے اور زرہ اور خود زیب تن فرمائی۔ اور آپ کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں؟ آپ اور آپ کے صحابہ کو کن مصائب اور مشکلات سے دوچار ہونا ہے۔ یہاں تک کہ جب باہر لڑنے والے پر جوش لوگوں نے دوبارہ مشورہ دیا اور موقع فراہم کر دیا کہ فیصلے کو بدل دیا جائے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرہ مبارک کو پڑھ کر انہوں نے محسوس کر لیا کہ ان کے جوش و خروش نے رسول ﷺ کو باہر لڑنے پر مجبور کر دیا ہے۔ حالانکہ آپ ایسا نہ چاہتے تھے اور انہوں نے دوبارہ اختیار آپ کو دے دیا کہ آپ مدینہ کے اندر لڑیں یا باہر لڑیں تو آپ نے اس پر دوبارہ غور کرنے

کے موقع سے فائدہ نہ اٹھایا۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ آپ انہیں ایک سبق دینا چاہتے تھے۔ آپ شوریٰ (Parliament) کے فیصلوں کی مثال قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہ چاہتے تھے کہ جب فیصلہ پختہ اور آخری ہو جائے تو پھر دوبارہ غور کے بجائے اس کا نفاذ چاہئے۔ اللہ پر توکل کرنا چاہئے جو ہو، سو ہو۔ آپ یہ بھی دکھانا چاہتے تھے کہ شوریٰ کا ایک ہی وقت ہوتا ہے۔ فیصلے کے بعد تردد اور ڈانواں ڈول نہیں ہونا چاہئے۔ دوبارہ غور کر کے از سر نو فیصلہ نہیں ہونا چاہئے۔ اس لئے کہ اس طرح کوئی بات آخری نہ رہے گی، فیصلے بار بار بدلیں گے اور دوبارہ غور کی اگر مثال قائم ہو جائے تو یہ سلسلہ ختم ہی نہ ہوگا۔ بس شوریٰ (Parliament) کا فیصلہ ہو اور پھر نفاذ ہو اور توکل علی اللہ ہو اس لئے کہ اسے اللہ پسند کرتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ..... ”بے شک اللہ تعالیٰ اس پر بھروسہ کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔“

اور وہ صفت جسے اللہ پسند کرتے ہیں اور اس صفت سے متصف لوگوں کو محبوب رکھتے ہیں تو اہل ایمان کا فرض ہے کہ وہ صفت ان کے اندر بدرجہ کمال پائی جائے اور وہ اس کے لئے بے حد حریص ہوں بلکہ وہ مومنین کی صفت ممتاز ہونی چاہئے۔ توکل علی اللہ اور سپردم بتو مایہ خویش را، اسلامی تصور حیات اور اسلامی زندگی کا خط توازن ہے۔ اب معاملہ اس کائنات کی عظیم حقیقت کے سپرد ہو جاتا ہے۔ یہ حقیقت کہ آخری فیصلہ اللہ کے ہاں ہوگا، اب وہ ہوگا جو وہ چاہے۔

احد کے عظیم تجربات میں سے ایک عظیم تجربہ اور یہ ایک عظیم سبق تھا۔ یہ سبق امت مسلمہ کے لئے ہر اس دور اور ہر زمانے میں ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ یہ صرف ایک دور ہی کی بات نہیں ہے بلکہ ہر دور کے لئے ہے۔

حقیقت توکل کو مزید ذہن نشین کرانے کے لئے اور اس کے اصول کو ثابت اور مستحکم کرنے کے لئے اگلی آیت میں ذرا تفصیل سے واضح کر کے اس حقیقت کو ظاہر کیا جاتا ہے کہ حقیقی قوت فاعلہ ذات باری ہے۔ فتح و کامرانی اور شکست اور ذلت اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے اگر نصرت چاہتے ہو تو اسی

سے چاہو اور اگر شکست سے بچنا چاہتے ہو تو اسی کے آگے گڑ گڑاؤ۔ اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ، اسی پر بھروسہ کرو، لیکن پوری تیاری کے بعد، نتائج سے بے فکر ہو جاؤ اور نتائج و عواقب اللہ پر چھوڑ دو۔

إِن يَنْصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَإِن يَخْذَلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُم مِّنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللَّهِ قَلِيلَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ

”اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں، اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہو؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ پر بھروسہ رکھنا چاہئے۔“

اس کی وجہ سے ایک مومن کا تصور اس بات سے پاک ہو جاتا ہے کہ کوئی چیز اللہ کے سوا کسی اور سے بھی طلب ہو سکتی ہے۔ ایک مومن کی سوچ براہ راست اس ذات کے ساتھ پیوست ہو جاتی ہے جو اس کائنات میں حقیقتاً متصرف ہے۔ اس لئے وہ ان تمام کھوٹے خداؤں اور باطل اسباب سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور ان کی حمایت اور نصرت طلب نہیں کرتا۔ اور وہ اچھے نتائج کے لئے صرف اللہ وحدہ پر توکل کرتا ہے۔ اسی سے توقع کرتا ہے کہ وہ معاملات کو اچھے رخ پر ڈالے گا، اور اپنی حکمت سے درست کرے گا۔ اس عقیدے کے بعد پھر تقدیر الہی کے نتیجے میں جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا ہے وہ اسے بڑی فراخ دلی سے قبول کرتا ہے۔ فکر و نظر کا یہ، وہ توازن ہے جسے انسانی فکر نے، صرف اسلام کے زیر سایہ پایا۔

اس کے بعد بات نبوت اور خصائص نبوت کی طرف چلی جاتی ہے تاکہ اس موضوع کے بعد امانت و دیانت کے بارے میں کچھ ہدایات دی جائیں، مثلاً یہ کہ مال غنیمت میں کسی قسم کی بددیانتی اور چوری سخت معیوب چیز ہے۔ اور یہ کہ جو شخص بھی اجتماعی امانتوں میں بددیانتی کرے گا وہ اس کا حساب دے گا۔ اور ہر شخص کا حق اسے پورا پورا دیا جائے گا۔

وَمَا كَأَنَّ لِنَبِيِّ أُنْ يَحُلُّ وَمَنْ يَحُلُّ يَأْتِ بِمَا عَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُؤَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا
كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ

”کسی نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ خیانت کر جائے..... اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت
سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا، پھر ہر تنفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر
ظلم نہ ہو گا۔“

احد کی پہاڑی اور گھاٹی سے تیر اندازوں نے حکم عدولی کرتے ہوئے اپنی جگہ اس لئے چھوڑ دی تھی
کہ انہیں یہ خوف دامن گیر ہو گیا تھا کہ شاید بعد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انہیں کوئی حصہ نہ
دیں۔ اس طرح جنگ بدر کے اموال غنیمت میں بعض منافقین نے یہ پروپیگنڈا کیا تھا کہ غنیمت میں
سے کچھ چیزیں غائب ہو گئی ہیں۔ اور اس سلسلے میں انہیں یہ حیا بھی نہ آئی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کا نام لینے سے تواحتراز کریں۔

اس لئے اس آیت میں یہ حکم اور قاطع فیصلہ آگیا کہ حضرت محمد کیا کوئی نبی بھی ہر گز یہ نہیں
کر سکتا کہ وہ اموال غنیمت میں سے کوئی چیز ادھر ادھر کر دے۔ یعنی مال غنیمت میں سے کوئی چیز علیحدہ
رکھ لیں اور یہ کہ وہ بعض فوجیوں کو زیادہ حصہ دیں یا غرض وہ کسی طرح کی کوئی خیانت کریں۔ وَمَا
كَأَنَّ لِنَبِيِّ أُنْ يَحُلُّ..... ”نبی کا یہ کام نہیں کہ وہ مال غنیمت میں کوئی خیانت
کرے۔“

یہ اس کی شان کے خلاف ہے۔ وہ اس کے مزاج اور طبیعت نبوت کے خلاف ہے۔ وہ اس کے
اخلاق کے خلاف ہے کہ ایسا کرے۔ گویا ذات نبوت سے اس فعل کا وقوع ہی ممکن نہیں ہے۔ یہاں یہ
نفی حلت اور حرمت کی نفی نہیں ہے۔ اس لئے کہ نبی کی امانت دار، منصف مزاج اور پاک طبیعت اور
مزاج ہی کے خلاف ہے کہ اس سے اس قسم کی کوئی بات وقوع پذیر ہو۔ بعض قرأتوں لفظ يَحُلُّ
ہے۔ یعنی مجہول کا فیصلہ آیا ہے۔ یعنی یہ بات جائز نہیں کہ نبی کے ساتھ خیانت کا برتاؤ کیا جائے۔ اور اس

کے متبعین اس سے کوئی چیز چھپائیں۔ اس صورت میں یہاں اس بات کی ممانعت ہوگی کہ رسول ﷺ کے ساتھ اس کے پیروکار خیانت نہ کریں اور یہ قرأت آیت کے آخری حصے کے ساتھ زیادہ ہم آہنگ ہے۔ حسن بصری رحمہ اللہ کی تلاوت ایسی ہی تھی۔

اس کے بعد ان لوگوں کو سخت تنبیہ کی جاتی ہے کہ جس نے خیانت کی مال غنیمت میں یا اور حکومتی اموال میں تو ان کا انجام یہ ہوگا۔

مِنْ بَعْدِهِ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ..... ”اور جو خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا، پھر ہر تنفس کو اس کی کمائی کا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر ظلم نہ ہوگا۔“

امام احمد نے سفیان، زہری، عروہ، ابو احمد ساعدی کی روایت نقل کی ہے۔ کہتے ہیں کہ رسول ﷺ نے قبیلہ ازد کے ایک شخص ابن لتبیہ نامی کو زکوٰۃ کا تحصیلدار مقرر فرمایا۔ وہ جب واپس آیا تو کہا یہ مال آپ کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔ اس پر رسول ﷺ ممبر پر کھڑے ہوئے اور یہ تقریر فرمائی: ”ان تحصیلداروں کا کیا حال ہے کہ ہم انہیں کام پر لگاتے ہیں اور واپس آکر وہ کہتا ہے کہ یہ تو تمہارا ہے اور یہ مجھے ہدیہ دیا گیا ہے۔ کیوں نہ وہ اپنے باپ یا ماں کے گھر بیٹھا اور انتظار کرتا کہ اسے ہدیہ دیا جاتا یا نہیں۔ اللہ کی قسم جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے جو شخص بھی اس مال سے کوئی چیز لے گا، قیامت کے دن وہ اس کے کندھے پر ہوگی۔ اونٹ ہوگا اور وہ آواز دے رہا ہوگا“ گائے ہوگی اور وہ آواز دے رہی ہوگی اور بکری ہوگی تو بھی وہ میاں ہی ہوگی۔ (بخاری مسلم)

اور امام احمد نے اپنی سند کے ذریعہ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کی ہے۔ انہوں نے فرمایا رسول اللہ ﷺ ایک دن ہم میں کھڑے ہوئے۔ انہوں نے غلول (غنیمت میں سے چوری) کا ذکر کیا۔ اسے عظیم امر قرار دیا اور اسے بہت ہی بڑا گناہ قرار دیا۔ اور فرمایا کہ قیامت کے دن مجھے کوئی ایسا شخص نہ ملے جو آئے اور اس کے کندھوں پر اونٹ ہو اور وہ کہے کہ اے رسول اللہ میری مدد کرو اور میں اسے یہ

جواب دوں کہ میں تمہارے لئے اللہ کے ہاں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں پوری طرح پیغام پہنچا دیا تھا۔ میں تم میں سے ایسے شخص کو بھی نہ ملوں جس کے کندھوں پر گھوڑا ہو، جو ہنہار ہا ہو اور وہ شخص مجھ سے کہے رسول اللہ ﷺ میری امداد کرو اور میں اسے جواب دوں میں تمہارے لئے اللہ کے ہاں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تمہیں پوری طرح تبلیغ کر دی تھی اور میں تم میں سے ایسے شخص کو بھی نہ ملوں جس کے کندھوں پر کوئی بے زبان جانور ہو اور وہ کہے رسول اللہ میری امداد کرو اور میں اسے بھی یہ جواب دوں کہ میں اللہ کے ہاں تمہاری کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہیں پوری طرح تبلیغ کر دی تھی۔ (بخاری مسلم روایت ابو حیان)

امام احمد نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عدی ابن عمیرہ الکندی سے روایت کی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”اے لوگو! تم میں سے کوئی شخص ہمارے لئے عامل مقرر ہو اور اس نے اس سے ایک سوئی چرائی یا اس سے زیادہ تو وہ چور ہے اور قیامت کے دن وہ اسے لے کر آئے گا۔“ اس پر انصار میں سے کالے رنگ کا ایک شخص اٹھا (مجاہد کہتے ہیں کہ وہ سعد ابن عبادہ تھے گویا میں اسے اب بھی دیکھ رہا ہوں) اور کہا اے اللہ کے رسول ﷺ میں اپنے منصب سے مستعفی ہوتا ہوں آپ اپنا کام سنبھال لے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا ہو گیا ہے؟ تو اس نے رسول ﷺ سے کہا میں نے آپ کو یہ اور یہ کہتے ہوئے سنا ہے اور میں یہ بات اب بھی کہتا ہوں: جسے ہم نے کسی ڈیوٹی پر لگایا تو اس کو چاہئے کہ وہ کم ہو یا زیادہ لے کر آئے۔ اسے جو کچھ دیا جائے وہ لے لے۔ اور جو نہ دیا جائے رک جائے۔ (مسلم ابوداؤد)

قرآن کریم کی اس آیت اور ان احادیث نے جماعت مسلمہ کی تربیت میں ایک عظیم کردار ادا کیا۔ یہاں تک کہ اس کے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے۔ ایک ایسا گروہ تیار ہوا جو نہایت ہی ایماندار، دیانتدار اور اموال حکومت کے بارے میں اس قدر محتاط تھا جس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ اور پوری انسانی تاریخ میں کبھی ایسی جماعت تیار نہیں ہوئی۔ یوں ہوتا کہ ایک عام مسلمان کے ہاتھ میں مال غنیمت میں سے ایک نہایت ہی قیمتی سامان پڑتا اسے کسی نے دیکھا ہی نہ ہوتا اور وہ اسے لاکر امیر کے حوالے کر دیتا۔ اور اس کا نفس اسے اس کے بارے میں کسی طرح بھی بدراہ نہ کر سکتا تھا۔ محض اس

ڈر سے کہ قیامت کے دن اس کی ملاقات نبی ﷺ سے ہو اور اس کی حالت یہ ہو جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اور یہ کہ وہ قیامت کے دن شرمندہ نہ ہو۔ جس سے اسے نبی ﷺ نے واضح طور پر خبردار کر دیا ہے۔ غرض مسلمانوں کی زندگی یوں تھی کہ فکر آخرت اور خوف آخرت ان کی زندگی کا عملی جزو ہوا کرتے تھے۔ اس کے اس احساس کا حصہ ہوا کرتے تھے اور ان کے تقویٰ اللہ خوئی اور غایت درجہ احتیاط کا راز ہی یہی تھا۔ آخرت کا تصور ان کی زندگی میں ایک زندہ تصور تھا، خوابیدہ نہ تھا۔ وہ ایک وعدہ فردانہ تھا۔ وہ ان کے یقین کا حصہ تھا جس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ وہ یہ یقین کرتے تھے کہ ہر کسی کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کوئی ظلم نہ ہو گا۔

ابن جریر طبری نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ جب مسلمان مدائن میں اترے تو انہوں نے مال غنیمت جمع کیا۔ ایک شخص آیا اور اس کے پاس کوئی چیز تھی اور اس نے اسے خزانچی کے حوالے کیا۔ اس کے ساتھیوں نے کہا ہم نے اس قدر قیمتی چیز کبھی نہیں دیکھی۔ ہمارے پاس جو بھی سامان جمع ہوا، وہ اس قدر قیمتی نہیں ہے جس قدر یہ قیمتی چیز ہے۔ تو انہوں نے سوال کیا کہ کیا تم نے اس سے کچھ لیا ہے؟ تو اس نے جواب دیا کہ میں نے کچھ نہیں لیا ہے اور اللہ کی قسم اگر اللہ نہ ہوتا تو میں یہ تمہیں لا کر نہ دیتا۔ تب مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ یہ ایک غیر معمولی شخص ہے۔ خزانچی کے ساتھیوں نے پوچھا تمہارا تعارف کیا ہے؟ تو اس نے کہا میں اپنا تعارف اس لئے نہیں کرتا کہ تم میری تعریف کرتے پھر وگے اور نہ دوسرے لوگوں کو بتاؤں گا کہ وہ میرے اس عمل کی تعریفیں کرتے پھر میں صرف اللہ کی تعریف کروں گا اور اس کے ثواب کا امیدوار رہوں گا۔ ان لوگوں نے اس کا پیچھا کیا اور جب وہ اپنے ساتھیوں میں پہنچا تو انہوں نے دیانت کہا کہ وہ ثابت بن عبد قیس ہے۔ (طبری ج ۳۔ ص ۱۶)

حضرت عمر کے دور میں جب اموال غنیمت لائے گئے، جنگ قادسیہ کے بعد کا واقعہ ہے تو ان میں کسریٰ کا وہ تاج بھی تھا جسے وہ ایوان شاہی میں بیٹھ کر پہنتا تھا۔ یہ بہت ہی قیمتی تھا۔ حضرت عمر نے اسے دیکھا اور کہا کہ قابل قدر ہیں وہ فوجی جنہوں نے اسے خزانہ میں جمع کیا اور کہا: ”جس قوم نے یہ تاج لا کر اپنے امیر کو دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ حد درجہ کے امین ہیں۔“

یہ تھی مسلمانوں کی اسلامی تربیت، یہ اس قدر عجیب و غریب معلوم ہوتی ہے کہ اس کی داستانیں افسانے معلوم ہوتے ہیں۔

اب اموال غنیمت اور اموال غنیمت کے اندر خیانت کی اس بحث کے بعد قرآن کریم اسی مناسبت سے اخلاقی قدروں کا ذکر کرتا ہے۔

”بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو، وہ اس شخص کے سے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانہ جہنم ہو، جو بدترین ٹھکانہ ہے۔ اللہ کے نزدیک دونوں قسم کے آدمیوں میں بدرجہا فرق ہے اور اللہ سب کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔“

یہ وہ دور رس تبدیلی ہے جس کے سائے میں تربیت پانے والوں کی نظروں میں اموال غنیمت کی کوئی حیثیت نہیں، اس دنیا کے بارے میں سوچنا ہی حقیر ہو جاتا ہے اور قرآن منہاج تربیت کے خطوط میں سے ایک خط ہے۔ یہ عجیب نقوش ہیں جن پر یہ منہاج انسانی دلوں کی تربیت کرتا ہے۔ ان کی ترجیحات ہی بدل جاتی ہیں، ان کے افق ہی بدل جاتے ہیں۔ اس لئے وہ دوسرے میدانوں کو چھوڑ کر زندگی کے اصل ہدف کی طرف آگے بڑھتے ہیں۔

أَفَمَنْ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللَّهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطِ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيرُ..... ”بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جو شخص ہمیشہ اللہ کی رضا پر چلنے والا ہو، وہ اس شخص کے سے کام کرے جو اللہ کے غضب میں گھر گیا ہو اور جس کا آخری ٹھکانہ جہنم ہو، جو بدترین ٹھکانہ ہے۔“

یہ ہیں حقیقی اقدار۔ یہ ہے میدان جس میں امید ہونی چاہئے۔ یہ ہے وہ میدان جس میں کام ہونا چاہئے اور یہ ہے وہ فیلڈ جس میں کمائی یا خسارے کی بات ہونی چاہئے۔ اور کس قدر وسیع خلیج ہے اس شخص کے درمیان جو رضامندی باری تعالیٰ کا طلبگار ہو اور اس میں کامیاب بھی ہو اور اس شخص کے

درمیان جو راہ غضب پر ہو اور اس میں گھر بھی چکا ہو اور جہنم کا مستحق ہو گیا ہو جو یقیناً بہت ہی برا ٹھکانہ ہے۔

یہ بھی ایک مقام ہے اور وہ بھی ایک مقام ہے اور ان دونوں مقامات کے درمیان ایک وسیع خلیج ہے ھُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللَّهِ..... ”یہ درجے ہیں اللہ کے نزدیک۔“ ہر شخص اپنے مقام تک استحقاق کی بنا پر پہنچتا ہے۔ اس لئے اس معاملے میں نہ کسی پر کوئی ظلم و زیادتی ہے اور نہ بے جا محبت اور طرفداری ہے۔ وَاللَّهُ بِصِيْرٍ بِمَا يَعْمَلُونَ..... ”اور اللہ اپنے بندوں کے اعمال پر نظر رکھتا ہے۔“

اب یہ پیرا گراف اپنے اصل موضوع کی طرف آتا ہے یعنی رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کی طرف۔ بتایا جاتا ہے کہ آپ کو رسول بنا کر دراصل اللہ تعالیٰ نے مکہ مدینہ اور پوری دنیا کے اہل ایمان پر ایک عظیم احسان کیا ہے۔ اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ رسالت کی اس اسکیم پر غور کریں۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ

”در حقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے ایک ایسا پیغمبر اٹھایا جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوراتا ہے اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے، حالانکہ اس سے پہلے یہی لوگ گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔“

اس پیرا گراف کا اختتام حقیقت نبوت محمدیہ پر کرنا، اور آپ کی ذاتی حیثیت و مقام کو یہاں بیان کرنا اور اسے ایک عظیم احسان جتانا، اور آپ اور آپ کی نبوت کا اس امت کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار جتانا اور اس امت کی تعلیم و تربیت اور اس کی قائدانہ صلاحیت اور کھلی گمراہی سے نکل کر اس کا

علم و حکمت اور تزکیہ اور طہارت کے اعلیٰ مقام تک پہنچ جانے کا تذکرہ ان سب امور کے اندر متنوع اور عمیق قرآنی احساسات ہیں جن پر غور ضروری ہے۔

یہ آیات ابتداً مال غنیمت پر بطور تبصرہ آئی ہیں کہ مال غنیمت کا لالچ، اس سے کسی چیز کے چوری ہونے، اور اس معمولی کام کے اندر بہت زیادہ مشغول ہونے کی وجہ سے تم نے احد کی جیتی ہوئی جنگ ہاری۔ اور تمہاری فتح شکست میں بدل گئی۔ اور اس کی وجہ سے مسلمان ملت کے ساتھ وہ کچھ ہوا جو تم نے دیکھ لیا۔ اس ریفرفنس میں رسالت کے عظیم منصب کے تذکرے اور اس عظیم احسان کے تذکرے جو احساس دلانا مقصود ہے وہ بہت ہی گہرا ہے۔ اور اس سے قرآن اپنے مخصوص انداز کے ساتھ امت کی تربیت کرنا چاہتا ہے۔ اس عظیم منصب کے ذکر اور یہ سمجھانے سے کہ یہ کس قدر عظیم احسان ہے تمہارے لئے یہ تاثر اور احساس دینا مطلوب ہے کہ تمام زمین کے اموال غنیمت، تمام کرۂ ارض سے چھینا ہوا مال اور تمام دنیا کے سامان و اسباب، اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہیں اور ان کی کوئی اہمیت نہیں ہے اور یہ قابل ذکر ہی نہیں ہیں۔ اس عظیم منصب و نعمت کے ہوتے ہوئے ان حقیر چیزوں کے تذکرے سے بھی ایک مسلمان کو حیا آتی ہے بلکہ اس کے بارے میں سوچنا بھی شرمندگی ہے۔ چہ جائیکہ مسلمانوں میں سے کوئی اس کے اندر دلچسپی لے۔

پھر یہ فکر انگیز اشارہ اس وقت دیا گیا کہ مسلمانوں کو شکست ہو چکی تھی، وہ رنج و الم میں مبتلا تھے اور اس معرکے میں مسلمانوں کی قیمتی جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ ایسے حالات میں نبوت کے عظیم منصب کے عظیم کام کو سامنے لا کر یہ فکر دلانا مقصود ہے کہ اس نبوت کے ذریعہ تم پر جو احسانات ہوئے ذرا ان پر بھی تو غور کرو۔ یہ وہ عظیم احسان ہے جو کو دنیا کے تمام دوسرے امور پر ترجیح دی جاسکتی ہے۔“

پھر بتایا جاتا ہے کہ اس احسان عظیم کے نتیجے میں تمہارے اندر جو تبدیلی آئی اس پر بھی ذرا غور کرو۔ تمہارے اندر اللہ کی آیات پڑھی جا رہی ہیں، تمہاری زندگیوں کو سنوارا جا رہا ہے، تمہیں کتاب سکھائی جا رہی ہے اور پھر دانائی اور حکمت اور ٹیکنالوجی سے آگاہ کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ اس سے قبل تم صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔

يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِذْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ

”اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں ایک حال سے بذریعہ انقلاب دوسری حالت میں منتقل کر دیا گیا تھا، ایک صورت حال تبدیل ہو گئی تھی اور ایک بالکل نئی صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ایک دور گزر گیا تھا اور ایک نیا دور آگیا تھا۔ اس لئے امت کو یہ شعور دیا جا رہا ہے کہ یہ ایک عظیم انقلاب ہے جو اس امت کے اندر محض اللہ کی قدرت، مشیت اور فضل و احسان کے ذریعہ برپا کیا جا رہا ہے۔ اور پھر اس امت کے ذریعہ پوری انسانی زندگی کے اندر اس عظیم انقلاب کے برپا کرنے کا آغاز بعثت رسالت محمدیہ کے ساتھ ہوا ہے جس نے اس امت کو برپا کیا اور تربیت دی۔ اس لئے اس عظیم انقلابی قوت کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اموال غنیمت جیسی حقیر چیز کو پیش نظر رکھ کر کوئی فیصلہ کرے۔ یا وہ معمولی قربانیوں اور رنج و الم اور شکست و ریخت پر کوئی جزع و فزع کرے۔ اس لئے کہ اس عظیم انقلاب کی راہ میں یہ چیزیں کچھ بھی نہیں ہیں۔

جنگ بدر کے واقعات کے بیان کے دوران رسالت محمدیہ کی اہمیت اور عظمت کے بیان میں یہ چند اشارات تھے جسے ہم نے اختصار کے ساتھ یہاں بیان کرتے ہیں۔ اس کے بعد مناسب ہے کہ ہم اس آیت قرآنی پر تفصیل سے روشنی ڈالیں جو حکمت و دانائی کے اشارات سے بھری ہوئی ہے۔

لَقَدْ مَنَّ اللَّهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ..... ”در حقیقت اہل ایمان پر تو اللہ نے بہت بڑا احسان کیا ہے کہ ان کے درمیان خود انہی میں سے پیغمبر اٹھایا۔“..... یہ اللہ کا عظیم احسان تھا کہ ان میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا۔ پھر یہ دوسرا احسان تھا کہ رسول کریم بھی عربی تھے۔ خود ان میں سے تھے، اللہ کی جانب سے کسی قوم میں رسول مبعوث کرنا دراصل اس قوم پر اللہ کا محض فضل و کرم ہوتا ہے۔ یہ خالص احسان اس لئے ہوتا ہے کہ بعثت رسول کے لئے خود اس قوم میں کوئی استحقاق کی بات نہیں ہوتی۔ اگر ان کا کوئی استحقاق ہوتا تو اس کے لئے کوئی قابل ذکر لوگ ہوتے، لوگوں کے اندر کوئی ایسا گروہ نہیں ہے جس پر یہ عنایت ہو رہی ہو۔ یہ تو محض اللہ کا فضل

و کرم ہے کہ ان میں رسول آگیا جو ان پر آیات الہی کی تلاوت کرتا ہے، اللہ کے کلمات سناتا ہے، اور اس کرم عظیم کے لئے ان کے ہاں کوئی سبب یا استحقاق نہ تھا، یہ صرف اور صرف احسان الہی ہے۔

اور یہ احسان پھر اس پہلو سے اور زیادہ اور گہرا ہو جاتا ہے کہ یہ رسول خود ان میں سے ان کا ہی بھائی ہے۔ ”خود ان میں سے ایک رسول“ کے الفاظ کے اندر نہایت گہرے اشارے ہیں۔ مومنین اور رسول کے درمیان رابطہ ایک نفس کا ایک نفس کے ساتھ رابطہ ہے۔ یہ رابطہ نہیں ہے کہ ایک فرد ایک قوم کے ساتھ مربوط ہو۔ صرف بات یہ نہ تھی کہ وہ ان میں سے ایک ہے، بلکہ اس سے زیادہ گہرا اور اس سے زیادہ ارفع مفہوم مطلوب ہے۔ ایمان کی وجہ سے وہ بلند ہو کر رسول سے مربوط ہو جاتے ہیں اور صرف ایمان کی وجہ سے وہ شرف و سر بلندی کے اس اونچے مقام تک پہنچ جاتے ہیں اور بے شک اہل ایمان پر یہ عظیم احسان ہے۔ اس طرح یہ احسان دو چند ہو جاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ رسول بھیجا گیا اور دوسرا یہ کہ یہ رسول تمہارے اندر موجود ہے اور وہ اس رسول کے پاس موجود ہیں اور دونوں کے درمیان یہ محبوب رابطہ قائم ہے۔

اس کے بعد اس احسان کے عملی آثار ظاہر ہوتے ہیں۔ ان کی شخصیت میں، ان کی زندگی میں اور پھر ان کی تاریخ میں یثْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ..... ”جو اس کی آیات انہیں سناتا ہے، ان کی زندگیوں کو سنوارتا ہے، اور ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔“ اب اس احسان کا ظہور بڑے وسیع اور عملی میدان میں ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ ان کی عزت افزائی کی شکل میں یہ احسان عظیم ظاہر ہوتا ہے کہ خود اس نے اپنی جانب سے، اپنے پروگرام کے مطابق رسول بھیجا جو ان سے اللہ کے کلام کے ذریعہ مخاطب ہے اور انہیں اللہ کی آیات سناتا ہے۔ اگر انسان اللہ کے صرف اسی ایک احسان پر اچھی طرح غور کرے تو وہ اللہ کے خوف سے مدہوش ہو جائے، کانپ اٹھے اور اس کے لئے یہ ممکن بھی نہ رہے کہ وہ اللہ کے سامنے کھڑا ہو سکے اور فوراً سجدہ شکر بجالائے۔

اگر وہ یہ سوچے کہ اس پر اللہ کرم کر رہا ہے، اس کے ساتھ بات کر رہا ہے، اس کو اپنی ذات و صفات کے بارے میں متعارف کر رہا ہے تاکہ انسان اس کی الوہیت کی ماہیت اور اس کے خصائص کو جان لے۔ اس کے بعد وہ ذات باری اس سے مخاطب ہو رہا ہے اور مخاطب بھی اس انسان اور اللہ کے اس حقیر بندے سے اور خطاب بھی اس بندے کی زندگی کے بارے میں ہو، اس کے دلی سوالات کے جواب دے رہی ہو، اس کی حرکات و سکنات پر بحث ہو رہی ہو، اور بات اس پر وگرام کی ہو رہی ہو جس میں اس حقیر انسان کی زندگی جاوید کا پروگرام مضمر ہے اور اس کی ہدایت کی بات ہو رہی ہو، اور یہ ہدایت بھی اس دستور کی طرف دی جا رہی ہو جس میں اس کے دل کی پاکیزگی ہے اور اس کے احوال کی بہتری ہے۔ اور اس کے بعد پھر اسے خوشخبری دی جا رہی ہے کہ اگر وہ اس پروگرام پر چلے گا تو وسیع تر جنت میں جگہ پائے گا، کیا اس سے اور کوئی عظیم احسان ہو سکتا ہے، بلکہ یہ خالص فیضان جو دو کرم ہے، اور خالص فضل و عطا ہے۔

اللہ تو غنی بادشاہ ہے، اور انسان کمزور اور محتاج ہے۔ لیکن یہ غنی بادشاہ اس کمزور اور محتاج سے ہمکلام ہے۔ وہ اس پر عنایات کی بارش کر رہا ہے، اسے دعوت دے رہا ہے، یہ غنی بادشاہ بار بار ان فقراء کو پکار رہا ہے اور اپنے جو دو کرم کی مسلسل دعوت دے رہا ہے۔ یہ عظیم کرم ہے، عظیم احسان ہے، عظیم فضل اور عطا ہے جو بے لوث ہے اور اس کے بالمقابل اس کا پورا شکر ادا نہیں کیا جاسکتا اور نہ ہی اس کے احسان کی وفاداری ممکن ہے۔

وَيُزَكِّهِمْ..... ”ان کی زندگیاں سنوراتا ہے“ پاک کرتا ہے، بلند کرتا ہے، متح کرتا ہے اور ان کے دلوں، ان کے تصورات، اور ان کے شعور کو پاک کرتا ہے۔ وہ ان کے گھرانوں کو پاک کرتا ہے۔ ان کی عزتوں کو پاک کرتا ہے، اور ان کے باہم روابط کو پاک کرتا ہے۔ ان کی انفرادی زندگی کو پاک کرتا ہے، ان کے معاشرے کو پاک کرتا ہے اور ان کے ارادوں کو پاک کرتا ہے۔ ان کو شرک بت پرستی کی گندیوں سے پاک کرتا ہے۔ ان کو خرافات اور وہم پرستی سے پاک کرتا ہے اور ان کی وجہ سے زندگی کے اندر جو رسم و رواج پاتے ہیں، جو غلط بندگیاں ہوتی ہیں ان سے پاک کرتا ہے۔ اور شرف

انسانیت سے فروتر گھٹیادرجے کی جو حرکات ہوتی ہیں ان سے انسانوں کو پاک کرتا ہے۔ ان کو جاہلیت کی زندگی کی تمام گندگیوں سے پاک کرتا ہے۔ نیز ان چیزوں سے پاک کرتا ہے جن سے انسانی شعور اور قومی شعائر ملوث ہو جاتے ہیں اور جن سے زندگی کے معانی، اقدار اور روایات گندی ہوتی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر جاہلیت اپنے ماحول میں کچھ ناپاکیاں پھیلا دیتی ہے۔ اسی طرح عرب جاہلیت نے بھی بعض گندگیاں پھیلا دی تھیں اور ان سب سے اسلام انہیں پاک کر رہا تھا۔

اور جاہلیت کی گندگیوں میں سے بعض کا تذکرہ حضرت جعفر بن ابی طالب نے کیا ہے، جب وہ نجاشی کے سامنے اسلام کا تعارف کر رہے تھے۔ اور یہ تعارف وہ قریش کے نمائندوں کے سامنے کر رہے تھے۔ جو ان مہاجرین کے خلاف مہم پر آئے ہوئے تھے۔ مطالبہ یہ تھا کہ وہ ان مہاجرین کو ان کے حوالے کر دے۔ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”شاہ محترم! ہم جاہلیت میں ڈوبی ہوئی قوم تھے۔ بتوں کی پوجا کرتے تھے، مردار کھاتے تھے۔ فحاشی کی تمام حرکات کرتے تھے۔ صلہ رحمی کے تمام تعلقات کو کاٹتے تھے۔ پردیسی سے برا سلوک کرتے تھے۔ ہم میں سے طاقتور ضعیفوں کو کھائے جا رہا تھا۔ ہماری یہی حالت تھی کہ اللہ نے ہم ہی میں سے ہمارے پاس ایک رسول بھیجا۔ ہم اس کے شجرہ نسب کو خوب جانتے ہیں، اس کی سچائی، اس کی امانت و دیانت سے بھی خوب واقف ہیں اور اس کی عفت مآبی بھی ہمارے سامنے ہے۔ اس نے ہمیں ایک اللہ کی طرف بلایا کہ ہم اسے ایک ہی جانیں، صرف اسی کی بندگی کریں۔ اور اس کے علاوہ ہم اور ہمارے آباء و اجداد جن پتھروں اور بتوں کی پوجا کرتے تھے ان کو جو اپنے گلے سے اتار دیں۔ اس نے ہمیں حکم دیا کہ سچی بات کرو، امانت میں خیانت نہ کرو، صلہ رحمی کرو، پڑوسیوں کے حقوق کا خیال رکھو، حرام امور کا ارتکاب نہ کرو، قتل نہ کرو، فحاشی سے اس نے ہمیں منع کیا، جھوٹی بات سے منع کیا، یتیم کا مال کھانے سے منع کیا، پاکدامن عورتوں پر بہتان لگانے سے منع کیا اور اس نے حکم دیا کہ صرف اللہ کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور روزے رکھو۔“

اور ان گندگیوں میں سے ایک گندگی وہ تھی جس کا تذکرہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کیا ہے۔ وہ جاہلیت کے زمانے میں مرد و زن کے تعلق جنسیت کا نقشہ روایت بخاری کے مطابق یوں کھینچتی ہیں: ”جاہلیت میں نکاح کی چار اقسام مروج تھیں۔ ایک تو وہ نکاح تھا جو آج کل ہمارے درمیان مروج ہے کہ ایک شخص دوسرے کی لڑکی کا پیغام دیتا، مہر مقرر ہوتا اور پھر نکاح ہو جاتا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ جب کسی شخص کی عورت ایام ماہواری سے پاک ہو جاتی تو وہ کہتا فلاں کے پاس جاؤ اور اس کے ساتھ تعلقات زن و شو قائم کرو۔ اور وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس وقت تک مباشرت نہ کرتا جب تک اس کا حمل واضح نہ ہو جاتا۔ یعنی جس شخص کے پاس اس نے اسے بھیجا تھا اس کے نطفے سے۔ اور جب حمل واضح ہو جاتا تو پھر خاوند اس کے ساتھ تعلقات جنسیت قائم کر لیتا اگر چاہتا۔ یہ اس لئے کیا جاتا تھا کہ اس شخص سے اچھی نسل پیدا ہو۔ اسے نکاح استبضاع کہا جاتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ دس افراد سے کم لوگ جمع ہوتے اور وہ ایک ہی عورت کے ساتھ تعلقات قائم کر لیتے۔ ہر ایک اس کے پاس جاتا، جب حمل ہو جاتا اور بچہ پیدا ہو جاتا اور کچھ شب و روز گزر جاتے تو وہ ان سب کو بلاتی۔ ہر ایک کو لازماً آنا پڑتا۔ وہ آتے اور اس کے ہاں اجتماع ہوتا۔ وہ کہتی تمہیں تو بات کا پتہ ہی ہے۔ اب بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ اے فلاں یہ بچہ تمہارا ہے اور وہ جس کے نام سے چاہتی اس کا نام رکھ دیتی۔ تو یہ اس کا بچہ ہو جاتا۔ اور وہ شخص انکار نہ کر سکتا۔ چوتھا نکاح ہوں ہوتا کہ بہت سے لوگ ایک عورت کے پاس جاتے۔ یہ عورت کسی کو بھی منع نہ کرتی، جو بھی چاہتا اس کے پاس جاتا۔ ان میں سے اگر کوئی حاملہ ہو جاتی اور حمل وضع ہو جاتا تو یہ سب لوگ اس کے ہاں جمع ہوتے۔ قیافہ دانوں کو بلایا جاتا۔ یہ قیافہ دان جس کے بارے میں چاہتے، بچے کو اس کے ساتھ ملا دیتے۔ وہ اسے لیتا، اس کا وہ بیٹا تصور ہوتا اور از روئے قانون وہ اس کا انکار نہ کر سکتا۔“

اب ذرا غور کیجئے کہ اس بہیمانہ گرے ہوئے جنسی ضوابط پر کیا کسی مزید تبصرے کی ضرورت ہے۔ یہ کافی ہے کہ ہم ایک ایسے شخص کے بارے میں سوچیں کہ وہ اپنی بیوی کو کسی کے پاس ایک اچھا بچہ پیدا کرنے کے لئے بھیجتا ہے۔ جس طرح اونٹنی، ایک گھوڑی اور ایک مادہ مویشی کو اچھا بچہ لانے کے لئے بھیجا جاتا ہے تاکہ بہترین نسل کشی ہو۔

رہی جسم فروشی کی چوتھی صورت تو وہ جسم فروشی کی ایک ایسی صورت ہے جس میں بچے کو کسی کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ اس میں وہ عار محسوس نہیں کرتے اور نہ اس سے رکتے ہیں۔

اور تیسری صورت بھی ویسی ہی ہے جس سے عربوں کو اسلام نے پاک کیا اور اگر اسلام نہ آتا تو وہ کانوں تک اس گندگی میں ڈوبے ہوئے تھے۔

جنسی تعلقات میں یہ گندگی عربوں میں محض اس لئے پھیلی ہوئی تھی کہ ان کا نقطہ نظر عورت کے بارے میں نہایت ہی گرا ہوا تھا، ابو الحسن علی ندوی اپنی کتاب میں فرماتے ہیں:

”جاہلیت کے دور میں عورتوں پر بے حد ظلم ہوتا تھا۔ اور ان کے حقوق مارے جاتے تھے۔ اس کی دولت لوٹی جاتی تھی۔ اسے میراث سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اور اگر اسے طلاق ہو جاتی یا اس کا خاوند فوت ہو جاتا تو اسے اپنی مرضی سے نکاح کرنے کی اجازت نہ ہوتی تھی۔ اور وہ اسی طرح میراث میں ملا کرتی تھی جس طرح مویشی اور سامان میراث کے طور پر ملا کرتے تھے۔ حضرت ابن عباس سے روایت ہے۔ اگر کسی کا باپ فوت ہو جاتا تو وہ اس کی منکوحہ کا سب سے پہلا مستحق ہو جاتا، وہ اگر چاہتا تو اسے اپنے نکاح میں لے لیتا، چاہتا تو اسے اس وقت تک بند رکھتا جب تک وہ اسے فدیہ نہ دلاتی یا مرنے جاتی تاکہ یہ اس کی تمام مملوکات پر قابض ہو جاتا۔ عطا ابن ربیع کہتے ہیں اہل جاہلیت کا رواج یہ تھا کہ جب کوئی مرد فوت ہو جاتا اور اس کی بیوی رہ جاتی تو اسے روک لیا جاتا یہاں تک کہ کوئی بچہ بالغ ہوتا اور یہ اس کے حوالے کر دی جاتی۔

سدی نے کہا کہ جاہلیت میں جب باپ اور بھائی فوت ہو جاتے یا لڑکا فوت ہوتا اور اس کے پیچھے بیوہ رہ جاتی تو اگر کوئی وارث جلدی سے اس بیوہ پر کپڑا ڈال دیتا تو وہ اس کی ہو جاتی اور وہ اسی سابقہ مہر کے عوض اس کے ساتھ نکاح کر لیتا یا وہ اسے کسی کے نکاح میں دے دیتا لیکن اس کے مہر کا حق دار وہ شخص ہوتا۔ اور اگر بیوی خاوند کے مرتے ہی اپنے میکے بھاگ جاتی تو آزاد تصور ہوتی۔ جاہلیت میں عورت کے ساتھ اس کے حقوق کے بارے میں سخت عدم توازن تھا۔ خاوند اس کے حقوق تلف کر سکتا تھا جبکہ وہ

خاوند کی حق تلفی کرنے پر قادر نہ تھی۔ اس کا مہر اس سے چھین لیا جاتا۔ اور اسے نقصان پہنچانے کے لئے روکے رکھا جاتا۔ خاوند تو اس کے ساتھ براسلوک کرتا، اس سے اعراض بھی کرتا اور بعض اوقات اسے معلق کر کے چھوڑ دیا جاتا۔ کھانے پینے کی چیزوں سے بعض چیزیں مردوں کے لئے مخصوص تھیں اور عورتوں پر وہ حرام تھیں۔ مرد کے لئے اجازت تھی کہ وہ جس قدر عورتوں سے نکاح کرتا، نکاح کر سکتا تھا۔

لڑکیوں کو اس قدر برا سمجھا جاتا کہ انہیں زندہ درگور کر دیا جاتا۔ ہشیم ابن عدی نے المیدانی کی روایت کے مطابق لکھا ہے کہ تمام قبائل عرب میں زندہ درگور کرنے کا رواج تھا، ہاں ایک شخص اگر اس پر عمل نہ کرتا تو دس نہ کرتے۔ اسلام آیا تو اس وقت عربوں کے اندر زندہ درگور کرنے کے بارے میں مختلف آراء اور طریقے پائے جاتے تھے۔ بعض لوگ بہت غیرت مند ہونے کی وجہ سے لڑکیوں کو زندہ درگور کرتے۔ اور ان کی وجہ سے وہ اپنی شرمندگی چھپاتے۔ بعض لوگ ایسے تھے جو سبز آنکھوں والی لڑکیوں کو دفن کرتے یا سیاہ فام کو زندہ درگور کر دیتے یا برص زدہ کو دفن کر دیتے یا لنگڑی کو دفن کر دیتے۔ اس لئے کہ یہ لوگ ان صفات کو بہت ہی بدشگون سمجھتے تھے اور بعض ایسے بھی تھے جو فقر و فاقہ کے خطرات کی وجہ سے اولاد کو قتل کرتے۔

بعض اوقات وہ اپنی لڑکیوں کو بڑی سنگدلی کے ساتھ قتل کرتے یا زندہ درگور کرتے۔ مثلاً کبھی ایسا ہوتا کہ والد موجود نہ ہوتا، سفر میں ہوتا، یا کوئی اور مصروفیات ہو تیں تو لڑکی کو زندہ درگور کرنے کا موقع نہ ملتا، وہ بڑی ہو جاتی وہ سمجھتی کہ اسے قتل کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے خود اپنی کہانیاں بیان کی ہیں جو خون کے آنسو لاتی ہیں۔ بعض لوگ لڑکیوں کو پہاڑ کی چوٹی سے گرا دیتے۔

ان گندگیوں میں سے ایک گندگی، اور سب سے بڑی گندگی، شرک تھی۔ پھر شرک کی بھی گری ہوئی شکل یعنی بت پرستی عربوں میں عام تھی۔ استاد ندوی اس کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں: ”عرب بت پرستی اور بتوں کی پوجا کی بدترین صورتوں میں مبتلا تھے۔ ہر قبیلہ بلکہ ہر درے کا ایک بت ہوا کرتا تھا۔ بلکہ ہر خاندان کا ایک بت ہوا کرتا تھا۔ کلبی کہتے ہیں۔ مکہ کے ہر گھرانے کا اپنا بت ہوتا تھا جسے وہ پوجتے

تھے۔ جب کوئی سفر پر جاتا تو جانے سے پہلے آخری کام یہ کرتا کہ وہ اس سے تبرک حاصل کرتا۔ اور جب گھر لوٹا تو سب سے پہلے اس کی پوجا کرتا۔ عرب بتوں کی پوجا کے اندر اس قدر غلو کر گئے تھے۔ بعض نے اپنے بت خانے بنا رکھے تھے۔ بعض کا اپنا علیحدہ ایک ہی بت ہوتا تھا۔ اگر کوئی بت خانہ نہ بنا سکتا تھا اور اپنا بت بھی نہ بنا سکتا تو وہ خانہ کعبہ کے سامنے ایک پتھر کھڑا کر دیتا یا کسی اور جگہ کھڑا کر دیتا، اس کا طواف کرتا جس طرح وہ خانہ کعبہ کا طواف کرتا تھا۔ اور ایسے بتوں کو وہ انصاب کہتے تھے۔ خانہ کعبہ کے اندر، حالانکہ کعبہ صرف اللہ کی عبادت کے لئے تعمیر ہوا تھا، اس کے صحن کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ بتوں کی پوجا سے آگے بڑھ کر انہوں نے بتدریج پتھروں کی پوجا شروع کر دی تھی۔ امام بخاری نے ابورجاء عطار دی سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم پتھروں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ اگر ہمیں کوئی اچھا پتھر ملتا تو پہلے پتھر کو چھوڑ کر دوسرا لے لیتے۔ اگر پتھر نہ ملتا تو ہم مٹی کا ایک ڈھیلا لے لیتے اس بکری کو دوہتے۔ اس کے بعد اس کا طواف کرتے۔ کلبی کہتے ہیں۔ اگر کوئی سفر کرتا اور کسی جگہ اترتا تو چار پتھر لیتا۔ ان میں سے دیکھتا کہ سب سے اچھا کون سا ہے تو اسے اپنا رب بنا لیتا اور بقیہ تین کو چولہے کے تین پتھر بنا لیتا۔ اور جب وہ اپنی منزل چھوڑتا تو اس پتھر کو بھی چھوڑ دیتا۔

عرب بھی دوسری قوموں کی طرح، ملائکہ اور جنوں کی پوجا کرتے۔ اسی طرح وہ ستاروں کی پوجا بھی کرتے۔ چنانچہ وہ فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں قرار دیتے اور انہیں اللہ کے ہاں سفارشی بناتے۔ ان کی عبادت بھی کرتے اور ان کے وسیلہ سے اللہ کے ہاں اپروچ (تقرب حاصل) کرتے۔ اسی طرح انہوں نے جنوں کو بھی شریک خدا کیا ہوا تھا۔ ان کی قدرت اور تاثیر کے وہ قائل تھے، بلکہ ان کی عبادت بھی کیا کرتے تھے۔ کلبی کہتا ہے قبیلہ خزاعہ کا بنو ملیح قبیلہ جنوں کی پوجا کرتا تھا۔ صاعد کہتے ہیں کہ حمیر سورج کی پوجا کرتے تھے۔ کنانہ چاند کے پجاری تھے۔ “(دیکھئے مآذ احرام المسلمون۔ ندوی ص ۳۴)

بت پرستی کے اس ابتدائی تصور کے ملاحظہ سے بسہولت معلوم ہو جاتا ہے کہ اس بت پرستی کی وجہ سے عربوں کے دل و دماغ اور ان کے تصورات اور ان کی عملی زندگی کے اندر کس قدر وسیع گندگی پھیلی ہوئی تھی۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ کس قدر عظیم انقلاب تھا جو اسلام نے عرب معاشرے کے

اندر برپا کیا۔ ان کی زندگی کو کس قدر پاک کیا گیا، ان کے تصورات کی کس قدر تطہیر کی گئی۔ اور ان کو اخلاقی اور اجتماعی گندگیوں سے کس قدر پاک کیا گیا، حالانکہ یہ تصورات اور یہ انفرادی اور اجتماعی گندگیاں ان کے لئے ایک قسم کے مفاخر تھے اور وہ اپنے اشعار اور اپنے میلوں اور بازاروں میں ان پر لمبی لمبی فخریہ تقریریں کیا کرتے تھے۔ مثلاً شراب نوشی، قمار بازی، قبائل کے اندر چھوٹے چھوٹے انتقام، ان کے نزدیک عظیم فضائل اخلاق تھے۔ اور یہ لوگ ان کے دائرے سے باہر قدم نہ رکھ سکتے تھے۔

رہی جنگ تو وہ ان کے لئے نہایت ہی معمولی بات تھی۔ خونریزی ان کے لئے روزمرہ کا کام تھا۔ ایک معمولی حادثہ بھی خونریزی کا باعث بن جاتا۔ قبیلہ بکر اور تغلب کے درمیان جنگ ہوئی اور چالیس سال تک ہوتی رہی۔ اس جنگ میں عظیم خونریزی ہوئی۔ جنگ یوں شروع ہوئی کہ کلیب رئیس معد نے تیر مارا اور بسوس بنت منذر کی اونٹنی کے تھنوں میں لگا۔ خون اور دودھ مل گئے۔ جس ابن مرہ نے کلیب کو قتل کر دیا۔ اس بکر اور تغلب قبائل کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اور جس طرح مہاہل برادر کلیب نے کہا ہے ”اس جنگ نے زندگی کو فنا کر دیا۔ ماؤں کو رلا دیا۔ بچوں کو یتیم کر دیا۔ اس قدر آنسو بہے کہ رکنے کا نام نہ لیا اور اس قدر لوگ مارے گئے کہ دفن نہ ہو سکے۔ اور جنگ داحس کا بھی حال ایسا ہی تھا۔ قیس ابن زہیر کے گھوڑے کا نام داحس تھا۔ قیس ابن زہیر اور حذیفہ ابن بدر کے درمیان ہونے والے شرطیہ مقابلے میں داحس آگے تھا۔ ایک شخص جو اسد قبیلے سے تعلق رکھتا تھا اس نے اس کے آگے رکاوٹ ڈالی اور حذیفہ آگے نکل گیا۔ اس نے اس کے چہرے پر طمانچہ مارا اور اس طرح اسے الجھا دیا۔ اور دوسرے گھوڑے آگے نکل گئے۔ اس کے بعد مقاتلہ شروع ہو گیا، پھر بدلے پر بدلہ لیا جاتا رہا۔ قبیلوں نے اپنے افراد کی نصرت کی۔ اس میں لوگ مارے گئے، قید ہوئے اور ہزاروں افراد کام آئے۔“

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عربوں کی زندگی میں، عظیم اور بلند مقاصد کی کوئی اہمیت نہ تھی، اگر ان کے ہاں کوئی بلند نصب العین ہوتا تو وہ ان گھٹیا سرگرمیوں میں مشغول ہونے کا وقت ہی نہ پاتے۔ ان کی زندگی کا کوئی پیغام نہ تھا، انسانوں کی بھلائی کا کوئی منصوبہ ان کے پیش نظر نہ تھا۔ اس دنیا میں ان کے

پاس کوئی بلند انسانی پروگرام نہ تھا کہ وہ زندگی کی ان بے قیمت اور گھٹیا سرگرمیوں میں مشغول نہ ہوتے۔ نیز ان کے پاس کوئی ایسا نظریہ حیات بھی نہ تھا جو انہیں ان اجتماعی مذموم گندگیوں سے باز رکھتا۔ اگر لوگوں تک الہی نظریہ حیات نہ پہنچا ہو تو پھر ان کی ترجیحات کیا ہوتی ہیں؟ ان کا تصور حیات کیا ہوتا ہے؟ اور ان کے اخلاق کیا ہوتے ہیں؟

جاہلیت بہر حال جاہلیت ہوتی ہے۔ اور ہر جاہلیت کی گندگیاں اور غلط کاریاں الگ ہوتی ہیں۔ ہر زمان و مکان میں ان کے لئے الگ مواقع رہے ہیں۔ جب لوگوں کے دل الہی نظریہ حیات سے خالی ہو جائیں اور ان پر خدائی فکر کی حکمرانی نہ رہے، جب لوگ الہی شریعت سے آزاد ہو جائیں تو خدائی نظریہ حیات پر مبنی ہوتی ہے، تو ان کی زندگی پر جاہلیت کی حکمرانی ہوتی ہے اور وہ جاہلیت کی مختلف صورتوں میں سے کسی ایک صورت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ آج ہمارے دور میں جس جاہلیت نے انسانیت کو کانوں تک گندگی میں ڈبو دیا ہے وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے زمانہ قدیم کی عرب جاہلیت سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے۔ اور نہ ان جاہلیتوں سے مختلف ہے جو اس وقت اس دنیا کے اطراف و اکناف میں مروج تھیں اور جن سے انسانیت کو اسلام نے نجات دی تھی۔

آج دنیا ایک عظیم گندگی میں زندگی بسر کر رہی ہے اس کی صحافت کو دیکھیں، اس کی فلموں کو دیکھیں، اس کے لباس کی نمائشوں کو دیکھیں، اس کے مقابلہائے حسن کو دیکھیں، اس کی رقص گاہوں کو دیکھیں، اس کے جموں کو دیکھیں، اس کے نشر و اشاعت کے اداروں کو دیکھیں، پھر ننگے گوشت اور ہیجان انگیز طور طریقوں کو دیکھیں، ادب و فن میں اس کی بیمار مزیت کو دیکھیں اور ذرائع اشاعت کے اندر اس کے گھٹیا اشاروں کو دیکھیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ گندگی کی دلدل میں گرفتار اور بیمار ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ معیشت پر ظالمانہ سودی نظام کی گرفت ہے۔ افرط زر اور دولت جمع کرنے اور اسے بڑھانے کے لئے غیر اخلاقی ذرائع کا استعمال عام ہے۔ اور قانون کے سایہ اور لباس کے اندر عوام کو لوٹا جا رہا ہے۔ اس کے ساتھ اخلاقی بے راہ روی اس قدر عام ہو گئی ہے جس کی لپیٹ میں ہر شخص اور ہر خاندان اور ہر نظام آ رہا ہے بلکہ ہر انسانی سوسائٹی پر اس کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں۔ ان تمام

امور پر غور کرنے سے یہ فیصلہ کرنا بہت ہی سہل ہو جاتا ہے کہ اس جدید جاہلیت کے زیر سایہ انسانیت ہلاکت خیز بیماری کی طرف بڑھ رہی ہے۔

انسان انسانیت کو کھائے جا رہا ہے۔ اس کی آدمیت تحلیل ہو رہی ہے، وہ حیوان کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ سانس پھولا ہوا ہے۔ وہ ایسی چیزوں کی دلدادہ ہو گئی ہے جو حیوانیت کو جگار ہی ہیں۔ اور انسان عالم حیوانات کی طرف اتر رہا ہے لیکن حیوان کو دیکھیں تو وہ اس انسان سے زیادہ پاکیزہ ہے۔ کیونکہ وہ ضابطہ فطرت کے اندر جکڑا ہوا ہے اور ضابطہ اس قدر مضبوط ہے کہ کبھی ڈھیلا نہیں پڑتا۔ نہ اس قدر گندہ ہوتا ہے جس طرح انسان اس وقت گندہ ہو جاتا ہے جب وہ عقیدے اور نظریہ اور نظریاتی نظام کے بندھنوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اور پھر سے اس جاہلیت میں داخل ہو جاتا ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے اسے نجات دی ہے۔ اور جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ اس آیت میں اشارہ کرتے ہوئے اسے اپنا خصوصی انعام قرار دیتے ہیں۔

وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ..... ”ان کو کتاب اور دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔“ اس آیت میں جن لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے وہ ان پڑھ اور جاہل تھے۔ وہ لکھنا نہ جانتے تھے۔ عقل اور سمجھ بوجھ کے اعتبار سے بھی امی اور جاہل تھے۔ ابواب علم میں سے کسی باب میں بھی اس وقت کے عالمی معیار علم و ثقافت کے مطابق کچھ درک نہ رکھتے تھے نہ ان کی زندگی کے کچھ بلند مقاصد تھے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں سے کسی بھی شعبے میں عالمی وقعت رکھتے ہوں، لیکن اچانک اسلامی نظریہ حیات آتا ہے، وہ دنیا کے استاد بن جاتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دنیا کے حکیم بن گئے۔ وہ ایک نظریاتی نظام زندگی کے حامل بن گئے، جس کے اندر نظام فکر، نظام اجتماع اور زندگی کی تنظیم کا پورا نظام موجود تھا۔ اور جس نے اپنے دور میں پوری انسانیت کو اس وقت کی جاہلیت سے نجات دی۔ اور اب ہمارے دور میں بھی جدید جاہلیت سے اس جدید بشریت کو، ان شاء اللہ وہی نجات دے گی۔ اس لئے کہ ہماری اس جدید جاہلیت میں وہ تمام عناصر موجود ہیں جن سے جاہلیت قدیمہ مرکب تھی۔ اخلاقی اعتبار سے بھی، اجتماعی اعتبار سے بھی، انسانی زندگی کے اہداف کے اعتبار سے بھی اور اعلیٰ مقاصد کے اعتبار

سے بھی۔ اس کے باوجود کہ جدید انسانیت نے علم و معرفت کے میدان میں بڑی بڑی پیش قدمیاں کی ہیں اور صنعتی میدان میں اس نے ریکارڈ پیداوار دکھائی ہے۔ اور زندگی کی بہترین سہولیات فراہم کی ہیں لیکن یہ انسانیت بدستور جاہلیت میں ڈوبی ہوئی ہے۔

وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ..... ”اگرچہ اس سے پہلے یہی لوگ صریح گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے۔“ اعتقادات و تصورات کے اعتبار سے گمراہی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ زندگی کے مفاہیم اور قدروں کے اعتبار سے بھی ڈوبے ہوئے تھے اور مقاصد اور زندگی کی سمت کے اعتبار سے بھی راہ گم کئے ہوئے تھے۔ اپنی عادات و اطوار کے اعتبار سے بھی، اپنے نظم و نسق کے اعتبار سے بھی، اپنے اجتماعی نظام اور اپنے اخلاقی نظام کے اعتبار سے بھی گمراہ تھے۔

وہ عرب جو اس آیت کے مخاطبین اولین تھے، وہ اچھی طرح، بغیر کسی شک و شبہ کے اپنے ماضی اور حال ماضی کے رنگ ڈھنگ سے واقف تھے، یہ ماضی انہیں خوب یاد تھا۔ اور وہ انقلاب جو اسلام کی وجہ سے ان کی زندگیوں میں نمودار ہو گیا تھا وہ ان کی نظروں کے سامنے برپا ہوا تھا، اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اسلامی نظریہ حیات کے بغیر ان کی زندگی میں اس قدر عظیم انقلاب برپا نہ ہو سکتا تھا، جس کی مثال تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔

وہ یہ جانتے تھے کہ یہ اسلام اور صرف اسلام تھا جس نے انہیں قبائلی طور طریقوں سے نکالا، قبائلی ترجیحات ان کے ذہن سے نکال دیں، قبائلی انتقام کے دلدل سے انہیں نکالا، صرف اس لئے نہیں کہ بس وہ ایک عظیم قوم بن جائیں بلکہ وہ اچانک بغیر کسی ابتدائی تیاریوں کے، بغیر کسی طویل زمانی منصوبے کے اچانک، ایسی قوم کی شکل اختیار کر لیں جو انسانیت کی قیادت کر رہی ہو، وہ انسانیت کے لئے نقشہ حیات تیار کر رہی ہو، اس کے لئے زندگی کا منہاج تیار کر رہی ہو، اس کی اجتماعی نظم بندی کر رہی ہو، ایسی صورت میں کہ اس کی کوئی سابقہ مثال ان کے سامنے نہ ہو اور پوری انسانی تاریخ میں بھی جس کی کوئی مثال نہ ہو۔

وہ علی وجہ البصیرت اس حقیقت کا ادراک رکھتے تھے کہ اسلام اور صرف اسلام نے انہیں قومی تشخص بخشا ہے۔ انہیں ایک سیاسی وجود بخشا ہے اور ایک بین الاقوامی حیثیت دی ہے۔ اور سب سے پہلے اور سب سے اہم یہ کہ انہیں ایک انسانی حیثیت عطا کی ہے، جس نے ان کی انسانیت، ان کی آدمیت اور اکرام انسانیت کو بلند کیا بلکہ ان کے پورے نظام حیات کو شرف انسانیت کی اساس پر منظم کیا۔ اور یہ تکریم ان کو اللہ تعالیٰ کی جانب سے بطور ہدیہ اور بطور احسان عطا ہوئی۔ اور اس کے بعد انہوں نے اس تکریم انسانیت کی بارش پوری انسانیت پر کر دی۔ انہوں نے پوری انسانیت کو سکھایا کہ انسان کا اکرام کس طرح کیا جاتا ہے؟ کس طرح اسے اللہ کی تکریم کے ساتھ اشرف المخلوقات قرار دیا جاتا ہے۔ اور انسان کو یہ شرف عطا کرنے میں ان کے سامنے نہ جزیرۃ العرب میں کوئی مثال تھی اور نہ ہی دنیا کے کسی دوسرے خطے میں کوئی مثال تھی۔ اس سے پہلے اصول شوریٰ پر ہم جو بحث کر آئے ہیں، وہ اس نظام اور شرافت انسانیت کے پہلوؤں میں سے ایک پہلو تھا، جس کے اندر وہ محسوس کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ان پر غیر معمولی انعام تھا۔

وہ اس بات کا اچھی طرح ادراک کئے ہوئے تھے کہ یہ اسلام اور صرف اسلام ہے جس نے انہیں ایک پیغام عطا کیا اور اب وہ اس پیغام کو تمام دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں، وہ انسانیت کو ایک نظریہ حیات دے رہے ہیں۔ وہ انسانی زندگی کے لئے انہیں ایک راہ دکھا رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ انسانی برادری کے اس وسیع کھیت میں اگر کوئی قوم زندہ رہ سکتی ہے تو وہ وہی قوم ہوگی جس کے پاس کوئی پیغام ہو، جس کے پاس زندگی گزارنے کا کوئی طریقہ حیات ہو اور وہ اس کے ذریعہ انسانیت کو آگے بڑھا رہی ہو۔

یہ اسلام تھا، اس کا تصور کائنات تھا، زندگی کے بارے میں اس کی آراء تھیں، معاشرے کے لئے اس کا اجتماعی اور قانونی نظام تھا، حیات انسانی کے لئے اس کی مخصوص تنظیم تھی اور اس کا مثالی مثبت اور واقعیت پسند نظام زندگی تھا جس کے زیر سایہ انسان کو خوشحالی نصیب ہوئی۔ اسلام اپنی ان خصوصیات

کے ساتھ ایک شخصی راہداری تھی جس کے ذریعہ وہ آگے بڑھے اور انہیں انسانیت نے پہچانا، ان کا احترام کیا اور انہیں انسانیت کی قیادت سپرد کی۔

آج ہو یا کل ان کے پاس یہی راہداری ہے۔ اس کے سوا اقوام عالم میں ان کی کوئی اور شناخت ہی نہیں ہے۔ ان کے لئے اب صرف یہی راستہ ہے انسانیت انہیں پہچانے اور ان کی عزت کرے یا پھر وہ اس پیغام کو چھوڑ دیں اور دوبارہ مہمل زندگی بسر کریں۔ جس طرح کہ وہ اسلام سے پہلے تھے، کوئی انہیں جانتا ہی نہ تھا اور نہ انہیں کوئی مانتا تھا۔

سوال یہ ہے کہ اگر وہ انسانیت کو اسلامی نظام زندگی کا پیغام نہیں دینا چاہتے تو اور وہ کون سا پیغام ہے جو دنیا کو دینا چاہتے ہیں۔ کیا وہ دنیا کو فنون، آداب اور سائنس میں کچھ دینا چاہتے ہیں؟ ان میدانوں میں تو دنیا ان سے کہیں آگے نکل گئی ہے۔ ان فروعی علوم و ثقافتوں کے میدان کے اندر انسانیت پہلے سے مالا مال ہو گئی ہے۔ نہ اسے کسی مزید چیز کی ضرورت ہے اور نہ اسے انتظار ہے کہ اس میدان میں عرب اسے کچھ دیں گے۔

کیا عرب دنیا کو صنعتی میدان میں کچھ عجوبہ دینا چاہتے ہیں؟ حالانکہ اقوام عالم کے ہاں صنعت نے اس قدر ترقی کر لی ہے کہ اس کے مقابلے میں بڑے بڑے گردن فراز جھک گئے ہیں، انہوں نے صنعتی مصنوعات کے بازار بھر دیئے ہیں اور ہمارے ہاں جو صنعتی پیداوار ہوتی ہے اسے زیر سایہ (OverShade) کر دیا ہے۔ عرب کے مقابلے میں بے زمار قومیں آگے ہیں، اس میدان میں۔ اور اس میدان میں ان کے ہاتھ میں زمام قیادت پہلے سے موجود ہے۔

کیا عرب دنیا کو اجتماعی مذہب کا کوئی فلسفہ دینا چاہتے ہیں؟ یا وہ دنیا کو کوئی ایسا اقتصادی اور تنظیمی نظام دینا چاہتے ہیں جو انہوں نے ایجاد کیا ہے۔ جو ان کی اپنی فکری کاوش کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت ہماری دنیا ان دنیاوی فلسفوں، مذاہب اور نظریات سے بھری پڑی ہے اور یہی دنیاوی نظریات ہیں جن کے تحت انسانیت نہایت ہی بد حالی کا وقت گزار رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ عرب اس انسانیت اور اقوام عالم کے سامنے کیا تحفہ پیش کرنا چاہتے ہیں، جس کی وجہ سے برادری اقوام میں ان کا تعارف ہو، انہیں امتیاز حاصل ہو اور اس میدان میں وہ برتر تصور ہوں؟

میں کہتا ہوں کہ ان کے پاس پیغام اسلام کے سوا کوئی اور پیغام نہیں ہے۔ یہی واحد نظام زندگی ہے جس کا پیغام وہ اس دنیا کو دے سکتے ہیں۔ ان کے پاس اللہ کے اس احسان کے سوا کوئی اور چیز نہیں ہے جس کا احسان انہوں نے مسلمانوں پر کیا۔ اور اس کے ساتھ انہیں اعزاز بخشا، اور ایک دن اسی پیغام کے ذریعہ انہوں نے پوری انسانیت کو نجات دی تھی، اور آج انسانیت سب سے زیادہ جس میدان میں مفلس ہے، سب سے زیادہ جس کی طرف محتاج ہے وہ یہی پیغام ہے۔ وہ جہنم کے گڑھے میں گرنے والی ہے۔ وہ حیرت، قلق اور بے اطمینانی کا شکار ہے۔

یہ وہ واحد پیغام تھا جسے انہوں نے کبھی انسانیت کو دیا تھا اور اس کے سامنے پوری انسانیت نے سر جھکا لیا تھا۔ آج یہی پیغام ہے جو عرب انسانیت کو دے سکتے ہیں اور اس میں انسانیت کی نجات مضمر ہے اور اسی میں اس کی کامیابی کا راز ہے۔

ہر قوم کے پاس کوئی نہ کوئی پیغام ہوتا ہے۔ تمام بڑی اقوام میں سے ہر قوم کے پاس کچھ نہ کچھ ہوتا ہے، سب سے بڑی قوم وہ ہوتی ہے جس کا پیغام بڑا ہوتا ہے، بڑی قوم وہ ہوتی ہے جو سب سے بڑا نظام دے۔ اور پھر دنیا میں اس نظام زندگی کے ساتھ منفرد تصور ہوتی ہے اور وہ نظام اس کی شناخت ہوتا ہے۔

عربوں کے پاس یہ پیغام موجود ہے۔ یہ ہے بھی ان کا اصلی پیغام۔ دوسری اقوام تو پیغام اسلام میں ان کی شریک حیات ہیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سا شیطان ہے جو انہیں اس عظیم اور قیمتی سرمائے سے محروم کر رہا ہے۔ کون ہے وہ شیطان اسے پہچانو۔

اللہ کا عظیم اور عظیم احسان تھا اس امت پر اس پیغام کی وجہ سے اس رسول کی وجہ سے اور اس کی رسالت کی وجہ سے ہے۔ اس عظیم احسان سے انہیں صرف شیطان ہی پھیر کر گمراہ کر سکتا ہے حالانکہ ان کو اللہ نے حکم دیا ہے کہ اس شیطان کو دھتکاریں اور اس پر سنگ باری کریں۔

☆ ☆ ☆ ☆ ☆

اس کے بعد معرکہ احد کے واقعات کے بیان میں بات ایک قدم اور آگے بڑھتی ہے۔ اور اس پر مزید تبصرہ ہوتا ہے اور نتائج اخذ کئے جاتے ہیں۔ ان کے تعجب کو پیش کیا جاتا ہے جس کا اظہار وہ ان نتائج کو دیکھ کر کرتے تھے جو احد میں برآمد ہوئے۔ وہ ان واقعات کو انہونی تصور کرتے تھے۔ ان کی سوچ یہ تھی کہ وہ مسلمان ہیں پھر بھی انہیں شکست ہوئی۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کے بارے میں ان کا تصور ابھی بہت ہی ابتدائی ہے۔ ابھی وہ تجربات سے گزر کر فکری اعتبار سے پختہ نہ ہوئے تھے۔ وہ عملی تربیت سے ابھی نہ گزرے تھے تاکہ وہ اصل صورت حال کے ساتھ اور حقیقی واقعات کے ساتھ وہ برتاؤ کریں اور اس دنیا کے تکوینی قوانین فطرت کا ادراک کریں جن کے مطابق یہاں ہر شخص نے اپنی عملی زندگی بسر کرنی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انہیں کھلے میدانوں میں کھڑا کر کے انہیں صاف صاف بتا دیا کہ انہیں جو کچھ درپیش ہوا وہ خود ان کے اپنے افعال کا لازمی نتیجہ تھا۔ انہوں جو تصرفات اور اقدامات کئے ان کے یہی فطری اور سنت الہی کے مطابق نتائج تھے۔ لیکن قرآن کریم انہیں صرف اس نکتہ پر ہی نہیں چھوڑ دیتا اس لئے کہ یہ نکتہ اگرچہ حقیقت ہے لیکن یہ انتہائی حقیقت نہیں ہے بلکہ ان اسباب اور اسباب کے قدرتی نتائج کی پشت پر تقدیر الہی بھی کام کرتی ہے۔ قرآن انہیں اس کی طرف بھی متوجہ کرتا ہے نیز اس سنن الہیہ اور قوانین فطریہ کی پشت مشیت الہیہ بھی کام کرتی ہے۔ یوں قرآن انہیں ان واقعات کی حکمت بتاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ نے ان واقعات کی اس تدبیر کی پشت پر ان کے لئے بھلائی کا ارادہ کیا تھا۔ اس میں ان کے لئے خیر تھی۔ اس دعوت کے لئے بہتری تھی جس کی خاطر وہ جدوجہد کر رہے ہیں۔ مقصود یہ تھا کہ وہ اس تجربے سے انہیں زمانہ مابعد کے لئے تیار کرے۔ ان کے دلوں کو صاف کر دے۔ ان کی صفوں کی تطہیر کر دے۔ ان منافقین کو علیحدہ

کر دیا جائے، جو ان واقعات کے نتیجے میں ننگے ہو گئے۔ آخر کار تمام امور بہر حال اللہ کی مشیت کے مطابق ہی سرانجام پاتے ہیں۔ اس کی تقدیر اور تدبیر کے مطابق ہی ظہور پاتے ہیں۔ یوں اس تبصرے سے ان کا تصور اور ان کا شعور مکمل ہو جاتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کے نہایت ہی گہرے عمیق اور لطیف بیان واقعات پر ذرا نظر ڈالیں:

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلِهَا قُلْتُمْ أِنَّا هَذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ
 أَنْفُسِكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۶۵) وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى
 الْجُمُعَاتِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ (۱۶۶) وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا
 وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ ادْفَعُوا قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَا تَبْعَانَا
 هُمُ لِلْكَفَرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي
 قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ (۱۶۷) الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا
 لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِنْ كُنْتُمْ
 صَادِقِينَ (۱۶۸)

”اور تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دو گنی مصیبت تمہارے ہاتھوں (طریق مخالف پر) پڑ چکی ہے۔ اے نبی ﷺ ان سے کہو، یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون؟ وہ منافق کہ جب ان سے کہا گیا ”اَوَلَمْ تَرَ كَيْفَ جَعَلَ اللَّهُ فِيكُمْ زُكُومًا“ (اپنے شہر کی مدافعت ہی کرو) تو کہنے لگے ”اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔“ یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے

دلوں میں نہیں ہوتیں، اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور ان کے جو بھائی بند لڑنے لگے اور مارے گئے ان کے متعلق انہوں نے کہہ دیا کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے۔ ان سے کہو اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو خود تمہاری موت جب آئے، اسے ٹال کر دکھا دینا۔“

اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر یہ لکھ دیا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی مدد کرے گا، جو اس کا جھنڈا اٹھانے والے ہوں اور جو اس پر پختہ ایمان اور عقیدہ رکھنے والے ہوں۔ لیکن اس نے اس وعدے کو ایک شرط سے مشروط کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ کی نصرت کے مستحق وہ اس وقت ہوں گے جب ان کے دلوں میں حقیقت ایمان اچھی طرح جاگزیں اور مستحکم ہو جائے۔ اور وہ اپنی تنظیم اور طرز عمل میں ایمان کے تقاضے پورے کر رہے ہوں۔ اور ان کی وسعت اور طاقت کے اندر جو کچھ ہو وہ انہوں نے تیار کیا ہو۔ ان کی طاقت میں جس قدر ممکن ہو وہ جدوجہد کر رہے ہوں۔ یہ ہے سنت الہیہ اور سنت الہیہ کی کسی کے ساتھ خاص دوستی نہیں ہوتی نہ وہ کسی کی رورعایت کرتی ہے۔ جب اللہ والے ان امور میں سے کسی میں بھی قصور اور کمی رکھتے ہوں تو ان کا فرض ہے کہ وہ اپنی تقصیرات کے نتائج بھی قبول کریں۔ اس لئے کہ صرف مومن ہونے سے ان کے لئے ضابطہ سنن الہیہ معطل نہ کر دیا جائے گا۔ نہ ناموس اعلیٰ باطل ہو جائے گا۔ وہ تو مسلم ہی تب ہوں گے جب وہ اپنی زندگی کے اندر سنن الہیہ کو جاری و ساری کر دیں۔ اور اپنی فطرت کو ناموس کائنات کے ساتھ ہم آہنگ کر دیں۔

لیکن ان کا نفس مسلمان ہونا بھی بیکار نہیں جاتا۔ نہ وہ بے اثر ہوتا ہے۔ ان کا اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا، اس کے جھنڈے اٹھانا، اس کی اطاعت کا عزم کر لینا اور اس کے نظام حیات کا التزام کرنا وغیرہ ان امور کا یہ اثر ضرور ہو گا کہ اللہ تعالیٰ ان کی ان تقصیرات اور ان غلطیوں میں سے خیر اور برکت کا پہلو نکال دے۔ اگرچہ ان غلطیوں کی وجہ سے وہ چوٹیں کھائیں، قربانیاں دیں اور وقتی طور پر شکست کھالیں۔ وہ ان غلطیوں سے ان کے تجربے میں اضافہ کرے گا۔ اس طرح ان کا عقیدہ صاف ہو جائے گا۔ ان کے دل صاف ہوں گے۔ ان کی صفوں کی تطہیر ہوگی اور اس طرح آخر کار وہ اس

نصرت کے حق دار ہو جائیں گے جس کا وعدہ اللہ نے کیا ہے۔ آخری انجام خیر و برکت پر ہوگا، مسلمان اللہ کی بارگاہ سے، اس کی رحمت و عنایت سے دھتکارے نہیں جاتے بلکہ اللہ تعالیٰ انہیں مزید زادِ راہ سے نوازتا ہے۔ اگرچہ اثنائے راہ میں انہیں تکالیف پہنچیں، مشکلات کا سامنا ہو اور رنج و الم سے دوچار ہوں۔

اس وضاحت کے ساتھ اور فیصلہ کن انداز میں اللہ تعالیٰ جماعتِ مسلمہ سے خطاب فرماتے ہیں۔ ان کے اس سوالیہ انداز میں اور جو واقعات پیش آئے، ان پر ان کی حیرانی اور پریشانی کا جواب دیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ان واقعات کا قریبی سبب کیا تھا؟ نیز یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ اس میں تقدیر الہی کے اندر دور رس حکمت کیا پوشیدہ تھی؟ اور منافقین کو بتایا جاتا ہے کہ موت کا ایک حق راستہ ہے۔ ڈر سے موت ملتی نہیں اور نہ ہی جہاد میں شرکت نہ کرنے سے موت موخر ہو جاتی ہے۔

”اور تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ اس سے دو گنی مصیبت تمہارے ہاتھوں ان پر پڑ چکی ہے۔ اے نبی ان سے کہو، یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

جنگِ احد میں مسلمانوں پر جو مصائب آئے وہ سب کے سامنے ہیں۔ ستر آدمی شہید ہوئے اور زخمی اور مزید مصائب ان کے علاوہ تھے۔ بہت ہی کڑوا دن تھا یہ ان کے لئے۔ ان پر یہ مصائب نہایت ہی شاق تھے اور ناقابلِ برداشت تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ مسلمان ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کر رہے ہیں، اور ان کے مخالفین اللہ کے دشمن ہیں اور مشرک ہیں اور مسلمان جو اس مصیبت میں مبتلا ہوئے، اس سے پہلے وہ ان دشمنانِ اسلام کو دو گنا نقصان پہنچا چکے تھے۔ یہ اشارہ ہے بدر کی طرف وہاں انہوں نے کفار کو نقصان پہنچایا تھا جبکہ وہ اللہ کے حکم پر درست کھڑے تھے۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر عمل پیرا تھے۔ اس سے قبل کہ وہ مالِ غنیمت کو دیکھ کر بے راہ ہو جائیں۔ اور اس سے قبل کہ ان کے دلوں میں ایسے خیالات پیدا ہوں جو ایمان کے ساتھ لگا نہیں کھاتے۔

اللہ انہیں یہ سب باتیں یاد دلاتے ہیں اور ان کے اس حیرانی سے بھرے ہوئے سوال کا جواب یوں دیتے ہیں کہ اس کا براہ راست سبب تو خود ان کے افعال تھے۔ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ..... ”اے نبی ان سے کہو یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔“

یہ خود تمہارے نفوس تھے، جن میں خلل آگیا، تم متفرق ہو گئے اور باہم تنازعہ کرنے لگے اور یہ تم ہی تھے جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی شرائط پر عمل نہ کیا۔ یہ تمہارے ہی نفوس تھے جن میں طمع اور لالچ داخل ہو گئی، اور یہ تم ہی تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے صریح احکام کی خلاف ورزی کی اور آپ کے جنگی منصوبے کو سبوتاژ کیا۔ پس یہ نتائج جن سے تم دوچار ہوئے اور جنہیں تم انہونی قرار دیتے ہو، اور تم کہتے ہو کہ یہ حالات کیسے پیش آ گئے؟ تو جواب یہ ہے کہ یہ تمہاری اپنی وجہ سے ہوا۔ تم پر تو اللہ تعالیٰ کی سنت الہیہ کا انطباق ہوا ہے۔ جب تم نے اپنے آپ کو اس سنت کے سامنے پیش کیا۔ انسان جب اپنے آپ کو سنت الہیہ کے سامنے پیش کرتا ہے تو وہ سنت اس پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ یہ شخص مسلم ہو یا مشرک ہو، اس سلسلے میں کسی رو رعایت نہ ہوگی۔ لہذا کسی کے اسلام کا کمال یہ ہونا چاہئے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کی سنت کے مطابق ڈھال لے اور وہ یہ کام پہلے ہی کر لے۔

إِنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ..... ”اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“ اور اس کی قدرت کا ہی یہ تقاضا ہے کہ وہ اپنی سنت کو نافذ فرماتا ہے۔ وہ اس کائنات میں اپنے ناموس کی کار فرمائی قائم کراتا ہے۔ اور تمام کام اس کی قدرت اور ارادے کے مطابق چلتے ہیں۔ اور یہ بھی اس کی قدرت کا تقاضا ہے کہ اس کی سنت معطل نہ ہو، جس پر اس نے اس کائنات اس زندگی اور زندگی کے ان واقعات کو چلایا ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ یہ بات پیش نظر رہے کہ تمام واقعات کی پشت پر اللہ کی تقدیر ہوتی ہے اور اس میں کوئی حکمت پوشیدہ ہوتی ہے، جس کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ ہر معاملہ جو پیش آتا اور ہر حادثہ جو واقعہ ہوتا ہے اس کی پشت پر اللہ کی تقدیر ہوتی ہے۔ ہر حرکت اور ہر سکون کے پیچھے دست تقدیر ہوتا ہے اور اس کائنات میں جو وقوعہ بھی پیش آتا ہوتا ہے اس کی پشت پر تقدیر ہوتی ہے۔

وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجُجُمَاتِ فَيَذِّبَ اللَّهُ..... ”جو نقصان لڑائی کے دن جب دو گروہ متقابل ہوئے، تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا۔“ یہ نقصان محض اتفاق سے یا سوائے اتفاق سے از خود پیش نہیں آیا۔ نہ وہ خواہ مخواہ بطور عبث پیش آیا۔ اس لئے کہ اس کائنات کے اندر ہونے والی ہر حرکت منصوبہ اور دست قدرت کے مطابق ہوتی ہے اور مجموعی لحاظ سے ان واقعات کے پیچھے حکمت پوشیدہ ہوتی ہے اور مجموعی لحاظ سے یہ واقعات اس پوری کائنات کی اسکیم کے مطابق ہوتے ہیں۔ اور اس کے باوجود وہ اس کائنات کے اندر جاری سنن الہیہ اور ان اٹل قوانین کے مطابق ہوتے ہیں جن کا کبھی بھی نہ تخلف ہوتا، نہ ان میں کوئی تعطل ہوتا ہے اور نہ ہی وہ قوانین کسی کے ساتھ رورعایت کرتے ہیں۔

تقدیر کے مسئلے میں اسلامی تصور حیات اس قدر کامل، شامل اور متوازن ہے، جس کا مقابلہ آغاز انسانیت سے لے کر آج تک کوئی تصور حیات نہیں کر سکتا۔

اسلامی تصور حیات کے مطابق اس کائنات کا ایک اٹل قانون ہے اور بعض ناقابل تعطل سنن الہیہ ہیں۔ ان اٹل قوانین فطرت اور ناقابل انحراف سنن الہیہ کے پیچھے اللہ کا ارادہ کام کرتا ہے اور اللہ کی آزاد مشیت ہے، جو کسی قید میں مقید نہیں ہے۔ اور ان سب یعنی سنن الہیہ اور مشیت الہیہ کی پشت پر پھر اللہ کی حکمت مدبرہ ہے۔ اور یہ تمام پھر اللہ کی حکمت مدبرہ کے موافق چلتے ہیں۔ ناموس کی حکمرانی ہے اور سنن الہیہ میں ہر چیز جاری ہیں، انسان بھی ان کا تابع و محکوم ہے۔ انسان ان سنن الہیہ کے دائرے میں اپنے فعل ارادی کے ساتھ اپنے دائرہ اختیار کے اندر کام کرتا ہے۔ اور وہ اپنی سوچ اور اپنی تدابیر کے مطابق جو کام کرتا ہے، یہ سنن ان افعال پر بھی منطبق ہوتی ہیں اور اس پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ اللہ کی تقدیر اور مشیت کے مطابق ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس میں اللہ کی کوئی حکمت اور تدبیر بھی کام کرتی ہے۔ اس نظام میں انسان کا ارادہ، اس کی حرکت، اس کی سوچ، اس کی قوت عمل یہ سب کچھ سنن الہیہ کا ایک حصہ ہیں۔ وہ ناموس کائنات کا حصہ ہیں۔ ان انسانی افعال کے ساتھ بھی اللہ اپنا کام کرتے ہیں، ان کو بھی وہ موثر بناتے ہیں اور یہ سب کچھ پھر بھی اس کے دائرہ قدرت

کے اندر ہوتا ہے۔ ان میں سے کوئی چیز نوا میس فطرت اور سنن الہیہ کے دائرے سے خارج نہیں ہوتی۔ اور نہ انسان کی کوئی حرکت اور سوچ ان سنن کے ساتھ متضاد ہوتی ہے یا ان کے بالمقابل ہوتی ہے۔ بعض لوگوں کی سوچ یہ ہے کہ وہ ترازو کے ایک پلڑے میں اللہ کے ارادے کے بالمقابل ہو۔ یہ صورت حال بالکل ممکن نہیں ہے۔ اسلامی تصور حیات ایسا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ انسان اس کا شریک بالمقابل نہیں ہے۔ نہ انسان اللہ کا دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو اس کا وجود اس کی فکر اس کا ارادہ بخشا تھا اس کی تقدیر اس کی تدبیر اور زمین کے اندر اس کی فاعلیت اسے عطا کی تھی تو اس نے اس وقت ان انسانی قوتوں اور سنن الہیہ کے درمیان کوئی تضاد نہ رکھا تھا اور نہ ان کے درمیان کوئی مقابلہ رکھا تھا۔ نہ یہ چیزیں مشیت الہیہ کے خلاف تھیں۔ نہ اللہ کے نزدیک یہ سب امور اللہ کی گہری حکمت سے باہر تھے۔ جو اللہ کی تقدیر کی پشت پر کار فرما ہے۔ اللہ کی سنت اور اللہ کی تقدیر کے اندر یہ بات رکھی گئی تھی کہ انسان اپنی تدبیر سے کام لے۔ وہ متحرک ہو اور اس کائنات میں مؤثر ہو۔ وہ سنن الہیہ کے بالمقابل کھڑا ہو اور وہ اس پر منطبق ہوں اور اللہ کی سنن کے تحت اس دنیا میں اسے لذت و الم آرام و بے آرمی، سعادت و شقاوت سے دوچار ہونا پڑے اور پھر اس کی ان تمام سرگرمیوں کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر کام کرے جس کے احاطے میں یہ پوری کائنات ہے نہایت ہی توازن اور تناسق کے ساتھ۔

یہ واقعات جو احد میں وقوع پذیر ہوئے، وہ اسلامی تصور حیات کی مثال تھے، یعنی تقدیر کے حوالے سے جو ہم بات کر آئے ہیں۔ ان واقعات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو سکھایا کہ فتح و شکست کے بارے میں اس کی سنت کیا ہے۔ انہوں نے اللہ کی سنت اور اس شرط کی خلاف ورزی کی جو اس نے فتح کے لئے رکھی ہوئی تھی تو اس نے انہیں ان آلام اور ان مصائب سے دوچار کیا جو احد میں انہیں پیش آئے۔ لیکن بات یہاں آکر ختم نہیں ہو گئی۔ اس مخالفت اور رنج و الم کے پیچھے یہ تقدیر کام کر رہی تھی کہ ان کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اسلامی صفوں میں منافقین کو چھانٹ کر علیحدہ کر دے۔ اہل ایمان کے دلوں کو صاف کر دے اور ان کے تصورات کے اندر جو ملاوٹ اور میل تھی اسے دور کر دے یا ان کے کردار میں جو ضعف اور کمزوری تھی وہ دور ہو جائے۔

بظاہر وہ رنج و الم سے دوچار ہوئے، لیکن اپنی جگہ اہل ایمان کے حق میں مستقبل کے اعتبار سے یہ خیر تھا۔ اگرچہ یہ رنج و الم بھی سنت الہی کے عین مطابق تھا، اللہ کے سنن میں سے ایک سنت یہ بھی ہے جو مسلمان اسلامی نظام حیات کو قبول کر کے اس کے آگے سر تسلیم خم کریں گے اور عموماً اسلامی نظام کی اطاعت کریں گے، اللہ ان کی حمایت و رعایت کرے گا اور ان کی غلطیاں بھی اپنی انتہاء پر جا کر وسیلہ ظفر اور ذریعہ خیر ہوں گی۔ اگرچہ وہ رنج و الم سے دوچار ہوں، کیوں؟ اس لئے کہ رنج و الم اور مصائب و شدائد کے ذریعہ تربیت ہوتی ہے، اسلامی صفوں سے کھوٹ دور ہوتا ہے اور آئندہ مرحلے کی خوب تیاری ہوتی ہے۔

اس مضبوط اور کھلے موقف پر مسلمانوں کے قدم جم جائیں گے، ان کے دل مطمئن ہوں گے، ان میں کوئی تزلزل نہ ہو گا، کوئی حیرانی نہ ہو گی اور کوئی پریشانی نہ ہو گی۔ اس طرح وہ اللہ کی تقدیر کو انگیز کریں گے، اس کائنات میں سنن الہیہ کے مطابق اپنے معاملات سرانجام دیں گے۔ انہیں یقین ہو گا کہ اللہ ان کی ذات اور ان کے ماحول میں فعال لمایرید ہے اور یہ کہ وہ تقدیر الہی کے آلات اور ذریعہ کار ہیں۔ اللہ جس طرح چاہے اپنے آلات کار کو استعمال کر سکتا ہے، یہ کہ ان کے درست فیصلے، ان کے صائب فیصلے اور درست فیصلوں کے اثرات اور غلط فیصلوں کے نتائج سب کے سب اللہ کی تقدیر کے پردے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ ان میں اس کی کوئی نہ کوئی حکمت ہوتی ہے اور جب تک وہ اس راہ انقلاب پر گامزن رہیں گے، ان کے لئے ہر مرحلہ خیر ہی خیر ہو گا۔

وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجُمُعَاتِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلْيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِينَ (۱۶۲) وَلْيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ اذْفَعُوا قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَا تَبْعُنَاكُمْ هُمْ لِلْكَفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ (۱۶۷)

”جو نقصان تمہیں اس دن پہنچا جس دن دو جمعیتوں کے درمیان ٹکڑ ہوئی، وہ اللہ کے اذن سے تھا۔ اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ لے کہ تم میں سے کون مومن ہیں اور منافق کون ہیں؟ وہ منافق کہ جب ان سے کہا گیا ”آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا کم از کم (اپنے شہر) کی مدافعت ہی کرو۔ تو کہنے لگے ”اگر ہمیں علم ہوتا کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔“ یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتیں۔ اور جو کچھ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ خوب جانتا ہے۔“

اس آیت میں عبد اللہ ابن ابی السلول اور اس کے ساتھیوں کے موقف کی طرف اشارہ ہے۔ انہیں جو خطاب دیا گیا ہے وہ الَّذِينَ نَافَقُوا (وہ لوگ جنہوں نے نفاق کیا) کا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر ان کا پردہ فاش کر دیا۔ اور اسلامی صفوں سے انہیں جدا کر دیا۔ اور ان کے اس دن کے موقف پر یہ تبصرہ کیا هُمْ لِلْكَفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ (اس وقت وہ ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے) یہ کہ وہ اپنے اس احتجاج میں سچے نہ تھے کہ آج مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگ نہیں ہو رہی ہے۔ اس لئے وہ واپس ہو رہے ہیں۔ اس لئے کہ ان کی وابستگی کافی الحقیقت یہ سبب نہ تھا۔ بلکہ وہ ”جو کچھ اپنے منہ سے کہہ رہے تھے وہ بات ان کے دل میں نہ تھی۔“ ان کے دلوں میں تو نفاق کی بیماری تھی۔ اور یہ نفاق انہیں نظریہ حیات کے تابع نہ کرتا تھا بلکہ وہ ان کی شخصیات اور ان کی ذاتی حیثیات کو نظریہ حیات سے زیادہ اہمیت دیتا تھا۔ ان لوگوں کے رئیس عبد اللہ ابن ابی السلول نے یہ اعتراض بھی کیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے احد کی دن اس کی رائے کو قبول نہیں کیا۔ اور اس واقعہ سے پہلے کے اسباب یہ تھے کہ جب رسول اکرم ﷺ اپنی رسالت کے پیغام کو لے کر مدینہ طیبہ پہنچے تو اس وقت عبد اللہ ابن ابی کی سربراہی میں ایک ریاست کی تشکیل کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کے لئے تاج بن رہا تھا۔ آپ ﷺ کی آمد کے نتیجے میں ریاست کا مقام حاملین اسلام نے حاصل کر لیا۔ یہ بات ان کے دل میں تیر کی طرح پیوست تھی۔ اور یہی وجہ تھی کہ وہ احد کے دن واپس ہو گئے تھے۔ چونکہ دشمن مدینہ کے دروازے پر تھے اس لئے یہ لوگ واپس ہو گئے اور مومن صادق کی یہ بات انہوں نے رد کر دی۔ یہ مومن صادق عبد اللہ بن عمرو ابن حزام تھے۔ وہ انہیں پکار

رہے تھے تَعَالَوْا قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوْ اذْفَعُوا..... ”(آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دفاع ہی کرو) اس کے جواب ان کا احتجاج واستدلال یہ تھا کہ ان کے خیال میں کوئی جنگ نہیں ہے۔ اگر کوئی بات ہوتی وہ ضرور جاتے۔ اور ان کے موقف کی تردید یوں کی گئی وَاللَّهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ..... ”اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہیں اللہ اسے خوب جانتا ہے۔“

یوں وہ اپنے تخلف اور پلٹنے کو حکمت اور مفید قرار دیتے ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو نقصان اور ضرر رساں قرار دیتے ہیں۔ اور اس سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اسلام کے صاف اور ستھرے تصور حیات کو خراب کرتے ہیں، کیونکہ اسلامی تصور حیات کے مطابق ہر شخص کی موت کا وقت مقرر ہوتا ہے۔ موت و حیات کی حقیقت یہ ہے کہ ان کا تعلق تقدیر الہی کے ساتھ ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ یہاں ان کے ان غلط تصورات کی تردید ضروری سمجھتے ہیں۔ فوراً ان کے اس تصور کی واضح تردید کر دی جاتی ہے، جس سے ایک طرف ان کی تیار کی ہوئی سازش کے تار و پور بکھر جاتے ہیں اور دوسری جانب سے اسلامی تصور حیات ہر قسم کے اجمال اور دھندلے پن سے پاک و صاف ہو جاتا ہے۔ فرماتے ہیں قُلْ فَاذْرُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صَادِقِيْنَ..... ”ان سے کہو اگر تم اپنے اس قول میں سچے ہو تو خود تمہاری موت جب آئے تو اسے ٹال کر دکھا دینا۔“

موت تو جس طرح مجاہد کو آتی ہے اسی طرح جو لوگ گھر میں بیٹھے رہتے ہیں، انہیں بھی آتی ہے، بہادر کو بھی آتی ہے اور بزدل کو بھی آتی ہے۔ نہ کوئی محافظ اسے ٹال سکتا ہے اور نہ کوئی احتیاطی تدبیر۔ نہ بزدلی اور جہاد سے غیر حاضری سے وہ ٹل سکتی ہے۔ اور یہ صورت حال ایسی ہے، جو خود اپنی دلیل آپ ہے اور اس میں کسی شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہی حقیقی صورت حال ہے جس کو قرآن مجید خود ان کے خلاف پیش کرتا ہے۔ یوں ان کی مکر وہ سازش کو رد کر دیا جاتا ہے۔ سچائی کو اپنی جگہ رکھ کر مستحکم کر دیا جاتا ہے۔ مسلمانوں کے دل مطمئن اور مضبوط ہو جاتے ہیں۔ انہیں اطمینان، آرام اور ذوق یقین سے سیراب کر دیا جاتا ہے۔

واقعات احد کے بیان کے اس انداز کی طرف ذہن انسانی ملتفت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اس بیان میں اس واقعہ یعنی عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں کی روگردانی کو بہت ہی موخر کر کے لایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ واقعہ اس معرکے کے ابتدائی دور میں ہوا تھا اور معرکے کے آغاز ہی سے وہ واپس ہو گیا تھا۔ اسے اول میں بیان کرنے کے بجائے آخر میں لایا گیا یہ کیوں؟

یہ تاخیر اس لئے کی گئی کہ اس میں بھی قرآن کریم کے انداز تربیت میں سے ایک خاص انداز کا اظہار کیا گیا ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس حادثہ پر تبصرے سے قبل وہ تمام اساسی تصورات بیان کر دیئے جو اسلامی نظام زندگی کے بنیادی قواعد میں شمار ہوتے ہیں اور جب مسلمانوں کے ذہن میں وہ تمام احساسات جاگزیں ہو گئے، اور مسلمانوں کی اقدار کے لئے حقیقی پیمانے وضع ہو گئے تو آخر میں ان لوگوں کی طرف اشارہ کر دیا گیا جنہوں نے نفاق اختیار کیا تھا۔ ان کے کردار اور ان کی سرگرمیوں کو بے نقاب کیا گیا۔ ایسے موقع پر ان لوگوں کے خلاف تنقید آئی جب مسلمانوں کے ذہن اس کے لئے تیار تھے اور اس قابل ہو گئے تھے کہ معلوم کر سکیں کہ ان کے افکار و تصورات کے اندر کیا کیا انحراف ہے اور کیا کیا کمزوریاں ہیں؟ اور یہ کہ ان کے پیمانے کس قدر غلط ہیں؟ اور یہ کہ ایک مومن کے دل و دماغ کے اندر افکار اور تصورات اور حسن و قبح کے پیمانے ایسے ہونے چاہئیں اور کسی فرد اور قوم کے اعمال کا جائزہ ان پیمانوں کے مطابق ہونا چاہئے اور اس کے بعد جب مومن پر اعمال اور افراد کو پیش کیا جاتا ہے تو وہ ایک روشن مزاج اور ایمانی احساس اور ایمانی سرمایہ حکمت کی روشنی میں ان پر فوراً حکم لگاتا ہے کہ کیا کمتر ہے اور کیا بہتر ہے۔ کون صالح ہے اور کون برا ہے۔

یہ قرآنی انداز بیان کا ایک خاص رنگ ہے۔ عبداللہ ابن ابی اس وقت تک اپنی قوم کا سرکردہ لیڈر تھا جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ہے۔ وہ اس لئے سوچ گیا کہ رسول اکرم ﷺ نے اس کی رائے کو قبول نہ کیا تھا۔ اس لئے کہ نبی ﷺ نے اصول مشورہ کو رائج کرنا تھا۔ پھر جو بات طے ہو جائے اس کو نافذ کرنا تھا چاہے وہ غلط ہی کیوں نہ ہو کیونکہ دوسری رائے کے سلسلے میں لوگوں کو رجحان ظاہر ہو گیا تھا۔ اس شخص کی اس روگردانی کی وجہ سے اسلامی صفوں کے اندر بڑی افراط فری پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے افکار

میں تزلزل پیدا ہو گیا تھا۔ پھر اس کی رائے کی اہمیت اور بھی واضح ہو گئی جب شکست ہوئی اور لوگوں کو حسرت اور افسوس ہونے لگا۔ اور دلوں میں یہ بات آئی کہ اسی کے کہنے پر عمل کر لیا ہوتا۔ اسلامی منہاج کے لئے یہ ضروری تھا کہ اس کی رائے اور اس کے اس فعل کو قدرے نظر انداز کر کے اور غیر اہم کر کے پیش کیا جائے اور جنگ کے واقعات کا آغاز اس واقعہ سے نہ کیا جائے۔ حالانکہ یہ حادثہ پہلے درپیش ہوا تھا۔ اس واقعہ کو اس قدر موخر کرنے اور پھر اسے بیان کر کے اس گروہ پر نفاق کا لیبل چسپاں کر دینے اور پھر ان کے لئے غائب اور مجہول صیغے کا استعمال اور اس گروہ کے سرغنے کا ذکر نہ کرنے سے اور انہیں الَّذِينَ نَافَقُوا..... کہہ کر پکارنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ان کی اہمیت کو کم کیا جائے اور یہ بات اصولاً ان تمام لوگوں پر چسپاں ہو جو ایسی حرکات کرتے ہیں اور بات اس طرح اصولی رنگ اختیار کرے جس طرح آغاز کلام میں اسے اصولی رکھا گیا تھا۔



اہل اسلام کے دلوں کے اندر سکون پیدا کرنے، ان کے دلوں اور ان کے ضمیر کو، ان سنن الہیہ پر مطمئن کرنے کے بعد جو اس کائنات میں جاری اور ساری ہیں، انہیں یہ بتانے کے بعد کہ تمام کام اللہ کی تقدیر کے مطابق ہوتے ہیں، اور یہ سمجھانے کے بعد کہ اللہ کی تقدیر کے پیچھے اللہ کی حکمت اور تدبیر کام کر رہی ہوتی ہے۔ اور یہ بات ذہن نشین کرنے کے بعد کہ موت کے لئے وقت مقرر ہے، اس کا وقت پہلے سے طے شدہ ہے اور جنگ میں شریک نہ ہونا اسے موخر نہیں کر سکتا اور جنگ میں شرکت سے موت پہلے نہیں آسکتی اور یہ سمجھانے کے بعد کوئی محافظ موت سے حفاظت نہیں دے سکتا اور کوئی تدبیر موت کو روک نہیں سکتی، غرض ان تمام امور کے بعد اب سیاق کلام میں ایک دوسری حقیقت کو لیا جاتا ہے۔ یہ حقیقت اپنی ذات میں بھی عظیم ہے اور اس کے اثرات بھی نہایت ہی عظیم ہیں۔

یہ حقیقت کیا ہے؟ یہ کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں وہ مردہ نہیں ہوتے، وہ تو زندہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے رب کے ہاں مہمان خصوصی ہوتے ہیں۔ ان کی زندگی، مرنے کے بعد، اسلامی جماعت کی زندگی سے منقطع نہیں ہوتی، وہ بعد کے واقعات سے لا تعلق نہیں ہوتے، وہ ان واقعات سے خود بھی

متاثر ہوتے ہیں اور واقعات میں ایک موثر فیکٹر بھی ہوتے ہیں اور زندگی عبارت کس چیز سے ہے؟ تاثر اور تاثر ہی تو زندگی ہے۔

یہاں معرکہ احد کے شہداء کی زندگی اور ان واقعات اور حادثات کے درمیان رابطہ قائم کر دیا جاتا ہے جو ان کی شہادت کے بعد پیش آئے۔ اس کے بعد گروہ مومن کی بات متصلاً بیان کر دی جاتی ہے، جس نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی پکار پر لبیک کہا۔ درآنحالیکہ وہ زخموں سے چور چور تھے۔ وہ نکلے، انہوں نے قریش کا تعاقب کیا، یہ قریش اگرچہ جاچکے تھے لیکن یہ خطرہ موجود تھا کہ وہ دوبارہ مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں۔ اس گروہ نے لوگوں کے اس ڈرامے کی کوئی پرواہ نہ کی کہ قریش پھر سے جمع ہو رہے ہیں۔ ذات باری پر توکل کی اور انہوں نے اس کارنامے کی وجہ سے اپنے ایمان کو حقیقت کا روپ دیا۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ
يُرْزَقُونَ (۱۶۹) فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ
لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ
(۱۷۰) يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ
الْمُؤْمِنِينَ (۱۷۱) الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ
لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقُوا أَجْرٌ عَظِيمٌ (۱۷۲) الَّذِينَ قَالُوا لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ
النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ
الْوَكِيلُ (۱۷۳) فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَمْ يَمَسَّ مِنْهُمْ شُوءٌ وَاتَّبَعُوا
رِضْوَانَ اللَّهِ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ (۱۷۴) إِنَّمَا دَرَكُوا الشَّيْطَانَ يُخَوِّفُ
أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا رَبَّكَ إِن كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ (۱۷۵)

”جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پارہے ہیں، جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش و خرم ہیں، اور مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے ہیں ان کے لئے بھی کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں و فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کے اجر کو ضائع نہیں کرتا۔ (ایسے مومنوں کے اجر کو) جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا..... ان میں جو اشخاص نیکو کار اور پرہیزگار ہیں ان کے لئے بڑا اجر ہے..... جن سے لوگوں نے کہا کہ ”تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، ان سے ڈرو“ تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ”ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔“ آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے، ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہو گیا، اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔ اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا۔ لہذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں صاحب ایمان ہو۔“

مومنین کے دل و دماغ میں تقدیر اور موت کے مقررہ وقت کے بارے میں صحیح تصورات بٹھانے کے بعد اور منافقین اسلامی صفوں کے اندر جو بے چینی، شکوک اور حسرتیں پیدا کرتے تھے ان کی تردید کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ مناسب سمجھا کہ اہل ایمان کے دلوں کے اندر مزید سکون اور پورا اطمینان پیدا کیا جائے۔ اس لئے منافقین مسلسل یہ پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ اگر تم اتنے ہی باتدبیر ہو تو خود اپنی موت کو روک لینا جب وہ آئے۔ لیکن سابقہ آیات میں پیدا کردہ ایمان و یقین اور اس مسکت جواب کے بعد اللہ نے چاہا کہ ان کے دلوں میں شہداء کے مستقبل کے بارے میں مزید اطمینان پیدا کر دیا جائے۔ وہ شہداء جو اللہ کی راہ میں قتل ہوئے (اور شہداء ہوتے ہی وہ ہیں جو اللہ کی راہ میں قتل ہوں) اور ان کے پیش نظر یہی مقاصد ہوں۔ اور ان مقاصد کے ساتھ کوئی اور مقصد شریک نہ ہو۔ تو ایسے شہداء جو فی سبیل اللہ قتل ہوئے وہ فی الحقیقت زندہ جاوید ہیں۔ ان کو ایسے خصائص حاصل ہیں جو زندہ لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ انہیں ان کے رب کے ہاں کھانے دیے جاتے ہیں اور

کھانے کے علاوہ ان پر فضل خداوندی ہے اور اس فضل پر وہ بہت خوش ہیں، اور ان کو پھر اہل ایمان کے معاملات کی رپورٹ دی جاتی ہے جن معاملات کے لئے انہوں نے اپنی جان دی۔ وہ پورے واقعات ان کو سنائے جاتے ہیں۔ ان کے بعد بھائیوں کے ساتھ جو واقعات پیش آتے ہیں وہ اس کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ اور یہ سب خواص وہ ہیں جو زندہ لوگوں کو حاصل ہوتے ہیں مثلاً ساز و سامان، خوشخبری، اہتمام اور تاثر اور تاثیر۔ یہ سب زندہ لوگوں کی صفات ہیں۔ لہذا ان کی جدائی وفات حسرت آیات نہیں ہے۔ وہ زندہ ہیں، ان کا رابطہ زندوں کے ساتھ قائم ہے اور اس کے علاوہ مزید فضل یہ کہ وہ فضل الہی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ فضل ان کے رزق اور مرتبے و مقام سے علیحدہ ہے۔ اس لئے لوگ شہداء اور ان کے بعد رہنے والے بھائیوں کے درمیان جو فرق کرتے ہیں وہ درحقیقت کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ اس لئے لوگوں کے ذہنوں میں عالم الحیاۃ اور عالم مابعد المات کے اندر جو فرق ہے وہ شہداء کے حوالے سے کچھ نہیں ہے۔ مومنین کے نقطہ نظر سے کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے کہ ان کا معاملہ یہاں بھی اللہ سے ہے اور وہاں بھی اللہ سے ہے۔

اس حقیقت کو ذہن میں بٹھانے کے بعد اس دنیا کے واقعات پر سوچنے کے انداز بدل جاتے ہیں۔ یہ حقیقت انسان کی سوچ بدل دیتی ہے۔ اس کائنات کے بارے میں ایک مومن کے اندر ایک بالکل نئی سوچ پیدا ہو جاتی ہے۔ کائنات کی یہ حرکت ایک مومن کے نقطہ نظر سے اپنے اندر تسلسل رکھتی ہے۔ وہ کبھی منقطع نہیں ہوتی۔ یوں ایک انسان جب مر جاتا ہے تو اس کی زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا بلکہ موت وجہ سے قبل المات اور بعد المات زندگی میں ایک پردہ ساحل ہو جاتا ہے۔

یہ موت وحیات کے لئے ایک نیا نقطہ نظر ہے۔ اس سے ایک مسلمان کے شعور میں عظیم انقلاب برپا ہوتا ہے۔ مسلمان کی زندگی اور موت دو کا استقبال ایک مخصوص نقطہ نظر کے ساتھ کرتے ہیں۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ
يُرْزَقُونَ..... ”اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پارہے ہیں۔“

یہ آیت اس بارے میں نص قطعی ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے، جنہوں نے زندگی قربان کر دی، اور لوگوں کی نظروں سے غائب ہو گئے انہیں مردہ کہنا یا سمجھنا ممنوع ہے۔ اور یہ آیت اس امر میں بھی قطعی ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ اپنے رب کے ہاں رزق پارہے ہیں۔ اور اس نہی اور اثبات کے بعد اس آیت میں ان خصائص حیات کا ذکر ہوتا ہے اور ان کے رزق دیئے جانے کا ذکر ہے۔

ہم اس جہاں فانی میں، شہداء کی زندگی سے صحیح معرفت نہیں پاتے۔ ہاں ان شہداء کی زندگی کے بعض اوصاف بعض احادیث میں ذکر ہوئے ہیں، لیکن اللہ جل شانہ کی طرف سے بذریعہ وحی آئی ہوئی یہ آیت ہمارے لئے اس ضمن میں کافی و ثنائی ہے۔ اس لئے کہ اللہ علیم وخبیر ہے اور صرف اللہ ہی اس بات کا ضامن ہے کہ وہ موت و حیات کے بارے میں تصورات کو بدل دے۔ یہ کہ ان کے درمیان کس حد تک دوئی اور جدائی ہے اور کس قدر اتحاد و اتصال ہے۔ اور یہ بات اللہ ہی بتا سکتا ہے کہ معاملات بعینہ ایسے نہیں ہیں جس طرح بظاہر ہمیں ہوتے ہوئے نظر آتے ہیں یا جس طرح ہم ان کا ادراک کر سکتے ہیں۔ اور ہم جب بے قید اور مطلق حقائق کے معانی اپنے اذہان میں مقرر کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ یہ مفہیم آخری مفہومات ہیں اور یہ کہ ہم نے حقائق بعد المات کا کماحقہ ادراک کر لیا ہے۔ لہذا ہمارے لئے یہ بہتر ہے کہ ہم صرف ذات باری تعالیٰ کے بیان کا انتظار کریں کہ اللہ نے کیا کہا ہے، اور اس پر اکتفاء کریں۔

شہداء وہ لوگ ہیں جو بظاہر قتل ہو جاتے ہیں۔ بظاہر ان کی زندگی ان سے جدا ہو جاتی ہے اور وہ بھی زندگی سے جدا ہو جاتے ہیں، جس طرح ہمیں نظر آتا ہے لیکن چونکہ وہ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں، اور تمام دنیاوی اغراض کو ترک کر کے قتل ہوتے ہیں، دنیا کی چھوٹی چھوٹی اغراض کو وہ چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کی روحیں اللہ سے مل جاتی ہیں، اس لئے وہ اپنی روحوں کو اللہ کی راہ میں قربان کر دیتے ہیں۔ اور وہ اسی طرح بظاہر قتل ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ جو مخبر صادق ہے ہمیں اطلاع دیتے ہیں کہ وہ مردہ نہیں اور ہمیں منع کرتے ہیں کہ انہیں زبان سے بھی مردہ نہ کہو۔ اور تاکید مزید فرماتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔ انہیں باقاعدہ رزق دیا جاتا ہے اور وہ اللہ کا رزق اس طرح حاصل کرتے ہیں جس طرح

زندہ لوگ حاصل کرتے ہیں۔ اور اسی طرح اللہ تعالیٰ ہمیں ان کی بعض دوسری خصوصیات کی بھی اطلاع دیتے ہیں، مثلاً

فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ..... ”جو کچھ اللہ نے اپنے فضل سے انہیں دیا ہے اس پر خوش اور خرم ہیں۔“ یعنی وہ اللہ کے ہاں سے آیا ہوا رزق بڑی فرحت کے ساتھ حاصل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں اچھی طرح ادراک ہو چکا ہوتا ہے کہ یہ تو اللہ کا فضل خاص ہے۔ یہ فضل خاص ان کے لئے ثبوت ہے اللہ کی رضامندی کا، اس لئے کہ وہ اس کی راہ میں قتل ہوئے۔ پس اس سے زیادہ ان کے لئے اور کیا چیز سامان فرحت ہو سکتی ہے کہ انہیں اللہ کا رزق اس احساس کے ساتھ ملے کہ وہ ان سے راضی بھی ہو چکا ہے۔

اس کے بعد یہ خصوصیت کہ ان کے دل ان لوگوں کے حالات کے اندر مشغول ہیں اور دلچسپی لے رہے ہیں جو اس دنیا میں زندہ رہ رہے ہیں اور ان کے زندہ رہنے والوں کے انجام کے بارے میں بہت ہی مطمئن ہیں۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ ان سے بھی اللہ تعالیٰ راضی ہے۔

يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةِ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ الْمُؤْمِنِينَ

”اور مطمئن ہیں کہ جو اہل ایمان ان کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی وہاں نہیں پہنچے، ان کے لئے بھی کسی رنج و خوف کا موقعہ نہیں ہے۔ وہ اللہ کے انعام اور اس کے فضل پر شاداں اور فرحاں ہیں اور ان کو معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ مومنوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔“

وہ اپنے بھائیوں سے منقطع نہیں ہو گئے، جو ابھی وہاں نہیں پہنچے اور ان سے جدا ہو گئے ہیں۔ وہ زندہ ہیں، ان کے ساتھ ہیں اور دنیا اور آخرت میں پیچھے آنے والوں سے جو کچھ ملنے والا ہے، اس پر وہ بہت ہی خوش ہیں اور وہ اس لئے شاداں و فرحاں ہیں کہ ان آنے والوں کے لئے بھی کسی رنج و خوف کا موقعہ نہیں ہے۔ وہ اپنے رب کے ہاں جو اعلیٰ درجے کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس سے انہیں معلوم

ہو گیا ہے کہ آنے والوں کے بھی مزے ہیں۔ اس لئے کہ ان پر بے بہا فضل و کرم ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا مومنین صادقین کے ساتھ یہی تعلق ہوتا ہے کہ وہ ان کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

سوال یہ ہے کہ زندگی کے خصائص میں سے کون سا وہ خاصہ ہے جو ان شہداء فی سبیل اللہ کو حاصل نہیں ہے؟ اور وہ کیا چیز ہے جو آنے والے مومنین سے ان کو ممتاز کرتی ہے اور یہ کہ ان کے اس انتقال کی وجہ سے پھر حسرت، فقدان اور وحشت اور افسوس کا کیا موقعہ ہے؟ یعنی پسماندگان کے لئے افسوس کا کیا موقع ہے کہ وہ افسوس کرتے ہیں۔ یہ تو نہایت خوشی کا موقعہ ہے۔ یہ تو رضامندی اور محبت کا موقعہ ہے کہ ایک شخص ہم سے جدا ہو کر اللہ کے ہاں پہنچ گیا۔ اور اس انتقال کے ساتھ ساتھ ہم سے ملحق بھی ہے۔

اگر موت فی سبیل اللہ ہے، تو وہ موت نہیں ہے اور خود مجاہدین کے اپنے شعور کے مطابق بھی وہ موت نہیں ہے۔ ان لوگوں کے لئے بھی موت نہیں ہے جو پیچھے رہ گئے ہیں بلکہ یہ زندگی کے میدان کی وسعت ہے۔ اس کے شعور کی وسعت ہے، اس کی صورتوں کی وسعت ہے۔ یہ حیات، شہید کی حیات، زندگی کی سرحدوں کے آگے چلی جاتی ہے۔ اسی طرح اس زندگی کے مظاہر بدل جاتے ہیں۔ یہ زندگی دنیا کی تنگ دامانی سے نکل کر ایک وسیع میدان میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کے سامنے وہ پردے اور رکاوٹیں نہیں ہوتیں جو ہمارے ذہن میں ہوتی ہیں۔ گویا زندگی اپنی شکل و صورت سے منتقل ہو کر دوسری شکل و صورت میں داخل ہو جاتی ہے۔ ایک زندگی ختم ہوتی اور دوسری شروع ہوتی ہے۔

اس آیت نے زندگی کو جو نیا مفہوم دیا ہے، یا قرآن کریم کی اس جیسی دوسری آیات شہداء کی زندگی کو جو مفہوم عطا کرتی ہیں، اس کے اثرات یہ ہوئے کہ مجاہدین کرام کے قدم طلب شہادت میں ہر وقت رواں دواں رہے۔ اور ان کی ایک مثال وہ نمونے ہیں جو ہم نے جنگ احد کے آغاز میں دیئے ہیں۔

اس حقیقت اور عظیم حقیقت کے بیان کے بعد کہ اہل ایمان کے لئے جو کچھ اللہ کے ہاں تیار کیا ہوا ہے، اس پر شہداء خوشیاں منا رہے ہیں، تو اللہ تعالیٰ یہاں وضاحت فرماتے ہیں کہ وہ اہل ایمان ہیں، کون ہیں اور ان کا ان کے رب کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَالرُّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقُوا اَجْرٌ عَظِيمٌ (۱۴۲) الَّذِينَ قَالُ لَهُمُ النَّاسُ اِبْرَ النَّاسِ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ (۱۴۳) فَاَنْقَلَبُوا بِنِعْمَةِ رَبِّهِمْ اِلَى اللّٰهِ وَفَضِّلْ لَمْ يَمَسُّهُمْ سُوءٌ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيْمٍ

”وہ لوگ جنہوں نے زخم کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہا ان میں جو اشخاص نیکو کار ہیں اور پرہیزگار ہیں ان کے لئے بڑا اجر ہے۔ جن سے لوگوں نے کہا کہ ”تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں، ان سے ڈرو، تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ”ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔“ آخر وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے، ان کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف ان کو حاصل ہو گیا۔ اللہ بڑا افضل فرمانے والا ہے۔“

یہ وہ لوگ تھے جنہیں جنگ احد کی دوسری صبح رسول اللہ ﷺ نے پکارا نکلو کہ ابھی تلخ معرکہ ختم نہیں ہے اور ان کی حالت یہ تھی کہ ان کے زخموں سے ابھی تک خون جاری ہے۔ اور وہ کل ہی جان لڑا کر موت کے منہ سے نکلے تھے۔ اور ابھی تک انہوں نے کل کے معرکہ کی ہولناکیوں کو بھولنا نہ تھا۔ ہزیمت کی تلخی ان کے منہ میں باقی تھی، درد کی شدت میں ابھی تک کمی نہ آئی تھی۔ مزید یہ کہ انہوں نے اعزہ و اقارب کی قیمتی جانوں کا نذرانہ کل ہی تو پیش کیا تھا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ان کی اکثریت بری طرح زخمی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے انہیں پکارا تھا اور صرف انہیں پکارا تھا اور یہ دعوت اور اس کے نتیجے میں لوگوں کی طرف سے لبیک کہنا، ایک ایسا فعل تھا جس کے اندر گہرے اشارات پائے جاتے ہیں۔ اور یہ بڑے حقائق پر مشتمل ہے۔ اور اس میں گہری حکمت پوشیدہ تھی۔

ممکن ہے رسول اللہ ﷺ یہ چاہتے ہوں کہ اس معرکے میں اہل ایمان کی آخری بات اور ان کا آخری شعور یہ نہ ہو کہ انہیں ہزیمت ہوئی ہے۔ اور وہ شکست کھا چکے ہیں اور اس زخموں کی حالت میں کراہ رہے ہیں۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ کپڑے جھاڑیں اور قریش کا تعاقب کریں۔ ان کا پیچھا کریں تاکہ ان کے ذہن میں یہ بات بیٹھ جائے کہ یہ تو ایک ابتلا تھی، ایک تجربہ تھا اور یہ اس معرکے کا کوئی آخری فیصلہ نہ تھا۔ اور اس کے بعد بھی مسلمانوں کی قوت اپنی جگہ موجود ہے۔ اور یہ کہ دشمن ابھی تک ضعیف ہیں۔ یہ تو ایک بار تھی جس میں اچانک شکست ہو گئی۔ اور ہم اس کا بدلہ لیں گے۔ اگر ہم نے کمزوری اور بے اتفاقی کو دور کر دیا اور اللہ اور رسول کے حکم کو تسلیم کیا۔

یہ بھی ممکن تھا کہ رسول اللہ قریش کے ذہنوں سے یہ بات نکالنا چاہتے ہوں کہ وہ فتح کے پھریرے اڑاتے ہوئے مکہ میں داخل ہو رہے ہیں۔ اس لئے آپ نے اس معرکے میں شریک ہونے والوں کی معیت میں ان کا تعاقب کیا۔ اور اس سے قریش کو یہ جتلانا مقصود تھا کہ انہوں نے ابھی تک مسلمانوں کی قوت کو توڑا نہیں ہے۔ اور یہ کہ ابھی تک ان میں تعاقب یا دوسری جنگ کی قوت باقی ہے۔ جس طرح سیرت کی روایات میں آتا ہے اس تعاقب سے یہ دونوں مقاصد پورے ہو گئے۔

شاید رسول اکرم ﷺ مسلمانوں اور پوری دنیا کو یہ احساس دلانا چاہتے تھے کہ اس دنیا میں ایک نئی حقیقت کا ظہور ہو چکا ہے اور وہ نئی حقیقت جو اپنے ظہور کے بعد اب قائم ہو چکی ہے وہ یہ ہے کہ اس نئی تحریک کا اصل سرمایہ اس کا عقیدہ ہے۔ یہی اس کا نصب العین ہے اور اس کے سوا اس کا کوئی مقصد حیات نہیں ہے اور اس کے سوا اس کو زندگی میں کوئی اور ترجیح نہیں ہے۔ مسلمان اس نظریہ حیات ہی کے لئے زندہ ہیں، اس لئے اس نظریہ حیات کے بعد ان کے نفوس کی کوئی اور تمنا نہیں ہے۔ اور وہ اس کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اس وقت اس کرۂ ارض پر یہ ایک بالکل نئی بات تھی۔ لہذا یہ بات ضروری تھی کہ پوری دنیا کو معلوم ہو جائے اور خود مسلمانوں کو بھی اس کا شعور ہو جائے کہ یہ جدید نظریہ اب قائم ہو چکا ہے اور اب یہ اس کرۂ ارض پر ایک امنٹ حقیقت ہے۔ اور اس حقیقت کا اس سے بڑا اظہار نہ ہو سکتا تھا کہ احد میں اس قدر زخم کھانے کے بعد فدایان اسلام اپنے رستے زخموں کے ساتھ ایک غالب قوت کے تعاقب میں نکل کھڑے ہوں۔ ان کی جانب سے یہ اقدام ایک واضح روشن اور بالکل ایک خوفناک اقدام تھا۔ اس میں توکل علی اللہ کی روشن مثال پائی جاتی تھی۔ اور لوگ ان جانبازوں کو جو ڈرارہے تھے کہ قریش پھر سے جمع ہو رہے ہیں، جس طرح ابوسفیان کے نمائندوں نے انہیں یہ بات پہنچائی تھی اور منافقین نے بھی قریش کے اس منصوبے کو خوفناک انداز میں پیش کیا کہ وہ ایسا کرنے والے ہیں۔

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقُوا اَجْرٌ عَظِيمٌ..... ”جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑی فوجیں جمع ہوئی ہیں ان سے ڈرو، تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا۔ اور انہوں نے جواب دیا ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہتر کار ساز ہے۔“

اس خوفناک صورت حال میں یہ تعاقب دراصل یہ اعلان تھا کہ اس کرۂ ارض پر اب انقلاب اور یہ عظیم انقلاب اب حقیقت بن چکا ہے۔ غرض یہ تھے وہ بعض پہلو جو رسول ﷺ کے اس حکیمانہ اقدام سے واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ سیرت کی بعض روایات سے ان لوگوں کے حالات کا پتہ چلتا ہے جنہوں نے زخموں کے اندر چکنا چور ہونے کے باوجود رسول ﷺ کی کال (پکار) پر لبیک کہا۔



محمد بن اسحاق نے عبد اللہ ابن جراحہ، ابو السائب سے روایت کی ہے کہ رسول ﷺ کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب جو بنو عبد الاشہل سے تعلق رکھتے تھے، وہ احد میں شریک تھے۔ اس نے بیان کیا کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے ساتھ احد میں شریک ہوئے تھے۔ میں تھا میرا بھائی تھا، ہم لوٹے دونوں

زخمی تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے موذن نے اعلان کیا کہ نکلو، دشمن کا تعاقب کرنا ہے۔ میں نے اپنے بھائی سے کہا یا بھائی نے مجھ سے کہا کیا اب ہم سے رسول اللہ ﷺ کی یہ جنگ رہ جائے گی۔ ہمارے پاس کوئی سواری نہیں ہے اور ہم دونوں شدید زخمی بھی ہیں۔ ہم دونوں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکل پڑے۔ میرا زخم بھائی سے ذرا کم تھا۔ جب اس کی طبیعت خراب ہوتی تو میں اسے پیچھے سے تھامتا، یہاں تک کہ ہم مسلمانوں کے ساتھ منزل مقصود تک پہنچ گئے۔



محمد بن اسحاق کہتے ہیں کہ احد کی جنگ بروز ہفتہ ۱۵ شوال کو ہوئی تھی۔ دوسرے دن ۱۶ شوال کو رسول اللہ ﷺ کے موذن نے اذان دی۔ اور حکم دیا کہ دشمن کا تعاقب کرنا ہے۔ اور موذن نے یہ اعلان بھی کیا کہ ہمارے ساتھ صرف وہ لوگ جائیں گے جو کل کے معرکے میں شریک ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھی جابر ابن عبد اللہ ابن عمرو ابن حرام نے کہا کہ میرے باپ نے مجھے اپنی بہنوں کی نگرانی کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ میری سات بہنیں تھیں۔ میرے باپ نے مجھ سے کہا کہ ”برخوردار نہ یہ میرے لئے مناسب ہے اور نہ آپ کے لئے مناسب ہے کہ آپ ان سات عورتوں کو چھوڑ کر جہاد کے لئے نکلیں۔“ اور میرے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جہاد کا شرف تمہیں دے دوں۔ اس لئے تم بہنوں کے پاس رہو۔ صرف ان کو رسول اللہ ﷺ نے اجازت دے دی اور وہ آپ کے ساتھ نکلے۔

جب اس عظیم حقیقت کا اعلان ہوا تو اس قسم کے عظیم اور بے مثال واقعات ظہور پذیر ہوئے۔ لوگوں کی ذہنی دنیا میں انقلاب آیا۔ ایسے تربیت یافتہ نفوس قدسیہ تیار ہوئے جو صرف اللہ کو اپنا وکیل و مددگار سمجھتے تھے۔ وہ صرف ذات باری پر راضی تھے، ذات باری ہی کو کافی سمجھتے تھے۔ وہ ذات باری ہی کو یاد کرتے تھے اور جب سخت سے سخت حالات پیش آتے تو ان کا ایمان اور پختہ ہو جاتا اور جب لوگ انہیں مشکلات سے ڈراتے تو ان کا جواب یہ ہوتا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنَعُوْا اِلَيْهِ لَمْ يَكُنْ لَآلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ كَافٍ بِهٖ اُوْلٰئِكَ اَلْاٰلِهَةُ الْغٰیْبَةِ۔

اور پھر انجام کیا ہو گا؟ وہی جو اللہ نے متوکلین کے لئے لکھ دیا ہے جو اللہ کے لئے خالص ہو جاتے ہیں اور جن کے لئے بس اللہ ہی کافی ہوتا ہے۔

فَانْقَلِبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمَسَّ لَهُمْ سُوءٌ وَّاَتَّبِعُوا رِضْوَانِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ

”آخر کار وہ اللہ تعالیٰ کی نعمت اور فضل کے ساتھ پلٹ آئے، ان کو کسی قسم کا ضرر بھی نہ پہنچا اور اللہ کی رضا پر چلنے کا شرف بھی انہیں حاصل ہو گیا، اللہ بڑا فضل فرمانے والا ہے۔“

وہ مشکلات سے بچ کر بغیر کسی تکلیف کے واپس ہو گئے۔ اللہ کی رضامندی کے ساتھ واپس ہوئے اور کامیابی اور خوشی سے واپس ہوئے۔ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ..... ”اللہ کی نعمت اور فضل کے ساتھ۔“ اللہ تعالیٰ یہاں پھر ان کی توجہ جو د اور بخشش کے سبب اول کی طرف مبذول کراتے ہیں، کہ سبب اول اللہ کی نعمت اور اس کا فضل ہوا کرتا ہے۔ اور اس میں یہ اشارہ بھی مقصود ہے کہ صحابہ کرام کا موقف قابل تعریف تھا۔ کیونکہ ان کا یہ موقف تھا کہ وہ صرف اللہ کا فضل اور اس کی نعمت کی تلاش میں تھے۔ تمام نعمتوں کا سرچشمہ یہی ہے کہ اللہ کا فضل ہو جائے اور ان کا موقف بھی ایسا تھا جہاں فضل خداوندی کی بارش تھی۔ وَاللّٰهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ..... ”اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔“ اس طرح اللہ اپنی ابدی کتاب میں یہ ثبت کر دیتے ہیں اور اپنے کلام میں ان کی یہ تصویر کھینچتے ہیں، ان کا یہ موقف پیش فرماتے ہیں اور اللہ کا کلام وہ کلام ہے جس کے ساتھ یہ پوری کائنات ہم آہنگ ہے۔ غرض ان کا موقف نہایت ہی شریفانہ ہے اور ان کی یہ تصویر بھی نہایت ہی خوبصورت ہے۔

جب انسان کے اس موقف اور ان کے اس نظارے پر غور کرتا ہے تو اسے احساس ہو جاتا ہے کہ صرف ایک ہی رات میں ان لوگوں کا نقطہ نظر یکسر بدل گیا ہے، وہ پختہ کار ہو گئے، باہم متناسق ہو گئے، وہ جہاں کھڑے تھے وہاں مطمئن ہو کر جم گئے۔ ان کے خیالات سے تمام دھند اور میل دور ہو گئی اور ان کی صورت حال بالکل نئی ہو گئی۔ کل ان کے تصورات میں اور ان کی صفوں کے اندر جو خلجان اور جو

تذبذب پایا جاتا تھا، آج اس کا نام و نشان نہیں ہے۔ صرف ایک رات ہی گزری تھی کہ ان کے موقف میں زمین و آسمان کا فرق ہو گیا۔ عظیم فرق اور میلوں کی مسافت ایک لمحہ میں طے ہو گئی۔ اس تلخ تجربے نے ان کے نفوس کے اندر اپنا کام کر دکھایا۔ اس حادثہ نے انہیں خوب جھنجھوڑا جس کی وجہ سے ان کے تصورات سے ہر قسم کے غبار چھٹ گئے، ان کے دل از سر نو جاگ اٹھے، ان کے قدم جم گئے اور ان کے دل از سر نو عزم صمیم سے مالا مال ہو گئے۔ بالکل درست ہے یہ کہنا کہ اس ابتلا میں بھی اللہ فضل پوشیدہ تھا۔

اس پیرا گراف کے آخر میں اس وقت کے موجودہ جزع و فزع اور خوف و ہراس کی علت بھی بتادی گئی۔ بتایا گیا کہ یہ تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں کا ڈر اور رعب تمہارے دلوں میں بٹھاتا ہے۔ وہ اپنے دوستوں کو رعب و بدبہ کے لباس میں پیش کرتا ہے۔ اس لئے اہل ایمان کو شیطان کی اس چال سے خوب خبردار رہنا چاہئے۔ اور اس کے اس مکر کو بے اثر بنانے کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں۔ اس لئے وہ اہل قریش سے نہ ڈریں کیونکہ وہ اس وقت شیطان کے ساتھی ہیں۔ وہ شیطان ہے دوستوں سے خائف ہونے کے بجائے اللہ سے ڈریں کیونکہ صرف وہی قوی قادر مطلق اور جبار ہے اور وہی اس بات کا مستحق کہ اس سے خوف کیا جائے۔

”اب تمہیں معلوم ہو گیا کہ وہ دراصل شیطان تھا جو اپنے دوستوں سے خواہ مخواہ ڈرا رہا تھا لہذا آئندہ تم انسانوں سے نہ ڈرنا، مجھ سے ڈرنا اگر تم حقیقت میں ایمان لانے والے ہو۔“

شیطان اپنے دوستوں کو بہت بڑا کر کے اور پھولا کر پیش کرتا ہے۔ وہ انہیں ایسے لباس میں پیش کرتا ہے جس میں وہ قوی اور طاقتور نظر آئیں۔ وہ دلوں میں یہ رعب بٹھاتا ہے کہ شیطان کے ساتھی سب کچھ اپنے حق میں پھیر سکتے ہیں اور ان کے ہاتھ لمبے ہیں۔ وہ نفع بھی دے سکتے ہیں اور ضرر بھی دے سکتے ہیں تاکہ شیطان اس ذریعہ سے اپنی ضروریات اور اغراض پوری کرتا رہے۔ اور ان دوستوں کے ذریعہ دنیا میں شر اور فساد پھیلائے۔ اور لوگوں کو اپنے دوستوں کے سامنے اس قدر جھکا دے کہ وہ ان

کی اطاعت غیر مشروط طور پر کریں۔ کوئی ان کے سامنے کسی بات کا انکار نہ کر سکے۔ کوئی شخص ان پر تنقید نہ کر سکے اور ان شر و فساد سے روکنے کی جرأت ہی نہ کر سکے۔

شیطان کی پالیسی یہ ہوتی ہے کہ باطل کو خوب پھولا کر اور موٹا کر کے پیش کرے۔ اس طرح کہ وہ قوی، صاحب قدرت، قہار اور جبار اور سخت گرفت کا مالک نظر آئے۔ اس کی کوئی پوزیشن نہ ہو۔ اس کا مقابلہ کرنے والا کوئی نہ ہو اور کوئی قوت ایسی نہ ہو جو اس پر غالب آسکتی ہو۔ شیطان کی مصلحت یہ ہے کہ وہ صورت حال کو اس طرح قائم رکھے۔ خوف اور رعب کے پردے میں اور تحریف اور پکڑ کی فضا میں شیطان کے دوست دنیا میں سب کاروائیاں کرتے ہیں۔ وہ معروف کو منکر بناتے ہیں اور منکر کو معروف بناتے ہیں۔ شر، فساد اور گمراہی پھیلاتے ہیں۔ سچائی، ہدایت اور عدل کی آواز کو دھیمما کرتے ہیں، بغیر اس کے کہ کوئی ان کو چیلنج کرے یا ان کے سامنے کھڑا ہو، یا قیادت کے مقام سے انہیں ہٹا سکے۔ غرض وہ باطل جس کی ترویج کرتے ہیں ان پر تنقید کی جرأت ہی اہل حق کو نہ ہو اور جس حق کو وہ مٹانا چاہتے ہیں اس کی وضاحت کرنے اور اسے غالب کرنے کی بھی کسی جرأت نہ ہو سکے۔

شیطان سخت مکار، دغا باز اور غدار ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے لباس میں آتا ہے۔ اور جو لوگ شیطانی وساوس کے مقابلے میں احتیاط نہیں کرتے، وہ ان دوستوں سے انہیں خوب ڈراتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ یہاں اسے خوب ننگا کرتے ہیں۔ اور وہ یوں ننگا ہو جاتا ہے کہ اس کے جسم پر اس کے مکرو فریب کا کوئی لباس ہی نہیں رہتا۔ اہل ایمان شیطان کی حقیقت کو اچھی طرح جان لیتے ہیں۔ اس کے وسوسوں اور اس کے مکرو فریب کی حقیقت کو پالیتے ہیں تاکہ وہ اس سے محتاط ہو جائیں۔ اس کے دوستوں سے نہ ڈریں اور نہ ان سے خائف ہوں۔ جو مومن ذات باری پر مکمل بھروسہ کئے ہوئے ہے۔ اس کے مقابلے میں شیطان بہت ہی کمزور ہوتا ہے اس لئے کہ اس کی قوت کا سرچشمہ اللہ ہوتا ہے۔ وہ واحد قوت جس سے کسی انسان کو ڈرنا چاہئے وہ صرف وہی قوت ہوتی ہے جو نفع اور نقصان پہنچانے پر قادر ہو اور نفع اور نقصان دینے والی قوت صرف اللہ کی قوت ہے۔ اور ایک مومن صرف اللہ سے ڈرنے والا ہوتا ہے۔ اور جب تمام اہل ایمان صرف اللہ سے ڈرنے والے بن جائیں تو وہ سب قوتوں کے

مقابلے میں قوی تر ہو جاتے ہیں۔ پھر ان کے مقابلے میں دنیا کی کوئی قوت ٹھہر نہیں سکتی۔ نہ شیطانی قوت اور نہ شیطان کے دوستوں کی قوت تَخَافُوهُمْ وَخَافُوا رَبَّكَ كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ..... ”پس تم ان سے نہ ڈرو اور مجھ ہی سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔“



اب اس سلسلے میں آخری نتیجہ اور آخری نچوڑ پیش کیا جاتا ہے۔ روئے سخن رسول اکرم ﷺ کی طرف کر کے بطور تسلی اور دلجوئی کہا جاتا ہے کہ آپ پریشان نہ ہوں، اور آپ اس بات کا غم نہ کھائیں کہ یہ اہل کفر والحاد کی جانب بہت تیزی سے جارہے ہیں۔ اور وہ اس کفر میں اس قدر تیز ہیں کہ گویا وہ کسی دوڑ کے مقابلے میں ہیں، کہا جاتا ہے کہ ذرا ان کی اس حرکت پر غور کرو کہ اس سے اللہ تعالیٰ کو نقصان کیا ہے؟ یہ تو خود ان کے لئے ایک مصیبت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ مصیبت ان کی قسمت میں لکھ دی۔ اللہ تعالیٰ کو اچھی طرح علم تھا کہ وہ کیا کریں گے اور کیا کیا کفر کرنے والے ہیں؟ اس لئے اس سے پہلے ہی یہ فیصلہ کر دیا کہ اچھا تو آخرت میں محروم ہو گے۔ اس لئے انہیں اس نے ان کے حال ہی پر چھوڑ دیا اور وہ ہدف کفر ہی کی طرف بڑی مسارعت سے بڑھتے رہے۔ ان کے سامنے راہ ہدایت بھی واضح تھی، لیکن انہوں نے اپنے اختیار تمیزی کو استعمال کرتے ہوئے کفر کی راہ کو اپنایا۔ اس لئے انہیں ان کے حال ہی پر چھوڑ دیا گیا۔ اور ان کو مزید مہلت دی گئی کہ وہ خوب گناہ سمیٹ لیں زیادہ سے زیادہ۔ یہ مہلت ان کو وقت کے لحاظ سے بھی دی گئی اور خوشحالی کی صورت میں بھی دی گئی۔ لہذا یہ مہلت اور خوشحالی ان کے لئے گویا بطور انعام کا ایک وبال اور مصیبت ہے۔ یہ حصہ آیات اس پر ختم ہوتا ہے کہ ان تمام واقعات کی پشت پر کیا حکمت تھی؟ یہ کہ مومنین کو کیوں ابتلا میں ڈالا گیا، اہل کفر کو کیوں اس قدر مہلت دی جا رہی ہے۔ یہ اس لئے پاک لوگ گندے لوگوں سے الگ چھٹ کر رہ جائیں۔ اور یہ پاکیزگی اور تطہیر کا عمل آزمائش اور ابتلا ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے کہ رسول کی بات بذریعہ آزمائش ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ وہ تو غیب ہے اور غیب کا علم صرف اللہ کو ہوتا ہے۔ لوگوں کو اس کا پتہ نہیں ہوتا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہ مناسب سمجھا کہ ایک مناسب طریقہ کار کے مطابق غیب کا اظہار

اہل ایمان پر ہو جائے، اہل ایمان کو دلوں کا حال معلوم ہو جائے، پاک لوگ گندے عناصر سے الگ ہو جائیں اور اللہ پر ایمان لانے والے، قطعی اور یقینی طور پر میدان میں آجائیں۔

وَلَا يَخْرُجُكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَنُيْضِرُّوا اللَّهَ شَيْئًا
يُرِيدُ اللَّهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حِطًّا فِي الْآخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ (۱۷۶) وَإِنَّ
الَّذِينَ اشْتَرَوْا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنُيْضِرُّوا اللَّهَ شَيْئًا وَلَهُمْ عَذَابٌ
أَلِيمٌ (۱۷۷) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُطْمِئِنُّ لَهُمْ خَيْرٌ لَّأَنفُسِهِمْ إِنَّمَا نَطْمِئِنُّ
لَهُمْ لِيُزِدَاؤُوا إِثْمًا وَلَهُمْ عَذَابٌ مُهِينٌ (۱۷۸) مَا كَانَ اللَّهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِينَ
عَلَىٰ مَا أَنتُمْ عَلَيْهِ حَتَّىٰ يَمِيزَ الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُظْلِعَكُمْ
عَلَىٰ الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللَّهَ يَجْتَبِيٰ مِنْ رُسُلِهِ مَنْ يَشَاءُ فَأَمُّنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ
وَإِنَّ تَوْمَنُّوًا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ (۱۷۹)

”(اے پیغمبر) جو لوگ آج کفر کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمہیں
آزردہ نہ کریں، یہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ
نہ رکھے، اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔ جو لوگ ایمان کو چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں وہ یقیناً
اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں، ان کے لئے دردناک عذاب تیار ہے۔ یہ ڈھیل جو ہم انہیں دیئے
جاتے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتری نہ سمجھیں، ہم تو انہیں اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ
خوب بارگناہ سمیٹ لیں، پھر ان کے لئے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔

اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہر گز نہ رہنے دے گا جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو۔ وہ
پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو غیب

پر مطلع کر دے۔ (غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو) اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ لہذا (امور غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلو گے تو تم کو بڑا اجر ملے گا۔“

غزوہ احد کے واقعات کا یہ بہترین اختتامیہ ہے۔ اس لئے کہ اس غزوہ میں مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے تھے اور اس جنگ میں کفار کو فتح اور غلبہ نصیب ہوا تھا۔ حق و باطل کی کشمکش میں ہمیشہ یہ شبہ پیدا ہو جاتا ہے اور اہل حق کے دلوں میں یہ بات ہمیشہ کھٹکتی ہے یا بعض اوقات کامیابی کی خواہش دلوں میں ابھرتی رہتی ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں حق کو کامیاب ہی ہونا چاہئے اور اگر کسی جگہ حق کو شکست ہو جس طرح احد میں اور کفر و باطل کو فتح و ظفر نصیب ہو تو یہ کیوں ہوتی ہے؟

یہ جھوٹا شبہ ہوتا ہے اور ہمیشہ دلوں میں اٹھتا رہتا ہے۔ اور انسان کی خواہش کامیابی اسے مسلسل دبا رہی ہوتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے اے رب! حق کو شکست اور باطل کو فتح کیوں ہوتی ہے؟ اہل حق مصائب میں مبتلا ہو رہے ہیں اور اہل باطل نجات پا رہے ہیں اور کامیاب ہو رہے ہیں اور اس طرح کیوں نہیں ہوتا کہ جب بھی حق و باطل کی باہم کشمکش ہو تو حق کو فتح نصیب ہو اور وہ غلبہ اور غنیمت لے کر واپس ہو؟ کیا حق اور سچائی اس بات کی مستحق نہیں ہے کہ اسے فتح نصیب ہو اور باطل کے لئے یہ قوت اور یہ رعب کیوں ہے کہ حق کے ساتھ نکلنا اس میں اسے ایسی کامیابیاں ہوتی ہیں جس سے اہل حق کے دلوں میں فتنے پیدا ہوتے ہیں اور ان کے دل متزلزل ہو جاتے ہیں۔

اور یہ سوالات عملاً اس وقت سامنے آئے جب احد کے دن اہل ایمان نے نہایت ہی تعجب اور سرسبکی میں یہ سوال کیا کہ اِنِّیْ هٰذَا؟..... ”یہ کیسے ہو گیا“..... لہذا اس آخری اختتامیہ میں اس کا آخری جواب دیا جاتا ہے۔ آخری اور فیصلہ کن بات کر دی جاتی ہے اور یوں اللہ تعالیٰ پریشان دلوں کو سکون فراہم فرما دیتے ہیں اور اس پہلو سے جو بڑا وسوسہ بھی دلوں کے اندر راہ پاتا ہے، اسے صاف کر دیا جاتا ہے۔ اللہ کی سنت کا بیان ہوتا ہے۔ اللہ کی سنت کے تحت اس کی تقدیروں کا بیان ہوتا ہے اور پھر ان تمام سنن اور تقدیروں کے پیچھے جو اس کی وسیع تر تدبیر اور حکمت کا فرما ہوتی ہے، وہ بھی

بتادی جاتی ہے اور یہ حکمت کل بھی تھی، آج بھی ہے اور کل بھی ہوگی۔ اور ہر اس جگہ ہوگی جہاں حق و باطل کی کشمکش ہو اور احد جیسے نتائج نکلیں۔

دنیا کے کسی معرکے سے باطل کا فتح مندی کے ساتھ نکل کر چلا جانا اور ایک وقت کے لئے اس کا پھول جانا اور طاقتور نظر آنا اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ بس اللہ تعالیٰ نے اسے کھلی چھٹی دے دی ہے۔ یا یہ کہ وہ اس قدر طاقتور ہو گیا ہے کہ اس پر اب غلبہ نہیں پایا جاسکے گا یا یہ کہ باطل ہمیشہ کے لئے حق کے لئے مضر ہی رہے گا۔ ایسا ہر گز نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح کسی معرکے میں سچائی کا شکست اور مصائب میں مبتلا ہو کر نکلنا یا سچائی کا کسی دور میں ضعف کا شکار ہو جانا اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ کوئی انصاف فرما رہے ہیں یا اللہ نے حق کو بھلا دیا یا اس نے باطل کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ سچائی کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر تباہ کر دے۔

یوں ہر گز نہیں ہو سکتا۔ یہ تو اللہ کی گہری حکمت اور تدبیر ہوتی ہے جو ہر جگہ اپنا کام کر رہی ہوتی ہے۔ کبھی حکمت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ باطل کو مہلت دی جائے اور وہ اپنی آخری سرحد تک پہنچ جائیں۔ وہ اپنے تمام برے نتائج ظاہر کریں، وہ لوگوں پر ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیں اور آخر کار وہ اس بات کے مستحق ہو جائیں کہ ان پر سخت سے سخت حملہ کیا جائے اور پھر حق کو آزمائش میں اس لئے ڈالا جاتا ہے کہ حق و باطل کے درمیان فرق ہو جائے۔ طیب اور خبیث کے اندر امتیاز ہو جائے، اور ان آزمائشوں میں جو لوگ ثابت قدم رہیں انہیں عظیم اجر ملے اور وہ ممتاز مقام کے مستحق ہو جائیں۔ اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ صورت حال سچائی کے لئے کمائی ہے اور باطل کے لئے خسارہ ہے۔ اور یہ کمائی زیادہ سے زیادہ ہو رہی ہو تو ادھر خسارہ زیادہ سے زیادہ ہو رہا ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُطَمِّسُ لَهُمْ وُجُوهُهُمۡ إِنَّمَا نُمَلِّیْ لَهُمۡ لِيُزۡدَادُوا إِثۡمًا وَلَهُمۡ

عَذَابٌ مُّهِیۡنٌ

”اے پیغمبر جو لوگ کفر کی راہ میں بڑی دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمہیں آزر دہ نہ کریں۔ یہ اللہ کا کچھ بھی بگاڑ نہ سکیں گے۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے، اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔“

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی ہے، اس کے ذریعہ آپ کے غبار خاطر کو دور کیا جا رہا ہے جو آپ کے دل پر ان واقعات کی وجہ سے تھا۔ آپ اس سے بے حد دلگیر تھے کہ جو لوگ کفر میں غلامی کر رہے ہیں وہ کفر میں سرپٹ بھاگے جا رہے ہیں۔ وہ نہایت سرعت کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں۔ گویا ان کے لئے کوئی ہدف مقرر ہے اور انہوں نے اسے حاصل کرنا ہے۔

یہ ایسے الفاظ ہیں اور ایسی تعبیر ہے، جن کے ذریعہ ان کی حقیقی نفسیاتی حالت کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اکثر اوقات نظر آتا ہے کہ بعض لوگ کفر میں متشدد ہوتے ہیں۔ وہ باطل، شر اور اللہ کی نافرمانی کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں۔ اس طرح کہ گویا انہوں نے اس کے مقابلے میں گول تک پہنچنا ہے۔ اس لئے ایسے لوگ نہایت قوت نہایت جرأت اور نہایت ہی تیزی سے آگے بڑھتے ہیں، بعض اوقات یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید پیچھے سے انہیں کوئی دھکیل رہا ہے کہ آگے بڑھو یا آگے سے کوئی انہیں پکار رہا ہے کہ جلدی پہنچو یہ ہے تمہارا انعام۔

آپ کا یہ غبار خاطر اور رنج و غم اللہ کی اس مخلوق کے لئے تھا۔ آپ حسرت سے انہیں دیکھتے تھے کہ یہ لوگ آستین چڑھائے آگ کی طرف تیزی سے گامزن ہیں اور آپ وہ قوت نہیں پارہے کہ انہیں بزور بازو روک دیں۔ یہ لوگ اللہ کی طرف سے بار بار کے ڈراوے کی طرف بھی کان نہیں دھرتے۔ پھر آپ اس سے بھی پریشان ہوتے ہیں کہ یہ لوگ جو آستین چڑھائے جہنم کی طرف سرپٹ دوڑ رہے ہیں، وہ صرف اپنے آپ ہی کو مصیبت میں مبتلا نہیں کر رہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ اہل اسلام کے لئے بھی رنج و الم اور درد و دکھ کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ لوگ دعوت اسلامی کو بھی دکھ دے رہے ہیں اور جمہور کے اندر اس کے پھلاؤ کو بھی روک رہے ہیں۔ اس لئے کہ جمہور عرب یہ دیکھ رہے تھے کہ مدینہ اور مکہ کی معرکہ آرائی کا انجام کیا ہوتا ہے تاکہ وہ بھی اس صف میں شامل ہو جائیں جس کا مستقبل روشن

ہو۔ جب قریش مسلمان ہو گئے اور انہوں نے سر تسلیم خم کر لیا تو تمام لوگ اللہ کے دین میں فوج در فوج داخل ہو گئے۔ اور اس بات میں شک نہیں کہ اس صورت حال کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے دل پر اثرات تھے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کی جانب سے رسول اللہ ﷺ کو مطمئن کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ آپ کو تسلی دی گئی اور آپ کے غبار خاطر کو دور کیا گیا۔

وَلَا يَخْزُنُكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ إِنَّهُمْ لَنُيَضُّوا بِاللَّهِ شَيْئًا

”اے پیغمبر جو لوگ آج کفر کی راہ میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمہیں آزر دہ نہ کریں۔ یہ اللہ کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔“..... یہ کمزور بندے اس جوگے نہیں ہو سکتے کہ وہ اللہ کو کوئی نقصان پہنچائیں۔ اور یہ بات محتاج بیان ہی نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی مرضی ہے کہ نظریاتی جنگ نظریاتی رہے اور مشرکین کے ساتھ معرکہ اپنی جگہ رہے۔ اور یہ خود اس کی جنگ اور اس کا معرکہ رہے۔ اس لئے رسول اللہ ﷺ کے کندھوں سے اس ذمہ داری کو اٹھالیا جاتا ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی بھی یہ ذمہ داری نہیں رہتی کہ وہ لوگوں کے نظریات تبدیل کرنے کے پابند ہوں۔ جو لوگ کفر کے اندر تیزی دکھا رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ کے ساتھ جنگ لڑ رہے ہیں۔ اور اللہ کے ساتھ اس جنگ میں انہیں ہرگز کامیابی نہیں ہو سکتی، اس لئے کہ وہ اس ذات باری کے مقابلے میں بہت ہی ضعیف ہیں۔ لہذا وہ دعوت اسلامی کو مال کار کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ اور اس سے نتیجہ خود بخود نکل آتا ہے کہ وہ ان حاملین دعوت اسلامی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ہیں جنہیں وہ اس وقت شکست خوردہ سمجھتے ہیں۔ چاہے جس قدر بھی وہ سرعت دکھائیں اور جس قدر بھی وہ اہل دعوت کو اذیتیں دے دیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ نے انہیں یہ کھلی چھٹی کیوں دے رکھی ہے کہ وہ کامیابی کے ساتھ آگے بڑھتے چلے جائیں اور اپنے غلبہ کی وجہ سے پھولے نہ سائیں۔ حالانکہ وہ اللہ کے براہ راست دشمن ہیں۔ اس لئے کہ اللہ نے ان کے لئے نہایت ہی برا اور نہایت ہی رسوا کن انجام تیار کر رکھا ہے۔ يُرِيدُ اللَّهُ الْأَلْحَقَ بِهِمْ حَبَطًا فِي الْآخِرَةِ..... ”اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے۔“ اللہ یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنا تمام سرمایہ یہاں ہی ختم کر دیں اور اپنے تمام گناہوں

کو اٹھائے ہوئے ہوں اور آخرت میں تمام عذاب کے سزاوار ہو جائیں اور یہ کفر کی راہ میں تیزی سے آگے بڑھ کر اپنی آخری منزل تک پہنچ جائیں۔ اس لئے کہ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ..... ”ان کے لئے بڑا عظیم عذاب ہے۔“

اور ان لوگوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے اس شرمناک انجام کا ارادہ کیوں کر لیا ہے؟ اس لئے کہ انہوں نے خود اپنی مرضی سے ایمان کے بدلے میں کفر خرید کر اپنے آپ کو اس کا مستحق بنالیا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ اسْتَبَرُوا الْكُفْرَ بِالْإِيمَانِ لَنْ يَصُورُوا اللَّهَ شَيْئًا وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ..... ”جو لوگ ایمان چھوڑ کر کفر کے خریدار بنے ہیں وہ یقیناً اللہ کا کوئی نقصان نہیں کر رہے ہیں۔ ان کے لئے دردناک عذاب تیار ہے۔“ ایمان تک ان کے ہاتھ پہنچ سکتے تھے۔ ایمان کے دلائل اس پوری کائنات میں بکھرے پڑے ہیں۔ خود انسانی فطرت اور نفس کے اندر دلائل ایمان موجود ہیں۔ خود انسان کے عجیب و غریب جسم کے منصوبے کے اندر اس میں باہم مکمل ہم آہنگی کے اندر اس میں ودیعت کردہ فطرت انسانی کے اندر پھر انسانی فطرت اور اس کے اس طبعی وجود میں پائی جانے والی ہم آہنگی کے اندر پھر اس میں اس کے خالق اور صانع کے وجود کا فطری شعور ودیعت کئے جانے کے اندر اور پھر اس شعور کی بہترین نفسیاتی اور طبعی مزاج کے اندر دلائل ہی دلائل ہیں۔ اور ان دلائل کے علاوہ رسولوں کی دعوت بھی تو موجود رہی ہے اور ہے۔ یہ دعوت اپنی اس فطری حالت میں موجود ہے جسے انسانی فطرت قبول کرتی ہے۔ اور اس فطرت اور اس دعوت رسل کے اندر پھر حسین ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور یہ دعوت لوگوں کی ضروریات اور ان کی زندگی کے لئے مکمل صلاحیت رکھتی ہے۔

ہاں ایمان ان کے سامنے مکمل طور پر موجود تھا ان کی دسترس میں تھا انہوں نے اور انہوں ہی نے راہ ایمان کو چھوڑ کر کفر کی راہ خرید لی۔ اور یہ کام انہوں نے اچھی طرح جانتے بوجھتے کیا۔ اس لئے وہ اس بات کے مستحق ہو گئے کہ اللہ انہیں اس حال میں چھوڑ دے کہ وہ کفر کی راہ پر سرپٹ دوڑیں تاکہ وہ اپنا پورا سرمایہ حیات اس راہ میں لگا دیں اور ان کے لئے ثواب آخرت میں کوئی حصہ نہ رہے۔ اور یہی

وجہ ہے کہ وہ اس قابل ہی نہیں ہیں کہ وہ اللہ کو کوئی نقصان دے سکیں۔ اس لئے کہ وہ مکمل طور پر گمراہ ہو گئے ہیں اور ان کے پاس سچائی کی معمولی مقدار بھی نہیں رہی ہے۔ اور گمراہی کے حق میں اللہ تعالیٰ نے کوئی دلیل اور کوئی طاقت نازل ہی نہیں کی ہے۔ اس لئے اپنی حقیقت کے اعتبار سے باطل کے پاس کوئی قوت نہیں ہوتی۔ لہذا وہ اہل حق اور دعوت اسلامی کو کبھی کوئی مضرت نہیں پہنچا سکتے۔ کیونکہ ان کے پاس اگر کوئی قوت ہے بھی تو وہ بہت ہی کمزور اور نحیف ہے۔ اگرچہ وہ اپنے آپ کو پھولا کر دکھائے، اور وقتی طور پر مسلمانوں کو کسی شکست کی وجہ سے رنج و الم پہنچ جائے۔

وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ..... ”ان کے لئے درناک عذاب ہے۔“ یہ اس قدر المناک ہو گا جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا اور اس قدر رنج و الم وہ اس دنیا میں اہل اسلام کو نہیں دے سکتے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّمَا نُطَمِّعُ لَهُمْ خَيْراً لَّنَفْسِهِمْ إِنَّمَا نَمْلِكُ لَهُمْ يُرْزَاقاً وَإِنَّمَا لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ

”جو ڈھیل ہم انہیں دے رہے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں، ہم تو انہیں اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بارگناہ سمیٹ لیں پھر ان کے لئے سخت ذلیل کرنے والی سزا ہے۔“

یہاں آ کر اب بات اس عقدے پر پہنچ جاتی ہے جو بعض دلوں میں خلجان کا باعث بنا ہوا تھا۔ بعض دلوں میں یہ سوال پیدا ہو رہا تھا اور وہ خلجان جسے بعض لوگوں کی روح محسوس کر رہی تھی، وہ دیکھ رہے تھے کہ بعض اللہ کے دشمن اور بعض سچائی کے دشمن مہلت پا رہے ہیں اور وہ عذاب الہی کی گرفت میں نہیں آ رہے ہیں۔ بظاہر خوب کھاتے پیتے ہیں، قوت، حکومت اور مال و مرتبے سے بہرہ ور ہیں اور خود بھی فتنے میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ اور ان کے ارد گرد پھیلی ہوئی دنیا میں بھی فتنہ سامانیاں کر رہے ہیں اور وہ اہل ایمان جن کے ایمان ضعیف ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں زمانہ جاہلیت کی طرح غیر مناسب تصورات اور خیالات رکھتے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ شاید اللہ تعالیٰ باطل، شر، انکار حق، کفر اور طغیان پر خوش ہوتا ہے، نعوذ باللہ۔ اس لئے وہ اسے مہلت دیتا ہے اور ان کے لئے رسی ڈھیلی چھوڑتا ہے۔ وہ یہ

بھی گمان کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ معرکہ حق و باطل میں کوئی مداخلت نہیں کرتے، اس لئے وہ باطل کو اس کے لئے آزاد چھوڑتے ہیں کہ وہ حق کا سر چھوڑ دے اور اللہ اس کی نصرت و امداد کے لئے کچھ نہ کریں، یا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید باطل ہی حق ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ اسے پنپنے، بڑھنے اور غالب ہونے نہ دیتے۔ یا وہ سمجھتے تھے کہ باطل کا حق یہ ہے کہ وہ حق پر غالب آجائے اور جزیرۃ العرب کی پوزیشن یہی رہے۔ اور سچائی کے حق میں غلبہ نہیں ہے ورنہ کیوں اللہ اہل باطل، ظالموں، باغیوں اور مفسدوں کو یوں چھوڑ دے کہ وہ باطل میں سرگرم رہیں، کفر کی طرف شتابی سے بڑھیں، طغیان میں سرگرداں رہیں اور یہ سمجھیں کہ وہ مستحکم ہو گئے ہیں اور اب کوئی قوت ان کے سامنے کھڑی نہیں ہو سکتی۔

یہ سب افکار باطلہ تھے۔ اللہ کے حق میں سوچ بری تھی۔ معاملہ ایسا نہ تھا اس لئے خود اللہ تعالیٰ اہل کفر کو متنبہ کرتے ہیں کہ ایسا ہرگز گمان نہ کرو۔ یہ جو اللہ تعالیٰ کی پکڑ تمہیں گھیرتی نہیں ہے حالانکہ وہ کفر میں تیزی دکھا رہے ہیں، اور یہ کہ انہیں جو اس دنیا میں حظ وافر دیا جا رہا ہے جس سے وہ لطف اندوز ہو رہے ہیں اور گمراہی میں آگے بڑھ رہے ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے لئے مزید فتنہ ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی مضبوط اسکیم ہے اور یہ ان کے لئے سخت آزمائش ہے کہ ان کی رسی ڈھیلی چھوڑی ہوئی ہے۔

وَلَا يَحْسِبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا أَنَّهُمْ يُفْلِحُونَ لَأَنفُسِهِمْ إِنَّمَا نُفْلِي لَهُمْ لِيُزَادُوا
إِنَّمَا..... ”یہ ڈھیل جو ہم انہیں دیئے جاتے ہیں اس کو یہ کافر اپنے حق میں بہتر نہ سمجھیں،
’ہم تو انہیں اس لئے ڈھیل دے رہے ہیں کہ یہ خوب بارگناہ سمیٹ لیں۔ پھر ان کے لئے سخت ذلیل
کرنے والی سزا ہے۔“

اگر وہ اس بات کے مستحق ہوتے کہ اللہ انہیں ان انعامات سے نکالے، انہیں ایسی ابتلا میں ڈالے جو ان کی آنکھیں کھولنے والی ہو تو ضرور اللہ انہیں ایسی ابتلا میں ڈال دیتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ ان کے لئے کوئی بھلائی نہیں چاہتے۔ اس لئے کہ انہوں نے ایمان کے مقابلے میں کفر خرید لیا ہے۔ پھر وہ کفر کے میدان میں تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ اس لئے اب وہ اس

بات کے مستحق ہی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس غفلت اور خواب خرگوش سے جگائے اور ابتلا میں ڈالے۔ یہ انعامات الہی اور سلطنت و قوت کے غرے میں ڈوبے ہوئے ہی بہتر ہیں۔ اس لئے لَھُمْ عَذَابٌ مُّہِینٌ..... ”ان کے لئے سخت ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔“ اہانت آمیز عذاب ہے اور اس کے مقابلے میں اہل ایمان کے لئے بلند مقام، مرتبہ اور انعامات ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابتلا بھی اللہ کی جانب سے ایک انعام ہوتا ہے اور یہ انعام بھی صرف اس شخص پر ہوتا ہے جس کے لئے اللہ نے خیر و فلاح کا ارادہ کیا ہو۔ اگر ابتلا اللہ کے دوستوں پر ہو تو اس میں ان کی کوئی بھلائی پوشیدہ ہوتی ہے۔ اگرچہ اللہ کے ان دوستوں کو تصرفات کی وجہ ابتلا ابتداء آئی ہو اور ان کے اپنے اعمال کے نتیجے میں آئی ہو۔ بہر حال اس میں کوئی خفیہ حکمت کار فرما ہوتی ہے، کوئی نہایت ہی لطیف تدبیر ہوتی ہے اور اپنے دوستوں پر اللہ کا فضل و کرم مقصود ہوتا ہے۔

یوں دل اپنی جگہ ٹھہر جاتے ہیں، نفس انسانی مطمئن ہو جاتا ہے اور اسلام کے واضح اور سیدھے حقائق مسلمانوں کے تصور کا حصہ بن جاتے ہیں۔

اللہ کی حکمت کا یہ تقاضا تھا اور مسلمانوں کے ساتھ اللہ کی ایک بڑی بھلائی تھی کہ اس نے انہیں چھانٹ کر ان منافقین سے علیحدہ کر دیا جو ان کی صفوں میں گھسے ہوئے تھے اور ان کے آنے کے مختلف اسباب تھے۔ وہ اس لئے نہیں آئے تھے کہ انہیں اسلام کے ساتھ کوئی محبت یا دلچسپی تھی بلکہ وہ مختلف حالات کی وجہ سے اسلامی صفوں میں گھس آئے تھے۔ اس لئے اللہ نے مسلمانوں کو احد میں ابتلا میں ڈالا اور یہ ابتلا بھی خود ان کی اپنی سوچ اور ان کے بعض کاموں کی وجہ سے ان پر آئی، لیکن اس میں حکمت یہ تھی کہ مجاہدین راہ حق کی صفوں میں سے خبیث اور طیب کے درمیان تمیز ہو جائے۔

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَىٰ مَا اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيَزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُظْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلَكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهِ مَنْ يَّشَاءُ فَاَمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ وَاِنْ تَوَمَّنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ

”اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہرگز نہ رہنے دے گا جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو، وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ تم لوگوں کو غیب پر مطلع کر دے۔ (غیب کی باتیں بتانے کے لئے تو) اللہ اپنے رسولوں میں سے جس کا چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ لہذا (امور غیب کے بارے میں) اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھو۔ اگر تم ایمان اور خدا ترسی کی روش پر چلو گے تو تم کو بڑا ہی اجر ملے گا۔“

یہاں یہ آیت قطعی طور پر فیصلہ کر دیتی ہے کہ اللہ کی شان یہ نہیں ہے، اس کی الوہیت کا تقاضا یہ نہیں ہے اور اس کی کائنات میں مروجہ سنت یہ نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کی صفوں میں منافقین کو اسی طرح چھپے ہوئے چھوڑ دے۔ حالت یہ ہے کہ منافقین بس دعوائے ایمان کریں، اسلام کا اظہار کریں اور اسلامی صفوں میں چھپے رہیں حالانکہ ان کے دل ایمان کی تروتازگی سے خالی ہوں، اور ان میں اسلام کی روح سرے سے نہ ہو۔ اس امت کو اللہ نے اس لئے برپا کیا ہے کہ وہ اس کائنات میں ایک عظیم کردار ادا کرے۔ ایک عظیم نظام زندگی کا علم لے کر اٹھے، اس زمین پر ایک منفرد صورت حال پیدا کر دے۔ ایک جدید نظام وجود میں آجائے۔ اس مشن اور عظیم نصب العین کا تقاضا یہ تھا کہ وہ پوری یکسوئی، پوری صفائی اور پوری تمیز کے ساتھ اس نصب العین کو پختہ طریقے سے پکڑے اور یہ تقاضا بھی تھا کہ اس کی صفوں کے اندر کوئی خلل اور کوئی کمزوری نہ ہو، اس کی بنیادوں میں کوئی کمزوری نہ ہو اور مختصر الفاظ میں یوں کہ ان مقاصد کا تقاضا تھا کہ یہ امت اس قدر عظیم ہو جس قدر اس کا یہ نصب العین عظیم ہے۔ جس نصب العین اور جس ٹارگٹ تک اسے اس کائنات میں پہنچنا ہے۔ اور آخرت کا بلند مقام و مرتبہ تو بہر حال ان کے لئے اللہ نے تیار کیا ہوا ہے۔

ان سب باتوں کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی صف ہر وقت جاگتی رہے تاکہ اس سے خبیث عناصر نکل جائیں۔ وہ کارکنوں پر اس قدر دباؤ رکھے کہ جو اینٹ کچی ہو، وہ پہلے دن ہی بیٹھ جائے۔ اور ان پر ہر وقت روشنی پڑتی رہے تاکہ اندرونی کمزوریاں اور ضمیر کے اندر برے خیالات کی تطہیر ہوتی رہے۔ یہی وجہ

ہے کہ اللہ نے بھی ان کی صفوں کو صاف کرنے کے لئے ان کی امداد فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کی شان کے یہ لائق نہ تھا کہ وہ اپنے دوستوں کی صفوں میں ایسے ناپاک لوگوں کو رہنے دے۔

نیز اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ بھی نہیں ہے کہ وہ لوگوں کو غائبانہ باتوں کا براہ راست علم دے دے۔ اس لئے کہ غیب کا علم تو صرف اللہ کے شایان شان ہے۔ انسان اپنی فطرت کے اعتبار سے جس پر انہیں پیدا کیا گیا ہے، اس بات کے اہل نہیں ہیں کہ وہ غیبی اطلاعات کا ادراک کر سکیں۔ انسانی جسم کی مشینری جو ان کے اندر تخلیق ہوئی ہے وہ اس اسکیم کے مطابق تیار ہی نہیں کی گئی کہ وہ غائبانہ امور کا ادراک کر سکے۔ الایہ کہ کوئی خاص مقدر اللہ کسی کو دے دے۔ اور یہ بھی خصوصی حکمت کے تحت ہوا کرتا ہے یعنی اس قدر جس قدر اس دنیا میں ان کی خلافت فی الارض کے مقاصد کے لئے ضروری ہو۔ اور اس مقصد یعنی انسان کے وظیفہ خلافت فی الارض کے لئے علم غیب کی سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ انسان کی اس موجودہ مشینری پر علم غیب کے دروازے کھول دے تو یہ مشینری ختم ہو کر رہ جائے، اس لئے کہ وہ علوم غیب کے اخذ کے لئے سرے سے تیار ہی نہیں ہے۔ صرف اس قدر غیب کا علم اسے درکار ہوتا ہے جس میں اس کی روح کا ملاپ اس کے خالق کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کا وجود و وجود کائنات سے مل جاتا ہے۔ علم غیب پر اطلاع پانے کا کم سے کم نقصان تو یہ ہو گا وہ ہاتھ پاؤں ہلانا چھوڑ دے گا، ہر وقت ان نتائج کے بارے میں سوچتا رہے گا جو واقع ہونے والے ہیں، اور وہ اس زمین میں کسی قسم کی ترقی کے لئے سوچ بھی نہ سکے گا۔

یہی وجہ ہے کہ یہ بات اللہ کی شایان شان نہ تھی کہ وہ لوگوں کو علم غیب کی اطلاع دے دے اور نہ یہ اس حکمت اور اسکیم کے مطابق تھی جس کے مطابق وہ اس زمین کو چلا رہا ہے۔

سوال یہ ہے کہ پس اللہ خبیث کو طیب سے کیسے جدا کرتا ہے؟ اور اس کی سنت اور اس کی شان اس تطہیر کے عمل میں کس طرح کام کرتی ہے؟ اور کس طرح اسے چھانٹ کر رکھ دیتی ہے؟ وہ کس طرح غبار اور دھند کو دور کرتا ہے؟ کس طرح منافقین کو الگ کر کے اسلامی صفوں کو پاک کرتا ہے تاکہ مسلمان اس کرہ ارض پر اپنا کردار ادا کر سکیں جس کے لئے مسلمانوں کو بطور امت برپا کیا گیا ہے۔

وَلَكِنَّ اللَّهَ يُجْتَبِي مَنْ رُئِيَ مِنْ يَشَاءُ..... ”اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔“ اللہ تعالیٰ کھرے کو کھوٹے سے اس طرح جدا کرتا ہے کہ اس نے رسولوں کو بھیجا، کوئی ان پر ایمان لایا اور کسی نے ان سے انکار کیا۔ اور رسالت کے تقاضے پورے کرنے کے لئے سلسلہ جہاد فرض کیا گیا۔ اور جہاد کے اندر لوگوں کو آزمائشوں میں ڈال کر آزمایا گیا، ان تمام اقدامات سے شان الہی ظہور میں آتی ہے۔ یوں اللہ کی سنت کام کرتی ہے اور یوں کھر اکھوٹے سے الگ ہو جاتا ہے۔ دلوں کی تطہیر ہو جاتی ہے، نفوس پاک ہو جاتے ہیں اور اللہ کی تقدیر میں جو ہوتا ہے وہ ظاہر ہوتا ہے۔

اس طرح اللہ کی حکمت کے ایک حصے سے پردہ اٹھتا ہے۔ یہ حکمت زندگی میں حقیقت بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ اور یہ حکمت ایک مضبوط بنیاد پر، کھلے بندوں، روشن ستارے کی طرح زمین پر استقرار حاصل کرتی ہے..... اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے جو روشن ہوتی ہے، جو واضح ہوتی ہے، جو سادہ اور قابل فہم ہوتی ہے، اب اللہ تعالیٰ اہل ایمان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور یہ مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے اندر حقیقی ایمان پیدا کریں اور پھر اس حقیقی ایمان کے تقاضے پورے کریں اور انہیں بتایا جاتا ہے کہ آخرت میں ایک فضل عظیم ہے جو ان کا منتظر ہے۔

فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَإِنْ تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيمٌ..... ”اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔ اگر تم ایمان لاؤ اور خدا ترسی کی روش پر چلو تو تم کو بڑا اجر ملے گا۔“..... واقعات احد کے بیان اور اس کے بعد ان واقعات پر تبصروں اور تنقیدوں کے بیان کے بعد یہ بہترین ہدایت اور مشورہ ہے جو اہل ایمان کو دیا گیا ہے۔



جنگ احد کے بارے میں قرآن کریم نے جو تبصرہ کیا ہے، اس میں بعض نہایت ہی اہم اور عظیم حقائق کی نشان دہی کی گئی ہے۔ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ان تمام حقائق کو گنوا دیا جائے اور یہاں ان کے بارے میں پوری تفصیلات دی جاسکیں، لیکن مناسب ہے کہ ان حقائق میں سے جو زیادہ عمومی اور شامل

اور زیادہ ظاہر ہیں ان کی طرف اشارہ کر دیا جائے تاکہ ان اشارات پر وہ تمام واقعات قیاس کر لئے جائیں جو اس غزوہ میں پیش ہوئے جیسا کہ قرآن کریم نے انہیں عبرت کے طور پر پیش کیا ہے۔

۱۔ اس معرکے اور اس پر ہونے والے اس طویل تبصرے نے ایک بنیادی حقیقت کا بالکل کھول کر بیان کر دیا ہے کہ یہ دین جو در حقیقت انسانوں کے لئے ایک نظام زندگی ہے، اس کا اصل مزاج کیا ہے اور وہ انسانوں کی زندگیوں کے اندر کس طرح کام کرتا ہے۔ یہ نہایت ہی اساسی اور سادہ اور قابل فہم حقیقت ہے لیکن بسا اوقات اسے بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے یا ابتداء ہی اس کا ادراک نہیں کیا جاتا اور اس کے بھول جانے اور اس کے نہ سمجھنے کی وجہ سے اس دین کی فہم میں فاش غلطیاں کی جاتی ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اس دین کی حقیقت کے سمجھنے میں بھی غلطی کی جاتی ہے بلکہ اس تاریخ کو سمجھنے میں غلطی کی جاتی ہے اور انسانی زندگی میں اس نے جو کردار ادا کیا یا کرتا ہے یا آئندہ کرے گا اس کے سمجھنے میں بھی نہایت ہی فاش غلطی ہوتی ہے۔

ہم میں بعض لوگ یہ توقع رکھتے ہیں کہ دین اسلام جو انسانی زندگی کے لئے اللہ کا تجویز کردہ نظام ہے، اسے معجزانہ طور پر کام کرنا چاہئے۔ اس میں اس کے انسانی مزاج، اس کی فطری قوت اور کسی وقت میں موجود مادی صورت حال کا کوئی لحاظ نہ رکھا جائے، چاہے انسان ترقی کے کسی درجے میں ہوں، اور جس معاشرے اور ماحول میں بھی ہوں۔

جب یہ لوگ دیکھتے ہیں کہ اسلام اس معجزانہ اور ساحرانہ انداز میں کام نہیں کرتا بلکہ اسلام لوگوں کی بشری طاقت کے مطابق کام کرتا ہے اور یہ انسانی محدود قوت اور انسان کی اصل بنیادی صورت حال باہم دگر مل کر کام کرتے ہیں۔ بعض اوقات انسان اور اس وقت کی موجود صورت حالات اسلامی نظام سے واضح طور پر متاثر ہو جاتے ہیں، اور یا یہ دونوں مل کر لوگوں کی جانب سے اسلام کی جانب رد عمل کو متاثر کرتے ہیں۔ بعض اوقات ان دونوں کے اثرات اسلام کے خلاف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ سے لوگ کیچڑ کی طرح بھاری ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کی نظروں میں لالچ، لذت اور شہوت اس قدر اہم ہو جاتی ہے کہ وہ اسلام کے پیغام کو قبول کرنے کی راہ میں حائل ہو جاتی ہے اور لوگ اسلامی سمت میں

نہیں چلتے۔ جب یہ لوگ ایسی صورت حال دیکھتے ہیں تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں اور یہ صورت حال ایسے لوگوں کی توقعات کے خلاف ہوتی ہے۔ اس لئے کہ یہ دین اللہ کی جانب سے ہوتا ہے..... اور بعض اوقات وہ اس بات میں شبہ کرنے لگتے ہیں کہ آیا یہ دین فی الواقعہ لوگوں کے لئے کوئی مکمل نظام حیات ہے بھی اور اس سے بھی آگے بڑھ کر بعض لوگ سرے سے اس دین کی حقانیت پر شک کرنے لگتے ہیں۔

فکر و عمل کی ان غلطیوں کی بنیاد صرف ایک غلطی پر ہے۔ وہ یہ کہ ایسے لوگوں نے اس دین کے مزاج ہی کو نہیں سمجھا۔ اس کے طریقہ کار ہی کو نہیں سمجھا، یا وہ اس حقیقت کو سمجھ کر بھول گئے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ دین انسانی زندگی کے لئے ایک منہاج ہے۔ اور اس کا انسانی زندگی کے اندر قیام خالص انسانی جدوجہد پر موقوف کیا گیا ہے۔ اور اس جدوجہد کو انسانی طاقت کے اندر محدود کیا گیا ہے۔ اور اس دین پر عمل پیرا ہونے کا آغاز وہاں سے کیا جاتا ہے جہاں انسان اپنی مادی زندگی کی ترقی کے مدارج میں سے جدوجہد میں موجود ہو، یہ دین انہیں جہاں پاتا ہے وہاں سے لے کر آگے چلتا ہے۔ اور انہیں اپنے آخری انجام تک پہنچاتا ہے۔ اور یہ سب کام انسان کی طاقت اور وسعت کے حدود میں کیا جاتا ہے۔ اور وہاں تک وہ انہیں آگے بڑھاتا ہے جس قدر ان کے اندر طاقت اور وسعت ہو اور جہاں تک وہ پہنچ سکتے ہوں اور پہنچنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے ہوں۔

اس کام میں اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک لحظہ بھی اس کام سے غفلت نہیں کرتا۔ کسی منصوبے میں غفلت نہیں کرتا۔ کسی اقدام میں غفلت نہیں کرتا۔ اور فطرت انسانی کے مطابق کام کرتا ہے، انسانی طاقت کے حدود کے اندر رہتے ہوئے کام کرتا ہے۔ انسان مادی اعتبار سے جہاں تک ترقی یافتہ ہو اس کے مطابق کام کرتا ہے، اور اس کے ساتھ ساتھ وہ اسے اس مقام تک لے جاتا ہے جہاں تک وہ ابھی تک نہیں پہنچ پایا تھا اور تاریخ انسانی میں انسان کے وضع کردہ تمام نظامہائے زندگی کے ادوار میں سے کسی دور میں بھی نہیں پہنچ پایا تھا۔ اسلام نے اپنے یہ کمالات عملاً اس وقت

دکھائے جب کبھی بھی ایک مختصر وقت کے لئے اسے نافذ کیا گیا اور آئندہ بھی وہ ایسا ہی کر کے دکھائے گا بشرطیکہ کوشش اس کے نفاذ کی کی جائے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غلطی کا آغاز اس دین کے مزاج کو نہ سمجھنے یا سمجھ کر اسے بھلا دینے کی وجہ سے ہوا جس طرح ہم نے کیا۔ اور ہم نے نفاذ دین کے لئے معجزانہ اور ساحرانہ انقلاب کا انتظار شروع کر دیا جو انسانی صورت حال کے مناسب نہیں ہے جس سے فطرت انسانی بدل جاتی ہے اور جس سے اسلام کا مزاج بدل جاتا ہے۔ اور یہ طریقہ کار اس کی فطرت حقیقی سے لگا نہیں کھاتا۔ اس کی استعداد اور اس کے رجحانات کے بھی خلاف ہے اور جو انسان کے مادی حالات کے بھی خلاف ہیں۔

کیا اسلام من جانب اللہ نہیں ہے؟ کیا وہ ایسی قوت قادرہ کی طرف سے ارسال کردہ نہیں ہے جسے کوئی قوت عاجز نہیں کر سکتی؟ تو پھر اسلام کے نفاذ کو کیوں انسانی طاقت کے حدود پر موقوف کر دیا گیا اور کیوں اسے انسانی جدوجہد کا محتاج کیا گیا ہے؟ پھر کیوں ایسا نہیں ہوتا کہ انسان اس کے لئے کام کریں اور وہ ہمیشہ غالب ہی ہوں؟ کیوں اسلامی لوگ ہمیشہ کامیاب نہیں رہتے؟ انسان کی خواہشات نفسانیہ اس کا مزاج اور اس کی مادی صورت حال کیوں اس پر غالب آجاتی ہیں اور کبھی ایسا کیوں ہوتا ہے کہ اہل حق شکست فاش کھاتے ہیں حالانکہ وہ اہل حق ہوتے ہیں؟

یہ تمام سوالات جیسا کہ ہم نے بیان کیا حقیقی سوالات ہیں اور یہ اس لئے پیدا ہوتے ہیں کہ ہم نے اس دین کے اصل مزاج ہی کو نہیں سمجھا ہے باوجود اس کے کہ اس دین کا مزاج اور اس کا طریق کار نہایت ہی سادہ ہیں یا ہم نے انہیں سمجھتے ہوئے بھلا دیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے اور وہ انسانی فطرت کو بھی تبدیل کر سکتا ہے۔ چاہے وہ فطرت انسانی کو اس دین کے ذریعہ بدلے یا اس کے لئے کوئی اور طریق کار اختیار کرے اور وہ اس بات پر بھی قادر تھا کہ ابتدائے آفرینش سے انسان کو کسی دوسری فطرت پر پیدا کرتا۔ لیکن اس کی مشیت یہ تھی کہ وہ انسان کو اس کی موجودہ فطرت پر ہی پیدا کرے۔ اور اللہ تعالیٰ نے پسند کیا کہ انسان کو ذی

ارادہ بنائے اور اس کے اندر ہدایت و ضلالت قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔ اور اس کی مشیت یہ بھی تھی کہ ہدایت کو انسان کی جدوجہد اور اس کی جانب سے طلب ہدایت اور اس کی استعداد قبولیت پر موقوف کر دیا جائے۔ پھر اللہ کی مشیت نے چاہا کہ انسانی فطرت ہمیشہ کام کرتی رہے اور اسے کسی صورت میں مٹایا نہ جاسکے نہ تبدیل کیا جاسکے اور نہ معطل کیا جاسکے اور اس کی مشیت یہ بھی تھی کہ اسلامی نظام زندگی کو اس کرہ ارض پر بذریعہ انسانی جدوجہد قائم کیا جائے اور انسانی طاقت اور وسعت کے حدود کے اندر قائم کیا جائے۔ اور یہ بھی مشیت الہی کا ایک حصہ تھا کہ انسان کو وہی کچھ ملے جس قدر وہ اپنی وسعت کے مطابق جدوجہد کرے۔ اس کی زندگی کے شب و روز کے مطابق اور جو صورت حال فی الواقعہ موجود ہو اس کے دائرے میں۔

انسانوں میں سے کسی کے لئے یہ حق نہیں ہے کہ وہ پوچھے اللہ نے ایسا کیوں چاہا۔ جب تک انسان بندہ اور خدا اللہ ہے اس لئے کہ انسان کے پاس اس کائنات کے نظام کا کلی علم نہیں ہے اور نہ اس علم تک کبھی انسان کے پہنچنے کا امکان ہے۔ نہ انسان کو یہ علم دستیاب ہو سکتا کہ اس کائنات کے ہر موجود کے حوالے سے نظام کائنات کے تقاضے کیا ہیں اور یہ کہ انسان کی موجودہ فطرت کی منصوبہ بندی اور تشکیل کے پیچھے کیا کیا حکمت کار فرما ہے۔ اس لئے ایسے مقامات پر ایک سچا مسلمان یہ سوال کر ہی نہیں سکتا کہ کیوں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایک سنجیدہ ملحد بھی یہ سوال نہیں کر سکتا کیوں؟ مومن تو اس لئے نہیں کر سکتا کہ اسے بارگاہ الہ میں بڑا بادب ہونا چاہئے اس لئے کہ اس کا دل ذات باری کی حقیقت اور اس کی صفات سے واقف ہوتا ہے اور اسے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ انسانی ادراک کا یہ میدان عمل ہی نہیں ہے۔ اور کافر اس لئے یہ سوال نہیں کرتا کہ وہ سرے سے خدا کو تسلیم ہی نہیں کرتا۔ اگر سے ذات باری کی معرفت ہوتی تو وہ اس کی ذات و صفات کا اعتراف کر لیتا۔ الوہیت کے تقاضوں کو جانتا۔

ہاں بعض ایسے لوگ جو سنجیدہ نہیں ہوتے اور اخلاقی لحاظ سے گرے ہوئے ہوتے ہیں وہ ایسے سوالات کرتے ہیں۔ وہ نہ سنجیدہ اور سچے مسلم ہوتے ہیں اور نہ ہی سنجیدہ اور سچے کافر ہوتے ہیں۔ اس لئے اس سوال میں زیادہ دلچسپی لینا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی اسے سنجیدگی کے ساتھ لینا چاہئے۔

کبھی یوں ہوتا ہے کہ ایک جاہل شخص ذات باری کے متعلق سوال کرتا ہے۔ اس لئے کہ ایسے جاہل کے سوال کا جواب براہ راست نہ دینا چاہئے۔ اسے صرف اللہ کی الوہیت کی حقیقت بتادینا چاہئے، تو اگر وہ اسے پالے تو مومن ہے اور اگر نہ پاسکے تو کافر ہے۔ بس ایسے جاہل کے ساتھ بات یہاں ختم ہو جاتی ہے۔ ورنہ یہ شخص بحث برائے بحث کر رہا ہو گا۔

اصل بات یہ ہے کہ اللہ کی مخلوقات میں سے کسی کو یہ سوال اٹھانے کا حق ہی نہیں ہے کہ اللہ نے حضرت انسان کو اس کی اس موجودیہ فطرت کے مطابق کیوں پیدا کیا؟ کیوں اس کی یہ فطرت کام کرتی رہتی ہے، اسے مٹایا نہیں جاسکتا۔ اس میں تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔ اسے معطل نہیں کیا جاسکتا اور پھر کیوں اللہ نے اسلامی نظام زندگی کے قیام کو انسانی جدوجہد پر موقوف کیا اور انسانی طاقت کے اندر جدوجہد کو ضروری قرار دیا۔

ہر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ اس حقیقت کا ادراک کرے۔ وہ دیکھے کہ انسانی فطرت انسانی ماحول کے اندر کس طرح کام کرتی ہے۔ پھر وہ انسانی تاریخ کا مطالعہ اس فطری انداز میں کرے۔ اس طرح ایک تو وہ تاریخی واقعات کے حقیقی اسباب کو سمجھے گا اور دوسرے یہ کہ اسے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ تاریخ کا رخ کس طرح موڑا جاسکتا ہے۔

یہ نظام زندگی جسے ہم اسلام کہتے ہیں، جس طرح اسے حضرت محمد ﷺ نے پیش فرمایا، اس زمین پر، ان لوگوں کی دنیا میں، صرف اس بنا پر جاری و ساری اور قائم نہیں ہو سکتا کہ بس وہ اللہ کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اور یہ صرف مجرد ”تبلیغ“ اور ”بیان“ سے بھی نافذ نہیں ہو سکتا۔ اور یہ اس طرح بھی نافذ نہیں ہو سکتا کہ اسے اللہ تعالیٰ ناموس فطرت اور قوانین قدرت کی طرح نافذ کر دے، جو اس نے آسمانوں کی گردش، ستاروں کی رفتار اور طبعی اسباب پر طبعی نتائج مرتب کئے جانے والے کے سلسلے میں جاری کئے ہوئے ہیں۔ بلکہ اس کے لئے یہ منہاج رکھا گیا ہے کہ اسے ایک انسانی جماعت لے کر اٹھے، جو سب سے پہلے اس پر اچھی طرح ایمان رکھتی ہو، پھر خود اس پر پوری طرح عمل پیرا ہو اور اپنی طاقت کے مطابق اسے زندگی کا وظیفہ اور نصب العین قرار دے۔ پھر دوسروں کے دلوں میں اس ایمان کی

منتقلی اور ان کی زندگیوں میں اس نظام کے قیام کے لئے یہ جماعت جدوجہد کرتی ہو، اور اس قدر جدوجہد کرے کہ اس سلسلے میں وہ اپنی پوری طاقت لگا دے۔ وہ انسانی کمزوریوں کے خلاف جہاد کرے وہ انسانی خواہشات کے خلاف جہاد کرے اور وہ اپنے نفس کی جہالت اور دوسرے نفوس کی جہالت کے خلاف جہاد کرے۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ جہاد کرے جو انسانی کمزوریوں، خواہشات نفسانیہ اور جہالت کی وجہ سے اس نظام زندگی کی راہ رو کے کھڑے ہیں اور اس نظام زندگی کو اس حد تک قائم کر دے جس حد تک انسانی مزاج اور طاقت اسے برداشت کر سکتے ہیں اور وہ انسانوں کو اس مقام سے پکڑے جس مقام پر وہ درجہ ترقی کے حوالے سے عملاً موجود ہوں۔ وہ ان انسانوں کے حقیقی حالات زندگی کو نظر انداز نہ کرے۔ نیز وہ لوگوں کے حقیقی حالات کے تقاضوں کو بھی نظر انداز نہ کرے اور ان حالات اور تقاضوں کے مطابق اس نظام کو چلائے۔ لوگوں کی یہ جماعت پہلے خود اپنے نفس پر فتح حاصل کرے، اور پھر کبھی وہ اپنے ماحول کے لوگوں پر فتح حاصل کرے اور کبھی یوں ہو کہ وہ اپنے نفس اور اپنے ماحول کے لوگوں سے شکست کھا جائے۔ یہ بات اس کی جدوجہد کے عین مطابق ہو۔ ان عملی طریقہ ہائے کار کے عین مطابق ہو، جو اس جماعت نے اختیار کئے یا جس قدر اسے اختیار کرنے کی توفیق ہوئی۔ پھر اس جماعت کے لئے ہر چیز سے پہلے ہر جدوجہد سے پہلے اور ہر وسیلہ و اسلوب سے پہلے ایک دوسرا بنیادی عنصر بھی ضروری ہے، وہ یہ کہ یہ جماعت اس نصب العین کے ساتھ کس قدر مخلص ہے اور وہ کس قدر اپنی ذات کے اندر اسے نافذ کر رہی ہے۔ اور یہ کہ اس نظام کے نازل کرنے والے اللہ کے ساتھ اس کا تعلق کس قدر ہے؟ اسے اس پر کس قدر اعتماد ہے اور اسے اس پر کس قدر توکل اور بھروسہ ہے؟

یہ ہے اس دین کی اصل حقیقت اور یہ ہے اس کا طریق نفاذ اور یہ ہے اس کی تحریک کا منصوبہ۔ اور یہی وہ بات ہے جسے اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو اچھی طرح سمجھانا چاہتے ہیں۔ واقعہ جنگ احد کے تمام واقعات کے بیان، ان واقعات پر آنے والے تبصروں کا پورا ماحصل یہی ہے۔

اب یہ کہ احد کے موقع پر اسلامی جماعت نے جب مکمل اسلام کو، جس میں اس وقت رسول اللہ ﷺ کے احکام شامل تھے، اپنے نفسوں میں عملی شکل پیش کرنے میں قدرے قصور کیا، اور بعض

مواقف پر اس نے بعض عملی اقدامات کرنے میں کوتاہی کی، اور جب اس نے اس مذکورہ بالا عظیم اساسی حقیقت کو سمجھنے میں کوتاہی کی اور اس نے یہ خیال کیا کہ ہم تو بہر حال کامیاب ہوں گے، اس لئے کہ یہ دین اور یہ نظام اللہ کی طرف سے ہے اور اس بنا پر اس نے اپنے تصرفات اور تدابیر کو نظر انداز کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے اس کو ہزیمت سے دوچار کر دیا تاکہ وہ ذرا تلخ تجربات کا مزہ بھی چکھ لے۔ چنانچہ اس تجربے کے بعد قرآن مجید نے ان کی اس غلط فہمی کو اپنے تبصرے کے ذریعہ دور کرنے کی کوشش کی۔

أَوَلَمْ أَصَابِكُمْ مِصْبِيهُ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّى هَذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ إِنَّ رَبَّ اللّٰهِ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ

”اور جب تم پر وہ مصیبت آئی جس کے دو گنا تمہارے ہاتھوں سے ان پر آئی تھی تو تم نے کہا یہ کیسے؟ اے پیغمبر کہہ دو کہ یہ خود تمہارے اپنے نفوس کی وجہ سے ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔“

جیسا کہ اس سے قبل سیاق کلام میں کہہ آئے ہیں، اللہ اہل ایمان کو اس مقام پر چھوڑ نہیں دیتے بلکہ انہیں اللہ کی تقدیر کے ساتھ پیوستہ فرماتے ہیں جو ان اسباب اور نتائج کی پشت پر کام کر رہے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ انہیں بتاتے ہیں کہ اس ابتلا کی پشت پر اللہ کا ارادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان کے لئے بھلائی چاہتے ہیں، رہی ابتلا تو یہ تو ان پر ان کے اپنے تصرفات اور اسباب ظاہری کی وجہ سے آتی ہے۔

یہ فیصلہ کہ اسلامی نظام زندگی کا قیام، انسانی جدوجہد پر چھوڑ دیا گیا ہے اور اس پر ان انسانی اقدامات کا اثر ہوتا ہے جو وہ اس کے حوالے سے کرتے ہیں۔ اس میں انسان کے لئے بہت بڑی بھلائی ہے۔ اس لئے کہ اسلامی نظام زندگی میں فساد کے بجائے اصلاح چاہتا ہے۔ اسے معطل کرنا نہیں چاہتا۔ وہ انسانی فطرت کی اصلاح اس طرح چاہتا ہے کہ وہ اسے بیدار کرتا ہے اور اسے اعتدال پر لاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ کسی دل میں ایمان اس وقت تک مکمل اور پورا نہیں ہو سکتا جب تک یہ شخص اسلام کے

حوالے سے لوگوں کا مقابلہ نہیں کرتا۔ یہ جہاد وہ سب سے پہلے تبلیغ اور بیان کے ذریعہ کرے گا۔ اس کے بعد وہ مجاہدہ ہاتھ سے کرے گا جب کہ مخالف اسلام قوت زبردستی راہ ہدایت کو مسدود کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں اس مومن پر ابتلا کا دور بھی آسکتا ہے جس میں اسے صبر سے کام لینا ہو گا، تکالیف برداشت کرنا ہوں گی، ہزیمت اٹھانی ہوگی اور اس پر صبر کرنا ہو گا۔ اگر فتح نصیب ہو تو سنجیدہ رہنا ہو گا۔ اس لئے کہ فتح کے وقت صبر اور سنجیدگی بہ نسبت شکست کے زیادہ مشکل ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ دل صاف ہو جائے، صفوف کے اندر سے کچا عنصر چھٹ جائے، جماعت اپنی صحیح راہ پر گامزن ہو جائے اور اپنی سیدھی راہ پر اوپر کی طرف چڑھتی جائے اور اس تمام سرگرمی میں متوکل علی اللہ ہو۔

اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ جب تک قلب مسلم ایمان کے معاملے میں لوگوں کے مقابلے میں مجاہدہ اور جہاد نہیں کرے گا ان کے دلوں میں حقیقت ایمان کا بیٹھنا نہایت ہی مشکل ہے۔ اس لئے کہ لوگوں کے ساتھ مقابلہ اور مجاہدہ سے قبل اس نے اپنے نفس کے ساتھ مجاہدہ کر لیا ہو گا۔ اور اس جہاد کے بعد اس کے سامنے ایمان کے وہ آفاق کھلیں گے جو اس کے سامنے کبھی نہیں کھل سکتے جب تک وہ بیٹھا ہو اور پرامن زندگی گزارنے کا عادی ہو اور ہر کسی کے ساتھ مسالمت کر رہا ہو اور ہر حال میں نباہ رہا ہو۔ جب وہ جہاد شروع کرے گا تو اسے لوگوں کے اندر حقائق نظر آئیں گے، زندگی کے اندر کچھ حقائق اس پر روشن ہوں گے جو ہرگز اس پر روشن نہیں ہو سکتے تھے جب تک وہ مجاہدہ فی سبیل اللہ نہیں شروع کرتا۔ اس جہاد فی سبیل اللہ ہی کے نتیجے میں اس کا نفس، اس کا شعور، اس کے تصورات، اس کی عادات، اس کا مزاج، اس کے تاثرات اور اس کی قوت قبولیت حق اس مقام تک پہنچ جائیں گے جہاں تک اس کے بغیر وہ ہرگز نہ پہنچ سکتا تھا۔ غرض جہاد کا یہ شاق اور تلخ تجربہ انسان کو کندن بنا دیتا ہے۔

اسی طرح کسی جماعت مسلمہ کے اندر بھی ایمان کی حقیقت اس وقت تک مکمل اور مضبوط نہیں ہو سکتی جب تک وہ تجربہ، امتحان اور ابتلا میں نہ پڑے۔ اور جب تک اس کا ہر فرد اپنی قوت کی حقیقت سے واقف نہ ہو۔ جب تک اس فرد کو اپنے نصب العین کا پتہ نہ ہو۔ اسی طرح اس جماعت کو بھی اپنی

تمام اینٹوں کا پتہ نہ ہو جن سے وہ بنی ہے۔ یوں کہ ہر اینٹ کس قدر بوجھ سہار سکتی ہے اور یہ کہ مشکل اور ٹکر کے وقت وہ اینٹیں ایک دوسرے کے ساتھ کس قدر پیوست ہیں۔

یہ تھی وہ حکمت جس کو اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو سمجھانا چاہتے تھے اور یہ حکمت اس کو تربیت کے اس کورس میں اسے سمجھائی گئی جو میدان احد میں اسے دیا گیا۔ اور اس کے بعد پھر واقعات احد پر اس سورت میں جو تبصرہ کیا گیا، اس میں بھی اسی حکمت کو اسے سمجھایا گیا۔ جبکہ ظاہری اسباب شکست کے بیان کے بعد اللہ نے فرمایا: ”جو نقصان لڑائی کے دن تمہیں پہنچا وہ اللہ کے اذن سے تھا اور اس لئے تھا کہ اللہ دیکھ لے تم میں سے مومن کون ہیں اور منافق کون ہیں۔“ اور دوسری جگہ فرمایا ”اللہ مومنوں کو اس حالت میں ہر گز نہ رہنے دے گا جس میں تم لوگ اس وقت پائے جاتے ہو۔ وہ پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔“ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں اللہ کی حکمت اور تقدیر کی طرف حوالے کرتا ہے، یعنی ان اسباب کی پشت پر جو تقدیر اور حکمت تھی۔ چنانچہ انہیں ایمان کی اس عظیم حقیقت اور سچائی کی طرف موڑتا ہے جو اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک وہ نفس انسانی کے اندر بیٹھ نہیں جاتی۔ فرماتے: ”اس وقت اگر تمہیں چوٹ لگی ہے تو اس سے پہلے ایسی ہی چوٹ تمہارے فریق مخالف کو بھی لگ چکی ہے۔ یہ تو زمانہ کے نشیب و فراز ہیں جنہیں ہم لوگوں کے درمیان گردش دیتے رہتے ہیں۔ تم پر یہ وقت اس لئے لایا گیا ہے کہ اللہ دیکھنا چاہتا ہے کہ تم میں سچے مومن کون ہیں اور ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو واقعی راستی کے گواہ ہیں کیونکہ اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اور وہ آزمائش کے ذریعہ مومنوں کو الگ چھانٹ کر کافروں کی سرکوبی کرنا چاہتا تھا۔“

تو گویا یہ اب اللہ کی تقدیر ہے، اس کی تدبیر ہے اور اس کی حکمت ہے، جو ان اسباب کی پس پشت کام کر رہی ہے، ان واقعات کے پیچھے کام کر رہی ہے۔ اور ان تمام اشخاص اور ان کی تمام حرکات کے پیچھے حقیقی موثر ہے۔ اور یہی اسلام کا کامل اور شامل اور جامع تصور ہے۔ اور یہ تصور ان واقعات کے نتیجے میں انسانی ذہن میں بیٹھ جاتا ہے۔ اور پھر ان واقعات پر جو تبصرہ کیا گیا ہے، اس میں بھی اس کی طرف واضح اشارات موجود ہیں۔

۲۔ اس معرکے کے واقعات اور ان تبصروں کے ذریعہ ایک دوسری حقیقت واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ یعنی نفس انسانی، فطرت انسانی، انسانی جدوجہد کے مزاج، اور ان تمام امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان میں فریضہ اقامت دین کے حصول کے امکانات..... حقیقت یہ ہے کہ نفس انسانی کامل نہیں ہے اور یہ اپنی حقیقت واقعہ کے اعتبار سے کامل نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ ارتقاء اور ترقی کے اہل بھی ہے اور وہ اس میدان میں ترقی و کمال کی انتہاؤں کو چھو سکتا ہے، جو انتہاء اور حد اس کے لئے مقرر کر دی گئی ہے۔

دیکھئے ہم انسانی جماعتوں میں سے ایک جماعت کا مطالعہ کرتے ہیں، اور یہ جماعت اپنی حقیقی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ جماعت گروہ صحابہ کی صورت میں ہے، جس کے بارے میں قرآن کریم کہتا ہے **كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ**..... (تم سب سے بہترین امت ہو، جسے لوگوں کے لئے نکالا گیا ہے) اور یہ خیر امت رسول اکرم ﷺ کے صحابہ تھے۔ یہ تمام انسانیت کی روح اور زمین کا نمک تھے۔ لیکن اس جماعت صحابہ کا جو مطالعہ اس سورت میں پیش کیا گیا ہے ”تم میں سے جو لوگ مقابلے کے دن پیٹھ پھیر گئے ان کی لغزش کا سبب یہ ہے کہ ان کی بعض کمزوریوں کی وجہ سے شیطان نے ان کے قدم ڈمگا دیئے تھے۔ اللہ نے انہیں معاف کر دیا۔“ اور بعض دوسرے صحابہ کے بارے میں ہے ”مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور کام میں باہم اختلاف کیا، اور جو نہی کہ وہ چیز تمہیں دکھائی دی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے تو تم اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کر بیٹھے۔ اس لئے کہ تم میں سے کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کی خواہش رکھتے تھے۔“ **وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ**..... ”اور دراصل تمہاری اس لغزش کو اللہ نے معاف کر دیا۔“..... انہی کے بارے میں قرآن کہتا ہے ”جب تم میں دو گروہوں نے یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ کمزوری دکھائیں اور اللہ تو ان کا مددگار تھا، اللہ ہی پر اہل ایمان کو توکل کرنا چاہئے۔“ انہی حضرات میں سے بعض لوگ شکست کھاتے ہیں اور وہ کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور ان کی ہزیمت کے بارے میں خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

”یاد کرو جب تم بھاگے چلے جا رہے تھے کسی کی طرف پلٹ کر دیکھنے تک کا ہوش تمہیں نہ تھا۔ اور رسول تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا۔ اس وقت تمہاری اس روش کا بدلہ اللہ نے تمہیں یہ دیا کہ تم کو رنج پر رنج دیئے تاکہ آئندہ کے لئے تمہیں یہ سبق ملے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ سے جائے یا جو مصیبت تم پر نازل ہو اس پر ملول نہ ہو۔“

جنگ بدر کے شرکاء سب کے سب مومن اور مسلم تھے۔ لیکن یہ اسلام کا ابتدائی دور تھا۔ اس وقت جماعت کی تربیت اور تشکیل ہو رہی تھی۔ لیکن وہ اسلامی نظریہ حیات اپنانے میں سنجیدہ اور سچے تھے۔ انہوں نے اپنا تمام معاملہ اللہ کے سپرد کر دیا تھا۔ اللہ کی راہنمائی پر راضی ہو گئے تھے۔ انہوں نے اس نظام زندگی کے آگے سر تسلیم خم کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ نے انہیں اپنے جوار رحمت سے دھتکار نہ دیا۔ ان پر رحم فرمایا اور انہیں معاف کر دیا۔ اور رسول اللہ ﷺ کو بھی حکم دیا کہ وہ انہیں معاف کر دیں۔ اور ان کے لئے مغفرت طلب کریں۔ اور اللہ نے رسول ﷺ کو یہ حکم بھی دیا کہ آپ ﷺ ان سے مشورہ بھی لازماً کریں۔ باوجود اس کے کہ ان سے غلطیاں ہوئیں، باوجود اس کے کہ مشورے کے نتیجے میں، احد میں نقصان ہوا۔ اللہ نے انہیں اپنے معاملات اور تصرفات کے نتائج کا مزہ چکھنے دیا۔ اور انہیں ایسے سخت اور تلخ ابتلا میں ڈالا۔ لیکن ان غلطیوں کے باوجود انہیں اسلامی صفوں سے باہر نکال کر نہیں پھینک دیا۔ اور یہ حکم صادر نہیں کیا: ”جاؤ تم اس کام کے لئے فٹ نہیں ہو، کیونکہ تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ تم سے کمزوریاں سرزد ہوئیں اور تم نے غلطیاں کیں۔“ بلکہ اسلام نے ان کی غلطیوں اور کمزوریوں کو قبول کر لیا۔ اس ابتلا میں ڈال کر ان کی تربیت کی۔ اس کے بعد ان کی غلطیوں پر مزید تبصرہ کر کے مزید تربیت کی۔ اور اس کے بعد نصیحت کر کے اور ہدایات دے کر مزید تربیت کی۔ اور یہ نصیحت اور یہ وعظ بھی نہایت ہی مشفقانہ انداز میں عفو و درگزر کے ساتھ کیا۔ جس طرح ایک بزرگ اپنے بچوں کی تربیت کرتا ہے۔ وہ آگ سے جلائے جاتے ہیں تاکہ انہیں معلوم ہو کہ آگ جلاتی ہے اور تاکہ وہ ہوشیار ہو جائیں۔ اللہ نے ان کے ضعف کو ان پر آشکارا کیا اور ان کے دلوں کی خفیہ سوچوں سے بھی انہیں آگاہ کر دیا۔ اس لئے نہیں کہ انہیں شر مندہ کیا جائے، یا ذلیل کیا جائے، یا حقیر سمجھا جائے یا یہ کہ انہیں مجبور کیا جائے اور ان پر وہ بوجھ ڈالا جائے جس کے وہ متحمل نہیں ہو سکتے، بلکہ

اس لئے کہ ان کے ہاتھ پکڑے جائیں، انہیں ہدایت دی جائے۔ ان کے اندر خود اعتمادی پیدا کی جائے اور وہ اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھیں اور کبھی بھی مایوس نہ ہوں جب تک وہ اللہ کی مضبوط رسی کو تھامے ہوئے ہیں۔

اس تربیت کے بعد وہ اپنے اصل مقام پر آگئے۔ اپنی آخری منزل تک پہنچ گئے اور ان کے اندر وہ رنگ پیدا ہو گیا جو احد کے معرکہ کے آغاز میں تھا۔ آج ہزیمت اور چوٹ لگنے پر ایک ہی رات گزری ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تعاقب کے لئے نکل رہے ہیں۔ آج نہ ان کے دل میں ڈر تھا نہ تردد تھا۔ آج وہ ڈرانے والوں کی باتوں کو خاطر ہی میں نہ لارہے تھے، جو انہیں ان الفاظ میں ڈرا رہے تھے:

الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا
حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ

”جن سے لوگوں نے کہا کہ تمہارے خلاف فوجیں جمع ہوئی ہیں، ان سے ڈرو۔ تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور انہوں نے جواب دیا کہ ہمارے لئے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔“

اور اس کے بعد جب افراد جماعت بڑے اور بالغ ہوتے گئے تو ان کا معاملہ بھی بدلتا گیا اور ان کا محاسبہ اس طرح کیا جانے لگا جس طرح بڑے اور بالغ افراد کا کیا جاتا ہے۔ لیکن ابتداء میں ان کی تربیت اسی طرح تھی جس طرح بچوں کی تربیت کی جاتی ہے۔ جو شخص غزوہ تبوک کے حالات پڑھے گا (سورت برأت میں) چند افراد اس غزوے سے پیچھے رہ گئے تھے۔ رسول ﷺ نے ان کا سخت محاسبہ کیا۔ یہ بہت ہی سخت محاسبہ تھا۔ اس سے احد اور تبوک کی پالیسی کے درمیان واضح فرق نظر آئے گا اس لئے کہ اب جماعت تربیتی لحاظ سے بہت ہی آگے جا چکی تھی۔ لیکن جب یہی لوگ احد میں تھے، تو ان سے نرمی کی گئی۔ اس لئے کہ اب تبوک کے معاملے میں وہ تربیت کے آخری مرحلے میں تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ تھے تو انسان۔ پھر بھی ان میں انسانی کمزوری تھی، غلطی ہو گئی، لیکن ان کے اندر غلطی کا اعتراف اور توبہ کا داعیہ موجود تھا، آخر کار معافی ہوئی۔

غرض اسلامی زندگی کے اندر انسان کی بشتریت کو ہمیشہ پیش نظر رکھا گیا ہے۔ اسے تبدیل نہیں کیا جاتا، اسے معطل نہیں کیا جاتا اس پر اس قدر بوجھ نہیں ڈالا جاتا کہ اس کی طاقت سے باہر ہو۔ اگرچہ اسلامی نظام زندگی اسے اس دنیا میں اس مقام بلند تک پہنچاتا ہے جو اس کے لئے مقدر ہو۔

اسلام کا یہ طرز عمل اس نقطہ نظر سے بہت ہی اہم ہے کہ وہ انسان کو ہمیشہ امید کی کرن سے نوازتا ہے تاکہ وہ سعی برائے کمال جاری رکھے اور آگے بڑھے۔ لیکن اسلامی نظام زندگی کے سایے میں یہ جماعت جس مقام بلند تک پہنچی وہ اس گھرے ہوئے مقام سے اپنے سفر کا آغاز کر کے پہنچی جس میں وہ اس وقت پڑی تھی جب اسلام آیا راستے میں اس سے لغزشیں ہوتی رہیں، اس لئے کہ راستہ دشوار گزار تھا، اور وہ جماعت بہر حال ایک انسانی جماعت تھی اور ایک نہایت ہی پسماندہ سوسائٹی سے اٹھی تھی جو جاہلیت میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ہر لحاظ سے پسماندہ تھی جب کہ ہم نے اس کے نمونے تشریح آیات کے وقت پیش کئے۔ اسلام کی اس پالیسی کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانیت کو اس مقام بلند تک پہنچنے کی امید سے مالا مال کر دیتا ہے۔ اگرچہ کسی معاشرے کے موجودہ حالات بد سے بدتر ہوں۔ پھر اس پسماندہ سوسائٹی سے امت کو اٹھا کر اسلام اس قدر ترقی دیتا ہے کہ اس کی مثال آج تک پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ابھی تک اس مثال کو دہرایا نہیں جاسکا حالانکہ یہ کوئی معجزانہ انقلاب نہ تھا جو اب ناقابل اعادہ ہے بلکہ یہ ایک ایسا انقلاب تھا جو اسلامی زندگی کے تحت رونما ہوا جو انسانی جدوجہد کے نتیجے میں رونما ہوا۔ انسانی طاقت کے حدود کے اندر رونما ہوا۔ آج بھی یہ انقلاب اسی انسانی طاقت کے بل بوتے پر برپا کیا جاسکتا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ انقلاب ممکن ہے۔

غرض اسلامی زندگی پر سوسائٹی کو وہاں لیتا ہے جہاں وہ موجود ہوتی ہے اور جہاں تک وہ مادی ترقی کر چکی ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ اسے مزید ترقی دیتا ہے جب کہ اس نے عربوں کی جاہلیت زدہ پسماندہ سوسائٹی کے ساتھ کیا جو نہایت ہی ابتدائی مدارج پہ تھی۔ نہایت گری ہوئی اور اس سوسائٹی کو اسلام نے نہایت ہی ایک مختصر عرصے میں جو ربع صدی سے بھی کم تھا، اوج کمال تک پہنچایا۔

لیکن اس کے لئے واحد شرط ضروری ہے۔ وہ یہ کہ کوئی انسانی سوسائٹی اپنی تکمیل اس نظام کے ہاتھ میں دے دے۔ اس پر ایمان لائے، اس کے آگے سر تسلیم خم کر دے۔ وہ اسے اصول حیات بنادے، وہ اسے اپنی تحریک کا شعار بنادے، اور اس طویل اور دشوار گزار سفر میں اس کے ساتھ ہم قدم ہو جائے۔

۳۔ ایک تیسری حقیقت جسے اس معرکے نے چھانٹ کر رکھ دیا اور اس پر تبصرہ بھی کیا، یہ تھی کہ اسلامی نظام زندگی کے اندر فرد مسلم اور جماعت مسلمہ کے درمیان ایک نہایت ہی پختہ رابطہ ہوتا ہے۔ ایک مسلم فرد کا رابطہ اس معرکے سے بھی ہوتا ہے۔ اخلاق اور طرز عمل میں بھی ہوتا ہے اور سیاسی تنظیم اور اقتصادی معاملات کے اندر بھی ہوتا ہے۔ غرض تمام اجتماعی معاملات کے اندر ہوتا ہے۔ جب فتح ہو تو بھی ہوتا ہے اور شکست ہو تو بھی ہوتا ہے۔ کیونکہ اسلامی جماعت کی فتح و شکست کے یہ بنیادی عناصر ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی نفس انسانی اور حیات بشری کے وسیع اور عریض میدان میں کام کرتا ہے۔ یہ اس قدر وسیع میدان ہے کہ جس کی مختلف سمتیں ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ جس کے نقطے ایک دوسرے میں داخل ہیں اور جس کے خطوط اور جس کی تاریخیں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط اور مخلوط ہیں ایک دوسرے کے لئے تکمیل کنندہ ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ شامل اور وابستہ ہیں اور اگر ان خطوط اور نقاط کے اندر سمتوں اور تاروں کے درمیان خلل ہو جائے تو کوئی نقشہ یا کوئی منصوبہ درست طور پر کام نہیں کر سکتا۔

اسلام چونکہ مکمل نظام حیات ہے۔ اس لئے یہ اس کی ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ اس پوری زندگی کو ایک اکائی کی حیثیت سے لیتا ہے۔ وہ اس زندگی کو ٹکڑے کر کے یا اس کے اجزاء کر کے نہیں لیتا۔ وہ نفس انسانی اور حیات انسانی کو ہر طرف سے لیتا ہے اور اس زندگی کے مختلف تار و پود کو جو ایک دوسرے کے ساتھ پوری طرح مربوط ہوتے ہیں، اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے۔ اور ان تمام ڈوریوں کو

متناسق اور متوازن طور پر ہلاتا ہے۔ وہ نفس انسانی کو اجتماعی زندگی سے نہیں کاٹتا اور نہ ہی زندگی کے ٹکڑے اور حصے بخرے کرتا ہے۔

اسلام کی اس جامعیت کی مثال اور اس کے باہم متداخل رابطوں کی مثال اس وقت سامنے آتی ہے جب قرآن مجید معرکہ احد میں ان کی غلطیوں پر تبصرہ کرتا ہے۔ اور یہ بتاتا ہے کہ فتح و شکست میں اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ قرآن کریم کا فیصلہ یہ ہے کہ ہزیمت اس شیطانی عمل کی وجہ سے ہوئی جس میں شیطان نے بعض لوگوں کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا: ”تم میں سے وہ لوگ جو جنگ کے دن پیٹھ پھیر گئے، انہیں ان کی بعض غلطیوں کی وجہ سے شیطان نے لغزش میں مبتلا کیا۔“..... جبکہ وہ لوگ جو انبیاء کے ساتھ مل کر لڑے، ان کے ساتھ وفاداری کی، وہ ایک ایسا ماڈل اور نمونہ ہیں جن کی پیروی کی توقع مسلمانوں سے کی جاتی ہے کہ انہوں نے اپنے معرکے کا آغاز اپنی کوتاہیوں کی طلب مغفرت سے کیا۔ ”اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر بہت سے اللہ پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے، انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی۔ وہ سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی کہ اے ہمارے رب ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہو گیا ہو، اسے معاف کر دے، ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر۔ آخر کار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثواب آخرت میں بھی عطا کیا۔ اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔“..... جب اللہ تعالیٰ جماعت مسلمہ کو ہدایات دیتے ہیں تو وہ انہیں میدان معرکہ میں پہلے کمزوری اور پریشانی سے منع فرماتے ہیں۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ انہیں ہدایات دیتے ہیں۔ وہ ذاتی پاکیزگی اختیار کریں اور استغفار کرتے رہیں: ”دوڑ کر چلو اس راہ پر جو تمہارے رب کی بخشش اور اس کی جنت کی طرف جاتی ہے جس کی وسعت زمین اور آسمانوں جیسی ہے۔ اور وہ ان اللہ ترس لوگوں کے لئے مہیا کی گئی ہے جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ بد حال ہوں یا خوش حال ہوں جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو پسند ہیں اور ان کا حال یہ ہے کہ کبھی کوئی فحش کام ان سے سرزد ہو جاتا ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے وہ اپنے

اوپر ظلم کر بیٹھتے ہیں تو معاً اللہ انہیں یاد آجاتا ہے اور اس سے وہ اپنے قصوروں کی معافی چاہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کے سوا اور کون ہے جو گناہ معاف کر سکتا ہے اور وہ کبھی دانستہ اپنے کئے پر اصرار نہیں کرتے۔“

اس سے قبل قرآن نے اہل کتاب کی ذلت اور ان کی ٹوٹ پھوٹ کی علت یہ بیان کی کہ انہوں نے معصیت کا ارتکاب کیا اور حد سے تجاوز کیا۔ یہ جہاں بھی پائے گئے ان پر ذلت کی مار پڑی، کہیں اللہ کے ذمہ یا انسانوں کے ذمہ میں پناہ مل گئی تو یہ اور بات ہے۔ یہ اللہ کے غضب میں گھر چکے ہیں۔ ان پر محتاجی اور مغلوبی مسلط کر دی گئی ہے۔ اور یہ سب کچھ صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ یہ اللہ کی آیات سے کفر کرتے رہے اور انہوں نے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور یہ ان کی نافرمانیوں اور زیادتیوں کا انجام ہے۔“

اس معرکے کے واقعات کے درمیان غلطی اور غلطی سے رجوع اور توبہ کہ بھی بات ہوتی ہے۔ اور تقویٰ اور خدا خوفی کی تلقین بھی بار بار کی جاتی ہے بلکہ تقویٰ اور خدا خوفی کی تلقین اس صورت میں بہت زیادہ ہے۔ اور توبہ اور خدا خوفی کے مضامین کا اس سورت کے مختلف النوع مضامین سے گہرا تعلق ہے۔ نیز یہ دعوت بھی یہاں دی جاتی ہے کہ سودی کاروبار کو ترک کرو، اللہ اور رسول کی اطاعت کرو، لوگوں کی غلطیوں کو معاف کرو، غصے پر قابو پاؤ اور ہر کسی کے ساتھ احسان کرو۔ یہ سب امور تقویٰ، تزکیہ نفس اور اجتماعی معاملات میں صفائی کے موضوعات سے تعلق رکھتے ہیں۔ غرض یہ پوری سورت باہم مربوط ہے اور ایک نہایت ہی اہم مقصد کی طرف بڑھتی نظر آتی ہے۔

۴۔ چوتھی حقیقت اسلامی تربیت کے منہاج سے متعلق ہے۔ پہلے یہاں واقعات بیان کئے جاتے ہیں، پھر ان واقعات کے نتیجے میں ذہن انسانی میں جو تاثرات، جو سوچ، جو شعور اور جو خواہشات پیدا ہوتی ہیں، پھر قرآن ان سے بحث کرتا ہے، اور اس کے بعد ان سب پر قرآن مجید تبصرہ کرتا ہے۔ جس طرح غزوہ احد کے واقعات اور تاثرات کے بعد قرآن نے ان پر تبصرہ کیا ہے۔ اس تبصرے میں قرآن کریم نفس انسانی کے ہر اس پہلو کو لیتا ہے جو ان واقعات سے متاثر ہوا، تاکہ اس میں اگر کوئی غلطی ہو تو

اس کی تصحیح کر دے اور نفس کے اندر اصل حقائق کا ذخیرہ جمع کر دے جو اسلام جماعت مسلمہ کے نفوس کے اندر پختہ طور پر بٹھانا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن کریم کسی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کرتا، کسی سوچ و خیال کو بھی نہیں چھوڑتا، کسی تصور کو نہیں چھوڑتا، کسی رجحان اور میلان کو نہیں چھوڑتا، لوگوں کو اس کی طرف متوجہ کرتا ہے اور ان پر روشنی ڈالتا ہے۔ انسانی نفس کے پوشیدہ ترین گوشوں کو سامنے لا کر ان میں پائے جانے والے خفیہ میلانات کو سامنے لایا جاتا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ انسان کا دل و دماغ بالکل عیاں اور نگاہوں کے سامنے کھڑا ہے۔ اس طرح انسان کے اندرون کا تزکیہ ہوتا ہے۔ اسے پاک کیا جاتا ہے، اس کی تطہیر ہوتی ہے اور نہایت ہی روشنی میں، انسانی شعور اور تصور کی تصحیح کی جاتی ہے اور ان اصولوں کو برقرار رکھا جاتا ہے جن پر وہ اسلام کے متعین تصور حیات کو استوار کرنا چاہتا ہے اور جس پر قرآن کریم اسلامی زندگی کا ڈھانچہ استوار کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ امور ہیں جن کے ذریعہ قرآن جماعت مسلمہ کی تربیت کرتا ہے۔ وہ کسی بھی واقعہ کو ذریعہ تربیت بناتا ہے اور یہ ہدایت دیتا ہے کہ یہ تربیت وسیع بنیادوں پر ہو اور عملی ہو۔

غزوہ احد پر کئے جانے والے اس تبصرے پر جب ہم نگاہ ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں بڑی جامعیت، بڑی دقت نظر اور گہرائی پائی جاتی ہے۔ دقت نظر کے ساتھ ساتھ ہر موقف، ہر حرکت اور ہر خلجان کو لیا گیا ہے۔ بڑی گہرائیوں کے اندر جا کر نفس انسانی اور اس کے شعور کے اندر خفیہ اور دفن احساسات کو لیا گیا ہے اور جامع اس قدر کہ نفس انسانی، اس کے تمام پہلوؤں اور تمام واقعات کو لیا گیا ہے۔ پھر ان واقعات کے اسباب کا گہرا تجزیہ کیا گیا ہے اور اس کے عمومی اسباب سامنے لائے گئے ہیں اور یہ بتایا گیا ہے کہ کن عوامل اور کن اسباب نے کیا نتائج پیدا کئے ہیں اور پھر بیان واقعات کے اندر زندگی سے بھرپور ہدایات و اشارات سے مالا مال اور موثر تصویر کشی کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ یوں نظر آتا ہے کہ گویا تصویر کشی کے اندر اور واقعات کے انداز تعبیر میں شعور اور سوچوں کا تلاطم برپا ہے اور موج پر موج اٹھ رہی ہے اور شعور کی یہ موجیں نہایت ہی گہری نہایت ہی خوفناک اور ساحل پر چڑھ دوڑنے والی ہیں۔ یہ بیان محض تو صیغی تبصرہ نہیں ہے بلکہ یہ زندہ تبصرہ ہے، جو مناظر کو آنکھوں کے

سامنے منقش کر دیتا ہے۔ یہ مناظر متحرک ہیں، ان کے اندر زندگی حرکت کرتی ہوئی نظر آتی ہے نہایت ہی چمکدار اور نہایت ہی معافی آفریں۔

۵۔ پانچویں حقیقت یہ ہے کہ اسلامی نظام زندگی ایک حقیقت پسند اور واقعیت پسند عملی نظام ہے۔ وہ اپنے آثار عالم واقعات میں پیدا کرتا ہے اور اس کے لئے وہ مسلسل عملی جدوجہد کی راہ اختیار کرتا ہے۔ وہ صرف نظریات اور محض عمل سے عاری اور مجرد اصولوں میں دلچسپی نہیں لیتا۔ وہ ہر مرحلے پر اپنی ہدایات کا عملی انطباق اور اطلاق چاہتا ہے۔ اس کی واضح ترین مثال غزوہ احد کے واقعات میں اصول شوریٰ کا عملی انطباق اور مظاہرہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے لئے یہ ممکن تھا کہ آپ ﷺ امت کو شوریٰ کے نتیجے میں سامنے آنے والے تلخ تجربے سے بچا کر لے جاتے جبکہ تحریک اسلامی نوخیز تھی، ہر طرف سے دشمنوں کے گھیرے میں تھی، اور دشمن نے مدینہ کی فصیل کے نیچے ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ میں کہتا ہوں کہ رسول ﷺ کے یہ ممکن تھا کہ وہ اس تلخ تجربے سے اس نوخیز تحریک کو بچا کر لے جاتے، جس سے وہ اس واقعہ کے اندر دوچار ہوئی۔ اگر آپ اپنی رائے میں یہ عمل فرماتے اور بطور استدلال اپنے سچے خوابوں کو پیش فرماتے، ان خوابوں کے اندر یہ اشارہ دیا گیا تھا کہ مدینہ ایک مضبوط ڈھال ہے، اور آپ سرے سے مشورہ ہی نہ کرتے، یا اس مشورے کو قبول نہ کرتے جو پارلیمنٹ نے کثرت رائے سے پاس کر دیا تھا اور بڑے پر جوش طریقے سے یا جب آپ ﷺ وردی میں نکلے تو بھی یہ پیشکش ہو گئی تھی کہ آپ اپنی رائے پر ہی عمل کریں جبکہ شوریٰ کے پر جوش لوگ اپنی رائے واپس لے رہے تھے جنہیں احساس ہو گیا تھا کہ انہوں نے رسول ﷺ کو باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن، باوجود اس کے کہ آپ ﷺ کو نتائج کا اچھی طرح اندازہ تھا، آپ ﷺ نے شوریٰ کے فیصلے کو نافذ کیا۔ جن امور تک وہ پہنچ گئی تھی ان پر عمل کیا گیا۔ اس لئے کہ رسول ﷺ یہ سمجھنا چاہتے تھے کہ جماعت کی اکثریت کا احترام اور پابندی کرو۔ یہ نتائج اچھے نہ ہوں۔ نیز آپ ﷺ یہ اچھی طرح جانتے تھے کہ نقصانات اور خسارے کے مقابلے میں اصول شوریٰ کی اہمیت زیادہ ہے اور یہ کہ جماعت کو شوریٰ کے اس عملی تجرباتی مرحلے

سے محروم نہیں رکھنا چاہئے۔ اس لئے کہ اس طرح وہ علم و معرفت اور تربیت و تجربے کے اہم موقعہ سے محروم ہو جائے گی۔

اس کے بعد اس معرکے میں تلخ نتائج دیکھنے کے بعد اس اصول کے جاری رکھے جانے کے احکامات از سر نو آتے ہیں۔ اس لئے کہ اس طرح یہ اصول نہایت ہی موثر انداز میں پاس کیا جاتا ہے اور اسے بحال رکھا جاتا ہے اور اس طرح اسلامی نظام زندگی کے ایک اہم اصول کو استقرار نصیب ہوتا ہے۔

اسلام کا یہ انداز تربیت نہیں ہے کہ کسی اصول کے نفاذ کو اس وقت تک موقوف رکھے جب تک قوم اس کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اسلام جانتا ہے کہ وہ اس کے لئے ہر گز تیار نہ ہو سکے گی جب تک اسے عملاً نافذ نہ کر دیا جائے اور یہ کہ امت کو ان زریں اصولوں سے محروم رکھنا ان نتائج کے مقابلے میں بہت ہی برا اور نقصان دہ ہے جو اصول شوریٰ کے نفاذ کے ابتدائی ایام میں نکل سکتے ہیں یا ایسے نتائج کا محض اندیشہ ہے۔ غلطیاں جس قدر عظیم ہوں، وہ اس بات کا جواز نہیں ہیں کہ کسی اصول کو نافذ نہ کیا جائے بلکہ کسی اچھے اصول کو ایک مختصر عرصے کے لئے بھی موقوف رکھنا بہتر نہیں ہے۔ کیونکہ اس عمل سے اس اصول کے ذاتی نشوونما کو موقوف کر دیا جاتا ہے۔ پھر اس کے نفاذ سے جو عملی تجربہ شروع ہو جاتا ہے وہ موقوف ہو جاتا ہے اس طرح پوری امت کی ترقی رک جاتی ہے۔

فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ..... ”انہیں معاف کر دیں، ان کے لئے مغفرت طلب کریں اور الامر میں ان سے مشورہ کریں۔“

غرض نظری اصولوں کے نفاذ کا طریق رسول ﷺ کی سنت اور احد کے اقدامات سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ آپ ﷺ نے ایک رائے پاس ہو جانے کے بعد دوبارہ اس مسئلے کو شوریٰ کے سامنے پیش نہ کیا۔ اور اسے دوبارہ نظر ثانی کے لئے پیش کرنے کو کمزوری، تردد اور غیر فیصلہ کن صورت تصور کیا گیا۔ یہ محض اس لئے کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ شوریٰ کا اصول لازمی نہیں ہے اور اس معاملے

میں ہمیشہ کے لئے اختلاف رائے ہو جاتا اور عملی اقدامات کے لئے مشکوک صورت حال پیدا ہو جاتی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ ”کسی نبی کے لئے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ خدائی فیصلہ آجانے سے پہلے اپنی وردی اتار دے۔“ اور ان تمام واقعات اور احکام کے عملی تجربات کے بعد دوبارہ یہ حکم آتا ہے کہ جب عزم صمیم ہو جائے تو پھر توکل کر کے اسے نافذ کرو فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ..... ”غرض اسلام میں اگر کوئی ہدایت ہے تو پھر نفاذ ہے، کوئی تعطل نہیں ہے۔“

۶۔ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں پر مشتمل جماعت صحابہ اور اس دنیا کے مکرم ترین فدا یان رسول پر قرآن مجید نے احکام کے واقعات کے بعد جو تبصرہ کیا ہے، اس تبصرے سے ہمیں ایک ایسا سبق ملتا ہے جو آج ہمارے لئے بہت ہی اہم ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو آج ہماری دنیا میں از سر نو اسلامی زندگی کا احیاء چاہتے ہیں۔

وہ یہ ہے کہ اللہ کا نظام اپنی جگہ موجود ہے۔ اس کی اقدار اور حسن و قبح کے پیمانے موجود ہیں۔ رہے لوگ تو وہ کبھی اس نظام کے قریب ہوں گے اور کبھی اس سے دور ہوں گے۔ اس نظام کے اصول اور طرز عمل اختیار کرنے میں کبھی غلطی کریں گے اور کبھی درست موقف اختیار کریں گے۔ لیکن ان کا موقف اور ان کے کسی عمل کا اسلامی نظام ذمہ دار نہیں ہوگا۔ نہ لوگوں کے عمل یا بے عملی سے اسلام کے پیمانے بدل جائیں گے۔ اس لئے کہ ہمارے دور میں لوگ اسلام کو لوگوں کے پیمانے سے ناپتے ہیں۔ اب اگر کوئی غلط کام کرتا ہے تو اس غلط کام کا وہ خود ذمہ دار ہے۔ اگر وہ منحرف ہوتے ہیں تو مسلمانوں کو کہا جائے گا کہ وہ منحرف ہو گئے۔ اسلام کسی کے انحراف اور غلطی سے چشم پوشی نہیں کرتا، اگرچہ وہ نہایت ہی محترم اور قابل قدر ہوں۔ اسلام اپنے اصولوں کے اندر ایسا انحراف نہیں کرتا کہ وہ ان محترم لوگوں کے عمل کے مطابق ہو جائے۔

ہم اس سے یہ سبق لیتے ہیں کہ کچھ شخصیات کو پاک اور بری الذمہ کرنے کے لئے ہمارے لئے یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اسلامی نظام زندگی میں تبدیلی کر دیں۔ اس امت کی بھلائی اسی میں ہے کہ اسلامی

نظام زندگی کے اصول و مبادی قطعی ہوں، صحیح و سالم ہوں، روشن اور واضح ہوں۔ جو لوگ ان سے انحراف کرتے ہیں انہیں منحرف کہا جائے۔ وہ لوگ جو بلند مرتبہ و مقام بھی رکھتے ہوں۔ ان کے انحراف اور بد عملی کے لئے کوئی وجہ جواز تلاش نہ کی جائے، خصوصاً اس طرح کہ اسلامی منہاج کے اندر تحریف کر دی جائے۔ اور اس کی اقدار اور پیمانوں کو بدل دیا جائے اور حالت یہ ہو جائے کہ ”خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں۔“ ہمارے لئے یہ زیادہ خطرناک ہے کہ ہم بعض محترم شخصیات کو بچانے کے لئے اسلام کے اندر تحریف کریں۔ اس لئے کہ اسلامی نظام زندگی شخصیات کے مقابلے میں بہت ہی اہم اور ارفع ہے۔ اسلامی تاریخ اس سے عبارت نہیں ہے کہ تاریخ کے اندر مسلمانوں نے جو کہا یا جو طرز عمل اختیار کیا وہ اسلامی تاریخ ہے۔ بلکہ صرف وہی افعال و اقدامات اسلامی تاریخ ہوں گے جو پورے اسلام کے مطابق ہوں اور اسلام کے ثابت شدہ اصولوں کے خطوط پر ہوں۔ ورنہ تمام غیر اسلامی افعال کا اسلام سے کوئی تعلق نہ ہو گا۔ انہیں اسلام کے سر نہ تھوپا جائے گا اور نہ انہیں تاریخ اسلام کہا جائے گا۔ یہ افعال صرف ان لوگوں کے افعال تصور ہوں گے جنہوں نے ان کا ارتکاب کیا اور ان افعال کے مرتکب اشخاص کو ہی ان کا فاعل تصور کیا جائے گا۔ انہیں غلطی، انحراف اور اسلام سے خروج تصور کیا جائے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ اسلام اور تاریخ مسلمانان ایک چیز نہیں ہے۔ اگرچہ یہ لوگ اپنا نام اسلامی رکھیں اور زبان سے اقرار اسلام کریں۔ اسلامی تاریخ، اسلام کے عملی نفاذ کی تاریخ ہے۔ لوگوں کے تصورات میں اسلام کا نفاذ، لوگوں کے طرز عمل میں اسلام کا نفاذ، لوگوں کے طریقہ حیات میں اسلام کا نفاذ، ان کے معاشرے میں اسلام کا نفاذ، اس لئے کہ اسلام ایک قائم محور ہے۔ اس محور کے ارد گرد، زندگی کی عملی چکی کو گھومنا چاہئے، ایک دائرے کے اندر رہ کر جب لوگ اس محور کے دائرے سے نکل جائیں بلکہ وہ سرے سے اس محور ہی کو ترک کر دیں تو ان کا تعلق ہی اسلام کے ساتھ کیا رہ جاتا ہے۔ اور کیوں ہم ان کے اعمال اور ان کے عملی اقدامات کو اسلام کے سر تھوپے جائیں یا اسلام کی تشریح مسلمانوں کے انحرافات کی روشنی میں کیوں کی جائے؟ بلکہ میں یہ پوچھتا ہوں کہ ایسے لوگوں کو مسلمان کیوں کہا جاتا ہے جبکہ نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کے محور کے ارد گرد نہیں گھومتے بلکہ اسلام کے دائرے بھی خارج ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگیوں میں اسلام کے نفاذ سے انکار کر دیا ہے۔ وہ

مسلمان تو اس لئے کہلاتے تھے کہ وہ اسلام پر عمل کرتے تھے۔ اپنی زندگی میں اسلام کو نافذ کرتے تھے۔ اس لئے مسلمان نہ تھے کہ ان کے نام اسلامی تھے۔ اس لئے مسلمان نہ تھے کہ وہ زبان سے اقرار مسلمانی کرتے تھے۔

یہ تھا وہ سبق جو اللہ تعالیٰ نے چاہا مسلمانوں کو دیا جائے، اسی لئے اللہ تعالیٰ نے پہلی جماعت مسلمہ کی غلطیوں کی نشاندہی کی۔ ان کے نقائص اور ان کی کمزوریوں کو قلمبند کیا اور اس کے بعد اللہ نے اعلان کر دیا کہ اللہ نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ ان سے کوئی مواخذہ نہ ہو گا۔ ان کا احترام بحال کر دیا گیا ہے۔ اگرچہ دنیا میں اپنے کمزور موقف کی وجہ سے انہیں تلخ نتائج بھگتنے پڑے۔

درس ۲۸ ایک نظر میں

یہاں تک معرکہ اُحد کا بیان ختم ہو جاتا ہے لیکن جماعت مسلمہ اور اس کے ارد گرد نواح میں پھیلے ہوئے دشمنان اسلام کے ساتھ معرکہ آرائی ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ خصوصاً یہودیوں نے مباحثے اور مجادلے شروع کر رکھے تھے، تشکیک اور بے چینی پیدا کرنا، سازشیں اور کینہ پروری اور گھات میں بیٹھ کر وار کرنے کے مواقع تلاش کرنا۔ اس معرکہ کے ارد گرد یہ اس سورت کے اکثر مباحث پھیلے ہوئے ہیں اور گھومتے ہیں۔

رسول اکرم ﷺ نے قبیلہ بنی قینقاع کو مدینہ کے قرب وجوار سے جلا وطن کر دیا تھا کیونکہ غزوہ بدر کے بعد وہ سخت بوکھلا گئے تھے اور انہوں نے سازشیں شروع کر دی تھیں۔ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع کر دی تھی اور جو عہد و پیمان ان کے ساتھ ہوئے تھے ان کو وہ کھلے بندوں توڑتے تھے۔ یہ عہد ان کے ساتھ رسول ﷺ کے مدینہ طیبہ میں ہجرت کرنے کے متصلاً بعد ہوئے تھے۔ اور اس وقت ہوئے تھے کہ اوس و کذرج کی اکثریت اسلام میں داخل ہونے کی وجہ سے مدینہ میں اسلامی ریاست قائم ہو گئی تھی۔ لیکن مدینہ کے ارد گرد بنی النضیر، بنو قریظہ ابھی موجود تھے۔ اس کے علاوہ خیبر کے یہودی اور ان کے علاوہ جزیرۃ العرب کے دوسرے یہودی بھی موجود تھے۔ یہ سب لوگ باہم مراسلت کرتے تھے، فوجیں جمع کر رہے تھے۔ مدینہ کے منافقین کے ساتھ رابطے قائم کر رہے تھے اور مدینہ اور مدینہ کے ارد گرد کے کفار کے ساتھ اور مکہ کے مشرکین کے ساتھ کے روابط قائم تھے۔ اور مسلمانوں کے خلاف انہوں نے نہ ختم ہونے والی سازشوں کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔

قُلْ لِلَّذِينَ كَفَرُوا سَعْتٌ بَلَّوْنَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (۱۲) قَدْ كَانَتْ لَكُمْ آيَةٌ فِي فِتْنَةِ الْكَافِرِينَ فَتَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَأُخْرَىٰ كَافِرَةٌ يَكْرَهُهُمُ مِّثْلَهُمْ رَأْيِ الْعَيْنِ وَاللَّهُ يُؤَيِّدُ بِنَصَرِهِ مَن يَشَاءُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّأُولِي الْأَبْصَارِ (۱۳)

”تمہارے لئے ان دو گروہوں میں نشان عبرت تھا جو (بدر میں) ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا گروہ کافر تھا۔ دیکھنے والے پچشم سردیکھ رہے تھے کہ کافر گروہ مومن گروہ سے دوچند ہے۔ (مگر نتیجے نے ثابت کر دیا کہ) اللہ اپنی فتح و نصرت سے جس کو چاہتا ہے مدد دیتا ہے۔ دیدہ بینار کھنے والوں کے لئے اس میں بڑا سبق پوشیدہ ہے۔“

جب رسول اللہ ﷺ نے ان کو اللہ کی جانب سے آیا ہوا یہ ڈراوا پہنچایا جو اس لئے نازل ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی نظر میں تھیں وہ تمام سرگرمیاں جو وہ ان دنوں دکھا رہے تھے اور جس غصے کا اظہار ان کی جانب سے ہو رہا ہے اور بدر کے بعد تو وہ مسلسل سازشوں میں لگے ہوئے تھے تو انہوں نے اس ڈراوے کو بہت ہی برے اور حقارت آمیز طریقے سے رد کر دیا۔ انہوں نے کہا: ”محمد! اپنے آپ کو غرور میں نہ ڈالو، تم نے بے شک قریش کے بعض لوگوں کو قتل کر دیا۔ یہ لوگ ناتجربہ کار تھے۔ انہیں کیا پتہ تھا کہ جنگ کس طرح لڑی جاتی ہے۔ اللہ کی قسم! اگر تم نے کبھی ہم سے جنگ لڑی تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ ہم لوگ کچھ ہیں۔ یقیناً تم ہم جیسے لوگ نہ پاؤ گے۔“ اس جواب کے بعد وہ سازشوں میں شریک ہو گئے۔ اس سورت میں ان کی سازشوں کے کچھ رنگ نقل کئے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے رسول اکرم ﷺ سے جو عہد و پیمان کیا تھا اسے انہوں نے توڑ دیا۔ رسول ﷺ نے ان کا محاصرہ کر لیا۔ چنانچہ وہ رسول ﷺ کے فیصلے پر ہتھیار ڈالنے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ رسول ﷺ نے انہیں مدینہ سے جلا وطن کر کے ”اذرعات“ بھیج دیا۔ یہودیوں کے مدینہ میں صرف دو گروہ رہ گئے بنو قریظہ اور بنو النضیر جو عہد کی پابندی بظاہر کر رہے تھے لیکن خفیہ طور پر یہ بھی سازشوں، مکاریوں، دھوکہ بازی، فتنہ بازی اور افواہیں پھیلانے میں مصروف تھے۔ غرض یہ لوگ وہ تمام کام کرنے لگے جو یہود اپنی پوری تاریخ میں بڑی مہارت سے کرتے آئے ہیں۔ اور کتاب اللہ میں اسے بالکل تفصیلات کے ساتھ ریکارڈ کیا گیا ہے اور پوری کرۂ ارض کی آبادی کو ان سے خبردار کیا گیا ہے کہ اس زمین پر یہ ایک ملعون قوم ہے۔

اس سبق میں بنی اسرائیل کے بعض اقوال و افعال کو لیا گیا ہے۔ نظر آتا ہے کہ وہ بارگاہ رب العزت میں بھی بے ادبی کرنے پر اتر آئے تھے۔ مسلمانوں کے ساتھ برا رویہ تو ان کے لئے کوئی بات

ہی نہ تھی۔ یہ لوگ میثاق مدینہ کے مطابق اپنی مالی ذمہ داریاں ادا کرنے سے پہلو تہی کرتے تھے جو معاہدہ انہوں نے خود نبی ﷺ کے ساتھ کیا تھا، وہ کہتے تھے: اللہ فقیر و نحس آغنیاء..... ”اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔“

اس سبق میں یہودیوں کے وہ واہی دلائل بھی ملیں گے جو وہ دعوت اسلامی کے خلاف پیش کیا کرتے تھے، جب بھی یہ دعوت انہیں دی جاتی۔ یہ دلائل سب کے سب جھوٹے ہوتے اور تاریخی اعتبار سے بھی ان کی کوئی اصل نہ ہوتی۔ مثلاً یہ کہ وہ اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد کی بھی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ وہ عہد یہ تھا کہ وہ اللہ کے احکام اور سچائی کو بیان کریں گے اور کبھی نہیں چھپائیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو توڑ دیا تھا، پس پشت ڈال دیا تھا اور اس کے بدلے انہوں نے مالی فوائد حاصل کئے۔ اپنے پیغمبروں کو ناحق قتل کیا، حالانکہ یہ پیغمبر ان کے پاس خارق عادت معجزات حسب الطلب ظاہر کر چکے تھے۔ نیز وہ پیغمبر واضح دلائل کے ساتھ آئے تھے مگر ان یہودیوں نے ان کو مسترد کر دیا۔

یہودیوں کے ان شرمناک اقوال و افعال کے ذکر کی وجہ سے، انبیاء کے ساتھ ان کے برتاؤ اور بارگاہ باری تعالیٰ میں ان کی گستاخیوں کے اظہار بیان کی وجہ سے، مدینہ کے ارد گرد بسنے والے یہودی اس نوخیز جماعت مسلمہ کے دشمن ہو گئے تھے۔ نیز اس سبق میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ یہودیوں اور مشرکین کی سازشوں اور ایذا رسانیوں سے مسلمانوں کو کس قدر تکلیف ہو رہی ہے۔ ان امور کا ذکر جماعت مسلمہ کی تربیت کے لئے یہاں نہایت ہی ضروری تھا۔ تاکہ وہ اپنے ماحول سے علی وجہ البصیرت خبردار ہوں کہ ان کے ارد گرد جو لوگ رہ رہے ہیں وہ کون ہیں۔ تاکہ اہل ایمان کو اس سرزمین کے حالات اچھی طرح معلوم ہو جائیں جس میں وہ کام کر رہے ہیں۔ نیز یہ کہ ان کی راہ میں کیا کیا مشکلات ہیں، کہاں کہاں ان کے لئے دام زیر زمین بچھے ہیں۔ اور اس راہ میں ان کے لئے کیا کیا مصائب تیار ہیں۔ مدینہ طیبہ میں یہودی مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں کر رہے تھے، وہ ان عداوتوں سے کم خطرناک تھیں جو مکہ کے مشرکین مسلمانوں کے ساتھ روا رکھتے تھے۔ غالباً مسلمانوں کے خلاف پوری تاریخ

اسلام میں جو سازشیں ہوتی ہیں وہ یہودی کرتے رہے ہیں۔ ہمیشہ یہ لوگ مسلمانوں کے لئے خطرناک رہے ہیں۔

اس اثر آفریں سبق میں پے درپے اس سلسلے میں ہدایات دی گئی ہیں۔ مسلمانوں کو بتایا جاتا ہے کہ کون سی اقدار ہیں جو دائمی ہیں اور کون سی اقدار زائل ہونے والی ہیں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں زندگی کی ایک محدود وقت کے لئے ہے۔ ہر نفس ایک دن موت سے ہمکنار ہونے والا ہے۔ اصل جزاء تو آخرت میں ملے گی۔ اصل کمائی اور خسارے کا پتہ تو وہاں لگے گا۔ وہاں جو شخص آگ سے بچا لیا گیا اور جنت میں داخل ہو گیا تو گویا وہ کامیاب رہا۔ اور دنیا تو ایسے ساز و سامان سے اٹی پڑی ہے جو ہر وقت دھوکے میں ڈال سکتا ہے۔ اور یہ ہمارے اموال، ہماری جانیں ہمارے پاس اللہ کی امانت ہیں۔ اہل کتاب اور مشرکین کی جانب سے اذیت تمہیں پہنچتی رہے گی۔ صرف صبر، اللہ خونی اور اسلام پر پختگی سے عمل ہی تمہیں آگ سے بچا سکتا ہے اور یوں ان سازشوں سے بھی بچا جاسکتا ہے۔

مدینہ کی پہلی جماعت کو جو ہدایات دی گئی ہیں، وہ آج بھی ہمارے لئے تازہ ہدایات ہیں۔ کل بھی ہمارے لئے یہی ہدایات ہیں۔ جو لوگ اسلام کو از سر نو قائم کرنا چاہتے ہیں اور جو لوگ اسلامی زندگی کا قیام چاہتے ہیں وہ اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے کہ ان کے دشمنوں کا وہی مزاج ہے جو مدینہ کے دشمنوں کا تھا۔ یہ دشمن وہی مشرکین اور اہل کتاب کے ملحدین ہیں۔ آج یہودی عالمین صہیونیت کی شکل میں آئے ہیں۔ عیسائی عالمی صلیب کی شکل میں ہیں۔ اور عالمی کمیونزم کی شکل میں ہیں۔ آج بھی تحریک اسلامی کو بتایا جاتا ہے کہ اس کی راہ میں جو مشکلات ہیں، جو دام رکھے ہوئے ہیں، ان کے وہی قربانیاں ہیں، وہی اذیتیں ہیں اور وہی ابتلاء ہیں۔ لیکن تم اپنی نظر آخرت پر رکھو۔ مالی اور جانی نقصانات برداشت کرنے پڑیں گے۔ لیکن تمہیں پہلی جماعت اسلامی کی طرح آج بھی وہی سبق یاد کرنا ہو گا۔ ”آخر کار ہر شخص کو مرنا ہے۔ اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو، کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ رہی یہ دنیا، تو یہ محض ایک ظاہر فریب دینے والی چیز ہے..... مسلمانو! تمہیں مال اور جان دونوں آزمائشیں پیش آکر رہیں گی، اور تم ابھی

اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں صبر اور اللہ ترسی کی روش قائم ہوئے تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔“

غرض قرآن وہی قرآن ہے جو تھا اس کی حیثیت وہی ہے کہ یہ اس امت کے لئے دائمی ہدایات پر مشتمل کتاب ہے۔ یہ اس امت کا حدی خواں اور رہبر و رہنما ہے۔ یہ اس کے لئے قابل اعتماد قائد ہے..... لیکن اس کے دشمن بھی وہی دشمن ہیں جو تھے اور انقلاب کی راہ بھی وہی ہے جو تھی۔



درس تشریح آیات (آیت نمبر ۱۸۰ تا ۱۸۹)

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ
بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخُلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۱۸۰) لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ
الَّذِينَ قَالُوا إِنْ بَلَغَ اللَّهُ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْأَنْبِيَاءَ
بِغَيْرِ حَقٍّ وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ (۱۸۱) ذَلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ أَيْدِيَكُمْ
وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَمٍ لِلْعَبِيدِ (۱۸۲) الَّذِينَ قَالُوا إِنْ بَلَغَ اللَّهُ عَهْدَ إِلَيْنَا أَلَا
نُؤْمِنُ لِرَسُولٍ حَتَّى يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ قُلْ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِنْ
قَبْلِي بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالَّذِي قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ
(۱۸۳) فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كَذَّبَ رَسُولٌ مِنْ قَبْلِكَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ
وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ (۱۸۴) كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّقُونَ أُجُورَكُمْ
يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ رُحِخَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا
إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ (۱۸۵) تَتَّبِعُونَ فِي أَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ وَلَسَّمَعْنَا مِنْ
الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا وَإِنْ
تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ (۱۸۶) وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ
الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَنَبِيٍّ لَهُ النَّاسُ وَلَا تَكْفُرُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ

وَأَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَبُئْسَ مَا يَشْتَرُونَ (۱۸۷) لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوْا وَيُجِبُّونَ أَنْ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (۱۸۸) وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ
وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۸۹)

”جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے۔ نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔

اللہ ان لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ان کی یہ باتیں بھی ہم لکھ لیں گے اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں وہ بھی ان کے نامہ اعمال میں ثبت ہے۔ (جب فیصلہ کا وقت آئے گا اس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو، اب عذاب جہنم کا مزا چکھو، یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، اللہ اپنے بندوں کے لئے ظالم نہیں ہے۔

جو لوگ کہتے ہیں ”اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی رسول کو تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آکر) آگ کھالے۔“ ان سے کہو ”تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے ہیں جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا تم ذکر کرتے ہو، پھر اگر (ایمان لانے کے لئے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو ان رسولوں کو تم نے کیوں قتل کیا؟“ اب اے نبی ﷺ، اگر یہ لوگ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں لائے تھے۔“

اس مجموعہ آیات میں پہلی آیت کے بارے میں کوئی ایسی روایت نہیں ہے کہ اس میں بخیلوں سے مراد کون لوگ ہیں اور یہ کہ بخل کے فعل مذموم سے کن لوگوں کو ڈرایا گیا ہے؟ اور یہ کہ قیامت میں ان کا انجام یہ ہو گا لیکن جس مقام پر یہ آیت ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کا تعلق بعد میں آنے والی آیات سے ہے جو یہودیوں کے بارے میں وارد ہیں، اس لئے کہ یہ یہودی ہی تھے جنہوں نے یہ کہا تھا کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ اور یہ وہی لوگ تھے جنہوں نے کہا تھا کہ اللہ نے ہم سے یہ وعدہ کیا ہے کہ ہم اس وقت تک کسی رسول کو نہ مانیں جب تک وہ ایسی قربانی نہ لے آئیں جسے آگ جلا دے۔“

اصل بات یہ ہے کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں ہے جنہیں اس وقت یہ دعوت دی جا رہی تھی کہ وہ میثاق مدینہ کے مطابق جن مالی ذمہ داریوں کے پابند ہیں، انہیں وہ ادا کریں۔ اور یہ دعوت بھی انہیں دی گئی تھی کہ وہ نبی آخر الزمان کی دعوت کو قبول کر لیں اور اللہ کی راہ میں انفاق کریں۔

چنانچہ یہ تہدید آمیز ڈرا ونا نازل ہوا، اور اس کے بعد یہودیوں کی ان کٹ جتنی دلائل کو رد کیا گیا جو وہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان نہ لانے کے لئے پیش کرتے تھے۔ ان دلائل میں نہایت ہی گستاخانہ طرز ادب اختیار کرتے تھے اور یہ بے ادبی دراصل وہ اپنے رب کی کرتے تھے۔ یہودیوں کو تہدید آمیز تنبیہ کے رسول اکرم ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے کہ ٹھیک ہے کہ یہ یہود آپ کی تکذیب کر رہے ہیں لیکن آپ سے قبل جو رسول گزرے ہیں اس کے ساتھ بہ نسبت آپ کے سخت رویہ ان کی اقوام نے اختیار کیا تھا۔ ان رسولوں میں سے انبیاء بنی اسرائیل بھی تھے جو ان کے پاس باقاعدہ دلائل لے کر آئے تھے، انہوں نے حسب طلب معجزات بھی پیش کئے جیسا کہ تاریخ بنی اسرائیل میں مشہور ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخُلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاتُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ

”جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لئے اچھی ہے۔ نہیں، یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں، وہی قیامت کے روز ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔ زمین اور آسمانوں کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔“

اس آیت کا مفہوم عام ہے۔ اس سے یہودی بھی مراد ہو سکتے ہیں جو میثاق مدینہ کے تحت عائد ہونے والی مالی ذمہ داریوں میں بخل سے کام لیتے تھے اور دوسرے لوگ بھی اس کے مدلول میں شامل ہیں جو اپنے دیئے سے خرچ نہیں کرتے اور بخل سے کام لیتے ہیں۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ بخل ان کے لئے خیر ہے کہ ان کے مال اس سے محفوظ ہوتے ہیں اور انفاق کی وجہ سے یہ اموال جاتے ہیں۔

یہ آیت انہیں اس قسم کے جھوٹے حساب و کتاب سے منع کرتی ہے، فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ جو کچھ جمع کرتے ہیں قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق ہو گا اور یہ طوق آگے سے بنے گا۔ یہ ایک نہایت خوفناک تہدید ہے۔ انداز تعبیر اس طرح ہے کہ اس میں بخل کو زیادہ بد شکل کر کے پیش کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور وہ پھر بھی بخل کرتے ہیں۔ وہ اپنے ذاتی مال میں بخل نہیں کر رہے بلکہ اللہ کے دیئے میں بخل کرتے ہیں۔ وہ جب اس دنیا میں آئے تھے تو ان کے ہاتھ میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ ان کے ہم قبیلہ لوگوں کے پاس کچھ تھا۔ تو اللہ نے ان پر اپنا فضل کیا اور ان کو سب کچھ دے دیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ خود اس کے دیئے میں سے اسے کچھ دیں تو انہوں نے اللہ کے فضل و کرم کو یاد نہ کیا اور تھوڑا سا واپس دینے میں بھی بخیلی کی۔ وہ یہ گمان کرنے لگے کہ یہ ذخیرہ اندوزی ان کے لئے مفید ہو گی حالانکہ یہ ان کے لئے سخت مضر ہے بلکہ شرمناک قسم کی مضرت ہے۔ اس لئے کہ وہ بہر حال اس جہاں سے جانے والے ہیں۔ اس مال اور دولت کو چھوڑنے والے ہیں۔ بعد کے لوگوں کے لئے اور آخر کار اللہ ہی وارث ہو گا۔ اس لئے کہ ”اللہ ہی کے لئے میراث ہے آسمانوں اور زمین کی۔“ تو پھر یہ سونا اور جمع شدہ دولت تو نہایت ہی تھوڑے عرصے کے لئے رہتی ہے۔ اس کے بعد سب کی سب اللہ کی طرف لوٹتی ہے۔ اور ان کے کھاتے میں تو

وہی کچھ ہے جو انہوں نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا۔ اللہ کی رضا کے لئے خرچ کیا۔ اس کا اجر ان کو پورا پورا ملے گا اور صرف اس صورت میں وہ آگ سے طوق سے بچ سکتے جب وہ اپنی زائد دولت اللہ راہ میں خرچ کر دیں۔

اس کے بعد یہودیوں پر سخت تنقید کی جاتی ہے۔ جن کے ہاتھوں میں دولت تھی۔ یہ دولت انہیں اللہ نے دی تھی۔ اور یہ سمجھنے لگے اپنے آپ کو غنی اور اللہ سے مستغنی کہ انہیں اللہ کی جانب سے کسی اجر اور صلے کی حاجت نہیں ہے۔ اور نہ انہیں دوچند سہ چند ثواب کی ضرورت ہے جو اللہ ان لوگوں کو دیتا ہے جو اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور جسے اللہ اپنا فضل کہتا ہے اور ان لوگوں کی جانب سے قرضہ سے تعبیر کرتا ہے۔ لیکن ان لوگوں نے ایک ذلیل شخص کی حیثیت سے یہ جواب دیا کہ اللہ کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ہم سے ہمارا مال قرض مانگتے ہیں اور پھر ہمیں دوگنا کر دیتے ہیں، حالانکہ خود اللہ تعالیٰ ربا سے منع کرتے ہیں اور اضعا ف مضاعفہ کو حرام قرار دیتے ہیں۔ ان کی یہ بات الفاظ کا کھیل ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہایت ہی رذیل اور بے ادب اور گستاخ لوگ ہیں۔

لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ أَغْنِيَاءُ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ
الْأَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَنَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ

”اللہ نے ان لوگوں کا قول سنا جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ ان کی یہ باتیں بھی لکھ لیں گے اور اس سے پہلے جو وہ پیغمبروں کو ناحق قتل رہے ہیں وہ بھی ان کے نامہ اعمال میں ثبت ہے۔ (جب فیصلہ کا وقت آئے گا اس وقت) ہم ان سے کہیں گے کہ لو، اب عذاب جہنم کا مزہ چکھو، یہ تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہے، اللہ اپنے بندوں کے لئے ظالم نہیں ہے۔“

اللہ کی ذات کے بارے میں بدترین خیالات یہودیوں کی تحریف شدہ کتب کے اندر بھی درج ہیں۔ لیکن قرآن نے ان کا جو قول نقل کیا ہے یہ ان کا ذات باری کے متعلق نہایت گھٹیا تصور ہے..... ”وہ جو کچھ کہتے ہیں ہم اسے لکھ لیں گے۔“ تاکہ ان کا محاسبہ کیا جاسکے۔ ان کی یہ بات یونہی

ہوا میں تحلیل نہ ہو جائے گی اور نہ ہی اسے مہمل اور لغوبات سمجھ کر چھوڑ دیا جائے گا۔ ان کی اس گستاخی کے بیان کے ساتھ ساتھ ان کے سابق کرتوتوں کا ایک حصہ بھی یہاں ذکر کر دیا جاتا ہے۔ یہ وہ گناہ ہیں جو ان کے ہم قوم ماضی میں کرتے رہے ہیں۔ یہ سابقہ گناہ ان کے کھاتے میں اس لئے ڈالے جاتے ہیں کہ ان کی فطرت بدستور وہی ہے۔ وہ اسی طرح نافرمان اور خطاکار تھے۔

وَقَتَّلَهُمُ الْأَنْبِيَاءَ بَغْيًا حَقًّا..... ”وہ پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں۔“..... بنی اسرائیل کی تاریخ نے قتل انبیاء کے اس مکروہ کام کے واقعات کو محفوظ رکھا ہے اور ان کا آخری کارنامہ وہ تھا جس میں انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو قتل کرنے کی سازش کی۔ وہ تواب بھی بہر حال یہ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے حضرت مسیح علیہ السلام کو پھانسی دلوادی تھی اور اس عظیم جرم پر وہ فخر کرتے ہیں۔

وَنَقُولُ لَهُمْ عَذَابُ الْخَرِيقِ..... ”ہم ان سے کہیں گے کہ چکھو آگ میں جلنے کا عذاب۔“ لفظ خریق یعنی جلنا اس لئے استعمال ہوا ہے کہ اس عذاب کی خوفناکی نظروں میں آجائے۔ اور یہ بات ذہن میں آجائے کہ یہ عذاب پاتے وقت آگ کے شعلے بھڑک اٹھے ہوں گے اور وہ اپنا کام ہولناک انداز میں کر رہے ہوں گے۔ آگ میں خوفناک جوش ہو گا۔ یہ اس لئے کہ ان کا یہ فعل بھی اسی قدر مکروہ ہے۔ انبیاء کو قتل کر دینا اور بغیر کسی جواز کے قتل کر دینا اور پھر وہ جو بات کر رہے ہیں وہ بھی بہت ہی گھٹیا ہے کہ اللہ فقیر ہے اور وہ غنی ہیں۔

ذَلِكَ بِمَا قَدَّمْتُمْ أَيْدِيَكُمْ..... ”یہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی ہے۔“ پوری جزاء جس میں نہ ظلم ہے اور نہ ہی کوئی سنگدلی ہے۔

وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ..... ”اللہ اپنے بندوں کے لئے ظالم نہیں ہے۔“ یہاں بندوں کے لئے عبید کا لفظ استعمال کرنے سے انسان کی اصل حیثیت بتادی گئی ہے کہ وہ اللہ کے مقابلے میں غلاموں کا غلام ہے۔ اور پھر بھی اگر وہ اللہ کی بارگاہ میں اس قدر بے ادبی کرتا ہے اور بندہ

اور غلام ہو کر وہ کہتا ہے کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں تو یہ کس قدر گستاخی ہے اور پھر اس کے ساتھ ساتھ انبیاء کے قتل جیسا شنيع کام۔

یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں پھر یہی قاتلین انبیاء بھی ہیں۔ ان کا مزید کارنامہ دیکھو کہ یہ کہتے ہیں کہ ہم محمد ﷺ پر اس لئے ایمان نہیں رکھتے کہ ہمیں خود اللہ نے یہ کہا ہے کہ وہ اس وقت تک کسی نبی پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ایسی قربانی نہ کرے جسے عالم غیب سے آگے آکر معجزانہ طور اسے کھانہ لے۔ جس طرح انبیاء بنی اسرائیل میں سے بعض کے ہاتھوں اس قسم کے معجزے کا اظہار ہوا تھا۔ اور جب تک محمد ﷺ کوئی اس قسم کا معجزہ نہ دکھائیں گے وہ چونکہ اللہ کے ساتھ عہد کر چکے ہیں اس لئے وہ ایمان نہیں لاسکتے۔

یہاں قرآن کریم ان کی اس بات کا تاریخی حوالوں سے جواب دیتا ہے کہ انہوں نے جن انبیاء کو قتل کیا تھا، انہوں نے تو ایسے معجزات دکھادیئے تھے جو خود انہوں نے طلب کئے تھے۔

الَّذِينَ قَالُوا إِنْ يَدْعُنَا إِلَىٰ آيَاتِنَا لَا نُؤْمِنُ لِرَسُولٍ حَتَّىٰ يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ قُلْ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مِّنْ قَبْلِي بِالْبَيِّنَاتِ وَبِالَّذِي قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوهُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

”جو لوگ کہتے ہیں ”اللہ نے ہم کو ہدایت کر دی ہے کہ ہم کسی کو رسول تسلیم نہ کریں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی نہ کرے جسے (غیب سے آکر) آگ کھالے۔“ تمہارے پاس مجھ سے پہلے بہت سے رسول آچکے جو بہت سی روشن نشانیاں لائے تھے اور وہ نشانی بھی لائے تھے جس کا ذکر تم کرتے ہو، پھر اگر (ایمان لانے کے لئے یہ شرط پیش کرنے میں) تم سچے ہو تو ان رسولوں کو تم نے کیوں قتل کیا؟ یہ نہایت ہی قوی الزامی جواب تھا۔ جس سے ظاہر ہو گیا کہ وہ جھوٹ بولتے ہیں اور بات توڑ موڑ کر بیان کرتے ہیں اور کفر پر اصرار کرتے ہیں۔ اور مزید یہ کہ سخت تکبر کا رویہ اختیار کئے ہوئے ہیں اور اللہ پر اختراء باندھتے ہیں۔

یہاں آکر اب بات کا رخ رسول اللہ ﷺ کی طرف مڑ جاتا ہے، آپ کو تسلی دی جاتی ہے اور آپ کی دلجوئی کی جاتی ہے اور آپ کے لئے ان مخالفین کے رویے کو قابل برداشت بنایا جا رہا ہے کہ یہ لوگ ایسا ہی سلوک اپنی تاریخ میں بے شمار رسولوں کے ساتھ کرتے آئے ہیں۔

فَإِنْ كَذَّبُوكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِنْ قَبْلِكَ جَاءُوا بِالْبَيِّنَاتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتَابِ الْمُنِيرِ..... ”یہ لوگ اگر تمہیں جھٹلاتے ہیں تو بہت سے رسول تم سے پہلے جھٹلائے جا چکے ہیں جو کھلی کھلی نشانیاں اور صحیفے اور روشنی بخشنے والی کتابیں ساتھ لائے تھے۔“

گویا نبی ﷺ پہلے رسول نہیں جن کو اہل کتاب یہودیوں نے جھٹلایا ہو، بنی اسرائیل اپنی پوری تاریخ میں ہمیشہ رسولوں کی تکذیب کرتے آئے ہیں۔ حالانکہ وہ رسول ان کے پاس صحیح دلائل لے کر آئے تھے۔ انہوں نے معجزات پیش کئے تھے۔ انہوں نے ایسے صحائف پیش کئے جن میں الہی ہدایات موجود تھیں۔ یعنی زبور..... اور انہوں نے کتاب منیر بھی پیش کی تھی مثلاً تورات اور انجیل۔ غرض یہ رسولوں اور ان کی رسالتوں کا طریقہ کار رہا ہے۔ اور اس راہ میں مشقت اور مصائب ہیں اور یہ واحد طریق کار ہے۔



اس کے بعد اب بات کا رخ جماعت مسلمہ کی طرف پلٹ رہا ہے۔ اسے بتایا جا رہا ہے کہ جن اقدار حیات کے بارے میں اسے بتایا جا رہا ہے ان کو وہ مضبوطی سے پکڑیں۔ اور ان اقدار کی خاطر قربانیاں دیں۔ پھر بتایا جاتا ہے کہ اس راہ میں کیا کیا مشکلات ہیں، کیا کیا کانٹے ہیں اور کیا کیا متاعب ہیں اور ان مشکلات پر صبر، تقویٰ، برداشت اور عزم صمیم کے ذریعہ قابو پایا جاسکتا ہے۔

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ وَإِنَّمَا تُوَفَّقُونَ أَجُورَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ (۱۸۵) لَتَجْلُوَنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ

وَأَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا أَذًى كَثِيرًا
وَلَا تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ

”آخر کار ہر شخص نفس کو مرنا ہے۔ اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو کامیاب دراصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔ یہی یہ دنیا، تو یہ محض ایک ظاہر فریب چیز ہے۔ مسلمانو، تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی، اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور اللہ ترسی کی روش پر قائم رہو، تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔“

اس حقیقت کا نفس انسانی کے اندر پوری طرح بیٹھ جانا ضروری ہے کہ اس دنیا کی زندگی بہر حال محدود، وقتی اور ایک متعین تاریخ تک ہے۔ اور اس کا خاتمہ لازمی ہے، یہاں اچھے لوگ بھی مرتے ہیں اور برے بھی رحلت کرتے ہیں۔ یہاں جہاد میں حصہ لینے والے بھی مرتے ہیں اور جو لوگ گھر میں بیٹھے رہتے ہیں وہ بھی مرتے ہیں۔ جو لوگ اپنے نظریات کی وجہ سے سر بلند ہوتے ہیں وہ بھی مرتے ہیں جو کبھی ذلت برداشت نہیں کرتے اور وہ بزدل بھی مرتے ہیں جو ہر قیمت پر زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ وہ لوگ بھی رحلت کرتے ہیں جن کے عزائم بلند ہوتے ہیں اور جن کے مقاصد پاکیزہ ہوتے ہیں اور وہ مفاد پرست بھی مرتے ہیں جن کے پیش نظر دنیا کی حقیر چیزیں ہوتی ہیں۔

سب مرتے ہیں۔ كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ..... ”ہر نفس نے موت کا مزہ چکھنا ہے۔“ یہ جام ہر کسی نے منہ سے لگنا ہے۔ ایک دن اسے اس زندگی کو خیر آباد کہنا ہے۔ اس سلسلے میں کسی ایک شخص اور ایک شخص کے درمیان کوئی امتیاز نہیں ہے۔ جام اجل باری باری ہر ایک کے سامنے آتا ہے اور ہر شخص اس کے ساتھ منہ لگاتا ہے۔ فرق اگر ہے تو ایک دوسرے زاویے سے ہے۔ فرق صرف اقدار میں ہے اور فرق انجام میں ہے۔

وَأَيْنَمَا تُوفَّوْنَ أَجُورُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَمَنْ رُحِزَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ
فَارَّ..... ”اور تم سب اپنے اپنے پورے اجر قیامت کے روز پانے والے ہو۔ کامیاب
در اصل وہ ہے جو وہاں آتش دوزخ سے سے بچ جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے۔“

یہ ہے ایک موت اور موت کے درمیان فرق۔ یہ انجام ہے جس کے ذریعے فلاں اور فلاں کے
درمیان فرق ہو جاتا ہے۔ یہ ہے وہ قیمت جو باقی رہتی ہے اور جس کے لئے سعی اور جدوجہد ضروری ہے
۔ اور وہ برانجام جس سے بچنے کے لئے رات اور دن فکر کرنا چاہئے۔

فَمَنْ رُحِزَ عَنِ النَّارِ وَأُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَارَّ..... ”جو آتش دوزخ سے بچ
جائے اور جنت میں داخل کر دیا جائے تو وہ کامیاب ہے۔“ زحزح کا لفظ اپنے زمزمہ ہی سے اپنے مفہوم
کو ظاہر کر دیتا ہے۔ وہ ایک صورت حال کا نقشہ نظروں کے سامنے لاتا ہے۔ اس کا ایک خاص پرتو ہے
۔ گویا آگ کے اندر کشش ہے، جو بھی اس کے قریب پھٹکے وہ اس میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس کے
دائرے میں آ جاتا ہے۔ اس لئے اس کو اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ کوئی اسے اس جاذبیت سے
آہستہ آہستہ چھڑائے تاکہ وہ اس کشش کے دائرے سے باہر آجائے۔ اس لئے جس کے لئے یہ ممکن ہو
کہ اسے اس دائرے سے کھینچ کر دور کر دیا گیا اور اس آگ کے دائرہ جاذبیت سے ہٹا دیا گیا اور وہ جنت
میں داخل ہو گیا تو گویا وہ کامیاب ہو گیا۔

یہ ایک واضح تصویر کشی ہے، ایک زندہ منظر ہے۔ اس میں حرکت ہے اور کھینچا تانی ہے۔ اور
حقیقت کے اعتبار سے بھی صورت حال یہی ہوتی ہے۔ آگ میں جاذبیت ہوتی ہے؟ کیا گناہ میں جاذبیت
اور لذت نہیں ہوتی؟ کیا نفس انسانی کسی ایسے راہنما کا محتاج نہیں ہے جو اسے آہستہ آہستہ آگ کے
دائرے جاذبیت سے دور کر دے۔ ہاں ضرور ہے اور یہ اسے آگ سے بچاتا ہے۔ کیا انسان، مسلسل
کوششوں کے باوجود ہمیشہ عمل میں قصور وار نہیں رہتا۔ الایہ کہ اس پر اللہ کا فضل و کرم ہو۔ ہاں یہ
فضل باری تعالیٰ ہی ہے جو اسے آگ سے دور کر دیتا ہے۔ فضل خداوندی اسے آہستہ آہستہ آگ کے
دائرے سے کھینچ لیتا ہے۔

وَمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعٌ الْخُرُورُ..... ”اس دنیا کا متاع تو ایک ظاہر فریب چیز ہے۔“ دنیا کا سامان تو بہر حال سامان ہی ہے۔ لیکن یہ حقیقی سامان نہیں ہے۔ یہ حالت بیداری اور ہوشیاری کا سامان نہیں۔ یہ دھوکے میں ڈالنے والا سامان ہے۔ انسان اس کے فریب میں آکر متاع سمجھتا ہے۔ یہ ایسا سامان ہے جو فریب اور دھوکہ پیدا کرتا ہے۔ رہا وہ سامان جو سچائی پر مبنی ہے اور حقیقی سامان ہے، اور جس کے لئے حقیقتاً جدوجہد کرنا چاہئے، وہ آخرت کا سامان ہے اور آخرت کی کامیابی ہے یہ ہے کہ انسان دوزخ سے ہٹا دیا جائے۔

جب یہ حقیقت انسان کے اندر جگہ پکڑ لیتی ہے اور جب نفس انسانی اپنے حساب و کتاب سے زندہ رہنے کی تڑپ نکال دیتا ہے، کیونکہ ہر نفس نے بہر حال ایک دن مرنا ہے اور اسی طرح جب اس نے اپنی فہرست ترجیحات سے دنیا کے نظر فریب سامان کو بھی نکال دیا تو اس وقت پھر اللہ اہل ایمان سے بات کرتے ہیں کہ ان کے لئے مالی اور جانی آزمائشیں آنے والی ہیں۔ اور اسی وقت پھر وہ ان قربانیوں کے لئے تیار ہوتے ہیں۔

لَتُبْكُوْنَ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنْ الَّذِيْنَ اَسْرَكُوْا اَذْيَ كَثِيْرًا وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْر

”مسلمانو! تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی، اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔ اگر ان سب حالات میں تم صبر اور اللہ ترسی کی روش پر قائم رہو تو یہ بڑے حوصلے کا کام ہے۔“

عقائد اور نظریات اور دعوت اور تحریک کی سنت یہ ہے کہ ان میں ابتلا، جان کی ابتلا، مال کی ابتلا ضروری ہوتی ہے اور نفس انسانی کو اس میں ثابت قدمی، صبر اور عزم سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس لئے کہ یہ جنت کی راہ ہے اور جنت تو تب ملتی ہے جب ناپسندیدہ کاموں سے اجتناب کیا جائے اور جنت ان کے اندر گھیری ہوئی ہے اور دوزخ شہوات نفس کے درمیان ہے۔

یہی ایک صورت ہے جس میں کسی دعوت کو لے کر اٹھنے والی جماعت کو برپا کیا جاسکتا ہے۔ اسی صورت میں دعوتی فرائض ادا کئے جاسکتے ہیں۔ یہی طریقہ ہے، ایسی جماعت کی تربیت کا۔ اور صرف اسی طریقے سے اس کی خفیہ قوتوں، بھلائی کی قوتوں، صبر و ثبات کی قوتوں کو جگایا جاسکتا ہے۔ یہ طریقہ کہ فرائض کو عملاً ادا کیا جائے اور لوگوں کی حقیقی حیثیت کو جاننا جائے اور زندگی کی اصلیت بھی ذہن میں ہو کہ اس کی کیا حقیقت ہے؟ یہی ایک طریقہ ہے کہ دعوت کے ارد گرد مضبوط لوگ جمع ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ کسی دعوت کو لے کر چلتے ہیں اور اسی کی راہ میں آنے والی مشکلات پر صبر کرتے ہیں اور ایسے ہی لوگوں پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔

کسی بھی دعوت کی قدر ایسے ہی لوگوں کے پاس ہوتی ہے اور وہ اسے اہم سمجھتے ہیں اور اس دعوت کی راہ میں وہ جس قدر مشکلات برداشت کریں گے، اس قدر وہ انہیں عزیز ہوگی۔ اس لئے وہ اس کو کبھی بھی نظر انداز نہ کریں گے، خواہ جیسے حالات بھی ہوں۔

آزمائش کو ہر دعوت کی سنت اس لئے قرار دیا گیا ہے کہ اس سے داعی اور دعوت دونوں مضبوط ہو جاتے ہیں۔ مقابلہ ہی انسان کے اندر سے اس کی خفیہ قوتوں کو جگاتا ہے۔ ان کو نشو و نما دیتا ہے، ان کو مجتمع کرتا ہے اور پھر ان کو ایک راہ پر لگاتا ہے۔ کسی بھی جدید دعوت کو چاہئے کہ وہ ان خفیہ قوتوں سے کام لے، انہیں جگائے تاکہ اس کی جڑیں مضبوط ہوں اور وہ معاشرے کے اندر گہری جڑیں رکھتی ہو۔ پھر نظریاتی اعتبار سے اسے چاہئے کہ وہ تروتازہ، اور انسانی فطرت کے اندر رچی بسی ہو۔

حالیہ دعوت کو اپنے نفوس کی حقیقت اچھی طرح معلوم ہو، اور وہ جہاد فی سبیل اللہ اور اس کی زندگی کو ساتھ ساتھ لے کر چلتے ہوں۔ انہیں معلوم ہو کہ نفس انسانی کی حقیقت کیا ہے اور اس کے اندر کیا کیا خفیہ قوتیں ہیں۔ انہیں معلوم ہو کہ ایک جماعت اور ایک معاشرے کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے۔ انہیں معلوم ہو کہ ان کی دعوت کے اصول اور ان کی نفسانی خواہشات کے درمیان کہاں کہاں اور کس کس طرح جنگ ہوگی اور پھر تمام لوگوں کے ساتھ اس دعوت کی جنگ کس طرح ہوگی۔ پھر انہیں

معلوم ہو کہ شیطان کن کن دروازوں سے نفس انسانی کے اندر داخل ہو جاتا ہے، راستے میں کہاں کہاں پھسلن ہے اور کہاں کہاں گمراہی کی دلدل ہے۔

اس جہد مسلسل کا ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس پر اس کے مخالفین بھی غور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ جو اس قدر قربانیاں دیتے ہیں لازماً اس میں کوئی خیر ہوگی کوئی راز تو اس میں ہوگا۔ یہ لوگ اس راہ میں اس قدر مشکلات برداشت کرتے ہیں اور وہ پر عزم طور پر اپنے موقف پر جے ہوئے ہیں۔ ایک مقام ایسا ضرور آتا ہے کہ مخالفین کے دل پگھل جاتے ہیں، وہ ٹوٹ جاتے ہیں اور آخر کار فوج در فوج تحریک میں داخل ہوتے ہیں۔

غرض دعوت کی یہ سنت ہے۔ اس دعوت کی راہ میں جو پُر مشقت حالات پیش آتے ہیں، ایسے حالات آتے ہیں جن حالات کے اندر تلخ کھینچا تانی قائم رہتی ہے اور اس راہ میں دشمنوں کے عملوں کا مقابلہ ہوتا ہے اور اس راہ میں ہر وقت مشکلات برداشت کر کے اللہ کی رحمت کی امید قائم رکھنا ہوتی ہے اور یہ سب کام صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو نہایت ٹھوس لوگ ہوں اور جو نہایت ہی الوا العزم ہوں۔

وَإِنْ تَصْصِرُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ..... ”اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو تو یہ ان لوگوں کے کاموں میں سے ہو گا جو اولو العزم ہیں۔“

مدینہ کی اسلامی جماعت اس بات کی توقع کرتی تھی کہ اس کی راہ میں اسے بے پناہ مشکلات پیش آنے والی ہیں۔ وہ اذیت، مصیبت اور مشکلات کی توقع کر رہی تھی۔ چاہے یہ مشکلات جانی ہوں یا مالی۔ یہ ان اہل کتاب کی طرف سے ہوں جو مدینہ کے ارد گرد بستے تھے یا ان دشمن مشرکین کی طرف سے ہوں جو مکہ میں تھے۔ لیکن یہ مشکلات ضرور ان کی راہ میں آئیں گی۔ وہ کبھی بھی شکست تسلیم نہ کرے گی..... اس جماعت کو یہ بھی یقین تھا کہ اس نے ایک دن ضرور مرنا ہے۔ اور یہ کہ اصل اجر تو وہ ہو گا جو آخرت میں ملے گا اور یہ کہ کامیاب وہی ہو گا جو آگے سے ہٹایا گیا اور جنت میں داخل کر دیا گیا اور یہ کہ دنیا کی زندگی تو متاع غرور ہے۔ مدینہ کی یہ جماعت اس قدر مضبوط بنیادوں پر کھلی

زمین پر کھڑی تھی اور وہ اسی شاہرہ پر گامزن تھی جو یقیناً منزل مقصود کو جاتی تھی۔ اور یہ پختہ اور مضبوط زمین اب بھی حاملین دعوت اسلامی کے لئے موجود ہے۔ اور یہ کھلی اور سیدھی شاہراہ ہر انسان کے سامنے ہے۔ اس کے دعوت کے وہی پرانے دشمن آج بھی اس کے دشمن ہیں۔ صدیوں وقت گزرنے کے باوجود یہ دشمن نہیں بدل۔ وہ آج تک اس کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں، حالانکہ صدیاں بیت گئیں اور قرآن وہی قرآن ہے اور وہی اس کا پیغام ہے جو تھا۔

ہاں، یہ درست ہے کہ فتنہ و ابتلا کے اسٹائل ہر دور میں بدل جاتے اور اس تحریک کے خلاف پروپیگنڈے کے نئے نئے وسائل سامنے آجاتے ہیں۔ اس کو ایذا دینے کے طریقے بھی نئے آتے رہتے ہیں۔ اس کی شہرت کو خراب کیا جاتا ہے، اس کے تصورات کے بنیادی عناصر کو خراب کیا جاتا ہے۔ ان کی اہمیت کو ختم کیا جاتا ہے اور دعوت کے مقاصد کے بارے میں غلط تاثرات دیئے جاتے ہیں، لیکن اس سلسلے میں واحد اصول یہ ہے:

لَتُبْلَوْنَ فِيْ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا اَذٰى كَثِيْرًا

”اے مسلمانو، تمہیں مال اور جان دونوں کی آزمائشیں پیش آکر رہیں گی اور تم اہل کتاب اور مشرکین سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔“

اس سورت میں اہل کتاب کی سازشوں کے ایک بڑے حصے کو بے نقاب کیا گیا ہے۔ یہ ان کے پروپیگنڈے اور شکوک و شبہات پھیلانے کیے نمونوں سے بھری پڑی ہے۔ کبھی شکوک و شبہات اصل دعوت اور اس کے اصول کے اندر پیش کئے جاتے ہیں۔ کبھی اس دعوت کے حاملین اور کارکنوں کے خلاف شبہات پھیلانے جاتے ہیں۔ اور اس کام کا اسٹائل اور شکل و صورت ہر دور میں بدل جاتی ہے۔ اور جدید وسائل، نشر و اشاعت کے بعد اس کے رنگ ڈھنگ بہت ہی بدل گئے ہیں۔ اور یہ تمام کام اسلام کے نظریاتی کام کے خلاف مسلسل ہو رہا ہے۔ نیز اس کا اول ٹارگٹ اسلامی جماعت اور اس کی

قیادت ہوتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مذکور بالا آیت میں جو فریم ورک دیا ہے یہ کام آج بھی بہر حال اسی کے اندر ہو رہا اور جس مزاج کا اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے اس مزاج سے ہو رہا ہے۔ اور دشمنوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو نشانہ ہی کی ہے اس کے رنگ ڈھنگ آج بھی وہی ہیں۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے جو ہدایت دی ہے وہ ہر دور میں جماعت اسلامی اور تحریک اسلامی کے لئے ایک سرمایہ ہے، جب بھی وہ اس دعوت کو لے کر اٹھے اور جب بھی وہ اس زمین کے کسی حصے میں اسلامی نظام کے قیام کا نصب العین لے کر اٹھے۔ جب بھی یہ کام شروع ہو گا تو اس کے خلاف فتنہ اور سازشوں کے وسائل حرکت میں آنا شروع ہوں گے، جدید سے جدید پروپیگنڈے کے وسائل کے دروازے کھل جائیں گے۔ اس کے مقاصد کو غلط رنگ میں توڑ موڑ کر پیش کیا جائے گا۔ اور اس کی صفوں کو منتشر کرنے کی سعی کی جائے گی اور قرآن کی جانب سے تحریک اسلامی کی ہدایت اور اس کی آنکھیں کھولنے کے لئے یہ آیت سامنے آجائے گی۔ وہ اس تحریک کے مزاج سے داعیوں کو خبردار کرے گی، اس کا طریق کار سمجھائے گی۔ اور اس کے مخالفین کا مزاج بھی تحریک کے سامنے رکھ دے گی جو راستے میں تحریک کی راہ پکڑے ہوئے ہیں اور یہ آیت تحریک اسلامی کے دل کو اطمینان سے بھر دے گی۔ اور اس راہ میں اسے جو مشکلات پیش آئیں انہیں انگیز کرے گی اور جب یہ بھیڑیے ہر طرف سے اس کا گوشت نوچیں گے اور جب اس کے چاروں طرف نشر و اشاعت کے وسائل بھونکنے لگیں گے اور جب اس پر ہر طرف سے ابتلا آئے گی اور اسے فتنہ سامانیوں کا سامنا ہو گا تو یہ تحریک مطمئن ہو کر اپنی راہ پر گامزن رہے گی اور اسے یہ تمام نشانات راہ صاف صاف نظر آئیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ اسے ابتلا، اذیت، فتنے اور باطل پروپیگنڈے سے پہلے ہی خبردار کر دیا گیا۔ بتا دیا گیا کہ وہ اس دعوت کی وجہ سے بہت کچھ سنے گی اور یہ اس لئے بتا دیا گیا کہ اس تحریک کو اس بات پر پہلے سے پختہ یقین ہے کہ صبر و تقویٰ ہی زاد راہ ہیں۔ اور ان کے ذریعے تمام سازشیں، تمام پروپیگنڈے ختم ہو جاتے ہیں، ان کے ہوتے ہوئے اذیت و ابتلا کی اہمیت اور شدت ہی ختم ہو جاتی ہے اور تحریک اپنے

ٹارگٹ کی طرف جاتی ہے، رواں دواں ہوتی ہے، نہایت پر امید ہو کر نہایت عزم کے ساتھ اور صبر و تقویٰ کے زاد راہ کے ساتھ۔



اس کے بعد روئے سخن اہل کتاب پر تنقید کی جانب ہو جاتا ہے۔ ان کے غلط موقف کی قلعی کھولی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ جب ان کو کتاب دی گئی تھی تو ان سے تو عہد لیا گیا تھا کہ تم یہ یہ کرو گے۔ مگر انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور جس بات کو ان کے پاس بطور امانت رکھا گیا تھا اس میں انہوں نے خیانت کی۔ ان سے پوچھا جاتا ہے:

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكُونُ مِنْهُ مُبَذَّوۃً وَرَءَ طُغُورِهِمْۖ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَبَيَّضُ مَا يَشْتَرُونَۖ

”اہل کتاب کو وہ عہد بھی یاد دلاؤ جو اللہ نے ان سے لیا تھا کہ تمہیں کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلا نا ہو گا۔ مگر انہوں نے کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ اور تھوری قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔ کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں۔“

اس سورت میں اہل کتاب کے بہت سے اقوال و افعال کو لیا گیا ہے خصوصاً یہودیوں کے۔ ان میں سے ممتاز ترین کردار ان کا یہ بیان ہوا ہے کہ ان لوگوں کی یہ عادت رہی ہے کہ یہ حق کو چھپاتے ہیں حالانکہ ان کو اچھی طرح یہ پتہ ہوتا ہے کہ یہ حق ہے۔ پھر یہ اس حق کو باطل کے ساتھ ملاتے ہیں اور اس طرح اپنے پروپیگنڈے کے لئے راہ ہموار کرتے ہیں۔ اس طرح وہ دین کے مفہوم میں شکوک و شبہات پھیلاتے ہیں۔ وہ اسلام کی صحت پر اعتراضات کرتے ہیں۔ وہ اس بات کا بھی انکار کرتے ہیں کہ اسلام اور ادیان سابقہ کے اندر بنیادیں مشترک ہیں۔ اسلام ادیان سابقہ کی تصدیق کرتا ہے اور دین اسلام کی تصدیق کرتے ہیں۔ ان کے پاس تو رات موجود تھی جس میں حضرت محمد ﷺ کی سچائی ثابت

تھی اور وہ جانتے تھے۔ اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ قرآن مجید بھی اسی منبع سے آیا ہے جس سے تورات اتری ہے۔

اب وہ جو یہ موقف اختیار کر رہے ہیں وہ ان کے لئے نہایت ہی نامناسب ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں حکم دیا ہے کہ وہ کتاب کی تبلیغ کریں گے اور اس میں جو کچھ ہے اسے چھپائیں گے نہیں وہ اسے بیان کریں گے اور تمام لوگوں کے سامنے بیان کریں گے۔ نہ چھپائیں گے اور نہ خفیہ رکھیں گے۔ لیکن انہوں نے اللہ کے اس عہد صریح کو پس پشت ڈال دیا۔ اس آیت کا انداز تعبیر نہایت ہی موثر ہے۔ اس کے اندر دینی فعل کے علاوہ ظاہری حرکت بھی ہے یعنی کسی چیز کو پس پشت پھینک دینا۔ فَتَبَدُّوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ..... (انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا) اور یہ حیا سوز کام انہوں نے کیا کیوں؟ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا..... (انہوں نے تھوڑی سی قیمت پر اسے بیچ ڈالا)

یہ کام انہوں نے اس دنیا کے مفادات کے لئے کیا۔ یہ یہودیوں کے مذہبی راہنماؤں کے ذاتی مفادات اور ان کی قومیت کے بچاؤ کے لئے انہوں نے یہ کام کیا۔ اور یہ سب کچھ ثمن قلیل ہی ہیں۔ اگرچہ وہ تمام عرصے کے لئے تمام دنیا پر قابض ہو جائیں۔ یہ بھی اللہ کے عہد کے مقابلے میں ثمن قلیل ہو گا۔ اور اگر اللہ کے ہاں ان کے لئے جو اجر تھا وہ اسے نظروں میں رکھتے تو یہ انہیں واقعی ثمن قلیل نظر آتا فَيَسَّسَ مَا يَشْتَرُونَ..... (کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں)۔



بخاری شریف میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ رسول ﷺ نے یہودیوں سے کوئی بات پوچھی۔ انہوں نے اسے چھپا دیا اور انہوں نے غلط جواب دیا۔ وہ چلے گئے۔ وہ یہ تاثر دیتے ہوئے گئے کہ انہوں نے رسول ﷺ کو وہ بات بتادی جو انہوں نے پوچھی تھی اور اس پر وہ اپنی جگہ خوش تھے کہ ان کو رسول ﷺ کے ہاں تعریف کا مستحق قرار دیا گیا لیکن خوش اس لئے بھی تھے کہ انہوں نے اصل بات چھپا دی تھی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوْا وَيُجِبُّونَ أَكْبَرُ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ

”تم ان لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کرتوتوں پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ایسے کاموں کی تعریف انہیں حاصل ہو جو فی الواقعہ انہوں نے نہیں کئے۔ حقیقت میں ان کے لئے دردناک سزا تیار ہے۔“

ایک دوسری روایت میں امام بخاری نے ابوسعید الخدری سے نقل کیا ہے کہ منافقین میں سے لوگ ایسے تھے کہ جب رسول اللہ ﷺ جہاد کے لئے نکلتے تو وہ ہمیشہ پیچھے رہ جاتے اور وہ یوں پیچھے رہ جانے کی وجہ سے بہت ہی خوش ہوتے کیونکہ یہ رسول اللہ کی مرضی کے خلاف ہوتا۔ جب رسول اللہ ﷺ واپس آتے تو یہ لوگ عذرات پیش کرتے اور قسمیں اٹھاتے۔ اور وہ اس بات کو پسند کرتے کہ انہوں نے جو نہیں کئے اس پر ان کی تعریف کی جائے۔ اس پر یہ آیت نازل لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ بِمَا أَتَوْا وَيُجِبُّونَ أَكْبَرُ يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا

اصل حقیقت یہ ہے کہ کوئی آیت کس واقعہ کے بارے میں نازل ہوئی؟ یہ کوئی قطعی بات نہیں ہے۔ ایسی روایات بعض اوقات ایسی صورت حال کو بیان کرتی ہیں جن میں کسی آیت سے کوئی دلیل رسول ﷺ نے پیش کی ہوتی ہے۔ راوی کو یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ شاید یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہے یا اگر کسی واقعہ پر کوئی آیت منطبق ہوتی ہے تو راوی کہتا ہے کہ یہ آیت اس کا مصداق ہے۔ اور یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس لئے ان دو روایتوں کے بارے میں بھی قطعی بات نہیں کی جاسکتی۔

رہی پہلی روایت تو اس میں سیاق کلام کے ساتھ ہم آہنگی ہے اس لئے کہ بات اہل کتاب کی ہو رہی ہے۔ اہل کتاب کے اس دعویٰ کا ذکر ہے کہ ان کو جو کتاب دی گئی ہے اور اس میں جو ان کے پاس امانت ہے وہ اسے چھپائیں گے نہیں۔ لوگوں کے سامنے بیان کریں گے۔ وہ چھپا رہے ہیں اور جھوٹ اور فریب

کاری کے طور پر کچھ اور بتاتے ہیں اور پھر یہ توقع بھی کرتے ہیں کہ ان کے اس جھوٹ اور اختراء پر ان کی تعریف ہوگی۔

اگر دوسری روایت درست ہے تو پھر بھی سیاق کلام میں منافقین کی بات موجود ہے اور یہ آیت بھی انہیں آیات کے ساتھ ملحق ہے۔ غرض یہ ان لوگوں کے نمونے ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے عہد میں پائے جاتے تھے۔ ایسے لوگ آج بھی ہر تحریک میں پائے جاتے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے نظریات کے تقاضے اور ان کے فرائض پورے نہیں کر سکتے اور نہ ہی نتائج برداشت کر سکتے ہیں اور نہ ہی نظریہ کی ذمہ داریاں پوری کرتے ہیں۔ جدوجہد سے پیچھے بیٹھے رہتے ہیں۔ اگر جدوجہد کرنے والے ناکام ہو جائیں اور انہیں ہزیمت ہو تو یہ لوگ سر اٹھاتے ہیں اور ناک میں شکن ڈال کر اور ناک کھینچ کر بات کرتے ہیں اور یہ تاثر دیتے ہیں کہ وہ بہت ہی عقلمند ہیں اور موقع شناس ہیں اور خود دار ہیں۔ اور اگر مجاہدین کو فتح حاصل ہو جائے اور انہیں مفادات ملیں تو ہمارے ایسے ساتھی آگے بڑھتے ہیں اور یہ ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ان کے اس منصوبے کے مؤید تھے اور یہ کہ اس فتح میں ہمارا بھی ہاتھ ہے۔ اور یہ لوگ اس بات کو پسند کرتے ہیں کہ ان کی مدح سرائی ان کاموں پر بھی ہو جو انہوں نے نہیں کئے۔

انسانیت میں سے یہ ان لوگوں کا نمونہ ہے جو ڈرپوک ہوتے ہیں اور بلند و بانگ دعویٰ کرتے ہیں۔ قرآن کریم ان لوگوں کی پینٹنگ چند لکیروں کے اندر کر دیتا ہے اور ان کے خدو خال بہت ہی واضح طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔ پھر ان الفاظ کا جامہ پہنا کر قرآن کریم ان خدو خال کو دائمی ریکارڈ کے طور پر محفوظ کر لیتا ہے تاکہ اس آئینے میں آنے والے اپنے چہرہ دیکھیں۔ یہ ہے اسلوب قرآن کریم کا۔

اس قسم کے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ رسول ﷺ کو بتا کر بتاتے ہیں کہ ان کے لئے نجات اخروی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ (تم ان لوگوں کو عذاب سے محفوظ نہ سمجھو) وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ..... (بے شک ان کے لئے دردناک عذاب ہے) اور عذاب الیم کی یہ وعید اللہ تعالیٰ

کی طرف سے ہے۔ جو مالک السموات والارض ہے۔ وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ تو پھر بچنے کی صورت ہی کیا رہتی ہے۔ اور نجات کب مل سکتی ہے؟ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللّٰهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (اور زمین و آسمانوں کا مالک اللہ ہے اور اس کی قدرت سب پر حاوی ہے)



درس نمبر ۲۹ ایک نظر میں

یہ سورت جس قدر سبقوں اور دروس پر مشتمل تھی یہ ان میں سے آخری درس ہے۔ اس سورت میں اسلامی تصور حیات کے اساسی عناصر میں اہم عناصر کی ایک بڑی تعداد کا ذکر ہوا ہے۔ اور ان عناصر کو ہر قسم کے اجمال، اشتباہ اور اہل کتاب کے ساتھ مجادلوں اور مشرکین کے ساتھ مباحثے کر کے ان اساسی عناصر کو منقطع کیا گیا ہے۔ اس پوری سورت میں اسلامی نظام زندگی کی نوعیت اور جان و مال کے حوالے سے اس کے تقاضوں کا بیان ہوا ہے۔ جماعت مسلمہ کو تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ان فرائض کو کس طرح ادا کرے گی۔ اور مشکل حالات کے ابتلا میں اس کا رویہ کیا ہوگا اور خوشحالی کے حالات میں وہ ابتلا سے کس طرح عہدہ بر آہوگی اور وہ اسلامی نظریہ حیات اور اس کے عظیم فرائض اور ڈیوٹیوں کو کس طرح سرانجام دے گی، جو نفس کے حوالے سے بھی ہیں اور مال کے حوالے سے بھی ہیں۔ یہی وہ مضامین تھے جو اس پوری سورت کا محور تھے اور جنہیں ہم نے پارہ سوئم اور چہارم کی تفسیر فی ظلال القرآن میں بیان کیا۔

اب یہ آخری درس ایک طرح کی آخری ضرب یا ضربات ہیں۔ یہ آخری ضربات اس سورت میں موضوع کے ساتھ نہایت ہی متناسب ہیں۔ اور یہ آخری ضرب بھی اپنے موضوع کے اعتبار سے اور طرز ادا کے اعتبار سے سابقہ ضربات سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

اس کے اندر ایک نہایت ہی گہری حقیقت کا بیان ہوا ہے۔ یہ کہ یہ کائنات ایک کھلی کتاب ہے۔ اس کے اندر ایمان و یقین کے بے شمار دلائل اور علامات موجود ہیں۔ اس کائنات سے اس ذات کا اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے جو اسے بڑی حکمت کے ساتھ چلا رہی ہے۔ اس سے اظہار ہوتا ہے کہ اس دنیا کی زندگی سے وراء ایک اخروی زندگی ہے۔ اس زندگی کا حساب و کتاب اور مکافات عمل وہاں ہوگا۔ ان دلائل کو کون پڑھ سکتا ہے، اس آیات و اشارات کو کون پاسکتا ہے، اس حکمت کا ادراک کون کر سکتا ہے؟ اور اس کائنات کی آواز کون سن سکتا ہے؟ یہ صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اولوالالباب

ہیں، جو اصحاب دانش و بنیش ہیں۔ وہ لوگ جو اس کتاب مفتوح پر سے یونہی نہیں گزر جاتے اور وہ ان ظاہر و باہر آیات اور نشانیوں سے آنکھیں بند نہیں کر لیتے۔

یہ حقیقت اس کائنات کے حوالے سے اسلامی تصور حیات کے اساسی عناصر میں سے ایک عنصر ہے۔ اور اس کے اور انسانی فطرت کے درمیان ایک عمیق ربط ہے۔ اور فطرت انسانی اور فطرت کائنات کے درمیان گہری داخلی مفاہمت اور ہم آہنگی ہے۔ یہ کائنات ایک جہت سے اپنے خالق کے وجود پر دلالت کرتی ہے۔ اور دوسری جہت سے اس سے وہ ناموس اکبر معلوم ہوتا ہے۔ جو مقصدیت گہری حکمت اور قصد و ارادے آپ کے حوالے سے اس کائنات کے اندر کار فرما ہے۔ اور اس کا روح رواں ہے۔ اور اس ناموس اکبر کا فہم و ادراک اس نقطہ نظر سے بہت ہی اہم ہے کہ اس کائنات، اس کے خالق الہ العالمین کے بارے میں انسان کیا موقف اختیار کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ کائنات اس موجودہ دنیا کے بارے میں اسلامی افکار کا اہم خزانہ اور منبع ہے۔ اس کے بعد اس درس میں، صاحبان عقل و دانش اور عالمان علم کائنات کی اس خشوع دعا کی قبولیت کا ذکر ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کائنات کی اس کتاب مفتوح کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اور یہ کائنات جن دلائل کو پیش کرتی ہے یہ ان پر غور کرتے ہیں۔ اور یہ کائنات جو مقاصد بتاتی ہے۔ یہ اس پر بھی تامل کرتے ہیں۔ اور دعا کی قبولیت کے ساتھ ساتھ ہدایات کیا دی جاتی ہیں؟ یہ کہ عمل پیہم، جہاد مسلسل، صبر و محبت اور ایمان تقاضوں کی بجا آوری ہی دراصل وہ تحفے ہیں جو ان لوگوں کو ملتے ہیں۔ جو اس کائنات کی کتاب مفتوح کو اللہ ترسی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور پھر آخر میں اہل کفر کی پوزیشن کو حقیر بنایا گیا ہے۔ اگرچہ ان کے پاس اس دنیا کا ساز و سامان زیادہ ہے۔ یہ کچھ بھی نہیں ہے، اصل دولت تو وہ ہے جو آخرت میں ملے گی مومنین کو اس کی بات کرنی چاہئے۔

اس سورت میں اہل کتاب اور مسلمانوں کے خلاف ان کے موقف کے بارے میں تفصیلی بات کی گئی تھی۔ اس آخری سبق میں اہل کتاب میں سے بعض اچھے لوگوں کا ذکر بھی کر دیا گیا ہے۔ اور آخرت میں ان کی جزا اور صفت خشوع کا ذکر خصوصی طور پر کیا گیا۔ اس نسبت سے کہ اہل ایمان میں سے ان

لوگوں کا ذکر کیا گیا تھا جو اس کائنات کی کتاب مفتوح کا مطالعہ کرتے تھے اور ان کے اندر بھی صفت خشوع اور انابت سے دعا کی تھی۔ اور انہوں نے اس امر کو نہایت ہشمرناک سمجھا کہ اللہ کی آیات کو معمولی دام کے عوض فروخت کیا جائے۔ جیسا کہ بعض اہل کتاب یہ کام کرتے تھے اور جن کا ذکر اس سورت میں ہو چکا ہے۔ اس کے بعد پوری سورت کا خاتمہ آتا ہے اور اس میں اس پوری سورت کی ہدایت کا خلاصہ دیا گیا ہے۔ اور جماعت مسلمہ کو یہ کہا گیا ہے کہ یہ ان کی زندگی کا خلاصہ ہے۔ یہ ان کے فرائض اور پروگرام کا خلاصہ ہے۔ اور اسی میں ان کی فلاح مضمر ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

”اے ایمان والو! صبر سے کام لو، پرستوں کے مقابلے میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لئے کمر بستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے فلاح پاؤ گے۔“

○..... ☆ ☆ ☆○

درس نمبر ۲۹ تشریح آیات (آیت نمبر ۱۹۰ تا ۲۰۰)

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَآيَاتٍ
لِّأُولِي الْأَلْبَابِ (۱۹۰) الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ
وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا
سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۹۱) رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تَدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْرَجْتَهُ
وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ (۱۹۲) رَبَّنَا إِنَّا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ
أَبْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَفَّنَا
مَعَ الْأَبْرَارِ (۱۹۳) رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَىٰ رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ
إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ (۱۹۴) فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ
مِّنْكُمْ مَّنْ ذَكَرَ أَوْ أُتِيَ بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِنْ
دِيَارِهِمْ وَأُودُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأَكْفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ
وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ
حُسْنُ الثَّوَابِ (۱۹۵) لَا يَحْزَنُكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ (۱۹۶) مَتَاعٌ
قَلِيلٌ ثُمَّ مَا لَهُمْ جَهَنَّمُ وَبُسُّ الْمِهَادِ (۱۹۷) لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ
جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ
خَيْرٌ لِلْأَبْرَارِ (۱۹۸) وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ

إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خَاشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا
أُولَئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۱۹۹) يَا أَيُّهَا
الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُونَ (۲۰۰)

”زمین و آسمانوں کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں جو اٹھتے، بیٹھتے اور لیٹتے، ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور زمین و آسمان کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں۔ (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں۔) پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ پس اے رب، ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلت و رسوائی میں ڈال دیا، اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہو گا۔ مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کی مانو، ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔ پس اے ہمارے آقا! جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے درگزر فرما، جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔ خداوند، جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے کئے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔“

زمین و آسمان کی تخلیق میں، اور رات اور دن کی گردش میں وہ کیا آیات اور نشانیاں ہیں، اور جب یہ اولوالالباب آسمان اور زمین میں تفکر کرتے ہیں تو وہ کیا نشانیاں ہیں؟ جب وہ رات اور ان کی گردش میں غور کرتے ہیں تو انہیں کیا نظر آتا ہے؟ جبکہ پھر وہ اللہ کو یاد کرنے لگتے ہیں کھڑے ہو کر بھی، بیٹھ کر بھی اور کروٹ لیتے ہوئے بھی۔ اور پھر سوال یہ ہے کہ ان کے نتیجہ فکر کا تعلق اللہ کے ذکر کے ساتھ کیسے مربوط ہو جاتا ہے کہ وہ فوراً کھڑے، بیٹھے اور کروٹ لیتے اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ اور پھر وہ اس ذکر کو اس پر خشوع و خضوع اور پر سوز دعا پر کیسے ختم کرتے ہیں؟ وہ کہتے ہیں - رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا

سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ.....(پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے پس اے رب ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے۔)

قرآن کریم یہاں ان لوگوں کی ایک زندہ اور متحرک تصویر کشی کرتا ہے جو اس کائنات کے اندر صحت مند غور کرتے ہیں اور ان کو اس کائنات کے مشرقات کا ادراک ہوتا ہے۔ اور وہ پھر ان مدرکات اور موثرات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، اور ان کی آنکھوں کے سامنے رات دن اس پوری کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اس کی طرف لبیک کہتے ہیں۔

قرآن کریم انسانی فکر و نظر میں بار بار دعوتِ نظارہ دیتا ہے اور بڑی تاکید سے حکم دیتا ہے کہ وہ اس کھلی کتاب کا مطالعہ کریں۔ جس کے صفحات رات اور دن خود الٹے پلٹتے رہتے ہیں۔ ہر صفحے پر صانعِ قدرت کے نشانات میں سے ایک نشان نظر آتا ہے۔ اور وہ فطرتِ سلیمہ کے اندر ایک ایسی سچائی کے پہچاننے کا بے حد جوش پیدا کر دیتا ہے، جو سچائی اس کتاب کے صفحات کے اندر جمی ہوئی ہے۔ اس کائنات کی اساس میں وہ سچائی موجود ہے۔ اس کائنات کے خالق کے مطالبات کے تسلیم کرنے کی طرف یہ سچائی مائل کرتی ہے۔ اور جس خالق نے اس کائنات میں یہ ناموس و دیعت کیا ہے۔ اس کی طرف رجوع کی دعوت دی جاتی ہے۔ دل میں خالق کی محبت بھی پیدا ہوتی ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس کا خوف اور خشیت بھی پیدا ہوتی ہے..... پھر یہ اولوالالباب کون لوگ ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو صحیح الفکر ہیں۔ جو آنکھیں کھول کر کتابِ کائنات کی آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ وہ آنکھوں پر پردے نہیں ڈالتے۔ وہ اپنے غور و فکر اور تدبر کے دریچے بند نہیں کرتے۔ اور اس طرح وہ اپنے دل کے حوالے سے، اپنے قیام میں، اپنے قعود میں اور کروٹ لیتے ہوئے اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یوں کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور ان کے ذرائعِ ادراک کھل جاتے ہیں اور وہ اس ناموس اکبر اور حقیقتِ کائنات کا ادراک کر لیتے ہیں جو اللہ نے اس کائنات میں ودیعت کی ہے۔ وہ اس کائنات کے مقصد و جو کو پا لیتے ہیں۔ اس ایجاد کرنے کے اصل اسباب ان کے علم میں آ جاتے ہیں اور وہ کائنات کے فطرت کے اجزائے ترکیبی اور نظامِ قیام

سے واقف ہوتے ہیں۔ یہ تمام راز وہ اس الہام کے ذریعہ پاتے ہیں جو فطرت کے ان نوا میس اور انسانی دل کے درمیان رابطے کے ذریعے ہوتا ہے۔

زمین و آسمان کا مشہد رات اور دن کی تبدیلی کا منظر اور سیاروں کی گردش کے مناظر ایسے مناظر ہیں کہ اگر ہم اپنی آنکھیں کھول کر دیکھیں، ہمارے دل کام کر رہے ہوں اور ہمارا ادراک اچھی طرح کام کرتا ہو اور ان کو اس نظر سے دیکھیں جس طرح ایک انسان کسی مشہد اور منظر کو پہلی مرتبہ دیکھتا ہے اور اگر ہم اپنے احساس سے ان مناظر کے عادی ہونے کے تصور کو دور کر دیں، اور اس تکرار کے اثرات سے اپنی حس کو پاک کر دیں تو ہمارے احساس کے لئے یہ قابل ارتعاش ہوں، ہمارے شعور کے اندر زلزلہ آجائے اور ہمیں اچھی طرح احساس ہو جائے کہ اس نظام کے اندر جس قدر دقت نظر سے ہم آہنگی پیدا کی گئی ہے وہ کسی حکیمانہ ہاتھ کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اس نظام کے پیچھے ایک مدبر عقل کام کر رہی ہے۔ اس نظام کے پیچھے ایک ناموس کام کر رہا ہے۔ جس کی خلاف ورزی ممکن نہیں ہے۔ اور یہ سب کچھ دھوکہ اور فریب نہیں ہو سکتا۔ نہ یہ کوئی بخت و اتفاق ہو سکتا ہے اور نہ یہ نظام محض فریب نظر ہو سکتا ہے۔

اور یہ بات بھی ہمارے شعور کے لئے کوئی کم زلزلہ خیز نہیں ہے کہ یہ زمین سورج کے ارد گرد اور اپنے محور پر گردش کر رہی ہے۔ اور اس سے رات اور دن کے دو مناظر پیدا ہو رہے ہیں۔ یہ کہ ان اجرام فلکی کے اندر کشش کام آ رہی ہے۔ اور اس نے ہر ایک جرم کو اپنی جگہ ٹھہرایا ہوا ہے۔ یا کوئی اور نظام ہے۔ یہ تو ہمارے مقرر کردہ اصول موضوعہ میں کبھی درست ہوں گے کبھی غلط ہوں گے۔ جو صورت بھی ہو لیکن ہر صورت میں کائنات کا یہ عجوبہ، عجوبہ ہی رہتا ہے۔ اور نظر آتا ہے کہ ایک عظیم نظام ہے جس نے ان دیو ہیکل سیاروں اور اجرام کو تھام رکھا ہے۔ نہایت دقت سے، نہ ٹوٹتے ہیں نہ باہم متصادم ہوتے ہیں، بنی نوع انسان میں ماہرین فلکیات چاہے اس کا جو بھی نام رکھیں، بہر حال یہ نظام قدرت کا نشان ہے، یہ سچائی کی برہان ہے، اور سچائی گردش ایام اور دوران فلک سے عیاں ہے۔

قرآن کریم نے یہاں جو صاف منظر کشی کی ہے، اسی میں آسمانوں اور اجرام فلکی کی گردش اور رات اور دن کے پیہم تبدیلی کے مناظر اولوالالباب اور صاحبان عقل و دانش کے شعور اور فکر پر جو اثرات چھوڑتے ہیں، ان اثرات کے ایک ایک جزء کو بڑی دقت کے ساتھ قلم بند کر دیا ہے۔ یہ ایک قسم کی اثر انگیز تصویر ہے۔ اسے دیکھ کر دل اس کائنات کے ساتھ باہم معاملہ کرتے وقت بہت ہی صحیح نظام اور طریقہ کا اختیار کرتا ہے۔ یہ مناظر اپنی زبان میں بات کرتے ہیں اور یہ دل کائنات کی فطرت کے ساتھ ہم آہنگی اختیار کرتے ہیں، اس کی حقیقت کے یکجا ہو جاتے ہیں۔ اور کائنات کے اشارات اور اثرات کو قبول کرتے ہیں۔ اس طرح کائنات کی یہ کتاب ایک مومن اور واصل باللہ انسان کے لئے کتاب علم و معرفت بن جاتی ہے۔ جسے اللہ نے تصنیف کیا ہے۔

اس مطالعہ کائنات کا انسانی شعور پر پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اللہ کی یاد اور اس کی عبادت کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ جو لوگ مطالعہ کرتے ہیں وہ کھڑے ہو کر، بیٹھتے ہوئے اور کروٹ بدلتے ہوئے ہی اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ جبکہ وہ زمین اور آسمانوں کی تخلیق پر غور کرتے ہیں اور جبکہ وہ رات اور دن کے اختلاف کا مطالعہ بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ یہ غور و فکر پھر عبادت بن جاتے ہیں۔ اور یوں یہ مشاہدات مشاہدات ذکر الہی بن جاتے ہیں۔ اس طرح، اس تصور انسان اور تصور کائنات کے مطابق دو حقائق ثابت ہو جاتے ہیں۔

پہلی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کی تخلیق میں تدبر اور مشاہدہ کرنا اور اللہ کی اس کھلی کتاب کا مطالعہ کرنا اور اللہ کے تخلیقی ہاتھ کا مطالعہ کرنا بھی حرکت کائنات کا مطالعہ اور اس کائنات کے صفحات کو الٹنا پلٹنا، درحقیقت اصلی اور بنیادی عبادت ہے۔ اور یہ ایک ذکر الہی ہے جو نہایت ہی حقیقی ذکر الہی ہے۔ اگر کائناتی علوم، جن میں اس کائنات کی تنظیم اور تشکیل سے بحث ہوتی ہے۔ اور اس کائنات کے اندر جاری و ساری نوامیس و سنن کا مطالعہ اور ان قوتوں اور ذخائر کا مطالعہ جو اس کائنات کے اندر جمع شدہ ہیں اور اس کائنات کے اسرار و رموز کے علوم کو اگر اس کائنات کے خالق کے ذکر اور اس کی یاد کے ساتھ یکجا کر دیا جائے اور اس مطالعے سے اللہ کی جلالت قدر کا شعور پیدا کیا جائے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا

احساس اجاگر کیا جائے تو یہ تمام عمل اس کائنات کے خالق کی عبادت بن جاتا ہے۔ اور نماز کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اور ان علوم کے ذریعہ زندگی درست ہو کر راہ مستقیم پر استوار ہو سکتی ہے۔ پوری انسانی آبادی اللہ کی طرف متوجہ ہو سکتی ہے۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ ہمارے مادی اور کافرانہ رجحان نے اس کائنات اور خالق کائنات کے درمیان تصوراتی بعد پیدا کر دیا ہے۔ انہوں نے تکوینی قوانین اور ازلی ابدی حقیقت کے درمیان تضاد پیدا کر دیا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ علم جو انسان کے لئے اللہ تعالیٰ کا خوبصورت ترین تحفہ تھا وہ خود انسان کے لئے ایک ایسی لعنت بن گیا ہے۔ جو انسان کا پیچھا کر رہا ہے۔ اور انسان کی زندگی کو جہنم میں تبدیل کر رہا ہے۔ اس کی زندگی قلق، روحانی خلا، اور عدم اطمینان کی صورت میں اس طرح بسر ہو رہی ہے جس طرح انسان کا ایک قہار و جبار بھوت پیچھا کر رہا ہے۔

اور دوسری حقیقت یہ ہے اس کائنات میں جو آیات الہی ہیں، وہ اپنی الہامی صورت میں اسی شخص پر ظاہر ہوتی ہیں جس کا دل ذکر الہی اور عبادت الہیہ میں مشغول ہو۔ اور جو لوگ اللہ کو یاد کرتے ہیں کھڑے ہو کر بیٹھ کر اور کروٹ لیتے ہوئے، درحقیقت وہی لوگ ہیں جو زمین و آسمان کی تخلیق پر غور کرتے ہیں اور رات اور دن کے پیہم آنے پر غور و فکر کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر عظیم حقائق کھلتے ہیں۔ جو آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق کے اندر اور اختلاف لیل و نہار کے نظام میں لپٹے ہوئے ہیں۔ ان رازوں کے رازدان ہونے والے ہی پھر اسلامی زندگی تک پہنچتے ہیں جو نجات اخروی، فلاح دنیوی اور خیر و صلاح کا ضامن ہے۔ رہے وہ لوگ جو صرف ظاہری دنیا کی زندگی ہی پر بس کرتے ہیں اور وہ اس کائنات کی بعض تکوینی چیزوں کو دریافت کر لیتے ہیں اور ان لوگوں کا کوئی ربط اسلامی نظام حیات سے نہیں ہوتا تو یہ لوگ تو پوری زندگی کی بربادی کی فکر کرتے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کو شکست و ریخت سے دوچار کرتے ہیں اور ان تکوینی اسرار و رموز کو بربادی کے لئے استعمال میں لاتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنی زندگی کو ایک ناقابل برداشت جہنم بنا رہے ہیں، وہ زندگی کے ایسے قلق سے دوچار کرتے ہیں جس میں سانس گھٹتی ہے۔ اور آخرت میں وہ اللہ کے غضب اور اس کے عذاب کی طرف لوٹیں گے۔

غرض یہ دونوں حقائق ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں، ان دونوں کو اس سورت نے موضوع بحث بنایا، جو اصحاب دانش کے لئے ان کے مطالعہ کائنات کے وقت اور تعلق باللہ کے قیام کی خاطر یہاں بیان کئے گئے ہیں۔ اور یہ ذکر و فکر کا وہ وقت ہوتا ہے، جس میں دلی صفائی حاصل ہوتی ہے، روح شفاف ہو جاتی ہے اور ادراک کے دروازے کھلتے ہیں، ہدایت اخذ کرنے کی استعداد بڑھ جاتی ہے اور اس میں انسان قبولیت، تاثر اور اخذ کے لئے تیار ہوتا ہے۔

مطالعہ کائنات کا یہ وقت عبادت الہی کا وقت ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ اللہ کی جانب سے استقبال اور بندے کی جانب سے اتصال کا وقت ہوتا ہے۔ اس لئے اس وقت ادراک کائنات اور آیات کو نبیہ کی استعداد بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس وقت اس کائنات میں محض غور و فکر اور اس کے نظام گردش لیل و نہار اور نظام ارض و سما ہی انسان کے ذہن میں القا کرتا ہے کہ اس کائنات کے اندر ایک عظیم حقیقت پوشیدہ ہے اور یہ کہ یہ کائنات عبث نہیں ہے۔ نہ یہ محض فریب نظر ہے، یہی وقت اللہ کے ساتھ وصال کا وقت ہوتا ہے۔ اور براہ راست معرفت الہی کا

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ..... ”پروردگار! یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا، تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔“ تو نے اس کائنات کو فضول پیدا نہیں کیا۔ بلکہ اس کو اس لئے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ حق ہو، سچائی اس کے قیام کا سامان ہو، سچائی اس کا قانون ہو، سچائی میں اصل ہو۔

سچ یہ ہے کہ اس کائنات کی ایک حقیقت ہے وہ ”عدم“ نہیں ہے جس طرح بعض فلسفے یہ کہتے ہیں کہ یہ عدم محض ہے۔ یہ حقیقت ہونے کے بعد ایک ناموس کے مطابق چلتی ہے لہذا یہ انارکی کے مطابق نہیں چل رہی ہے۔ وہ ایک مقصد کی طرف بڑھ رہی ہے اس لئے وہ بخت و اتفاق کے مطابق نہیں چلتی۔ غرض وہ اپنے وجود، اپنی حرکت اور اپنے مقاصد کے حوالے سے ایک عظیم سچائی کے کنٹرول میں چلتی ہے۔ اور اس کے ساتھ کوئی باطل ملاوٹ نہیں کر سکتا۔

یہ پہلا ڈنچ ہے جو اصحاب علم و دانش کے دلوں کو اس وقت دیا جاتا ہے جب وہ نظام تخلیق ارض و سما اور نظام گردش لیل و نہار پر غور کرتے ہیں اور اس ڈنچ سے انہیں عبادت الہی، ذکر الہی اور اتصال ذات کا احساس دلایا جاتا ہے۔ اس ڈنچ سے ان کے پردہ احساس پر حقیقی سچائی کا ایک نقش پڑ جاتا ہے جو اس کائنات کی نقشہ سازی میں کار فرما ہے۔ جب یہ اصحاب دانش اس سچائی تک پہنچ جاتے ہیں تو معاً وہ اللہ کی تسبیح اور تنزیہ کرنے لگتے ہیں اور ان کی اس تاویل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَذَا بَاطِلًا..... ”اے ہمارے رب، تو نے اس کائنات کو عبث نہیں پیدا کیا۔“

اس کے بعد یہ نفسیاتی سوچ ذرا اور آگے بڑھتی ہے۔ کچھ مزید تکوینی احساسات اور الہامات سامنے آتے ہیں فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (۱۹۱) رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تَدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ..... ”ہمیں دوزخ کی آگ سے بچالے، تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلت اور رسوائی میں ڈال دیا۔ اور پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔“..... سوال یہ ہے کہ زمین و آسمان کے اندر جو سچائی ہے اور اختلاف گردش لیل و نہار کے اندر جو سچائی ہے، اس کے ادراک اور اس دعائیہ ارتعاش شعور کے درمیان کیا منطقی ربط ہے کہ صاحب ادراک نہایت ہی اللہ ترسی نہایت ہی عاجزی اور نہایت ہی یکسوئی سے دعا کرنے لگتا ہے؟

جب اصحاب دانش اس سچائی کا ادراک کر لیتے ہیں جو اس کائنات کی تہہ میں کام کرتی ہے تو ان کے نزدیک اس ادراک کا مفہوم یہ ہوتا کہ اس کائنات کے اندر ایک تقدیر ہے، ایک تدبیر ہے، اس کے اندر ایک حکمت کام کر رہی ہے اور اس کا ایک مقصد تخلیق ہے۔ یہ کہ لوگوں کی زندگی کے پس پشت، ان ستاروں میں ایک سچائی اور عدل کام کر رہا ہے۔ اس لئے لوگ یہاں جو کچھ اعمال و افعال کرتے ہیں، ان کا کسی دن حساب و کتاب ضروری ہے۔ مکافات عمل ہونا چاہئے، اور مکافات عمل کی بنیاد پر عدالت اور انصاف کے لئے لازماً ایک دوسرا جہاں ہونا چاہئے۔ جس میں سچائی، عدل اور جزا و سزا متحقق ہو۔

غرض اصحاب دانش کی دعا کے اندر جو حقائق سامنے آئے وہ فطرت کی بدیہی منطق ہے۔ جس کی کڑیاں اس طرح سرعت کے ساتھ ایک دوسرے سے ملتی چلی جاتی ہیں۔ اور ان کا شعور ایک ہی چپ میں آگ اور جہنم کا شعور حاصل کر لیتا ہے۔ اور معاد دست بدعا ہوتے ہیں کہ اللہ! ہمیں اس سے بچا، یہ وہ پہلی بات ہوتی ہے جو ان کے دلوں میں آتی ہے۔ اور یہ آمد اس ادراک کا منطقی نتیجہ ہے جو اس کائنات کے اندر پنہاں سچائی کے حوالے سے وہ کر لیتے ہیں۔ کیفیت کے اعتبار سے یہ دعا نہایت ہی طویل، خشوع و خضوع سے پر، نہایت ہی مضطرب دل کے ساتھ نہایت ہی کانپتے ہوئے جسم کے ساتھ اور پوری یکسوئی کے ساتھ، دل مومن سے اٹھتی ہے اور الفاظ کے اعتبار سے وہ ایک میٹھا نغمہ ہے۔ جس کی ضربات ہم آہنگ اور نغموں کی پرسوز حرارت اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ خوبصورت الفاظ میں ہے۔

ذرا آپ ان صاحبانِ عل و دانش کی ذہنی دنیا کا پہلا زلزلہ دیکھیں۔ وہ اس میں اپنے رب کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں تاکہ وہ انہیں آگ کے عذاب سے بچائیں ذرا غور فرمائیں رَبَّنَا اِنَّا لَكُمُ نَدْخِلُ النَّارَ فَقَدْ اُخْزَيْنَا..... ”تو نے جسے دوزخ میں ڈالا اسے درحقیقت بڑی ذلت اور رسوائی میں ڈال دیا۔ وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ اَنْصَارٍ..... ”پھر ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہو گا۔“

اس دعا سے اظہار ہوتا ہے کہ ان کا خوف آگ کے عذاب سے تھا، اور اس سے بھی زیادہ ان کا خوف اس رسوائی سے تھا جو اہل دوزخ کو ہو ا کرتی ہے۔ ان کی ذہنی دنیا میں یہ ارتعاش اس شرمندگی اور رسوائی کی وجہ سے آیا جو اہل دوزخ کی ہو گی۔ اس لئے یہ خوف انہیں محض اس سبب سے دامن گیر ہو کہ انہیں اللہ سے حیا لاحق ہو گئی۔ اس طرح وہ آگ سے داغے جانے کے مقابلے میں اللہ سے حیا کرنے میں زیادہ حساس ہیں۔ اور یہ خوف اور کپکپی ان کے اس شعور کو بھی ظاہر کرتی ہے کہ اللہ کے مقابلے میں کوئی کسی کی مدد نہیں کر سکتا، اس لئے کسی ظالم کا کوئی ناصر اور مددگار نہ ہو گا۔

اب یہ پر خشوع دعا ذرا آگے بڑھتی ہے:

رَبَّنَا إِنَّا أَسْمَعُكَ مُنَادِيًا يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ آمِنُوا بِرَبِّكُمْ فَآمَنَّا رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا
وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّئَاتِنَا وَتَوَقَّنا مَعَ الْأَبْرَارِ

”مالک! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کی
مانو، ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی، پس اے ہمارے آقا جو قصور ہم سے ہوئے ہیں ان سے
درگزر فرما جو برائیاں ہم میں ہیں انہیں دور کر دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ کر۔“

اہل دانش کھلے دل لئے ہوئے ہیں، ان پر جو القاء ہوتا ہے وہ لبیک کہتے ہیں۔ ان کا احساس مزید تیز
ہو جاتا ہے، اب ان کی نظریں اپنی تقصیروں، کوتاہیوں، گناہوں اور نافرمانیوں پر لگ جاتی ہیں۔ وہ فوراً
اپنے رب سے اپنے گناہوں کی مغفرت کے طلبگار ہوتے ہیں، وہ اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے کے لئے
تیار ہو جاتے اور اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ان کی موت نیک لوگوں کے زمرے میں ہو۔

اس فقرے میں اس دعا کا جو پر تو ہے وہ اس پوری سورت کے مضامین کے شیڈ کے ساتھ ہم آہنگ
ہے۔ تمام سورت مضامین تطہیر اخلاق، اللہ اور رسول ﷺ کی معصیت اور نافرمانی سے استغفار کا رنگ
لئے ہوئے ہیں۔ اس پوری سورت میں شہوات نفسانیہ اور ذنوب و خطیئات کے خلاف ایک بھرپور
جنگ کا سماں ہے۔ اور یہ وہ جنگ ہے کہ ہر میدانی معرکہ میں کس بھی فتح مندی کا دار و مدار اس جنگ
میں کامرانی اور فتح مندی پر ہے۔ جب تک اس اخلاقی تطہیر کی جنگ میں فتح نصیب نہ ہو۔ اس وقت تک
اللہ کے دشمنوں اور ایمان کے دشمنوں کے خلاف کوئی میدانی جنگ نہیں جیتی جاسکتی۔ اور اس پوری
سورت میں یہی مضامین دیئے گئے ہیں جو باہم وابستہ، ہم آہنگ، متکامل، ہمسایہ اور ایک جیسے اثرات کے
حامل ہیں۔

اس دعا کا خاتمہ توجہ الی اللہ اور فضل خداوندی کی امید واری سے ہوتا ہے۔ اس بات پر اعتماد اور
یقین کا اظہار کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر وعدے کی وفا ہوتی ہے۔ رَبَّنَا وَآتِنَا مَا وَعَدْتَنَا عَلَى
رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيعَادَ ”خداوند! جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کے

ذریعے سے کہتے ہیں ان کو ہمارے ساتھ پورا کر اور قیامت کے دن ہمیں رسوائی میں نہ ڈال، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف کرنے والا نہیں ہے۔“

یہاں اب دعائیہ انداز میں یہ مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ رسولوں نے آپ کے جو وعدے ہم پہنچائے ہیں، اور ہمیں تو یقین ہے کہ آپ کے ہاں وعدہ خلافی نہیں ہوتی، وہ وعدے پورے کر دے۔ یہ لوگ امید کرتے ہیں کہ قیامت کے دن وہ شرمندہ نہ ہوں گے۔ یہ ان کے افکار کی دنیا میں پہلے جھٹکے کے نتیجے میں ان کے دین کی حالت ہے کہ وہ امید سے دامن بھرے ہوئے ہیں کہ وہ رسوا نہ ہوں گے۔ اور اسے وہ دعا کی ابتدا میں بھی لاتے ہیں اور آخر میں بھی لاتے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اصحاب دانش کس قدر حساس ہو گئے ہیں۔ ان کے دل کس قدر نرم ہو گئے ہیں۔ وہ کس قدر صاف ہو گئے ہیں۔ اللہ کا ڈر اور معصیت کے شرم سے ان کے دل بھرے ہیں۔

اپنے مجموعی مضمون کے اعتبار سے، یہ دعا، ان اہل دانش کی جانب سے مطالعہ فطرت کے نتیجے میں مکمل قبولیت مکمل آمادگی کا اظہار ہے جو ان کے دل پر نظام کائنات کے مطالعہ سے القاء ہوئی۔

مناسب ہے کہ ہم اس دعا پر ایک بار پھر غور کریں، اس کی فنی خوبصورتی اور اس کی مناسب طرزِ ادا پر نگاہ ڈالنا بھی ضروری ہے۔

قرآن کریم کی ہر سورت میں، اس کی آیات کے لئے ایک متعین قافیہ اپنایا گیا ہے۔ اور قرآن مجید کے اندر قافیہ اور فواصل کا وہ طریقہ نہیں اپنایا گیا جو اشعار میں ہوتا ہے۔ کہ حرف سے حرف ملے۔ لیکن ان کا نغمہ اور زیر و بم باہم متشابہ ہوتے ہیں۔ مثلاً الفاظ بصیر، حکیم، مبین اور مریب ایک جیسے صوتی اثرات رکھتے ہیں۔ یا مثلاً الباب، ابصار، النار اور قرار جیسے الفاظ کے صوتی اثرات یکساں ہیں یا مثلاً خفیا، شقیا، شر قیا جیسے الفاظ اگرچہ شعری قافیہ نہیں لیکن ان کا صوتی ایقاع ایک جیسا ہے۔ ان میں سے پہلا قافیہ اکثر پر زور تقریر جیسے مواقع پر ہوتا ہے۔ جہاں اندازِ بیانیہ ہوتا ہے..... دوسرا قسم کا قافیہ دعاؤں کے مواقع پر ہوتا ہے اور تیسری قسم کو حکایات اور بیانِ واقعات کے لئے لایا جاتا ہے۔

سورہ آل عمران میں پہلی قسم کا قافیہ ہے، صرف دو جگہ اس سے انحراف ہوا ہے۔ ابتداء میں جہاں دعا تھی، پھر ان آخری آیات میں جہاں پھر دعا ہے۔

یہ انداز بالکل ایک نیا اور انوکھا انداز ہے جو قرآن نے مخصوص تعبیرات کے لئے اختیار کیا ہے۔ دعا کے لئے جو انداز اختیار کیا گیا وہ دعا کو نرم آواز اور پر سوز لہجہ دیتا ہے۔ الفاظ کے اندر مٹھاس پایا جاتا ہے۔ جو عاجزی کے ساتھ عرض مدعا کے لئے نہایت ہی موزوں ہے۔

ایک دوسری فنی خصوصیت بھی ان آیات میں پائی جاتی ہے۔ کائنات میں تخلیق ارض و سما کا منظر اور گردش لیل و نہار کے جو مناظر انسان کے غور و فکر کے لئے پیش کئے گئے تھے، ان کے ساتھ مناسب یہ تھا کہ دعا ایسی ہو جس میں خشوع و خضوع خوش آوازی کے ساتھ ہو۔ اس کے نعمات طویل ہوں، اس کے آواز کے زیر و بم نہایت ہی گہرے ہوں۔ اس طرح اس منظر کے الہامات، اثرات طویل ہوں اور اعصاب سماعت اور خیال پر اس کے گہرے اثرات ہوں اور پھر یہ تاثر وجدان پر منتقل ہو جائے۔ کیونکہ ان کلمات کے صوتی حرکات کے اندر بھی نہایت خشوع، خوش گواری، توجہ اور اللہ ترسی ہے۔ اس منظر کی جس طرح عبارت طویل ہے اس طرح نعمات بھی طویل ہیں۔ جس سے قرآن کریم کی تعبیرات کی اصل غرض و غایت پوری ہوتی ہے اور اس کے ساتھ قرآن کریم کی اصل نئی خوبیاں بھی سامنے آتی ہیں۔

جس طرح یہ دعا طویل ہے۔ اسی جواب دعا بھی طویل ہے:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّمَّنْ دُكِّرَ أَوْ أُنْشِيَ
بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ فَأَلْزَمَ الْهَاجِرُونَ وَأُخْرِجُوا مِّنْ دِيَارِهِمْ وَأُودُوا فِي
سَبِيلِي وَقَاتِلُوا وَقَاتِلُوا لَا كُفْرَ بِّ عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَلَا دُخْلَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي
مِّنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ (۱۹۵) لَا

يُخَذِّلُكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ (۱۹۶) مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَا لَهُمْ جَهَنَّمَ
وَبُسِّ الْمِهَادِ (۱۹۷) لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ
لِلْأَبْرَارِ (۱۹۸) وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ
وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خَاشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَئِكَ لَهُمْ
أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ (۱۹۹) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا
اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۲۰۰)

جواب میں ان کے رب نے فرمایا ”میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کر نیوالا نہیں ہوں۔ خواہ مرد
ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ لہذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے
اور جو میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے ان
کے سب قصور معاف کر دوں گا اور انہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں
گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ ہی کے پاس ہے۔“

اے نبی ﷺ! دنیا کے ملکوں میں اللہ کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں کسی دھوکے میں
نہ ڈالے۔ یہ محض چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے، پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے
قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لئے ایسے
باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ کی طرف سے یہ سامان
ضیافت ہے ان کے لئے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لئے وہی سب سے بہتر ہے۔

یہ ایک مفصل جواب دعا ہے۔ طرز ادا بھی طویل ہے۔ اور یہ قرآن کریم کے طرز ادا کے عین مطابق ہے۔ تقاضائے حال اور فریقین کے موقف کے عین مطابق نفسیاتی اور شعوری دونوں زاویوں سے۔

اب ہم اللہ کی جانب سے آنیوالے جواب دعا اور قبولیت دعا کے مضامین کی طرف آتے ہیں۔ یہ جواب اسلامی نظام زندگی کے کن امور کو ظاہر کرتا ہے اور یہ کہ اس نظام کا مزاج کیا ہے، اس کے اجزائے ترکیبی کیا ہیں اور یہ نظام انسان کی تربیت کے لئے کیا منہاج اختیار کرتا اور اس کی خصوصیات کیا ہیں؟

یہ اصحاب دانش جنہوں نے تخلیق ارض و سما میں غور کیا، جنہوں نے گردش لیل و نہار میں تدبیر کیا اور جنہوں نے اس کائنات کی کتاب مفتوح سے دلائل و آیات اخذ کئے اور ان کی فطرت نے ان دلائل و آیات حق کو قبول کیا اور اس کے بعد وہ اپنے رب کی طرف متوجہ ہوئے۔ انہوں نے خشوع و خضوع سے بھرپور، سوز و ساز میں ڈوبی ہوئی طویل دعا کی۔ اور اس کے بعد ان کے رب رحیم و کریم کی طرف سے فوراً جواب دعا آیا کیونکہ ان کی دعا نہایت ہی پر خلوص تھی وہ محبت سے بھری تھی..... اب دیکھئے جواب دعا کیا ہے؟

یہ جواب دعا قبولیت دعا پر مشتمل ہے، اور اس میں اسلامی منہاج حیات کے اصل عناصر ترکیبی کی طرف ہدایت کی گئی ہے۔ اور اس کے فرائض بتائے گئے ہیں فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اِنِّي لَا اُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِنْكُمْ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى بَعْضُكُمْ مِنْ بَعْضٍ..... جواب میں ان کے رب نے فرمایا۔ ”میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں، خواہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔“

تم لوگوں کی جانب سے صرف تدبر اور تفکر ہی کافی نہیں ہے۔ خشوع اور خضوع اور سوز دعا ہی کافی نہیں ہے۔ صرف اللہ کی طرف متوجہ ہو کر گناہوں کی معافی مانگنا ہی کافی نہیں ہے اور صرف نجات

اخروی کی طلب ہی کافی نہیں ہے۔ بلکہ عمل ضروری ہے۔ مثبت عمل کی ضرورت ہے۔ اور یہ مثبت عمل نتیجہ ہے۔ اس غور و فکر اور توجہ الی اللہ کا، اس آمادگی اور اس احساس جس کا اظہار اس پر سوز دعا میں ہوگا۔ اس کا تقاضا ہے کہ انسان مثبت عمل پر آمادہ ہو، وہ عمل جسے اسلام اسی طرح عبادت تصور کرتا ہے جس طرح اسلام تفکر اور تدبر کو عبادت سمجھتا ہے۔ جس طرح اسلام ذکر و فکر، خوف و استغفار اور پر امید توجہ الی اللہ کو عبادت سمجھتا ہے۔ وہ عمل جسے اسلام تمام عبادات کا ثمرہ قرار دیتا ہے۔ اور یہ ثمرہ سب کی جانب سے قبول ہوگا۔ مرد یہ عمل کریں یا عورتیں یہ عمل کریں۔ اس عمل کے مقابلے میں جنس و صنف کی کوئی شرط نہیں ہے۔ اس لئے کہ مرد اور عورت انسانیت میں بالکل مساوی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے اجزاء اور آباء و اجداد ہیں اور قیامت کے ترازو میں برابر ہیں۔

اس کے بعد ان اعمال کی تفصیل دی جاتی ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ اسلام کے نظریہ حیات جان و مال کے ساتھ تعلق رکھنے والی کیا ڈیوٹیاں ہیں۔ نیز ان اعمال کے ذکر سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس نظام زندگی کا مزاج کیا ہے؟ اور وہ کیا گراؤنڈ ہے جس کے اوپر یہ نظام تعمیر ہوتا ہے۔ اور اس کے طریق کار کا مزاج کیا ہے اور اس میں کیا کیا رکاوٹیں اور کیا کیا کانٹے ہیں۔ اور یہ کہ ان مشکلات پر قابو پانے کی اشد ضرورت ہے۔ ان کانٹوں کو ایک ایک کر کے چننے کی ضرورت ہے اور اس زمین میں پاک درخت لگانے کے لئے کس کس تیاری کی ضرورت ہے۔ پھر اسے اس زمین پر تمکنت دینے کے لئے کن کن اقدامات کی ضرورت ہے، چاہے جس قدر قربانیاں دینی پڑیں۔ چاہے جس قدر مشکلات کو انگیز کرنا پڑے۔

فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَآخَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَوَدُّوا فِي سَبِيلِي وَقَاتِلُوا وَقُتِلُوا لَا يَكْفُرُونَ
عَنْهُمْ سِبَائِهِمْ وَلَا دُخْلُكُمُ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ثَوَابًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ
الثَّوَابِ

”لہذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے، اور میری راہ میں اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ستائے گئے، اور میرے لئے لڑے اور مارے گئے ان سب کے قصور معاف کر دوں گا اور انہیں

باغوں میں داخل کر دوں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ ان کی جزا ہے اللہ کے ہاں اور بہترین جزا اللہ کے پاس ہے۔“

اس قرآن نے سب سے پہلے جن لوگوں کو خطاب کیا اور دعوت فکر دی، ان کے یہی خدوخال تھے۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے مکہ سے ہجرت کی، یہی لوگ تھے جن کو محض اپنے نظریہ حیات کی وجہ سے اپنے گھروں سے نکالا گیا۔ اس کے سوا ان کا اور کوئی قصور نہ تھا۔ یہی لوگ تھے جنہوں نے اس نظریہ کی خاطر قتال کیا اور مارے گئے۔ لیکن یہ خدوخال ان تمام لوگوں کے ہونے چاہئیں جو دعوت اسلامی کو لے کر اٹھتے ہیں۔ جب بھی کوئی اٹھے اور جہاں بھی کوئی اٹھے۔ یہی خدوخال ہوں گے ان لوگوں کے جو جاہلیت کے اندر پل رہے ہوں، جو جاہلیت بھی ہو وہ..... جو دشمن کی سرزمین پر پل رہے ہوں جو دشمن بھی ہو وہ اور جو سرزمین بھی ہو وہ..... جو دشمن اقوام کے اندر ہوں۔ جو قوم بھی ہو وہ اور ان لوگوں کا پیاناہ صبر لبریز ہو جائے۔ دشمنوں کی نیش رینوی اور ان کی لالچ اور ان کی خواہشات نفسانیہ ان کے آڑے آرہی ہوں۔ اور جب وہ قلیل تعداد میں ہوں تو انہیں اذیت کا نشانہ بنایا جا رہا ہو اور یہ حالات نہایت ہی ابتدائی دور میں تھے جبکہ وہ مستضعفین تھے۔ اس کے بعد اس پاک پودے نے ذرا قوت پکڑی اور ہر جگہ پر یوں ی قوت پکڑتا ہے اور باوجود ان اذیتوں کے پکڑتا ہے۔ باوجود ہجرت اور جلا وطنی کے پکڑتا ہے۔ اس کے بعد یہ قوت اپنے پاؤں پر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس کے اندر مقابلے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنا دفاع کر سکتی ہے۔ اس مرحلے پر پھر قتال و مقاتلہ شروع ہو جاتا ہے۔ یہ دشوار، تلخ اور مشکل جدوجہد ہی دراصل گناہوں کا کفارہ بنتی ہے اور یہ اجزاء اور ثواب دنیا و آخرت کا سبب بھی بنتی ہے۔

یہ ہے طریق کار، یہ ربانی منہاج کار ہے۔ جس منہاج زندگی کے لئے اللہ نے یہ طریق کار وضع کیا ہے کہ اسے انسانوں کی زندگی میں عملاً نافذ کرنے کے لئے انسانی جدوجہد کے ذرائع کو استعمال کیا جائے گا۔ اسی طریق کے مطابق اور اسی مقدار جہاد کے مطابق جو مومنین اور مجاہدین فی سبیل اللہ کی راہ میں خالص اس کی رضا جوئی کے لئے کرتے ہیں۔

یہ ہے مزاج اس نظام حیات کا، یہ ہیں اس کے عناصر ترکیبی اور یہ ہیں اس کے فرائض، یہ ہے اس منہاج کا طریق تربیت، یہ ہے اس کا طریقہ ہدایت و ارشاد کہ وہ اس کائنات میں غور و فکر کے وجدانی مرحلے سے گزر کر انسان کو مثبت عمل کی طرف منتقل کرتا ہے۔ اور یہ عمل اس نظریاتی تاثرات کے مطابق ہوتا ہے اور اسی طرح یہ نظام زندگی قائم ہوتا ہے۔

اس کے بعد یہ جواب دعا میں ارض کفار کے اندر ساز و سامان کے بھرے ہوئے بازاروں کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے جو اسلامی نظام زندگی کے دشمن اور نافرمان ہیں۔ متوجہ کیا جاتا ہے کہ ایک مسلمان اس ساز و سامان کو وہی وزن دیتا ہے جو فی الحقیقت اس کا اس دنیا کیلئے ہے۔ اور اسے اپنے لئے فتنہ نہیں بناتا ہے۔ اور نہ اسے اہل ایمان کے لئے فتنہ بننے کا موقعہ دیتا ہے۔ کیونکہ، اس لئے کہ اہل ایمان بہت بڑی قربانیاں دے رہے ہیں۔ انہیں ہدایت دی جا رہی ہے۔ انہیں اپنے گھروں سے نکالا جا رہا ہے اور انہیں قتل کیا جا رہا ہے اس لئے دنیا کا ساز و سامان ان کے لئے فتنہ نہ ہو جائے۔

لَا يَعْزُبُ عَنْكَ الْقُلُوبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْأَلْدَادِ (۱۹۶) مَتَاعٌ قَلِيلٌ ثُمَّ مَا لَهُمْ جَهَنَّمَ وَبُئْسَ الْمِهَادُ (۱۹۷) لَكِنَّ الَّذِينَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا نُزُلًا مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا عِنْدَ اللَّهِ خَيْرٌ لِلْآخِرِينَ

”اے نبی! دنیا کے ملکوں کی اللہ کے نافرمانوں کی چلت پھرتی کسی دھوکے میں نہ ڈالے، یہ صرف چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے، پھر یہ سب جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔ برعکس اس کے جو لوگ اپنے رب سے ڈرتے ہوئے زندگی بسر کرتے ہیں ان کے لئے ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان باغوں میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ کے پاس سے یہ سامان ضیافت ہے ان کے لئے، اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے نیک لوگوں کے لئے وہی سب سے بہتر ہے۔“

لوگوں کا ممالک میں چلنا پھرنا، سیاستیں کرنا یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ دو لٹمند ہیں اور ان کے پاس کچھ ہے۔ نیز یہ ان کے مرتبے اور سیاسی قوت کی بھی علامت ہے۔ یہ ایسے مظاہر ہیں جو اہل ایمان

کو کھٹک سکتے ہیں۔ وہ دل میں کسک محسوس کر سکتے ہیں۔ عام لوگ ایسا احساس بہر حال رکھتے ہیں جیسا کہ وہ مشکل معاشی حالات اور محرومیت کا شکار ہوں۔ انہیں اذیت دی جا رہی ہو اور وہ جہد مسلسل کر رہے ہوں انہیں جلاوطن کیا گیا ہو اور وہ بہتری کے لئے جہاد کر رہے ہوں۔ ان پر ہر قسم کی تکالیف اور خوفناک حالات آرہے ہوں اور دشمنان اسلام اور باطل پرست ناز و نعم میں پل رہے ہوں۔ یہ صورت حال ایک طرف تو غفلت کا شکار جمہور عوام کو قلبی اذیت میں مبتلا کرتی ہے کہ جب وہ دیکھتے ہیں کہ سچائی اور اہل حق مشکلات میں ہیں اور باطل اور اہل باطل کامیاب ہیں بلکہ عیش میں ہیں۔ اور خود ان گمراہوں اور اہل باطل کے دلوں میں بھی یہ صورتحال غرور اور خود اعتمادی پیدا کرتی ہے اور وہ مزید گمراہ ہوتے ہیں۔ اور شر و فساد میں اور سرکش اور گمراہی میں مزید آگے بڑھتے ہیں۔ اس لئے یہاں یہ آیت آئی کہ ”اے نبی! دنیا کے ملکوں میں اللہ کے نافرمان لوگوں کی چلت پھرت تمہیں دھوکے میں نہ ڈالے۔ یہ چند روزہ زندگی کا تھوڑا سا لطف ہے، اور پھر یہ جہنم میں جائیں گے جو بدترین جائے قرار ہے۔“..... متاع قلیل ہے۔ ختم ہونے والا اور جانے والا ہے۔ اور دائمی ٹھکانہ ان کا جہنم ہے۔ جو بہت بری جگہ ہے۔ اور اس تھوڑے سے جانیوالے اور ختم ہونے والے متاع قلیل کے مقابلے میں کیا ہے؟ باغات ہیں، ان میں دائمی زندگی ہے اور اللہ کی طرف سے عزت افزائی ہے۔ ”ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔“..... ”ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔“..... یہ سامان ضیافت ہے ان کے لئے۔“..... جو اللہ کے ہاں مزید ہے وہ نیکو کاروں کے لئے بہت بہتر ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ اگر اس حصے کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں اور دوسرے حصے کو دوسرے میں تو جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ نیک لوگوں کے لئے بہت ہی بہتر ہے۔ اور یہ شک کسی دل میں نہ ہوگا کہ جو لوگ اپنی زندگی میں تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کا پلڑا ان لوگوں سے بھاری ہوگا جنہوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا۔ اور اسی طرح کوئی ذی عقل انسان اس معاملے میں تردد نہ کرے گا کہ اسے وہی حصہ اختیار کرنا چاہئے جو دانشور اپنے لئے اختیار کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ یہاں تعلیم و تربیت کے میدان میں اور اسلامی تصور حیات کی اساسی قدروں کے قیام میں مسلمانوں کے ساتھ کوئی وعدہ نہیں فرماتے کہ وہ ان کی نصرت فرمائیں گے۔ یہ وعدہ بھی نہیں فرماتے کہ تمہارے دشمنوں کو میں مقہور و مغلوب کر کے تمہیں دوں گا اور یہ وعدہ بھی نہیں فرماتے کہ تمہیں زمین کے اند تمکین اور استقرار نصیب کیا جائے گا اور نہ وہ اس دنیا کی زندگی کی چیزوں میں سے کسی دوسری چیز کا وعدہ فرماتے ہیں۔ جیسا کہ بعض دوسرے مقامات پر اللہ نے وعدہ فرمایا ہے وہ جو اللہ تعالیٰ اپنے اوپر یہ فرض کرتا ہے کہ وہ اپنے دوستوں کی مدد کرے گا بمقابلہ دشمنان اسلام۔

یہاں اللہ تعالیٰ صرف ایک چیز کا وعدہ فرماتے ہیں، وہ جو اللہ کے ہاں ہے۔ دعوت اسلامی میں اصل اجر یہی ہے۔ اور یہی ہے اس دعوت کا نقطہ امتیاز۔ ہر ہدف اور ہر مقصد سے بے نیازی، ہر مصلح نظر سے استغناء۔ یہاں تک کہ وہ اس خواہش سے بھی بے نیاز ہو جائے کہ اس کا نظریہ حیات غالب ہو۔ اللہ کا حکم بلند ہو اور اللہ کے دشمن مقہور اور مغلوب ہوں۔ غرض اللہ کی مرضی یہ ہے کہ اہل ایمان اس غرض سے بھی بے نیاز ہو جائیں اور اپنے امور اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیں۔ اور ان کے دل اس سے بھی پاک ہو جائیں کہ یہ مقاصد ان کے لئے پسندیدہ ہوں، اگرچہ یہ صرف ان کی ہی خواہش نہیں ہوتی۔

یہ عقیدہ کہ جان دینی ہے، وفاداری کرنی ہے اور ادائیگی فرض بجالانا ہے اور بس بغیر کسی دنیاوی غرض اور لالچ کے۔ بغیر اس طلب کے کہ دنیا میں نصرت، غلبہ، تمکین فی الارض اور سر بلندی حاصل ہو۔ اور ہر چیز کا انتظار دار آخرت میں ہو۔

اور اس کے بعد نصرت بھی آتی ہے۔ تمکین فی الارض بھی نصیب ہوتا ہے اور دنیا میں اسلام کو سر بلندی بھی نصیب ہوتی ہے۔ لیکن یہ تمام امور بیعت میں داخل نہیں ہیں۔ یہ امور سودے میں شامل نہیں۔ اس سودے میں مومنین نے قیمت کا کوئی حصہ اس دنیا میں وصول نہیں کرنا۔ یہاں تو صرف ادائیگی فرض، وفائے عہد اور جان دینا ہے اور مشکلات کو برداشت کرنا ہے۔

مکہ مکرمہ میں دعوت اور دعوت کے لئے بیعت اسی اصول پر جاری تھی۔ یہی سوداواں ہورہا تھا۔ لیکن اللہ نے مسلمانوں کو نصرت، غلبہ اور سر بلندی نصیب نہ کی تھی۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے انہیں زمین کے اندر اقتدار کی چابیاں سپرد نہ کی تھیں۔ نہ انسانیت کی قیادت کا منصب ان کے حوالے کر دیا تھا۔ ہاں جب وہ اس معیار کے مطابق مخلص ہو گئے اور اس معیار کے مطابق وفائے عہد کرنے لگے تو انہیں سب کچھ ملا۔

محمد ابن کعب القرظی فرماتے ہیں عبد اللہ ابن رواحہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے عقبہ کی رات کے موقع پر (اوس اور خزرج کے نمائندوں کے اسی رات بیعت کی اور فیصلہ ہوا کہ آپ ﷺ مدینہ کو ہجرت فرمائیں گے۔) عرض کیا اللہ کے رسول ﷺ آپ اپنے رب کے لئے اور اپنے لئے جو شرائط چاہیں عائد کر دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: میں رب کے لئے تو یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم اس کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو گے۔ اور اپنے لئے میں یہ شرط لگاتا ہوں کہ تم لوگ میری حفاظت اسی طرح کرو گے جس طرح تم اپنی جان و مال کی حفاظت کرتے ہو۔“ اس پر انہوں نے کہا تو پھر ہمیں کیا ملے گا؟ تو آپ ﷺ نے وسلم نے جواب دیا صرف ”الجنة“۔ اس پر انہوں نے سب کہا اس سودے میں ہم بہت ہی نفع میں رہے۔ نہ ہم خود اس سودے کو واپس کرتے ہیں اور نہ فریق دوئم سے اس کی منسوخی کا مطالبہ کرتے ہیں۔“

یہ تھی بات الجنة فقط جنت اس میں ان سے یہ وعدہ نہ تھا کہ انہیں نصرت، عزت، اتحاد، قوت، تمکن فی الارض، قیادت، مال اور دولت یا کوئی اور چیز ملے گی۔ اگرچہ یہ تمام چیزیں انہیں دی گئیں۔ لیکن یہ چیزیں سودے سے خارج تھیں..... اس کے باوجود ان کا خیال یہ تھا کہ وہ اس سودے میں کامیاب رہے۔ اور یہ کہ نہ افاقہ کرتے ہیں اور نہ دوسرے فریق سے اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں۔ انہوں واضح سودا کیا۔ دو بیعت کرنیوالوں کے درمیان یہ سودا ہوا۔ معاملہ ختم ہوا۔ معاہدہ ہو گیا اور اس کے بعد اس میں کوئی سودا بازی نہیں ہوئی۔

یوں اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کی تربیت کی جس کے بارے میں اللہ کا فیصلہ یہ تھا کہ اس کرہ ارض پر اقتدار کی چابیاں اس کے سپرد ہونی ہیں۔ زمام اقتدار اس کے ہاتھ میں ہوگی اور اسے یہ قیادت اس وقت سپرد ہوئی جب وہ ہر قسم کے لالچ سے پاک ہو گئے، ہر قسم کی خواہشات کو انہوں نے لات ماردی، ہر قسم کی خواہشات نفس پر انہوں نے ضبط کیا۔ یہاں تک کہ انہوں نے اسلامی انقلاب کے حوالے سے بھی اپنی فطری خواہشات کو ترک کر دیا۔ اسلامی نظام کے قیام کی خواہش کو بھی انہوں نے دبا دیا۔ اور انہوں نے نظریہ حیات کی کامیابی کے لئے سوچنا بند کر دیا۔ جس کے لئے وہ جانیں دے رہے تھے۔ اس لئے کہ اس عظیم قیادت کی ذمہ داریاں اٹھانے کا اہل کوئی ایسا شخص یا جماعت نہیں ہو سکتی جس کے نفس کے اندر کوئی خواہش ہو یا اس کے نفس کے اندر کوئی نفسانیت ہو اور وہ پورا پورا اسلام میں داخل نہ ہو گیا ہو۔



سورت کے مضامین ختم ہونے سے قبل روئے سخن پھر اہل کتاب کی طرف مڑ جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اہل کتاب میں بعض لوگ ایسے ہیں جو مومنین کی طرح صحیح العقیدہ ہیں۔ اور یہ لوگ قافلہ ایمان میں شامل ہو گئے ہیں۔ وہ اسی کے ساتھ جارہے ہیں۔ اس لئے ان کی جزا بھی وہی ہوگی جو اہل ایمان کی ہوگی۔

وَإِنَّ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَمَنْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خَاشِعِينَ لِلَّهِ لَا يَشْتَرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ

”اہل کتاب میں سے کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کو مانتے ہیں، اس کتاب پر ایمان لاتے ہیں جو تمہاری طرف بھیجی گئی ہے اور اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو اس سے پہلے خود ان کی طرف بھیجی گئی تھی، اللہ کے آگے جھکے ہوئے ہیں، اور اللہ کی آیات کو تھوڑی سی قیمت پر بیچ نہیں دیتے۔ ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا۔“

یہ اہل کتاب کے ساتھ اختتامی خطاب ہے۔ اس سے قبل اہل کتاب کے فرقوں اور ان کے مختلف مواقف کے بارے میں اس سورت کے ایک بڑے حصے میں بات ہوئی تھی۔ یہاں بتایا جاتا ہے کہ ایمان کے اعلیٰ نمونوں کی اس نمائش گاہ اور دعا اور قبولیت دعا کے اس منظر میں اہل کتاب میں سے بعض لوگ ایسے بھی ہیں جن کے نمونے اس نمائش میں رکھنے کے قابل ہیں۔ اس لئے کہ اہل کتاب میں سے بعض لوگ صحیح راستے پر گامزن ہو گئے ہیں۔ وہ صحیح انجام تک آپہنچے ہیں۔ وہ تمام کتب پر ایمان لے آئے ہیں۔ (موجودہ اور سابق) وہ اللہ اور اس کے درمیان بلحاظ اطاعت فرق بھی نہیں کرتے۔ وہ اللہ کے رسولوں میں سے بھی کسی میں فرق نہیں کرتے۔ وہ اس کتاب پر بھی ایمان لائے جو ان کی طرف نازل ہوئی اور اس کتاب پر بھی ایمان لائے ہیں جو مسلمانوں پر نازل ہوئی ہے۔ اور یہی اسلامی نظریہ حیات کی خصوصیت ہے کہ وہ قافلہ ایمانی کی طرف قرب و محبت کی نظروں کے ساتھ دیکھتا ہے۔ اس کا نقطہ نظر یہ ہے کہ وہ نظریہ کی ایک ہی لائن ہے جو ذات باری کے ساتھ موصول ہے۔ وہ اسلامی نظریہ حیات کو ایک وحدت سمجھتا ہے۔ اسے کلی نقطہ نظر سے دیکھتا ہے۔ یہاں اہل کتاب مومنین کی خصوصیات میں سے جس اہم خصوصیت کو ظاہر کیا جا رہا ہے وہ ان کی صفت خشوع و خضوع ہے اور ان کی یہ صفت کہ وہ اللہ کی آیات کے بدلے اس دنیا کے ثمن قلیل کو قبول نہیں کرتے۔ یہ صفات اس لئے ذکر کی گئیں کہ انہیں دوسرے اہل کتاب کی صفوں سے چھانٹ کر الگ کر دیا جائے جن میں یہ دونوں کمزوریاں موجود تھیں۔ یعنی متکبر بھی تھے اور بے حیا بھی تھے۔ آیات کو چھپاتے بھی تھے اور ان میں تحریف بھی کرتے تھے۔ اور یہ کام وہ نہایت ہی گھٹیا مقصد کے لئے کرتے تھے۔ اور ان کے ساتھ وہی وعدہ اجر کیا جاتا ہے جو اہل ایمان کے ساتھ ہے اور یہ اجر دستی طور پر ادا ہو گا کوئی ٹال مٹول نہ ہوگی۔ اِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ..... (اللہ تعالیٰ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا۔)

اب آخری ضرب ہے۔ اللہ کی جانب سے ان لوگوں کو پکار دی جاتی ہے جو ایمان لائے ہیں۔ اس میں اس راہ کی مشکلات کا مختصر ترین نچوڑ اور خلاصہ پیش کیا جاتا ہے اور راستے کی ذمہ داریوں اور شرائط کا ذکر کیا جاتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ

”اے لوگو جو ایمان لائے ہو، صبر سے کام لو، باطل پرستوں کے مقابلہ میں پامردی دکھاؤ، حق کی خدمت کے لئے کمر بستہ رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو، امید ہے فلاح پاؤ گے۔“

عالم بالا سے یہ پکار، اہل ایمان کے لئے ہے۔ اور اس صفتی نام سے یہ پکار ہے جس صفت نے انہیں ذات باری سے مربوط کیا ہے۔ وہ ذات جو ان مومنین پر یہ ذمہ داریاں ڈال رہی ہے۔ جو انہیں اس پکار کے اہل بناتی اور جو انہیں ذمہ داریاں اٹھانے کی تربیت دیتی ہے۔ اور انہیں اس زمین پر بھی اسی طرح مکرم بناتی ہے جس طرح انہیں آسمان پر مکرم بنایا گیا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا..... (اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔)

اور پکار کس لئے ہے۔ صبر سے کام لو، جرات دکھاؤ، ہر وقت دشمن کے مقابلے کے لئے تیار رہو، اور ہر وقت خوف اللہ کو پیش نظر رکھو..... اس پوری سورت میں صبر اور تقویٰ کی بار بار تلقین کی گئی ہے۔ ان کا تذکرہ الگ الگ بھی ہوا ہے اور یکجا بھی ہوا ہے۔ نیز اس پوری سورت میں یہ دعوت دی گئی ہے کہ راہ حق میں مشکلات برداشت کرو، مجاہدہ کرو، سازشوں کا مقابلہ کرو اور جو لوگ شکست کی طرف بلاتے ہیں اور ہمت شکنی کی باتیں کرتے ہیں ان کی طرف توجہ نہ کرو اور یہاں اس سورت کے آخر میں اس مضمون کو دہرا کر صبر اور مصابرت کی دعوت دی جاتی ہے۔ اللہ کی راہ میں ہر وقت تیار رہنے اور اللہ خونی کو اختیار کرنے کی تلقین یہاں بہترین خاتمہ ہے۔

صبر اس راہ کا بہترین سامان ہے، راہ دعوت اسلامی کا، اس لئے کہ یہ طویل اور پر مشقت راستہ ہے۔ یہ مشکلات سے پر اور کانٹوں سے اٹا پڑا ہے۔ جگہ جگہ ابتلا و آزمائش ہے۔ ہر وقت چوٹ لگنے اور جان کی قربانی کے مواقع ہیں۔ اور ہر موقع ایسا ہے جس میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ انسانی خواہشات پر صبر، نفس کے مرغوبات پر صبر، ہر قسم کے لالچوں اور آرزوؤں پر صبر، اپنے ضعف اور نقص پر صبر، ان کے مزاج کے انحراف پر صبر، نفس کی جلد بازی اور افسردگی پر صبر، لوگوں کی خواہشات پر صبر، لوگوں

کے ضعف اور کمزوری پر صبر، لوگوں کے جہل اور بری سوچ پر صبر، ان کے مزاج کے انحراف پر صبر، ان کی نخوت اور غرور پر صبر، ان کی چالبازیوں پر صبر، باطل کے غرور پر صبر، کفر کی گندگی پر صبر، شر کے پھیلنے پھولنے پر صبر، شہوت کے غلبے پر صبر، غرور اور کبر کی آگ پر صبر، مددگاروں کی قلت پر صبر، اعانت کنندگان کی قلت پر صبر، راستے کی طوالت پر صبر، کرب اور بے چینی کے اوقات میں شیطانی وسوسوں پر صبر، اور جہاد کی تلخی پر صبر اور ان تمام نفسیاتی تاثرات اور متنوع انفعالات پر صبر..... مثلاً رنج، الم، غیض و غضب، دلی تنگی اور گھٹن، بعض اوقات بھلائی پر بے اعتمادی اور انسانی فطرت کی اصلاح کی ناامیدی وغیرہ..... بعض اوقات رنج و ملال اور تھکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے اور انسان پر مایوسی کا غبار چھا جاتا ہے۔ ایسے حالات میں صبر ہی کام دیتا ہے۔ پھر جب غلبہ نصیب ہوتا ہے تو انسان کو انتقام پر قدرت حاصل ہو جاتی ہے۔ اور اس وقت پھر صبر کی ضرورت پیش آتی ہے۔ پھر بعض اوقات مادی سہولیات ملتی ہیں تو ان پر تواضع اور سنجیدگی کرنا ہوتی ہے۔ بغیر تکبر اور بغیر میلان انتقام اور بغیر اس کے کہ قصاص میں حد سے گزر جائیں..... پھر خوشحالی اور بد حالی دونوں میں اللہ سے لو لگائے رکھنا، اس کے فیصلوں کے سامنے سر تسلیم خم کرنا، اور نہایت ہی اطمینان نہایت ہی اعتماد اور منکسر المزاجی کے ساتھ اپنے تمام امور اس کے حوالے کر دینا۔

ان سب امور میں صبر کرنا اور ان جیسے دوسرے امور میں صبر کرنا، ایسے امور ہیں جو مسالک راہ حق کو، اس کے اس طویل سفر میں پیش آتے رہتے ہیں۔ ایسی مشکلات اور ایسے حالات پیش آتے رہتے ہیں۔ جن کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ان مشکلات کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں۔ ان مشقتوں کا مفہوم کلمات کے جامہ میں نہیں سماتا۔ اس مفہوم کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے جس پر وہ معانی گزرے ہوں اور جس نے اس راہ کی مشقتوں کو انگیز کیا ہو۔ اس نے ان تاثرات کو چکھا ہو اور وہ ان تلخ تجربوں سے خود گزرا ہو۔

وہ لوگ جو ایمان لائے تھے، انہوں نے ان مذکورہ بالا مشکلات کے اکثر پہلوؤں کی تلخی کو خود چکھ لیا تھا۔ اس لئے انہوں نے اس پکار کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ وہ صبر کے مفہوم کو اچھی طرح سمجھتے تھے جس کے بارے میں انہیں تلقین کی جا رہی ہے کہ وہ اسی پر گامزن ہوں۔

اب صبر کے بعد مصابرہ کیا ہے؟ یہ صبر کا باب مفاعلہ ہے۔ یعنی صبر میں باہم مقابلہ کرو۔ ان تمام امور میں جن کا ذکر اوپر ہوا۔ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ مصابرت جو اہل ایمان کے صبر کو اپنی تلوار سے کاٹنا چاہتے ہیں۔ یعنی مذکورہ بالا جذبات کے ساتھ مصابرت یا دشمنوں کے ساتھ مصابرت، پس جہاد کے اس طویل سفر میں ان کا صبر ختم نہ ہونے پائے۔ بلکہ انہیں آخر دم تک اپنے اعداء سے زیادہ صبر کا مظاہرہ کرنا چاہئے۔ ان دشمنوں سے انہیں زیادہ صبر والا ہونا چاہئے جو دلوں کے اندر چھپے ہوئے ہیں۔ اسی طرح شریک دشمنوں کے مقابلے میں بھی۔ گویا اہل ایمان اور ان کے دشمنوں کے درمیان مصابرت کا مقابلہ ہے کہ اس میدان میں کون آگے نکلتا ہے۔ حکم دیا جاتا ہے کہ صبر کا مقابلہ صبر سے کرو، مدافعت کا مقابلہ مدافعت سے کرو، جدوجہد کا مقابلہ جدوجہد سے کرو، اصرار کا مقابلہ اصرار سے کرو، اور آخری مقابلہ یہ ہو گا کہ اہل ایمان مقابلے میں سب سے آگے ہوں گے۔ اگر باطل اپنے نظریے پر اصرار کرتا ہے صبر کرتا ہے، اور اپنی راہ پر گامزن ہے تو حق اس بات کا زیادہ مستحق ہے کہ زیادہ مصر ہو، زیادہ صبر ناک ہو اور اپنی راہ میں زیادہ جدوجہد کرنے والا ہو۔

اور رابطہ کیا ہے۔ جہاد کے مقامات پر مورچے لگانا۔ مورچہ زن ہونا۔ دشمنوں کے حملوں کے خطرناک مقامات پر چوکیاں قائم کرنا، اور اسلامی جماعت ہر وقت دشمن پر نظر رکھتی تھی۔ کبھی وہ سوتی نہ تھی، اس لئے کہ اس کے ساتھ اس کے دشمنوں نے کبھی مصالحت نہیں کی تھی۔ جب سے اس نے دعوت اسلامی کا بوجھ اٹھانے کا اعلان کیا۔ اور لوگوں پر اس دعوت کو پیش کیا، تو وہ میدان جنگ اور حالت جنگ میں رہی ہے۔ کسی جگہ بھی اور کسی دور میں بھی وہ رابطہ جہاد سے مستغنی نہیں رہی ہے، اور آخر الزمان اور قیامت تک یہ پوزیشن ایسی رہے گی۔

دعوت اسلامی لوگوں کے سامنے ایک حقیقت پسندانہ نظام زندگی پیش کرتی ہے۔ ایسا نظام جو ان کے ضمیر کے اندر بھی قائم ہوتا ہے، جو ان کے مال پر بھی حکمران ہوتا ہے، جو ان کی زندگی کے تمام امور پر حکمران ہوتا ہے، جو ان کی معیشت پر بھی حکمران ہوتا ہے اور جو ایک منصفانہ اور سیدھا نظام ہوتا ہے۔ لیکن دنیا کا قانون ہے کہ شر ایسے منصفانہ، عادلانہ اور خیر پر مشتمل سیدھے نظام کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرتا۔ کوئی باطل خیر، عدل اور استواری کو محبوب نہیں رکھتا، اور کوئی ظلم عدل، مساوات اور شرافت کو برداشت نہیں کرتا۔ اس لئے دعوت اسلامی کی مخالفت میں اصحاب شر، اصحاب باطل اور ظالم کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے خلاف تمام گندے اور مفاد پرست اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ لوگوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے رہیں۔ ظالم اور متکبر بھی اسلام کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ ظلم اور استکبار سے دست بردار ہونے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ اور اس کے مقابلے میں تمام بد اخلاق اور بے راہ روی اختیار کرنے والے لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اپنی اخلاقی بے راہ روی اور شہوت رانی کو ترک نہیں کر سکتے۔ اس لئے ان سب کے ساتھ مسلسل جہاد بہت ضروری ہے۔ اور ان کے مقابلے میں صبر اور مصابرت فرض عین ہے۔ اس لئے مسلسل چوکیداری اور اسلامی کوسٹ گارڈز کی ضرورت ہے تاکہ یہ نہ ہو کہ امت مسلمہ کے خلاف کوئی قوت اچانک حملہ آور ہو جائے، جبکہ ایسی قوتیں ہر سرزمین اور ہر نسل میں اس کے خلاف تاک لگائے ہوتی ہیں۔

یہ ہے اس دعوت کا مزاج، اس کا طریق کار اس کی پالیسی یہ نہیں ہوتی کہ وہ حد سے تجاوز کرے لیکن اس کی یہ پالیسی ضرور ہوتی ہے کہ وہ اس کرۂ ارض پر ایک مستحکم نظام زندگی اور ایک صحت مند منہاج قائم کرے۔ لیکن دعوت اسلامی کے مقابلے میں ہمیشہ کوئی نہ کوئی ایسی قوت اٹھ کھڑی ہوتی ہے جو اس منہاج اور اس نظام کو ناپسند کرتی ہے۔ اور پھر یہ قوت اس کی راہ میں اپنی پوری قوت لا کر کھڑی ہو جاتی ہے اور ہر قسم کی مکاری کرتی پھرتی ہے۔ وہ دعوت اسلامی کی ہر برائی پر خوش ہوتی ہے، جو ہاتھ، دل اور زبان سے دعوت اسلامی کے خلاف مسلسل جدوجہد کراتی ہے۔ اس لئے تحریک اسلامی کا بھی

فرض ہے کہ وہ اس معرکہ میں اپنے پورے فرائض اور واجبات کے ساتھ کودے۔ اور اس کا فرض ہے کہ وہ ہر وقت بیدار رہے اور کسی وقت بھی غافل نہ ہو۔

لیکن ان تمام کاموں میں اللہ ترسی کا ہتھیار اس نے لازماً اپنی کمر کے ساتھ باندھا ہوا ہو۔ کیونکہ تقویٰ ایک بیدار چوکیدار ہے جو دل کے دروازے پر بیٹھا ہوتا ہے۔ وہ اسے غافل نہیں ہونے دیتا۔ وہ اسے ضعیف نہیں ہونے دیتا۔ اور وہ اسے حدود سے گزرنے بھی نہیں دیتا۔ اور وہ اسے راہ راست سے بھٹکنے بھی نہیں دیتا۔

اور تقویٰ کے اس بیدار چوکیدار کی ضرورت کا احساس صرف اس شخص ہی کو ہو سکتا ہے جس نے اس راستے کی مشقتوں کو دیکھا ہوتا ہے۔ جس نے متضاد میلانات اور بکثرت اور پے درپے تاثرات کے دباؤ کا مقابلہ کیا ہو۔ مختلف حالات اور مختلف لحظات میں۔

اس سورت میں تار باب پر یہ آخری ضرب تھی۔ جس میں اس قسم کے بے شمار مضارب استعمال کئے گئے۔ اور یہ ضربات سب کی سب ان تاروں پر لگائی گئیں ہیں جن کا تعلق دعوت اسلامی کی راہ میں عائد ہونے والے فرائض اور واجبات سے تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آخر میں یہ فیصلہ دیا جاتا ہے کہ اگر تم ہمہ گیر فلاح چاہتے ہو اور مکمل انقلاب چاہتے ہو تو ان فرائض کا بطریق احسن پورا کرنا ضروری ہے۔
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ..... (امید ہے کہ تم فلاح پاؤ گے۔)

